مفکر اسلام

حضرت مولانا ابو المحاسن سید محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا ابو المحاسن سید محمد سجادؒ سے متعلق براہ راست
آپ کے تلامذہ و متعلقین کی نایاب تحریرات و روایات کا مجموعہ





مرتب

طلحہ نعمت ندوی

مولانا مفتی اختر امام عادل قاسمی

جمعیۃ علماء ہند

Celebrating 100 years of Jamiat Ulama-i-Hind

حضرت مولانا ابوالمحاسن
محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ

مرتب

طلحہ نعمت ندوی

ناشر

مفکر اسلام حضرت
مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجادؒ

(یعنی حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ سے متعلق براہ راست
آپ کے تلامذہ و متعلقین کی نایاب تحریرات وروایات کا مجموعہ)

مرتب

طلحہ نعمت ندوی

تقدیم و نظر ثانی

مولانا مفتی اختر امام عادل قاسمی

ناشر

جمعیۃ علمائے ہند دہلی

تفصیلات کتاب

تمام حقوق بحق مرتب محفوظ

کتاب کا نام : مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجادؒ

مرتب : طلحہ نعمت ندوی

صفحات : ۵۵۲

سال اشاعت : ۲۰۱۸

قیمت : ۴۰۰

ناشر : جمعیۃ علمائے ہند۔ دہلی

کمپوزنگ : ابوذر شیبان

ملنے کا پتہ

فہرست مضامین

عرض مرتب

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان کے ان عظیم المرتبت علماء میں تھے جنہوں اس ملک میں مسلمانوں کے دفاع، اسلامی تشخص کے تحفظ اور حقوق اسلامی کی بازیابی کے لئے کوششیں کیں اور اپنا سب کچھ قربان کر دیا، وہ ملک کے ان عظیم المرتبت بزرگوں میں ہیں جن کے احسانات سے یہاں کے مسلمانوں کی گردنیں ہمیشہ زیر بار رہیں گی، جمعیۃ علماء ہند، خلافت کمیٹی اور امارت شرعیہ جیسی تنظیموں میں ان کا کردار بنیادی اہمیت کا حامل ہے، اور ان کے بغیر ان اداروں کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے اس ملک کے مسلمانوں کو ایک اسلامی نظام کے تحت منظم کرنے اور ان کی زندگی کو اسلامی زندگی بنانے کے لئے امارت کی تحریک چلائی، اور جب ملک گیر پیمانہ پر ان کو اس کی تنفیذ میں کامیابی نہیں مل سکی تو اپنے صوبہ کی سطح پر اس کو نافذ کر دیا۔ جمعیۃ العلماء کی تاسیس و تنظیم میں بھی ان کا بنیادی حصہ ہے، اخیر میں وہ اس کے جنرل سکریٹری بھی رہے اور اسی عہدہ پر ان کا انتقال ہوا، جمعیت کے تمام بزرگوں کو ان کے کارناموں کا اعتراف تھا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان تمام کارناموں کے باوجود انہیں وہ شہرت حاصل نہیں ہو سکی جس کے وہ مستحق تھے، اور اس کی بنیادی وجہ (جیسا کہ ان کے سوانح نگاروں کی زبانی معلوم ہو گا) ان کی شان بے نیازی اور جذبۂ اخلاص تھا، انہوں نے اپنی ذات کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی۔

ان کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے مضامین کے دو مجموعے شائع ہوئے، ایک تو اصلاً ماہنامہ ''الہلال'' پٹنہ کا خصوصی نمبر تھا لیکن ماہنامہ کے بند ہو جانے کی وجہ سے محاسن سجاد کے نام سے شائع ہوا، دوسرا مجموعہ مولانا عبدالصمد رحمانی نے مرتب فرمایا تھا۔ دونوں مجموعے عرصہ ہوا نایاب تھے، اور ان کے مشمولات بھی لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکے تھے، ان مضامین میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے کارناموں اور شخصیت و کمالات کا جس انداز میں ذکر ہے وہ کسی سوانح میں اس تفصیل کے ساتھ نہیں آسکا ہے۔ جناب مولانا انیس الرحمن صاحب قاسمی ناظم امارت شرعیہ نے "حیات سجاد" کے نام سے ان دونوں مجموعوں کے مضامین کا انتخاب شائع کیا تھا، لیکن بہت سے اہم مضامین اس میں بھی نہیں آسکے، اس لئے جب جمعیۃ علماء کی طرف سے حضرت مولانا سجاد کی خدمات پر سیمینار کا علم ہوا تو اس طرف سیمینار کے کنوینر جناب مولانا اختر امام عادل صاحب کی توجہ مبذول کرائی گئی کہ ان تمام مضامین کا مجموعہ شائع ہونا چاہئے، انہوں نے اس کی تائید کرتے ہوئے یہ ذمہ داری راقم کو سونپ دی

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

حضرت مولانا کی شخصیت پر ایک سیمینار تقریباً پندرہ سال قبل امارت شرعیہ میں بھی ہو چکا ہے، جس کے محرک حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمیؒ تھے، اس سیمینار کے مقالات کا مجموعہ بھی شائع ہوا جس میں حضرت مولانا کے کارناموں پر مختلف حیثیتوں سے روشنی ڈالی گئی ہے لیکن اس کے باوجود ان کی حیات و خدمات پر ایک مفصل و محقق سوانح عمری کا کام ہنوز

تشنۂ تکمیل ہے اور ان کی سیاسی، ملی، دینی اور قومی خدمات ہنوز تشریح و تفصیل کی محتاج ہیں۔ کاش کہ:

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

اس کتاب کے مختلف مضامین میں بھی حضرت مولانا کی سوانح کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے، اور جابجا مختلف اہل قلم نے اس عزم کا اظہار بھی کیا ہے، مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کے مضمون سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے بہت سا مواد حاصل کر لیا تھا، لیکن پھر ان کا پتہ نہیں چلتا۔ حضرت مولانا کے تمام چھوٹے بڑے مضامین اور علمی آثار کی ترتیب کا بھی جابجا ذکر ہے، لیکن یہ کام بھی کماحقہ نہیں ہو سکا، اور اب اتنا طویل عرصہ گذر جانے کے بعد تمام مضامین و مواد کی تلاش اور بھی دشوار ہے۔

پیش نظر مجموعہ میں مذکور الصدر دونوں مجموعوں کے مضامین کے علاوہ کچھ اور مضامین بھی شامل ہیں جو حضرت صاحب سوانح کی وفات کے فوراً بعد مجلات ورسائل میں لکھے گئے یا بعد میں ان کی زیارت کرنے والوں نے لکھے، مشاہداتی و تاثراتی مضمون کے علاوہ کسی ایسے صاحب قلم کا مضمون نہیں شامل کیا گیا ہے جو براہ راست ان کے ذاتی مشاہدات پر مشتمل نہ ہو۔ حضرت مولانا کی وفات پر یوں تو بہت سے مضامین شائع ہوئے جس کا اشارہ اس مجموعہ کے متعدد مضامین میں بھی جابجا ملے گا لیکن افسوس کہ اب ان میں بہت کم ہماری دسترس میں ہیں، اصل کام تو انہیں مضامین کی تلاش و ترتیب کا تھا جس سے اس مجموعہ کی قیمت میں اضافہ ہوتا اور اس کی معنویت بڑھ جاتی، اور جہاں تک رسائی ہو سکی تلاش کی کوشش کی گئی لیکن کامیابی بہت کم مل سکی، مزید قدیم

کتب خانوں کی تلاش و تحقیق کے لئے فرصت ہمدست نہیں، سیمینار سے قبل اس کی اشاعت میں بہت کم وقت باقی رہ گیا ہے اس لئے جو کچھ مل سکا پیش خدمت ہے، مزید پھر کبھی فرصت ملی تو ان شاء اللہ۔

سیمینار کے کنوینر و محرک جناب مولانا اختر امام عادل صاحب قاسمی کا حکم ہوا کہ دونوں مجموعوں میں جتنے مضامین ہیں سب شامل کئے جائیں، خواہ وہ باب الجدل ہی کیوں نہ ہو، مولانا مسعود عالم ندوی کے مجموعہ میں راغب احسن صاحب کا ایک تنقیدی مضمون شائع ہوا تھا اور پھر اس کا جواب لکھوایا گیا تھا جو بقول مولانا عبد الماجد دریابادی مقدمہ نگار کتاب "کتاب المناقب میں کتاب الجدل کا اضافہ تھا"، اور بقول مولانا مناظر احسن گیلانیؒ "قدیم کتب رجال کے طریقۂ و منہج کی تجدید تھی"، لیکن مرتب (مولانا مسعود عالم ندویؒ) نے بھی اشاعت پر اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہوئے ایک مختصر نوٹس میں اعتراضات کا جواب دیا تھا، پھر ایک مضمون ”سرود رفتہ“ کے عنوان سے جناب شمس ہاشمی صاحب بہاری کا شامل کتاب کیا گیا تھا، مولانا نے مقدمہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ انہوں نے راغب صاحب سے اس میں ترمیم کی گذارش کی لیکن وہ راضی نہ ہوئے مجبوراً انہیں نوٹس بھی لکھنا پڑا اور ایک جوابی مضمون بھی لکھوا کر شامل کرنا پڑا جس کی وجہ سے بہت سے اہم مضامین شامل کتاب نہ ہو سکے۔ پھر مولانا سید عروج احمد صاحب قادری نے ”حقیقت سجاد“ کے نام سے ایک مختصر رسالہ میں اس کا جواب دیا تھا جو حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کے مختصر مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا تھا، اور راغب صاحب کا مضمون ہی مولانا عبد الصمد رحمانی کے لئے بھی ایک نئے مجموعہ کی ترتیب کا محرک بنا کہ اس ایک مضمون کی وجہ

سے احباب کی نگاہ میں پورا مجموعہ نظر ثانی کا محتاج تھا، جیسا کہ مولانا نے مقدمہ میں اس کی وضاحت فرمائی ہے، پھر مولانا کے قریب رہنے والے احباب ورفقاء سے مضامین لکھوائے گئے، اور مولانا کے کمالات کے مزید پہلو سامنے آئے اور اس طرح اس شر سے خیر کے کئی پہلو نکل آئے، مولانا مسعود عالم صاحب نے مقدمہ میں مولانا عبد الصمد رحمانی سے معذرت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کا مضمون جو امارت شرعیہ پر تھا وہ بھی اعتراضات وجوابات کی وجہ سے شائع نہ ہو سکا، عجب نہیں کہ یہ وجہ بھی مولانا رحمانی کے لئے محرک ہوئی ہو، لیکن خود مولانا کے مجموعہ میں مولانا کا کوئی مضمون امارت شرعیہ پر شامل نہیں ہے، معلوم نہیں وہ کہیں شائع بھی ہوا یا نہیں، بعد میں مولانا ہی نے تاریخ امارت شرعیہ لکھی، ممکن ہے وہ اسی مضمون کی تفصیل ہو۔ محاسن سجاد میں بھی جو مضامین مرتب کی حسب تصریح شائع ہونے سے رہ گئے تھے ان کے متعلق بھی کوئی علم نہیں کہ آیا وہ کسی اخبار یا رسالہ میں شائع ہوئے یا ضائع ہو گئے۔ اگر یہ مجموعہ شائع نہ ہوتا یا مضامین اخبارات کی فائلوں میں شائع ہو کر گم ہو جاتے تو مولانا کے بہت سے حالات پردۂ خفا میں رہ جاتے۔ اللہ بھلا کرے ان تمام کا جنہوں نے اس میں محنت کی اور جو اس کے محرک بنے کہ ان کی وجہ سے اس مرد مجاہد کی زندگی کے بہت سے مخفی گوشے اہل علم ونظر اور امت کے سامنے آکر نمونہ بن گئے، بالخصوص اس دور میں جب کہ حضرت مولانا جیسے بزرگوں کے حالات کی بہت ضرورت ہے۔

مولانا قاسمی صاحب کا حکم ہوا کہ ان تمام مضامین کو شامل کیا جائے، اس لئے کہ تاریخی دیانت کا تقاضا یہی ہے، نیز وقت نے جس طرح

مولانا کے ناقدین کے سوالات جواب دیئے ہیں، اور ان تنقیدات کی ہوا اکھڑ گئی ہے، یہ حقیقت بھی لوگوں کے سامنے آجائے، علاوہ ناقدین کے قلم سے مولانا کے حسن اعتراف میں بعض ایسی سچائیاں ابل کر آگئی ہیں، جن سے سیرت سجاد کی تصنیف میں مدد مل سکتی ہے،۔۔۔ گرچہ میرا ارادہ اس قصۂ پارینہ کو دہرانے کا نہیں تھا لیکن ان کے حسب الحکم دونوں مضامین اور حقیقت سجاد کو بھی اس کے تمام مقدمہ اور تمہید کے ساتھ اس مجموعہ میں جگہ دی گئی ہے۔

مجموعہ کی مزید تفصیل اور کام کے طریقہ کار اور منہج کے ذکر سے قبل دونوں مجموعوں پر اجمالی روشنی ڈالنا بہتر معلوم ہوتا ہے:

محاسن سجاد کے اکثر مضامین کا آغاز خطاب کی شکل میں ہوتا ہے جیسے کسی خط میں یہ مضامین لکھے گئے ہوں جب کہ حیات سجاد میں ایسا نہیں ہے۔ محاسن سجاد الہلال بک ایجنسی پٹنہ سے چھوٹے سائز پر ۱۹۲ صفحات میں شائع ہوئی تھی جس میں موضوع وار مضامین مرتب کے گئے تھے، نظم صرف ایک ہی شائع کی گئی تھی جو مولانا سید عروج احمد قادری کی تھی، دیگر نظموں کے بارے میں مولانا نے مقدمہ میں معذرت کی ہے کہ ان دونوں مضامین نے کتاب کے بہت سے صفحات گھیر لئے جس کی وجہ سے بہت سے اہم مضامین اور نظمیں شامل نہ ہو سکیں، ان نظموں کی بعد میں اشاعت کا کوئی علم نہیں، کتاب کے سرورق پر مولانا محمد سمیع اللہ کتب خانہ عزیزیہ دہلی اردو بازار لکھا ہے۔ مولانا عبد الماجد دریابادی نے تین صفحات میں جامع مقدمہ لکھا ہے۔ پھر تقریب کے عنوان سے مرتب نے اپنی معروضات پیش کی ہیں، مولانا نے

ترتیب مضامین پر گفتگو سے قبل حضرت صاحب سوانح کے سلسلہ میں جو لکھا ہے اس کا یہاں نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، مولانا لکھتے ہیں:

"۱۷ شوال کی شام بھلائے نہیں بھولے گی، علالت کی خبریں تو ایک ہفتہ سے مل رہی تھیں، لیکن مرض کی شدت کا احساس نہیں تھا، اسی لئے عیادت میں بھی سستی ہوئی، ۱۷ کی صبح کو ہم لوگ (راقم، منصور کاکوی، عبد الاحد فاطمی) روانہ ہوئے، دس بجے پھلواری پہنچے، مولانا ہوش میں نہیں تھے، سانس زوروں پر چل رہی تھی، لیکن کسی کو خطرناک حالت کا احساس نہیں تھا، کوئی بارہ بجے ایک ڈاکٹر سید عثمان صاحب تشریف لائے تو خطرہ کی گھنٹی بجی، ہم لوگ عثمان صاحب کی گھبراہٹ دیکھ دیکھ کر سہمے جاتے تھے، بے چارے نے اپنی سی تمام تدبیریں کیں، تیمارداروں اور دوستوں نے دوڑ دھوپ میں کمی نہ کی لیکن وقت پورا ہو چکا تھا، پھر بھی بات ذہن میں نہیں آتی تھی کہ مولانا اس قدر جلد جدا ہو جانے والے ہیں، چار بج کر بیس منٹ پر ہم لوگ رخصت ہوئے اور بیس پچیس منٹ کے بعد یہ پاکباز ہستی جسے دنیا ابو المحاسن محمد سجاد کے نام سے پکارتی تھی اس دار فانی سے رخصت ہوگئی، رحمہ اللہ رحمۃ الابرار الصالحین من عبادہ۔ صبح کو پھر منصور اور عبد الاحد ملے، سب کے دل ٹوٹے ہوئے تھے اور آنکھیں آمادۂ گریاں، لیکن لب کشائی کی ہمت نہیں ہوتی تھی، بات ہوئی تو یہ کہ الہلال کا سجاد نمبر نکالا جائے اور ترتیب و تبویب یہ گنہگار کرے"۔ اس کے بعد مولانا نے لکھا ہے کہ کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ الہلال نمبر کے بجائے "محاسن سجاد" کی تجویز سامنے آئی اور اس کی ذمہ داری بھی مولانا ہی کو دی گئی۔

پھر مولانا نے پہلے مضمون کے آغاز میں ذاتی حالات پر ایک نوٹ حسب ذیل الفاظ میں لکھا تھا: "ذاتی حالات کے سلسلے میں چار مضمون شائع کئے جا رہے ہیں، ان کے لکھنے والے مولاناؒ سے خاص تعلق رکھتے تھے، مولانا عبد الحکیم صاحب تو عرصہ تک ساتھ کام کرتے رہے اور مولانا کے قائم کئے ہوئے مدرسہ انوار العلوم کے نظم و اہتمام کا سارا بار ان ہی کے کندھوں پر ہے۔ خان بہادر مباک کریم صاحب سے مولانا مرحوم نے باضابطہ استفادہ کیا تھا، خود مولانا مبارک کریم صاحب کے بیان کے مطابق مولاناؒ نے ان سے متوسطات تک کی کتابیں پڑھی تھیں، لیکن دوسرے جاننے والے اس کی تائید نہیں کرتے، ممکن ہے انہیں اس کا علم نہ ہوا ہو۔ اس سلسلے کا تیسرا مضمون خاص طور پر لائق ذکر ہے، مولانا اصغر حسین صاحب نے مولاناؒ کی تعلیمی زندگی کا مفصل اور مکمل خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ کامیاب ہیں، اس پُر معلومات تحریر کے لئے ہم خاص طور پر شکر گذار ہیں۔ برادر محترم حکیم یوسف حسن خاں صاحب (جنہیں مولانا مبارک کریم صاحب، مولانا اصغر حسین صاحب اور مولانا مرحوم تینوں سے تلمذ کا شرف حاصل ہے) نے بھی الہ آباد کی زندگی کا مختصر خاکہ پیش کیا ہے۔ ان چاروں مضمون کے علاوہ ہمیں مولوی سید شاہد حسین صاحب سوزؔ الہ آبادی (نبیرۂ مولانا عبد الکافی صاحب مرحوم) کی ایک مرتب کردہ یادداشت استاذ محترم حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ کے توسط سے ملی، جس سے مولاناؒ کی تعلیمی اور تدریسی زندگی پر خاصی روشنی پڑتی ہے، حالات کے تکرار کے باعث ہم اسے نہیں چھاپ رہے ہیں، لیکن اعتراف حقیقت سے گریز ہوگا اگر اس کا اظہار نہ کر دیا جائے کہ ہمیں

حواشی کی تحریر اور بعض واقعات کی تصحیح میں مولوی شاہد حسین صاحب کی اس یادداشت سے کافی مدد ملی"۔

مولانا عبد الصمد صاحب رحمانیؒ کی حیات سجاد اس کے کچھ دنوں کے بعد ہی شائع ہوئی، مولانا نے مقدمہ میں لکھا ہے:

"۱۵؍ شوال ۱۳۵۹ھ (۱۸؍ نومبر ۱۹۴۰ء) کی شام غم کی پہلی صبح کو جب سوگوار دل کو افاقہ کی پہلی مہلت ملی، اور وفورِ غم کے سکون سے اس احساس کی صلاحیت ہوئی کہ تمام مسلمانانِ ہند کے متاع گراں نمایہ کو ہم ہمیشہ کے لیے سپردِ خاک کر آئے۔ تو اسی کے ساتھ ساتھ اس کا بھی احساس ہوا کہ مرنے والے کی زندۂ جاوید زندگی کو سپردِ قلم کیا جائے تاکہ مرنے کے بعد بھی مرنے والے کی زندگی سے اسی طرح فائدہ اٹھایا جائے۔ جیسا کہ اس کی زندگی میں ہم فائدہ اٹھاتے تھے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز یہ سامنے آئی، کہ الہلال کا "سجاد نمبر" نکالا جائے، جو حضرت استاذ مرحوم کی سرپرستی میں اب تک نکل رہا تھا، مگر تقدیر الٰہی نے ساتھ نہ دیا۔ اور یہ خواب تعبیر کا جامہ نہ پہن سکا۔ "سجاد نمبر" کے بدلے "محاسن سجاد" کی تجویز سامنے آئی۔ اور یہ قرار پایا کہ مولانا مسعود عالم صاحب ندوی جو مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ارادت مند، اور عزیز بھی ہیں، وہی اس کی ترتیب و تبویب بھی کریں۔

چار پانچ مہینوں کی پیہم کاوشوں کے بعد ایک اچھا خاصہ مجموعہ "محاسن سجاد" نامی پریس سے نکلا۔ اور "سابقون اوّلون" کا سہرا مولانا ممدوح کے سر بندھا۔ لیکن ہونے والی بات نہایت تکلیف دہ یہ ہوئی کہ اس مجموعہ گلدستہ

میں ایک کانٹا بھی شامل ہوگیا۔ اور مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کو اپنی تقریب میں اس کی نسبت ان الفاظ میں معذرت لکھنی پڑی: "راغب احسن صاحب کا مضمون شاید بہتوں کے لیے تکلیف دہ ہو، پر حالات کچھ ایسے پیدا ہوگئے کہ اس کی اشاعت ناگزیر ہوگئی۔ الخ"

اس مجموعہ میں راغب صاحب (جنرل سکریٹری ضلع کلکتہ مسلم لیگ) کے مضمون کی افادیت کا تعلق محاسن سجاد سے نہیں ہے، بلکہ ان کے اختلاف مسلک کے معاندانہ جذبات سے ہے، جس کا حاصل ہے کہ مولاناؒ کی زندگی کا خاتمہ ناکامی پر ہوا۔ اور مولانا ملک وملّت دونوں کے لیے کھوئے گئے۔

محاسن سجاد جب اس طرح پریس سے نکلا تو پڑھنے والوں پر یہ اثر ہوا کہ مولاناؒ کے ارادت مندوں اور اپنوں کو راغب صاحب کے مضمون کی وجہ سے اس درجہ آزردگی اور تکلیف ہوئی کہ وہ اس کا تحمل نہ کرسکے۔ اور محاسن سجاد کے مجموعہ سے تبری کا اظہار کیا۔ اور غیروں کی نظر میں وہ اس لیے قابلِ اعتناء نہیں ہوا کہ آخر وہ "محاسن سجاد" ہے۔ اب اصل مسئلہ جہاں پر تھا، پھر وہیں آگیا۔ کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت پر کوئی مختصر مجموعہ مرتب کیا جائے۔ اس منزل پر پہنچ کر صورتِ حال یہ تھی کہ دفتر امارت شرعیہ میں ایک طرف اس طرح کے خطوط آنے لگے۔ کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت اور حالات پر کوئی کتاب لکھی گئی ہو تو بھیج دی جائے۔ اور دوسرے طرف احباب کا اور مولاناؒ کے ارادت مندوں کا تقاضا شروع ہوا کہ اس کام کو جلد سے جلد انجام دیا جائے۔

امارت شرعیہ کی دفتری خدمت (نظامت) کے ساتھ میرے لیے
اس کی انجام دہی دشوار سے دشوار تر تھی۔ مگر احباب کے اس اصرار پر سپر رکھ
دینی پڑی کہ مولاناؒ کے وصال کے بعد مولاناؒ کے کارنامے اور خدمات کی ترتیب
تم ہی دو۔ اس لیے کہ مولانا کی زندگی میں بحیثیت کلرک کے مولاناؒ کے مسودات
کی ترتیب تم ہی دیا کرتے تھے"۔ اس میں بھی موضوع وار مقالات مرتب کئے
گئے ہیں، اور کئی نظمیں بھی شامل کتاب ہیں، مولانا عروج احمد قادری کی دونوں
کتابوں میں حضرت مولانا کی وفات پر الگ الگ نظمیں شامل ہیں اور وہ دونوں
اس مجموعہ میں بھی موجود ہیں، ان دونوں نظموں سے مولانا عروج احمد قادری
کے حضرت مولانا سے غایت درجہ کے تعلق کا اندازہ ہوتا ہے شاید یہی عقیدت
ومحبت تھی جس نے ان سے بعد میں حضرت مولانا کے دفاع میں راغب صاحب
کے مضمون کا جواب بھی لکھوایا۔

اس مجموعہ کے مقالات کی ترتیب میں میں نے موضوع بندی کے
بجائے تسلسل کو ترجیح دی ہے اور شخصیات کے حسب مراتب ان کے مقالات کو
جگہ دی گئی ہے، معاصرین میں کہیں کہیں اس کی کمی نظر آئے گی لیکن علماء کے
مقالات کو میں نے ان کے تقدم زمانی کے لحاظ سے اولیت دی ہے ۔

کتاب میں اصحاب مضامین کا مختصر تعارف حواشی میں درج کیا گیا ہے،
ان میں معروف شخصیتوں پر اختصار کے ساتھ اور کم شہرت یافتہ شخصیات کے
بارے میں کچھ تفصیل ذکر کرنے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن پھر بھی بہت سی
شخصیات کے حالات نہیں مل سکے۔ مضمون نگاروں کے علاوہ بھی جن شخصیات
کے بارے میں مجھے اندازہ ہوا کہ ان کا ذکر کہیں اور نہیں آسکا ہے، اور مجھے ان

کے حالات معلوم تھے، میں نے ان کے متعلق اپنی معلومات درج کردی ہیں کہ
شاید اس کے ذریعہ ان کے حالات محفوظ رہ جائیں۔ میں نے رجال کے ذکر میں
خواہ وہ صاحب مضمون ہوں یا کوئی اور، اس کی کوشش کی ہے کہ وہ معلومات
درج کی جائیں جو عام طور پر مشہور نہیں لیکن اس کے باوجود اہل علم کو اس میں
تشنگی نظر آئے تو معاف فرمائیں کہ میں اس کام میں کسی ایک منہج کو نہیں اپنا سکا،
اس کے بہت سے وجوہات ہیں جو یہاں ذکر نہیں کئے جاسکتے ، بعض شخصیات پر
میں نے عمداً حاشیہ نہیں درج کیا اور مقامات میں بھی زیادہ جگہوں کا تعارف نہیں
درج کرسکا کہ مفصل تعارف کے لئے جس تحقیق وجستجو کی ضرورت تھی اس کی
فرصت مجھے ہمدست نہ تھی، بعض پر میں نے عمداً کچھ نہیں لکھا کہ مولانا ہی پر
ایک مضمون میں ان پر مفصل لکھ چکا ہوں جو مجموعۂ مقالات کے ساتھ ان شاء
اللہ شائع ہوگا۔ جن شخصیات ومقامات پر میں نے حواشی درج کئے ہیں وہ اکثر
حضرت صاحب سوانح کے علاقہ سے متعلق ہیں جن سے راقم کا بھی تعلق ہے
اور ان سے واقفیت کے لئے مجھے کسی مطالعہ کی ضرورت نہیں تھی، اس علاقہ
کے علاوہ دیگر مقامات خصوصاً شمالی بہار کے بہت سے مقامات ورجال (جن کا اس
مجموعہ میں بار بار ذکر آیا ہے) سے عدم واقفیت کی بنا پر ان کے سلسلہ میں میں کچھ
نہ لکھ سکا۔ سابقہ حواشی علی حالہ باقی رکھے گئے ہیں، جن کے اخیر میں (م) ہے
وہ مولانا مسعود عالم صاحب کے حواشی ہیں، مولانا عبد الصمد صاحب اور مقالہ
نگاروں کے حواشی ان کے ناموں کے ساتھ درج ہیں، اس کے علاوہ بقیہ حواشی
میرے ہیں۔

دونوں مجموعوں میں جابجا الفاظ کی کمی بیشی نظر آئی، مجھے معلوم نہیں کہ ان کے مرتبین نے اشاعت کے بعد ان پر نظر ثانی کی تھی یا نہیں، اور کی تو ان کے وہ تصحیح کردہ نسخے کہاں ہیں، جن کی روشنی میں ان اغلاط کی تصحیح کی جاتی اور اس کی وضاحت ہوتی کہ یہ مصنف کا سہو قلم ہے یا عمداً ان کی تحریر ہے یا پھر طباعت کی غلطی ہے۔ عربی کی طرح ابھی تک اردو میں مختلف نسخوں کو سامنے رکھ کر مضامین کی تصحیح، حواشی میں ان تصحیحات کی وضاحت یا زبان کے اصول وقواعد کے مطابق عبارتوں کے اغلاط کی نشاندہی کا رواج عام نہیں ہوا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ قدیم وجدید کتابوں کے مختلف ایڈیشنوں میں بسا اوقات بہت زیادہ فرق نظر آتا ہے، لیکن ان کی طرف توجہ نہیں ہو پاتی، اس سلسلہ میں عام محققین کے منہج اور مغربی اصول تحقیق (جس میں متن کی ترتیب کے بجائے حواشی میں مختلف نسخوں کا فرق واضح کر دینا کافی سمجھا جاتا ہے) کے بجائے حضرت مولانا فضل اللہ صاحب رحمانی (نبیرہ حضرت مونگیریؒ) کا منہج تحقیق قابل تقلید نظر آتا ہے، جس کی انہوں نے اپنی مشہور زمانہ کتاب "فضل اللہ الصمد فی توضیح الادب المفرد" میں وضاحت فرمائی ہے کہ اصل یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے مصنف نے کیا لکھا ہے بجائے اس کے کہ صحیح کیا ہے اور متن میں اسی کو درج کیا جائے پھر حواشی میں غلطی کی تصحیح کی جائے۔

مضامین کے مجموعہ میں مشمولات کی تکرار کوئی نئی بات نہیں، اس مجموعہ میں بھی سوانح حیات پر کئی مضامین ہیں نیز دیگر مضامین میں بھی مکررات ملیں گے۔ حالات وسوانح پر اس مجموعہ میں سب سے مفصل مضمون حضرت امیر شریعت مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، جو حضرت

صاحب سوانح علیہ الرحمۃ کے خصوصی تربیت یافتہ اور عزیز شاگردوں میں تھے۔

واقعات کے سلسلہ میں یہ عرض کر دینا بھی مناسب ہے کہ صاحب سوانح کے واقعات وحالات میں مختلف مضامین میں تضاد نظر آئے گا، بالخصوص بچپن اور طالب علمی کے واقعات میں متعدد مضامین میں مختلف واقعات ذکر کئے گئے ہیں، اس سلسلہ میں قرائن کے ذریعہ صحیح فیصلہ تک پہنچنا ایک اہم کام ہے، جو ابھی باقی ہے۔

اردو میں علماء کی تحریروں میں اکثر عربی تاریخیں درج کی جاتی ہیں لیکن بہت سے عام واقعات کی انگریزی تاریخیں یاد رہتی ہیں تو وہی درج کر دی جاتی ہیں، اس طرح دونوں تاریخوں میں خلط مبحث ہو جاتا ہے، اس لئے اس کتاب میں جہاں جہاں عربی تاریخیں پہلی بار آئی ہیں کوشش کی گئی ہے کہ وہاں عربی سنہ اور تاریخ بھی قوسین میں درج کر دی جائے، لیکن اگر وہی تاریخ کتاب میں مکرر آئی ہے تو پھر وہاں اضافہ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، البتہ اجمالی طور پر اتنا ذکر کر دینا مناسب ہے کہ حضرت کی ولادت ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۲ء اور وفات ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹۴۰ء میں ہوئی، ان کی زندگی اور تمام حالات وواقعات انہیں دو تاریخوں کے درمیان کی ہیں اس لئے ان کو پیش نظر رکھا جائے تو دونوں تاریخیں آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہیں۔

ماضی میں قلمی یا مطبوعہ کتابیں بغیر کسی فہرست کے شائع کی جاتی تھیں، اور تحقیق کے لئے پوری کتاب کا مطالعہ ضروری ہوتا تھا، لیکن آج کے اس مشینی دور میں انسان کے پاس اتنا وقت نہیں کہ پوری کتاب کا مطالعہ کرے

اس لئے نہ صرف فہرست مضامین بلکہ رجال ومقامات کے اشاریے بھی مرتب ہونے لگے اور اب تو انگریزی اور عربی کی کتابوں میں بسا اوقات ایسے مفصل موضوعاتی اشاریے بھی مرتب ہونے لگے کہ انسان جلد از جلد اپنے مطلوبہ مواد تک پہنچ سکے، اردو میں ابھی موضوعاتی اشاریہ کا رواج عام نہیں ہوا ہے، اس مجموعہ کے لئے مفصل فہرست کے علاوہ موضوعاتی اشاریہ کی ضرورت اس لئے بھی معلوم ہوئی کہ ایک موضوع پر مختلف مضامین میں مختلف الفاظ میں روشنی ڈالی گئی ہے، ایک محقق وباحث کو اس سے تمام متعلقہ مواد تک رسائی میں آسانی ہوگی، مرتب نے اس میں باحثین کی سہولت پیش نظر رکھی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ یہ مجموعہ اہل علم اور اہل تحقیق کے لئے مفید ہو سکے۔

اس کتاب کو مرحلۂ تکمیل تک پہنچانے میں جن حضرات کی عنایات وتوجہات شامل رہیں یا ان کا تعاون حاصل ہوا ارشاد نبوی (علی صاحبہ الصلاۃ والسلام) من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ کے حسب الحکم ان کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے۔

جمعیۃ علماء کے صدر حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب دامت برکاتہم اور مولانا سید محمود مدنی ناظم جمعیۃ علماء ہند، مولانا معزالدین قاسمی ناظم ادارۃ المباحث الفقہیہ جمعیۃ علماء کی عنایتوں کا ممنون ہوں کہ انہوں نے ایک علمی خدمت کا موقع فراہم کیا۔ اپنے کرم فرما محترمی مولانا اختر امام عادل صاحب کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ انہوں نے بہت سے مقالات ومواد کی فراہمی اور نشاندہی کر کے نیز بار بار اپنی توجیہات سے ممنون فرمایا، فجزاہ اللہ خیرا الجزاء۔ والد محترم مولانا حشمت علی صاحب حفظہ اللہ (صدرالمدرسین

مدرسہ محمدیہ استھانواں) کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے اس کتاب پر نظر ثانی فرما کر بعض اطلاعات کی تصحیح بھی کی اور پروف بھی دیکھے، برادر محترم مولانا سید ولی حسن قادری ندوی سے بہت سی معلومات کے لئے مراجعت کی جس کے لئے ان کا بہت بہت شکریہ، حفظہ اللہ وبارک فی حیاتہ۔ اپنے برادر خورد عزیزم ابوذر محمد شیبان (بی ٹیک، حیدرآباد) کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری ہے کہ اس کتاب کی ترتیب میں شروع سے اخیر تک ان کا تعاون حاصل رہا جس کے بغیر اس کی تکمیل بہت مشکل تھی، اللہ تعالیٰ ان کو دین ودنیا دونوں کی ترقی عطا فرمائے۔

اللہ تعالیٰ اس مجموعہ کو قبول فرما کر صاحب تذکرہ اور مرتب ومعاونین سب کے لئے رفع درجات کا ذریعہ بنائے اور اسے مفید بنائے، آمین۔

طلحہ نعمت ندوی

استھانواں، بہار شریف

۲۵ محرم الحرام ۱۴۴۰ ہجری روز جمعہ

مقدمہ

گاہے گاہے باز خواں۔۔۔۔۔

مولانا مفتی اختر امام عادل قاسمی

ہر عہد کی ایک ضرورت ہوتی ہے اور اسی کے مطابق افراد اور رجال کار پیدا ہوتے ہیں، حضرت مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجادؒ بھی اسی سلسلۂ قانون فطرت کی ایک کڑی تھے، مولانا محمد سجادؒ نے جس عہد میں اپنی آنکھیں کھولیں، وہ عہد انتہائی انتشار کا تھا، ہندوستان کی سرزمین پر صدیوں حکمرانی کرنے والی تاریخی امت سیاسی منظرنامے سے غائب ہو چکی تھی اور ہندوستان کے سیاسی افق پر ایک نئی امت کا سورج طلوع ہو چکا تھا، صدیوں سے قائم ایک شاندار تہذیبی، سیاسی اور اقتصادی نظام کا شیرازہ بکھر چکا تھا، اور ایک نیا اخلاقی، تہذیبی، سیاسی اور معاشی نظام اس کی جگہ لے رہا تھا، ایک بساط الٹ چکی تھی، اور نئی بساط پر نئے مہرے جمائے جا چکے تھے، جس قوم نے سرزمین ہند کی سب سے شاندار تاریخ بنائی تھی، اب وہ خود تاریخ کا حصہ بنتی جا رہی تھی اور جس امت نے اپنی قابل فخر روایات کے مطابق دنیا کو سخاوت وفیاضی کا عملی درس

دیا تھا، آج وہ خود نئے حکمرانوں کے حضور سوالیوں اور حقوق و نوازشات کے امیدواروں کی صف میں کھڑی تھی۔

سوچئے کیسا المناک اور اذیت ناک دور تھا وہ، علامہ حالی بھی تڑپ اٹھے تھے۔

جس دین کے مدعو تھے کبھی قیصر و کسریٰ
وہ آج خود مہمان سرائے فقراء ہے

اور اپنا غم آقائے نامدار کے حضور اس طرح پیش کیا تھا:

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے
امت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے

اقبال بھی خون کے آنسو روئے تھے:

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

مولانا محمد سجادؒ اس منظرنامہ کے عینی شاہد تھے، اور فطرت کی جانب سے حساس اور فکرمند دل و دماغ لیکر آئے تھے، انہوں نے ایک خوشحال زمیندار گھرانے میں اپنی آنکھیں کھولی تھیں اور نیا عہد زمیندارانہ نظام پر خط نسخ کھینچ رہا تھا، پرانے تمام اقدار مسخ کئے جا رہے تھے اور نئے مصنوعی اقدار کو ان کی جگہ دی جا رہی تھی۔

ادوار حیات میں گہرا ارتباط

مولانا محمد سجادؒ کی زندگی کا پورا مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ ان کی حیات اور خدمات کا ہر گوشہ ایک دوسرے سے مربوط ہے، اس درجہ کا ارتباط ان کے

معاصر علماء اور قائدین کے یہاں کم نظر آتا ہے، مولانا سجادؒ کی زندگی کا ہر لمحہ مقصدیت کے ساتھ گہرا ربط رکھتا ہے اور ہر پہلا لمحہ دوسرے لمحہ کی تمہید معلوم پڑتا ہے، مولانا کی تدریسی خدمات سے لیکر مدرسہ انوارالعلوم کی مجاہدانہ سرگرمیوں اور " انجمن علماء بہار "تحریک خلافت، جمعیۃ علماء ہند اور پھر امارت شرعیہ کے قیام تک کی پوری تاریخ پڑھ جائیے، آپ کو ہر جگہ یہ حقیقت جگمگاتی نظر آئے گی۔

انتخاب خداوندی

مولانا سجادؒ کے حالات زندگی پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جیسے ان کو کسی خاص کام کے لئے تیار کیا جارہاہو، شروع سے آخر تک ان کے حالات زندگی پر تاریخی ترتیب کے مطابق نظر ڈالی جائے تو ان کا ہر پچھلا دور اگلے دور کی تمہید معلوم ہوتا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ایک عہد سے نکلتے ہوں تو دوسرا عہد ان کے استقبال کے لئے تیار کھڑا ہو۔۔۔۔وہ تعلیمی دور سے فارغ ہوئے تو تدریسی دور ان کے سامنے موجود تھا، وہ سیکھنے کے رسمی مرحلے سے نکلے تھے کہ ایک زمانہ خود ان سے سیکھنے کا منتظر تھا، تدریسی مرحلے میں کئی مدارس نے ان کی خدمات سے استفادہ کیا، جس میں خود وہ مدرسہ بھی شامل ہے جہاں انہوں نے اپنے طالب علمی کے خوبصورت ایام گذارے تھے، جہاں وہ طالب بن کر گئے تھے وہیں مطلوب بن کر تشریف لائے، پھر تدریس کا یہ دور بھی " گیا" کے ایک ایسے مدرسہ پر اختتام پذیر ہوا جو محض ان کی علمی خدمات ہی کا مرکز نہیں بلکہ ان کی مجاہدانہ اور ملی سرگرمیوں کا نقطۂ آغاز بھی تھا اور یہیں سے انہوں نے غلام ہندوستان میں ملت اسلامیہ کی نشأۃ ثانیہ، امت مسلمہ کے ملی تشخصات

وامتیازات کے تحفظ واحیاء اور شرعی بنیادوں پر اس بکھری ہوئی قوم کی شیرازہ بندی کا پروگرام بنایا۔

زوال کی بنیاد

اور اسی زمانہ میں ان پر یہ راز منکشف ہوا کہ ہندی مسلمانوں کے انتشار وزوال کی جڑیں دراصل خود علماء ومشائخ کی صفوں سے وابستہ ہیں، پوری امت شخصیات اور جماعتوں کے نام پر بٹی ہوئی تھی، عجب افرا تفری کا عالم تھا، مسلمان باہم دست وگریبان تھے، بحث ومناظرہ کی محفلیں گرم تھیں، کفر وضلالت کے فتوے داغے جارہے تھے، اور یہ سب کچھ عین اس وقت ہورہا تھا، جب پوری دنیائے کفر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف متحد ہوچکی تھی، مسلم ممالک اور ریاستیں غیر مسلم نوآبادیات میں تبدیل ہورہی تھیں، اور اسلامی آثار وباقیات کو مٹانے کی تیاری مکمل ہوچکی تھی۔۔۔۔ ظاہر ہے کہ اس طبقاتی جنگ کی سربراہی علماء ومشائخ کررہے تھے، ہر طبقہ کا ایک قائد تھا جو اس کی نکیل تھامے جدھر چاہتا تھا لے جاتا تھا۔

مولانا سجادؒ کی اولیات وامتیازات

امت کی شیرازہ بندی سے قبل علماء کی شیرازہ بندی

☆ایسے نازک وقت میں حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجادؒ کا دوررس دماغ اس نتیجہ پر پہونچا کہ امت کی شیرازہ بندی سے قبل علماء کی شیرازہ بندی ضروری ہے، جب تک علماء اپنی جنگ ختم نہ کریں گے یہ امت لڑتی ہی رہے گی، بعد کے حالات وواقعات نے ثابت کیا کہ یہ اس وقت کا سب سے صحیح اور دوررس فیصلہ تھا، مولانا سجادؒ کی یہ فکر عالمی تھی مگر ان کے وسائل محدود

تھے، لیکن انہوں نے اپنے محدود وسائل سے بھی ایسے عظیم کارنامے انجام دیئے، جو تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

ناممکن کے انتظار میں ممکن کو کھودینا دانشمندی نہیں

چنانچہ "انجمن علماء بہار اور جمعیۃ علماء ہند "کے ذریعہ علماء کی شیرازہ بندی کے بعد مولانا سجادؒ نے ہندوستان میں "امارت شرعیہ " کے قیام کی جدوجہد شروع کی، ان کے نزدیک کسی غیر مسلم ملک میں مسلمانوں کی وحدت و تنظیم کی اس سے بہتر کوئی اساس نہیں تھی، مولانا کے پیش نظر ایک طرف مسلم اقلیتی ممالک کے بارے میں فقہاء کی ہدایات و تصریحات تھیں، تو دوسری طرف ہندوستان کا موجودہ سیاسی منظر نامہ، اس تناظر میں جب کہ ہندوستانی مسلمان سیاسی شوکت واقتدار سے محروم ہو چکے تھے، ان کے مذہبی شعائر و آثار کی حفاظت اور ان کو کسی مضبوط اور مقدس رشتۂ واحد میں جوڑنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہ تھی کہ مسلمان اپنے داخلی مسائل و معاملات کو منظم و مستحکم کرنے کی فکر کریں، اور ایک امیر شریعت کی ماتحتی میں اپنی زندگی گذارنے کی عادت ڈالیں، جہاں تک وہ نہیں پہونچ سکتے اس کے انتظار میں جہاں تک پہونچ سکتے ہیں اس کو ہاتھ سے نہ جانے دیں، اور ناممکن کی تلاش میں ممکن کو نہ کھو بیٹھیں، یہ ایک انتہائی مثبت اور دانشمندانہ سوچ تھی اس سے ایک طرف ان نصوص وروایات کی تعمیل ہوتی تھی، جن میں نصب امیر کی تاکید کی گئی ہے، اور امارت سے آزاد موت و حیات کو جاہلیت کی موت و حیات سے تعبیر کیا گیا ہے۔۔۔۔ دوسری طرف فقہاء کی ہدایات کے مطابق وہ اہم ذمہ داری پوری ہوتی تھی جو کسی غیر مسلم ملک میں مسلم اقلیت ہونے کی حیثیت سے ہندوستانی

مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔۔۔۔۔ تیسری طرف اس بکھری ہوئی زوال پذیر قوم کی تنظیم ہوتی تھی، جو برسوں کی غلامی و مظلومی کی وجہ سے صحتمندانہ سوچ اور تعمیری کردار سے بھی محروم ہوتی جارہی تھی۔

غیر اسلامی ملکوں میں امارت شرعیہ خلافت اسلامیہ کی متبادل

☆"قیام امارت " کے تعلق سے مولانا سجادؒ کے دل میں جو خیال آیا، یہ محض ان کے مطالعہ و تحقیق کا نتیجہ معلوم نہیں ہوتا، بلکہ یہ توفیق ربانی کا حصہ اور سلسلۂ فیضانی کی ایک کڑی محسوس ہوتی ہے، جو اللہ کے خاص بندوں پر ہوتی ہے، کیوں کہ اس وقت ہندوستان میں نہ ارباب علم کی کمی تھی اور نہ کتابوں کی، ایک پر ایک محقق اور دقیقہ رس علماء، فقہاء اور دانشور موجود تھے، لیکن اس کار عظیم کے لئے انتخاب حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجادؒ کا کیا گیا۔

چنانچہ ۱۸/۱۹ شوال المکرم ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۵/ جون ۱۹۲۱ء کو محلہ پتھر کی مسجد پٹنہ میں جو عظیم الشان اجلاس ہوا، یہ ایک تاریخ ساز اور عہد آفریں اجلاس تھا، جس نے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایک سمت راہ متعین کیا۔

مولانا سجادؒ ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک متوازی حکومت قائم کرنے کے خواہاں تھے، لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کی قوت و شوکت کا دور ختم ہو چکا تھا، اور ان کی حکومت و سیاست قصۂ پارینہ بن چکی تھی، اور اسلامیت کی جگہ جمہوریت نے لے لی تھی، اس لئے ان حالات میں ان کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ ہندوستان میں دوبارہ جلد اپنی حکومت بحال کر سکیں، وہ بھی اس وقت جب کہ خود مسلمان غیر مسلم سیاست کے ہاتھوں کھلونا اور آلۂ کار بنتے جارہے تھے،

مولانا نے سوچا کہ جو چیز ممکن نہیں اس کے لئے ممکن کو چھوڑ دینا دانشمندی نہیں ،اس لئے انہوں نے امارت شرعیہ کا ممکنہ خاکہ تیار کیا،ورنہ ان کا نشان تحریک، حکومت الٰہی کا قیام اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بحالی تھا،جیسا کہ ان کی کتاب حکومت الٰہی اور امارت شرعیہ کے زیر نگرانی ان کی سیاسی جماعت انڈی پنڈنٹ پارٹی اور اس کی سیاسی سرگرمیوں اور بہار میں تشکیل وزارت سے سمجھ میں آتا ہے۔

☆اس طرح مولانا سجادؒ غلام ہندوستان کی تاریخ کے ایسے مجدد گذرے ہیں، جن کی تجدیدی خدمات کا فیض آج تک جاری بلکہ روز بروز وسیع ہوتا جارہا ہے۔

نظام قضا کی بنیاد

☆مولانا سجاد پہلے آدمی تھے جنہوں نے غیر مسلم ہندوستان میں مسلمانوں کے عائلی اور ملی مسائل کے حل کے لئے نظام قضا کی بنیاد ڈالی،جب کہ نہ امارت شرعیہ کی تاسیس ہوئی تھی اور نہ جمعیۃ علماء ہند کا قیام عمل میں آیا تھا،یہ ۱۹۱۷ء کی بات ہے۔

آئینی وسیاسی بصیرت

☆اسی طرح آپ ہندوستان کے پہلے عالم تھے جو اسلامی قانون کے ساتھ ملکی آئین اور دنیا کے دیگر ملکوں کے قوانین پر بھی گہری اور ناقدانہ نظر رکھتے تھے۔۔۔

☆نیز آپ علماء ہند میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنی سیاسی پارٹی بنائی،انتخابی سیاست میں حصہ لیا،اور بہار میں وزارت کی تشکیل کی ،بہار میں

اردو زبان کا غلغلہ آپ کے عہد حکومت کی دین ہے، آپ نے نظام حکومت میں مسلمانوں کے اجتماعی مفادات کے لئے بہت سی آئینی اصلاحات بھی کیں۔۔۔

شاہی میں فقیری

☆اسلامی ہند کے سقوط کے بعد آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے شاہی میں فقیری کی تاریخ دہرائی،اور اپنی پارٹی کے عہد حکومت میں بھی مٹی کے کچے مکان میں رہے،اور یہ مکان بھی اپنا نہیں کرایہ کا تھا،اور کرایہ حکومت نہیں خود اپنی جیب خاص سے ادا کرتے تھے،اور اسی کچے مکان کے آستانے پر بڑے بڑے علماء واعیان اورامراء ورؤساء اپنی حاضری میں شرف محسوس کرتے تھے،ایسے واقعات پچھلی تاریخوں میں بہت بار پڑھے گئے تھے،لیکن مولانا سجادؒ ان واقعات کی عملی تصویر اور ان اخلاقی وروحانی اقدار کے زندہ نمونہ تھے۔

ناجائز مقدمات کے خلاف کارروائی

☆مولانا سجاد نے مسلمانوں کی ناجائز گرفتاریوں کے خلاف آواز بلند کی،اور ان کے مقدمات کی پیروی کے لئے مستقل شعبہ قائم کیا،اس کے لئے جداگانہ افراد مقرر کئے،جن کی خود ہی آئینی تربیت کی اور مقدمات کی پیروی کے ہنر بتائے،بڑے بڑے وکلاء اور ماہرین قانون آپ کی آئینی صلاحیت کا لوہا مانتے تھے ،مسلمان حربی جنگ ہار چکے تھے، مولانا سجاد نے آئینی جنگ کا سلسلہ شروع کیا،اور ایک ایک گرفتار کو قید سے نجات دلائی ،بلکہ نقصانات کا معاوضہ بھی دلوایا،غیر مسلم ہندوستان میں مولانا سجاد کی یہ وہ سنت ہے جو آج بھی ملت اسلامیہ کے لئے بے پناہ معنویت رکھتی ہے اور بہترین نمونۂ عمل ہے۔

بحیثیت مفکر تعلیم

☆مولانا سجاد کا ایک بڑا امتیاز یہ تھا کہ وہ مخصوص تعلیمی نظریات کے حامل تھے، ہندوستان سے اسلامی اقتدار کے خاتمہ کے بعد مسلمانوں میں جو تعلیمی انحطاط پیدا ہوا، اور رفتہ رفتہ علماء عصری علوم ومسائل سے اور عصری تعلیم یافتہ حضرات دین سے دور ہوتے چلے گئے۔

ایک جامع تعلیمی ادارہ کا تصور

☆مولانا ایک ایسے تعلیمی ادارہ کا تصور رکھتے تھے، جہاں دین کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ علوم جدیدہ کی بھی اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہو، مولانا موجودہ ہندوستان کو پچھلی صدیوں کی اسلامی درسگاہوں سے وابستہ کرنا چاہتے تھے، جب ایک ہی درسگاہ سے محدثین اور فقہاء بھی تیار ہوکر نکلتے تھے اور ماہرین لسانیات ومعاشیات اور معقولی علماء ومفکرین بھی ۔۔۔۔علامہ مناظر احسن گیلانیؒ نے اپنی کتاب "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت" میں جس نظام تعلیم کی ترجمانی کی ہے اس کا بنیادی تصور مولانا سجادؒ کے یہاں موجود ہے، علامہ گیلانیؒ بھی مولانا سجادؒ کے تعلیمی نظریات سے متأثر تھے، اور کئی تعلیمی مجالس میں آپ کے ساتھ شرکت کا بھی ان کو موقعہ ملا تھا، علامہ گیلانیؒ کی یہ کتاب حضرت مولانا سجادؒ کے تعلیمی افکار ونظریات کا عکس جمیل متصور ہوتی ہے۔

مدارس کے لئے جدید تعلیمی نظام

مدارس کے تعلیمی نظام کو منضبط اور ترقی یافتہ بنانے کے لئے بھی مولانا سجادؒ کے ذہن میں ایک خاکہ تھا، انہوں نے ایک جامع تعلیمی وفاق کا نقشہ مرتب کیا تھا، جس میں تمام مدارس بحیثیت رکن شریک ہوں اور ان میں کسی ایک بڑے مدرسہ کو جامعہ کا درجہ دیا جائے، اور مختلف مدارس کو مختلف علوم

وفنون کے لحاظ سے تقسیم کیا جائے، ایک مدرسہ ایک ہی فن پر محنت کرے، اور اسی فن کے متخصصین پیدا کرے، اس طرح ہر فن کو الگ الگ مدرسوں پر بانٹ دیا جائے، اور فن ہی کی بنیاد پر مدارس کی درجہ بندی کی جائے، اور سب کا مشترکہ امتحان ہو اور جامعہ اس میں مرکزی کردار ادا کرے۔۔۔۔۔

مولانا سجادؒ نے مدرسہ عزیزیہ بہار شریف کو مرکز بنا کر اس نظام کا عملی آغاز بھی کر دیا تھا، لیکن دوسری مصروفیات کے ہجوم میں اس پر پوری توجہ نہ دی جاسکی، اور عمر نے بھی وفا نہ کی، ورنہ علامہ گیلانیؒ کو حضرت مفکر اسلام مولانا سجادؒ کے تعلیمی نظام سے بڑی توقعات وابستہ تھیں، اور ان کا خیال تھا کہ اگر یہ نظام کامیاب ہو جاتا تو ایک مثالی تعلیمی نظام تیار ہو سکتا تھا، جو پورے ملک کے لئے معیار کا کام کرتا۔

صنعتی تعلیم

مولانا سجاد ٹیکنیکل تعلیم کے بھی بڑے حامی تھے، اور کہتے تھے کہ ملک وقوم کی ترقی صنعتی ترقیات سے وابستہ ہے، جس ملک کی صنعت جتنی زیادہ مضبوط ہوگی وہ ملک اتنا ہی زیادہ ترقی کرے گا، مولانا سجادؒ نے دیدارگنج پٹنہ کی وسیع وعریض شاہی مسجد میں ایک جدید معیار کے مدرسہ کی بنیاد ڈالی تھی، مولانا اس میں صنعتی مدرسہ قائم کرنا چاہتے تھے، لیکن عمر عزیز نے اس کا بھی موقعہ نہیں دیا، مولانا کی مثال "یک انار صد بیمار" کی تھی، ایک کام پورا نہیں ہوتا کہ دوسرا اس سے اہم کام آپ کے سامنے آجاتا تھا۔

غیر مسلم اقتدار میں اسلام کی سیاسی شناخت

آج ضرورت ہے کہ حیات سجادؒ کی خصوصیات وامتیازات دنیا کے

سامنے پیش کی جائیں، ان کے افکار و نظریات کی اشاعت پر توجہ دی جائے، اور ان کو داستان ماضی کے طور پر نہیں بلکہ بین الاقوامی نشان ملت، اور غیر مسلم اقتدار میں اسلام کی سیاسی علامت کے طور پر پیش کیا جائے، ظاہر ہے کہ یہ ذمہ داری آج سب سے زیادہ جمعیۃ علماء ہند اور امارت شرعیہ بہار پر عائد ہوتی ہے، جو آپ کی خدمات جلیلہ کی یادگار ہیں۔

مولانا سجادؒ پر اب تک ہو چکے کاموں کی مختصر روداد

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کے سانحۂ ارتحال (۱۷/شوال المکرم ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۸/نومبر ۱۹۴۰ء بروز دوشنبہ) کے بعد ایک سال کے عرصہ میں (۱۹۴۱ء تک) آپ کی شخصیت پر چھوٹی بڑی کئی کتابیں شائع ہوئیں، اور متعدد اہل قلم اور اصحاب دانش نے حضرت مولانا کو خراج عقیدت پیش فرمایا، جن میں چار (۴) دستاویزی کتابیں ہمارے علم میں ہیں:

(۱) حیات سجاد- تحریر: مولانا عظمت اللہ ملیح آبادیؒ حسب ارشاد حضرت مولانا عبدالحلیم صدیقی ناظم جمعیۃ علماء ہند۔ (صفحات: ۷)

یہ حضرت مولانا سجادؒ پر دستیاب تحریرات میں سب سے قدیم ترین تحریر ہے، اس کا ذکر محاسن سجاد (مرتبہ مولانا مسعود عالم ندویؒ) میں آیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محاسن سجاد کے منظر عام پر آنے سے قبل یہ تحریر شائع ہو چکی تھی، یہ پہلے مضمون کی صورت میں اخبار مدینہ میں شائع ہوئی، بعد میں جمعیۃ علماء ہند نے کتابی صورت میں شائع کی، طباعت انصاری برقی پریس دہلی میں ہوئی۔۔۔ اس کا ایک نسخہ خانقاہ رحمانی مونگیر کے کتب خانہ رحمانیہ میں موجود ہے۔

(۲) محاسن سجاد، مرتبہ: حضرت مولانا مسعود عالم ندویؒ (صفحات: ۱۹۲)

یہ حضرت مولانا سجادؒ کی شخصیت اور خدمات پر اولین کتاب ہے جو آپ کی وفات کے بعد ایک سال کے اندر شائع ہوئی، مولانا عظمت اللہ ملیح آبادیؒ کی تحریر کتابی صورت میں بعد میں شائع ہوئی، اولاً یہ مضمون کی صورت میں شائع ہوئی تھی، اس کا تقدم اسی معنیٰ میں ہے، یہ ہندوستان کی کئی اہم اور ممتاز شخصیات کے مقالات و مضامین کا مجموعہ ہے، مثلاً حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، مولانا مسعود عالم ندویؒ، مولانا حافظ عبدالحکیم مہتمم مدرسہ انوارالعلوم گیا، مولانا زکریا صاحب فاطمی ندوی مدیر الہلال، مولانا اصغر حسین صاحب پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ، مولانا حکیم قاری یوسف حسن صاحب بہار شریف، علامہ سید سلیمان ندویؒ، ڈاکٹر سید محمود سابق وزیر تعلیم بہار، مولانا امین احسن اصلاحی صاحب تدبر قرآن، مولانا محمد منظور نعمانیؒ، مولانا سید محمد مجتبیٰ صاحب، جناب راغب حسن صاحب سکریٹری کلکتہ مسلم لیگ، جناب شمس ہاشمی صاحب اور امیر شریعت رابع حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ۔۔۔

یہ کتاب مولانا محمد سمیع اللہ صاحب نے ربیع الاول ۱۳۶۰ھ مطابق اپریل ۱۹۴۱ء میں کتب خانہ عزیزیہ اردو بازار دہلی سے شائع کی تھی، لیکن اب بازار میں دستیاب نہیں ہے، خدا بخش لائبریری پٹنہ میں اس کا نسخہ موجود ہے۔۔۔ اسی طرح اب انٹرنیٹ پر بھی بآسانی دستیاب ہے۔

(۳) حقیقت سجاد، مرتبہ: سید احمد عروج قادری امجری (گیا) (صفحات: ۵۴)

"محاسن سجاد" میں جناب راغب حسن صاحب سکریٹری مسلم لیگ کلکتہ کا ایک تنقیدی مضمون شائع ہوا تھا، جس سے حلقۂ سجاد میں کافی ناراضگی پیدا ہو گئی، اسی کے جواب میں محاسن سجاد کی اشاعت کے صرف دو ماہ بعد جون ۱۹۴۱ء میں یہ کتاب "حقیقت سجاد" شائع ہوئی، اس پر حضرت علامہ مناظر احسن گیلانیؒ کا بیش قیمت پیش لفظ بھی ہے۔ یہ کتاب بھی اب دستیاب نہیں ہے، خدا بخش لائبریری اور خانقاہ مونگیر وغیرہ میں اس کے نسخے موجود ہیں۔

(۴) حیات سجاد ــ مرتبہ: حضرت مولانا عبد الصمد رحمانیؒ (صفحات: ۱۶۰)

یہ کتاب مکتبہ امارت شرعیہ پٹنہ سے " حقیقت سجاد" کے تین چار ماہ کے بعد شوال المکرم ۱۳۶۰ھ مطابق اکتوبر ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی، اس میں بھی ملک کے ممتاز اہل علم کے نگارشات شامل ہیں، مثلاً:

حضرت مولانا عبد الصمد رحمانیؒ، حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ، علامہ مناظر احسن گیلانیؒ، حضرت امیر شریعت ثانی مولانا شاہ محی الدین قادری پھلوارویؒ، شاہ ابو طاہر فردوسیؒ، قاضی سید احمد حسین سابق ایم ایل سی، علامہ سید سلیمان ندویؒ، بیرسٹر محمد یونس سابق وزیر اعظم حکومت بہار، شاہ سید حسن آرزو پٹنہ، سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی سابق صدر جمعیۃ علماء ہند، حافظ محمد ثانی صاحب، شیخ عدالت حسین، مولانا سید محمد عثمان غنی ناظم امارت شرعیہ، مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ، مولانا محمد امین سورتی گجرات، اور حکیم محمد شعیب نیرؔ پھلوارویؒ وغیرہ۔

یہ کتاب بھی اب عام طور پر دستیاب نہیں ہے، مخصوص لائبریریوں میں اس کے نسخے موجود ہیں۔

حضرت مولانا سجادؒ کے حالات پر یہ چاروں کتابیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں، اور ماخذ کا درجہ رکھتی ہیں، بعد کے اکثر لوگوں نے انہی کتابوں سے استفادہ کیا ہے،

☆ان کتابوں کے بعد طویل خاموشی چھائی رہی، عرصۂ دراز تک مولانا سجاد کی شخصیت پر کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی، اور نہ کوئی چھوٹا یا بڑا پروگرام ہوا، لمبے سکوت (یعنی تقریباً ساٹھ (۶۰) سال کی طویل مدت گذر جانے) کے بعد حضرت امیر شریعت سادس مولانا سید نظام الدین صاحبؒ اور فقیہ العصر و قاضی القضاۃ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کے عہد میں محاسن سجاد اور حیات سجاد کا ایک انتخاب نو "حیات سجاد" کے نام سے شائع ہوا، جس کو تاریخی ترتیب کے لحاظ سے پانچواں مجموعۂ مضامین کہہ سکتے ہیں، یہ انتخاب موجودہ ناظم امارت شرعیہ حضرت مولانا انیس الرحمن قاسمی دامت برکاتہم نے تیار کیا ہے، اس کتاب کی اشاعت اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ عرصہ کے بعد خاموش فضا میں کچھ ارتعاش پیدا ہوا، اور بعض نایاب تحریریں دوبارہ زیور طباعت سے آراستہ ہو گئیں۔۔۔۔۔ پھر اسی کتاب نے امارت شرعیہ پٹنہ کے مولانا سجاد سیمینار (منعقدہ ۲۰، ۲۱/اپریل ۱۹۹۹ء) میں اکثر شرکاء کے لئے مأخذ کا کام کیا، سیمینار کے اکثر مدعوئین اور مقالہ نگاروں کو گذشتہ اکابر کی تحریرات اسی کتاب میں پڑھنے کو ملیں، سیمینار سے قبل اس انتخاب کی اشاعت غالباً اسی حکمت عملی کے تحت ہوئی تھی کہ یہ اہل علم اوراصحاب قلم

کے لئے رہنما خطوط کا کام کرے ،اس سیمینار میں یہ حقیر بھی شریک تھا، سیمینار کے اکثر مقالات اسی کتاب کے حوالوں سے مزین تھے، خود مجھے بھی اس کتاب سے آگے کچھ تحقیق کا موقعہ نہیں ملا تھا۔۔۔۔

☆اسی سیمینار کے موقعہ پر امارت شرعیہ نے حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی سربراہی میں حضرت مولانا سجادؒ کی اہم کتابوں اور تحریرات کا ایک پورا سیٹ تیار کیا اور اس طرح حضرتؒ کے علوم و معارف کے ایک نئے باب کا آغاز کیا۔

☆۲۰۰۳ء میں سیمینار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ "حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد-حیات وخدمات" کے نام سے شائع ہوا۔

بلاشبہ امارت شرعیہ کی یہ مساعی جمیلہ لائق صد تحسین ہیں۔۔۔۔

کرنے کے مزید کام

لیکن ابھی کام باقی ہیں:

☆حیات سجاد کے نام سے امارت شرعیہ نے جو انتخاب تیار کیا وہ مکمل انتخاب نہیں تھا، قدیم اصحاب قلم کی کئی اہم تحریرات اس مجموعہ میں شامل ہونے سے رہ گئی تھیں، مثلاً علامہ مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا عبد الماجد دریابادیؒ ،مولانا عبد الحکیم اوگانویؒ، شیخ عدالت حسینؒ، شاہ ابو طاہر فردوسیؒ مولانا زکریا فاطمیؒ، مولانا امین احسن اصلاحی، قاری یوسف حسن خان، ڈاکٹر سید محمود صاحب سابق وزیر تعلیم بہار، اور جناب شمس ہاشمی صاحب، وغیرہ، جب کہ ان مضامین میں مولانا سجادؒ کی زندگی کے بعض ایسے اہم گوشے موجود ہیں اور بعض ان سوالات کے جوابات ہیں جو دوسرے مضامین میں نہیں ملتے ،ان مضامین

کا مطالعہ کئے بغیر مولانا سجادؒ کی نہ مکمل سیرت تیار ہو سکتی ہے، اور نہ بہت سے سوالات کے جوابات مل سکتے ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ مولانا سجادؒ کے سیمیناری مجلہ میں کئی پہلو بے حد تشنہ اور نامکمل رہ گئے، اور مولانا کی پوری زندگی کا آئینہ اس میں نہیں آسکا ہے، اس لئے کہ زیادہ تر لوگوں نے اس انتخاب "حیات سجاد" جدید کو دیکھ کر مضامین مرتب کئے تھے، اصل مجموعے اکثر لوگوں کی پہونچ سے باہر تھے۔

جناب راغب حسن صاحب کا تفصیلی مضمون گو سخت تنقیدات پر مشتمل ہے مگر ناقد کے قلم سے بھی بعض ایسے حقائق ابل کر آگئے ہیں جو دوستوں کے قلم سے نہیں آسکے، بلاشبہ ان کی تنقیدات بے حد ناہموار اور بعض جگہوں پر جارحانہ بھی ہیں، لیکن کئی صداقتوں سے جس خوبی کے ساتھ انہوں نے پردہ اٹھایا ہے وہ دوسرے حضرات کے یہاں نہیں ملتا، حیات سجاد میں مضمون کے منفی رخ کو دیکھ کر اس کو مسترد کر دیا گیا تھا، لیکن اس کی بنا پر کئی ایسی سچائیاں بھی دفن ہو گئیں جو حضرت سجادؒ کے مدح کے خانے میں جا سکتی ہیں۔

☆اسی طرح مولانا سجاد صاحبؒ کے علوم و معارف کا جو سیٹ امارت شرعیہ نے شائع کیا، ان کو سامنے رکھ کر مولانا کے علوم وفنون اور نظریات وافکار پر بھی کام کرنے کی ضرورت ہے، اور یہ ایک علمی قرض ہے جو جمعیۃ علماء ہند اور امارت شرعیہ دونوں پر عائد ہوتا ہے۔

☆مولانا سجادؒ کی مرتب سوانح کی ضرورت عرصہ سے محسوس کی جا رہی ہے، مولانا کی وفات پر قریب اسی (۸۰) سال کا طویل عرصہ بیت

گیا لیکن اب تک مولانا کی کوئی باقاعدہ مستند سوانح نہیں آسکی۔ یہ بھی ایک بڑا قرض ہے جس کی ذمہ داری دونوں پر آتی ہے۔

جمعیۃ علماء ہند کا تاریخی فیصلہ

ماشاء اللہ جمعیۃ علماء ہند اپنی صدی مکمل کرنے جارہی ہے، جمعیۃ علماء ہند کی تحریک وتاسیس سے تعمیر وتنظیم تک مولانا سجادؒ کی جو زریں خدمات رہی ہیں، آپ نے جس خون جگر سے اس باغ ملت کو سینچا ہے، اور ابتداء سے لے کر زندگی کے آخری لمحات تک مولاناؒ نے جس صدق وخلوص کے ساتھ اور عہدوں اور اعزازات سے بے نیاز ہوکر جماعت کا دماغ بلکہ روح رواں بنے رہے، یہ تاریخ کی سچائی ہے اور ایسی مثالیں تاریخ میں بہت کم ملتی ہیں۔

جمعیۃ علماء ہند نے اسی تاریخی سچائی کے اعتراف کے طور پر حضرت مولانا سجادؒ کی شخصیت پر سیمینار کرنے کا فیصلہ کیا، تاکہ مولانا کی سیرت کے ان پہلوؤں کو سامنے لایا جائے جن کی ابھی اس ملک کو اور انسانیت کو ضرورت ہے، نیز مولانا کی حیات طیبہ کے جن گوشوں پر اب تک کام نہیں ہوسکا ہے، ان کو بھی شروع کرنے کی کوشش کی جائے۔۔۔۔ بلاشبہ جمعیۃ علماء ہند کے یہ اقدامات اس کی فرض شناشی اور اپنی جڑوں سے وابستگی کا ثبوت ہیں۔

کچھ زیر نظر مجموعہ کے بارے میں

یہ مجموعہ جو آپ کے پیش نظر ہے، یہ بھی جمعیۃ علماء ہند کے اسی پروگرام کا ایک حصہ ہے، یہ انتہائی قیمتی اور نادر دستاویزات کا مرکب اور ان مشاہدات وتجربات اور چشم دید واقعات کا مجموعہ ہے، جو براہ راست آپ کے تلامذہ واحباب، معاصرین ومستفیدین اور خود آپ کے دیکھنے اور برتنے

والوں نے بیان کئے ہیں، ان میں اکابر بھی ہیں اور اصاغر بھی، اور مثبت اور منفی دونوں طرح کا مطالعہ کرنے والے اہل قلم ہیں۔۔۔۔۔

یہ بنیادی طور پر انہی چار(۴) نایاب کتابوں کا مجموعہ ہے جن کا ذکر اوپر تفصیل کے ساتھ آچکا ہے۔ علاوہ بعض ایسی تحریریں بھی شامل کی گئی ہیں جو براہ راست مولانا سجادؒ کو دیکھ یا سن کر تیار کی گئی تھیں، اور دوسری کتابوں سے دستیاب ہوئیں، مثلاً مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ، اور فقیہ ملت حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ وغیرہ کے مضامین۔

اس مجموعہ کو نئی ترتیب اور نئے رنگ وآہنگ کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے، اس میں جابجا حواشی اور تعلیقات کا اضافہ کیا گیا ہے اور اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ کوئی بات غیر مستند نہ ہو، نیز اس کا بھی اہتمام کیا گیا ہے کہ صرف براہ راست نقل کرنے والوں کے مضامین شامل کئے جائیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اس مجموعہ میں شامل بہت سی تحریرات نایاب ہوچکی تھیں، اور جو میسر تھیں وہ بھی تحقیق وتعلیق کی متقاضی تھیں، جمعیۃ علماء ہند نے جب حضرت مولانا سجاد صاحب پر سیمینار کا پروگرام بنایا اور بحیثیت کنوینر مجھے اس کے مآخذ ومواد کی تلاش میں کافی سرگردانی اٹھانی پڑی، تو میں نے شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ ان نایاب خزینوں کو پھر سے دنیا کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔

اللہ پاک جزائے خیر دے جناب مولانا طلحہ نعمت ندوی استھانوی صاحب کو جن سے خدابخش لائبریری پٹنہ میں اسی مطالعہ وتحقیق کے دوران میری ملاقات ہوئی، اور پھر یہ تعارف اور تعلق میں تبدیل ہوگئی، انہوں

نے اس ضرورت کو بحسن وخوبی پورا کیا، مولانا موصوف ایک خوش مذاق اور باسلیقہ عالم دین ہیں، تحقیق و تاریخ کے ذوق سے بھی آشنا ہیں، کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، اللھم زدفزد۔

اس موقعہ پر میں جمعیۃ علماء ہند کے اکابر بالخصوص حضرت امیر الہند مولانا قاری محمد عثمان منصور پوری صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند، حضرت مولانا سید محمود اسعد مدنی صاحب ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند اور حضرت مولانا معز الدین قاسمی صاحب ناظم ادارۃ المباحث الفقہیۃ جمعیۃ علماء ہند دامت برکاتہم العالیۃ کی خدمات عالیہ میں کلمات تشکر وامتنان پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں، جنہوں نے اس عظیم علمی کام کا بیڑا اٹھایا، سیمینار کی اہم علمی ذمہ داریوں کے لئے میرا حوصلہ بڑھایا، اور اپنے مفید مشوروں سے نوازا، فجزاھم اللہ احسن الجزاء آمین۔

اختر امام عادل قاسمی

خادم جامعہ ربانی منورواشریف سمستی پور بہار

۲۱/ صفر المظفر ۱۴۴۰ھ مطابق یکم نومبر ۲۰۱۸ء جمعرات

محاسن ابو المحاسن

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ[1]

مرنا اور جینا دنیا کے روزانہ کے کاروبار ہیں۔ کون نہیں مرا اور کون نہیں مرے گا، آج وہ کل ہماری باری ہے، اس پر بھی عزیزوں اور دوستوں کی ہر موت پر رونے والے روتے ہیں، ان کے دامن فراق پر ماتم اور فریاد کرتے ہیں، ان کی ایک ایک خوبیوں کو یاد کر کے ان کا نوحہ پڑھتے ہیں۔ عام حالت یہی ہے، لیکن بعض موتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ ان کی خبر سن کر زبان بند ہو جاتی ہے، آنسو سوکھ جاتے ہیں، دل کی حرکت بڑھ جانے کے بجائے گھٹ جاتی ہے، اندر ہی اندر گھٹن محسوس ہوتی ہے، مگر جی نہیں چاہتا کہ کچھ بول کر دل کی بھڑاس نکالئے اور آنسو بہا کر غم ہلکا کیجیے۔ مولانا ابو المحاسن محمد سجاد مرحوم کے سانحہ کا مجھ پر بالکل یہی اثر ہوا، دن بیت گئے، ہفتے گذر گئے، مہینہ پر ایک اور مہینہ گذرا مگر زبان نہ کھلی اور دل کی امانت قلم کے سپرد نہ ہو سکی۔ عزیزوں اور

---

[1] سید صاحب کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، پیدائش دیسنہ بہار شریف میں ۱۳۰۱ھ (۱۸۸۴ء) میں، اور وفات کراچی میں ۱۳۷۳ھ (۱۹۵۳ء) میں ہوئی مولانا مسعود عالم ندوی نے "حضرت الاستاذ علامہ سید سلیمان ندوی متع اللہ المسلمین بطول بقائہ" لکھا تھا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے "حیات سلیمان" از شاہ معین الدین احمد ندوی و "تذکرہ سلیمان" از مولانا غلام محمد حیدرآبادی۔ سید صاحب کی حیات وخدمات پر تقریباً بیسیوں کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، جن میں مذکورہ بالا دونوں کتابیں مفصل اور مشہور ہیں۔

دوستوں کو تعجب ہے کہ میرا قلم جو احباب کی سوگواری میں ہمیشہ اشک ریز رہتا ،اس دفعہ اپنے فرض کو کیوں بھولا ہے؟ مگر یہ کیسے بتاؤں کہ اس ناگہانی اور غیر متوقع غم سے مجھے کیوں چپ سی لگ گئی، ہر چند زبان خاموش تھی، لیکن کئی دنوں تک سوتے جاگتے مرحوم کی صورت آنکھوں میں پھرتی اور خواب میں نظر آتی رہی۔ تدمع العين ويحزن القلب ولا نقول الا ما يرضى ربنا و انا بفراقك لمحزونون۔

اکثر اکابر و مشاہیر کی ملاقاتیں خاص حالات کی بنا پر یاد رہتی ہیں اور یہ بھی یاد رہتا ہے کہ یہ ملاقاتیں کب ہوئیں، کہاں ہوئیں اور کیسے ہوئیں؟ لیکن اگر محبت کا عہد یاد کی عمر سے زیادہ ہو تو اس کو ازلی ملاقات کہہ سکتے ہیں" الارواح جنود مجندة فما ائتلفت منها ائتلفت وما اختلفت منها اختلفت"۔اسی اصول کی بنا پر مجھے یاد نہیں کہ میری ان کی ملاقات کب ہوئی؟ کہاں ہوئی اور کیونکر ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرب مکانی، اتحاد زمانی اور شدت ہم ذوقی کی بنا پر ہم ایک دوسرے سے اتنے آشنا تھے کہ پہلی ملاقات میں دید و شنید پر کوئی نیا اضافہ نہ کر سکی۔

اس آخری زمانہ میں وہ سال میں ایک دفعہ میرے ایام قیام وطن میں کوئی نہ کوئی کام نکال کر دیسنہ ضرور تشریف لاتے اور میری عزت بڑھاتے۔ اور ان کے ملنے والوں میں کون تھا جس کی عزت اپنی محبت سے وہ نہ بڑھاتے، ان کی تواضع میں بلندی، سادگی میں بناؤ اور خاموشی میں گویائی تھی، وہ اکیلے تھے لیکن لشکر تھے، پیادہ تھے مگر برق رفتار تھے، وہ قال نہ تھے سراپا حال تھے، کہتے کم کرتے زیادہ تھے، ان کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ "راہ" اور "منزل" کے فرق کو کبھی فراموش نہ کیا، انہوں نے راہ میں ہمراہیوں کے لطف کلام میں پھنس کر

منزل سے ہٹنا کبھی گوارا نہیں کیا، وہ وطن کی آزادی اور احکام مذہبی کی پیروی کے درمیان التباس اور تصادم سے کبھی بے خبر نہیں رہے۔ جذبۂ آزادی کی پوری قوت کے باوجود انہوں نے کانگریس یا کانگریسی حکومت کے غلط قدم اٹھانے پر کبھی بزدلانہ یا صلح پسندانہ درگذر سے کام نہیں لیا۔

مرحوم کی زندگی کے سوانح لکھنے والے لکھیں گے، مگر عقیدت کی چند سطریں ان کے ایک نیاز مند کی طرف سے یادگار اوراق رہیں تو محسن کے شکریہ کا بار اس کے کندھے سے کم ہو۔

وطن

صوبہ بہار میں قصبہ بہار اور گیا کے درمیان کا علاقہ ہندوؤں کے عہد میں بودھوں اور جینیوں کی یادگاروں سے بھرا ہوا ہے۔ اسی راستہ میں چند میل آگے بڑھ کر بودھوں کی مشہور درسگاہ نالندہ کے آثار اور کھنڈر ہیں، اسی سے ملا ہوا پنہسہ نام مسلمانوں کا ایک گاؤں ہے، جہاں سادات کے کچھ گھرانے آباد ہیں، انہیں میں سے ایک گھر میں مولانا سجادؒ کی ولادت ہوئی۔

تعلیم و تربیت:

تیرہویں صدی کے شروع میں صوبہ بہار میں مولانا وحید الحق صاحب استھانوی بہاری کے دم قدم سے علم کو نئی رونق حاصل ہوئی۔ قصبہ بہار میں انہوں نے مدرسہ اسلامیہ [1] کی بنیاد ڈالی اور بہت سے عزیزوں کی تربیت کی، ان

[1] مدرسہ اسلامیہ کی تاسیس بعض اطلاع کے مطابق ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۸۸۴ میں ہوئی

میں سے ایک مولانا سجادؒ بھی تھے۔ عربی کی ابتدائی تعلیم انہی کے زیر سایہ ہوئی اور ان کی پہلی شادی بھی انہی کی دختر نیک اختر سے ہوئی تھی۔

آخری تعلیم الہ آباد کے مدرسہ سبحانیہ میں مولانا عبد الکافی صاحب الہ آبادی کے درس میں ہوئی اور وہیں ۱۳۱۷ھ سے ۱۳۲۲ھ [۱۹۰۱ سے ۱۹۰۴] تک رہ کر سند فراغ حاصل کیا۔

ابتدائی کام

تعلیم سے فارغ ہو کر مدرسی کی خدمت انجام دی۔ اس عرصہ میں کبھی وہ مدرسہ اسلامیہ بہار میں رہے اور کبھی مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں۔ ۱۳۲۹ھ (۱۹۱۱ء) تک یعنی سات برس تک وہ اس فرض کو انجام دیتے رہے۔ ۱۳۲۹ھ میں گیا میں مدرسہ انوار العلوم کی بنیاد ڈالی۔ مولانا عبد الوہاب[3] منطقی بہاری بھی شریک کار تھے۔ یہ بات مجھے یوں یاد رہی کہ شاید ۱۹۰۸ء یا ۱۹۰۹ء تھا کہ مدرسہ مذکورہ کے ایک جلسہ سالانہ میں مولانا عبد الوہاب صاحب کی دعوت پر مولانا شبلی نعمانی مرحوم اور مولانا عبد الحق صاحب حقانی دہلوی مرحوم شریک جلسہ ہوئے تھے اور تقریریں کی تھیں۔ مولانا سجاد صاحب مدرسہ انوار العلوم کا یہ جلسہ سال بسال کیا کرتے تھے اور اس میں علماء کو بلاتے تھے اور ان سے تقریریں کراتے تھے، میرا خیال ہے، اکثر علماء سے ان کی ملاقاتوں کا آغاز انہی جلسوں میں ہوا، مجھے بھی ایک دو دفعہ ان جلسوں میں حاضری کا اتفاق ہوا۔

سیاسیات کا ذوق

---

[3] مولانا عبد الوہاب اس وقت انوار العلوم سے نکل کر کلکتہ جا چکے تھے۔ (م)

ان کو سیاسیات کا ذوق جنگ عظیم میں ترکی کی شکست اور ممالک اسلامیہ کی پراگندگی سے ہوا۔ وہ اس وقت الہ آباد میں تھے، ان کے ایک انگریزی داں شاگرد ان سے عربی پڑھنے آتے تھے، وہ اپنے ساتھ اردو اور انگریزی اخبارات لاتے تھے اور مولاناؒ کو پڑھ پڑھ کر سناتے تھے۔ یہ آگ روز بروز بھڑکتی چلی گئی، مولانا ابو الکلام کے الہلال کی تحریک نے بنگال کے قرب کے سبب بہار پر پورا اثر کیا تھا، اور بہت سے علماء نے ان کی اس تحریک پر لبیک کہا، ان میں سے مولانا سجادؒ کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔

رانچی کی اسیری کے زمانہ میں مولانا ابوالکلام نے ہم خیال اور کار فرما علماء کی تلاش و تفتیش کا کام ایک مخلص کے سپرد کیا تھا، انہوں نے جن علماء کا نشان دیا ان میں سے ایک مولانا سجادؒ بھی تھے جو اس وقت انوار العلوم گیا کی مسند درس پر تھے۔

۱۹۱۹ء سے تحریک خلافت کی ترقی کے ساتھ ساتھ مولاناؒ کا ذوق سیاست بھی بڑھتا گیا، ۱۹۲۰ء میں مولانا عبد الباری صاحب فرنگی محلی کی تحریک اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کی تائید سے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی صدارت میں جب جمعیۃ العلماء دہلی کی بنیاد پڑی تو موصوف اس کے لبیک کہنے والوں میں سب سے اول تھے، اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ کتنے رفیق سفر تھک تھک کر اپنی جگہ بیٹھ رہے تھے، مگر انہی کی ایک ہستی تھی جو آخر تک جمعیت کے ساتھ لگی رہی بلکہ یہ کہنا چاہیئے کی انہیں کی روح تھی جو اس کے قالب میں جلوہ گر ہوتی رہی۔

بہار میں امارت شرعیہ کا قیام ان کی سب سے بڑی کرامت ہے۔ زمین شور میں سنبل پیدا کرنا اور بنجر علاقہ میں لہلہاتی کھیتی کھڑی کر لینا ہر ایک کا کام نہیں۔

۱۹۱۸ء میں معارف میں اس تحریک کو اٹھایا گیا اور اصلاحات کے سلسلہ میں اس کو پیش کیا گیا۔ پھر یورپ سے واپسی کے بعد چاہا کہ اس کو تمام ہندوستان کا مسئلہ بنایا جائے، مگر اس عہد کے جدید تعلیم یافتہ علم برداروں نے اس کو چلنے نہ دیا، مگر بہار میں مولانا ابو الکلام صاحب کی تحریک پر مولانا سجاد صاحبؒ کی قوت عمل نے اس کو وجود کا قالب بخش دیا۔

مولانا سجاد مرحوم کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ علماء سیاسیات میں بھی قوم کی رہبری کا فرض انجام دیں۔ مسلمانوں میں دینی تنظیم قائم ہو جائے جس کے تحت میں ان کے تمام تبلیغی، مذہبی و تعلیمی و تمدنی کام انجام پائیں، دار القضاء قائم ہو کر مسلمانوں کے ہر قسم کے مقدمات و معاملات تصفیہ پائیں۔ مسلمانوں کا بیت المال قائم ہو، جہاں مسلمانوں کے صدقات و مبرات و زکاۃ کی ساری رقمیں اکٹھی ہو کر ضروریات میں خرچ ہوں اور مستحقین میں تقسیم ہوں۔ مولاناؒ نے عمر کے آخری بیس برس انہی کاموں میں صرف کئے اور حق یہ ہے کہ انہوں نے ہر قسم کی مالی بے بضاعتی، مدد گاروں کی کمی، رفقاء کی نامساعدت، اور حالات کی مخالفت کے باوجود جو کچھ کر دکھایا وہ ان کی حیرت انگیز قوت عمل کا ثبوت ہے، اور اللہ تعالی کی توفیق خاص ہے۔

بہار کی تنہا دولت:

ان کا وجود گو سارے ملک کے لئے پیام رحمت تھا، مگر حقیقت یہ ہے صوبہ بہار کی تنہا دولت وہی تھے، اس صوبہ میں جو کچھ تبلیغی، تنظیمی، سیاسی اور مذہبی تحریکات کی چہل پہل تھی وہ کل انہی کی ذات سے تھی، وہی ایک چراغ تھا جس سے سارا گھر روشن تھا، وہ وطن کی جان اور بہار کی روح تھے، وہ کیا مرے کہ بہار مر گیا، مرثیہ ہے ایک کا اور نوحہ ساری قوم کا۔

علم وفضل:

فلسفۂ تاریخ کے ماہر کہتے ہیں کہ علم اور عمل کم یکجا ہوتے ہیں، لیکن انہی کمیاب مثالوں میں مولانا سجادؒ کی ذات تھی، وہ اپنے وقت کے بڑے مشاق مدرس اور حاضر العلم عالم تھے۔ خصوصیت کے ساتھ معقولات اور فقہ پر ان کی نظر بہت وسیع تھی، جزئیات فقہ اور خصوصاً ان کا وہ حصہ جو معاملات سے متعلق ہے ان کی نظر میں تھا، امارت شرعیہ کے تعلق سے اقتصادی ومالی و سیاسی مسائل پر ان کو عبور کامل تھا۔ زکاۃ و خراج و قضا وامامت وولایت کے مسائل کی پوری تحقیق فرمائی تھی، ہر چند کہ سالہا سال سے درس و تدریس و مطالعہ کا اتفاق نہیں ہوا تھا مگر جب گفتگو کی گئی تو علم تازہ نظر آیا۔

فہم ورائے:

ان کا علم محض کتابی نہ تھا بلکہ آفاقی بھی تھا۔ معاملات کو خوب سمجھتے تھے، ان کو بارہا بڑے معاملات اور مقدمات میں ثالث بنتے ہوئے دیکھا ہے اور تعجب ہوا ہے کہ کیوں کر فریقین کو وہ اپنے فیصلہ پر راضی کر لیتے تھے اور اس لئے لوگ اپنے بڑے بڑے کام بے تکلف ان کے ہاتھ میں دیتے تھے، کیونکہ ان کے پاس اللہ تعالی کا سب سے بڑا عطیہ فکر رسا اور رائے صائب تھی، مسائل و

حوادث میں ان کی نظر بہت دور پہنچ جاتی تھی، وہ ہر گتھی کو نہایت آسانی سے سلجھا دیتے تھے، حریف کی چالوں کی تہ تک پہنچ جاتے تھے، باوجود تواضع و خاکساری کے اپنی رائے پر پوری قوت کے ساتھ جمتے تھے اور محض ہٹ اور ضد سے نہیں بلکہ دلائل کی قوت اور مصالح کی طاقت سے وہ دوسروں کو منوانے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔

اخلاق:

وہ بے حد خاکسار اور متواضع تھے، کبھی کوئی اچھا کپڑا انہوں نے نہیں پہنا، کبھی کوئی قیمتی چیز ان کے پاس نہیں دیکھی، کھدر کا صافہ، کھدر کا لمبا کرتا، کھدر کی صدری، پاؤں میں معمولی دیسی جوتے اور ہاتھ میں ایک لمبا عصا، یہ ان کی وضع تھی، مگر وہ اپنی سادہ اور معمولی وضع کے ساتھ بڑے بڑے جلسوں، اور بڑے بڑے مجمعوں میں بے تکلف جاتے تھے اور اپنا لوہا منواتے تھے، جوہر پہچاننے والے بھی تلوار کی کاٹ دیکھتے تھے غلاف کی خوبصورتی نہیں۔

ہر شخص کی مصیبت میں ہر وقت کام آتے تھے، اور ہر ایک کی سفارش میں ہر وقت سینہ سپر ہو جاتے، اللہ تعالی نے ان کو جاہ مرتبہ بھی عنایت فرمایا، انہوں نے خود اپنی پارٹی کی وزارت بھی بنائی اور بادشاہ گر نہیں تو وزیر گر ضرور بنے، کانگریس حکومت کے زمانہ میں بھی ان کو اچھا اقتدار حاصل رہا، مگر خدا گواہ ہے کہ وہ اس اثر او اقتدار کو اپنی ذات کے لئے کبھی کام میں نہیں لائے، جو کچھ کیا وہ مسلمانوں کے لئے۔

ان کی زندگی نہایت سادہ تھی، غربت اور عُسرت کی زندگی تھی، گھر کے خوشحال نہ تھے، امارت سے معاوضہ بہت قلیل لیتے تھے، سفر معمولی سواریوں اور معمولی درجوں میں کرتے تھے اور اسی حال میں پورب سے پچھم، اور پچھم سے پورب، اور اتر سے دکھن اور دکھن سے اتر دوڑتے رہتے تھے، ان کا دن کہیں گذرتا تھا اور رات کہیں، مسلمانوں کی سلامتی اور تنظیم کی ایک دھن تھی کہ ان کو دن رات چکر میں رکھتی تھی، کہیں قربانی کا جھگڑا ہو، مسلمانوں پر مقدمہ، کہیں سیلاب آئے، کہیں آگ لگے، کہیں ہندو مسلمان کا تنازعہ ہو، وہ ہر جگہ خود پہنچ جاتے تھے، معاملہ کا پتہ لگاتے تھے، مظلوموں کی مدد کرتے تھے، جہاں سے ہو سکتا وہ ان کو لا کر دیتے تھے اور خود خالی ہاتھ رہتے تھے۔

بہار میں زلزلہ کے زمانے میں انہوں نے جس تندہی سے کام کیا اور ایک ایک گاؤں میں جا کر جس طرح بے گھروں کو اور بے خانماؤں کی مدد دی وہ ان کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہے جس کا صلہ امید ہے کہ اللہ تعالی نے اپنی بارگاہ سے ان کو عطا فرمایا ہوگا۔

لیڈروں اور قومی کارکنوں کے پاس عام طور سے ان کے اثر کے ذرائع تین ہیں، یا دولت ہے، یا حسن تقریر ہے، یا زور قلم ہے۔ مرحوم ان تینوں دولت سے محروم تھے، وہ غریب تھے اور غریبوں ہی میں زندگی بسر کی، زبان میں لکنت تھی جس کے سبب سے وہ بولنے پر قادر نہ تھے اور اسی لئے وہ تقریر بہت کم کرتے تھے اور ان کے قلم میں وہ زور بھی نہ تھا جو آج کل کی انشاء پردازی کا کمال ہے۔ تاہم ان کا بدل ان کے پاس ان کا ایک اخلاص تھا جو ان کی

ہر کمی کو پورا کر دیتا تھا، عجب نہیں کہ زبان اور قلم کا عجز ہی تھا جو ان کی قوت عمل کی صورت میں ظاہر ہوا۔

جمعیۃ العلماء کے اجلاس کلکتہ کے خطبہ میں میرے قلم سے ان کی نسبت یہ الفاظ نکلے تھے، جو پہلے مدح تھی اب مرثیہ ہے۔

> "۱۳۴۳ھ کے اجلاس خاص مراد آباد کے موقع پر بھی مجھے یہ عزت عطا ہوئی تھی، مگر عین وقت پر وفد جدہ کی شرکت نے انکار پر مجبور کیا اور میں خوش ہوں کہ اس کی بدولت ایک خاموش ہستی بولی اور ایک بے زبان نے زبان کے جوہر دکھائے اور ایک ہمہ تن سوز و گداز نے کاغذ کے صفحوں پر اپنے دل کے ٹکڑے بکھیرے"

یہ بھی مولاناؒ ہی کی قوت جاذبہ تھی جو مختلف الخیال علماء اور مختلف الرائے سیاسی رہنماؤں اور قومی کارکنوں کو ایک ساتھ ایک پلیٹ فارم پر جمع کئے اور ایک شیرازہ میں باندھے ہوئے تھی۔

شاید یہ کم لوگوں کو علم ہو کہ مولاناؒ کی خانگی زندگی غمگین تھی، ان کے بڑے بھائی مجذوب تھے، ان کی بیوی معذور و مختل تھیں، ان کا بڑا لڑکا جو پڑھ لکھ کر فاضل اور گھر کا کام سنبھالنے کے قابل ہوا، عین اس وقت کہ اس کے نکاح میں چند روز باقی تھے، باپ نے دائمی جدائی کا داغ اٹھایا اور یہ سننے کے قابل ہے کہ وہ لڑکا مرض الموت میں تھا کہ مسلمانوں کی ایک ضرورت ایسی سامنے آئی کہ باپ بیمار بیٹے کو چھوڑ کر سفر پر روانہ ہو گیا، واپس آیا تو جوان بیٹا دم توڑ رہا تھا۔

ان کی اپنی زندگی بھی دین و ملت ہی کی نذر ہوئی۔ ترہت کے دُور افتادہ علاقہ میں جہاں کہ ملیریا کے ڈر سے ادھر کے لوگ اُدھر جانا موت کے منہ میں جانا سمجھتے ہیں، یہ مرد خدا اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر سال میں کئی کئی بار جاتا تھا اور کئی کئی دن وہاں رہتا تھا۔ آخری سفر بھی وہیں ہوا، اور وہیں سے ملیریا کی سخت بیماری اپنے ساتھ لایا اور اسی حال میں جان جان آفریں کے سپرد کی۔

جانے والے تیری روح کو سلام! جب تو زندہ تھا تو تیری قوم نے تیری قدر نہ پہچانی! اب تو عالم ابد میں ہے۔ میرے کان غیب سے تیری زبان مجاز سے یہ آواز سنتے ہیں۔

یٰلیت قومی یعلمون بما غفر لی ربی و جعلنی من المکرمین (یٰسین) (اے کاش میری قوم جانتی کہ خدا نے مجھے بخشا اور مجھے ان میں داخل کیا جن پر اس کا کرم ہوا۔) [۴]

---

[۴] - حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مضمون پہلے معارف (مارچ ۱۹۴۳ء) میں شائع ہوا، پھر کچھ ترمیم کے ساتھ اس عنوان سے محاسن سجاد میں درج کیا گیا، سید صاحب نے اپنے معمول کے مطابق ان کی وفات پر اپنے رسالہ معارف میں ان کا ماتم کیا، یہی مضمون یادرفتگاں میں "مولانا سجاد کی یاد" کے عنوان کے ساتھ شامل ہے۔ اس کا پہلا پیراگراف اس کتاب میں حذف کر دیا گیا ہے۔ سید صاحب نے لکھا ہے "۲۳/ نومبر ۱۹۴۰ء اور ۲۱/ شوال ۱۳۵۹ھ کی سہ پہر تھی کہ پھلواری سے مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نائب امیر شریعت بہار کی وفات کی خبر آئی، دل کو یارائے ضبط نہ رہا، آنسوؤں کے چند قطرے زمین پر گرے، وہ زمین جو اب مرنے والے کی خواب گاہ ہے، ابھی قلب میں یہ ہمت بھی نہیں کہ جی بھر کے ماتم کروں اور دل کے شیون کو سپرد قلم

دریں آشوب غم عذرم بنہ گر نالہ زن گریم
جہانے را جگر خوں شد ہمیں تنہا نہ من گریم

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ
صدق مجسم، پیکر عمل، مدبر کامل، متعدد تحریکات کے بانی[۵]

حضرت مولانا شاہ محی الدین قادری امیر شریعت ثانیؒ[۶]

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد غفر اللہ لہ ورحمہ کا حادثۂ ارتحال بے حد جاں سوز اور انتہائی صبر آزما ہے، ایسی ذات جس نے دین ومذہب کی حمایت اور مسلمانوں کی صلاح میں جان لگادی، عافیت وآرام سب کچھ لٹادیا، خلوص مجسم تھے، یہ انہی کا دل وجگر تھا کہ اس حالت میں کہ ایک طرف اکلوتا بیٹا" حسن سجاد

اس طرح یہ مضمون یادرفتگان، حیات سجاد اور محاسن سجاد تینوں میں موجود ہے۔

[۵]-یہ عنوان حضرت امیر شریعت ثانیؒ کے مضمون سے لیا گیا ہے (اختر)

[۶] حضرت مولانا شاہ محی الدین بن بدرالدین پھلواروی علیہ الرحمۃ کی پیدائش ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۸۰ میں اپنے وطن پھلواری شریف پٹنہ میں ہوئی، تعلیم اپنے والد اور مولانا عبداللہ صاحب رامپوری سے حاصل کی اور تکمیل مولانا عبدالرحمن صاحب آروی سے خود پھلواری کی خانقاہ میں کی، اس کے بعد تدریس اور قومی وملی خدمت میں مشغول ہوگئے، ۱۳۴۳ مطابق ۱۹۲۴ میں اپنے والد کی وفات کے بعد امیر شریعت اور سجادہ نشین خانقاہ مجیبیہ ہوئے، اور تقریباً سنہ ۱۳۴۴ھ میں حج کو گئے اور عراق میں قیام کرکے وہاں کے اہل علم سے بھی مستفید ہوئے، ۲۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۶ مطابق ۲۲ اپریل ۱۹۴۷ کو وفات پائی اور خانقاہ ہی میں اپنے جد اعلیٰ حضرت شاہ مجیب اللہ قادری کے آستانہ میں مدفون ہوئے۔ حالات کے لئے دیکھئے محی الملۃ والدین از شاہ عون احمد قادری۔

مرحوم" کی جس کی عمر چوبیس پچیس سال کی ہوگی جب عالم فاضل ہوکر، مختلف صلاحیتوں کا مجسم بن کر باپ کی آرزوؤں کا مرجع بنتا ہے اور باپ کی بہتیری امیدیں اس سے وابستہ ہوتی ہیں، حمی محترقہ میں مبتلا ہوتا ہے اور دوسری طرف دینی اور جماعتی ضرورت داعی ہوتی ہے کہ فوری طور پر مظفرپور اور چمپارن کے علاقہ میں پہنچیں، اس کشمکش کے امتحان میں بھی کھرے سونے کی طرح نمایاں اور اجاگر ہوتے ہیں، اور نسبی علائق، پدری شفقت، دنیاوی اور مادی محبت پر دین ومذہب کی حمایت اور مسلمانوں کی فلاح و اصلاح کا جذبہ غالب آتا ہے اور علالت کی اطلاع وخبر کے باوجود اس کی تیمارداری کے سروسامان دوسرے کے سپرد کرکے خود اللہ کی راہ میں رخت سفر باندھ کر روانہ ہوجاتے ہیں، پھر وہاں پہنچ کر مصیبت زدگان زلزلہ کے سلسلہ میں مظفرپور اور بتیا کے علاقوں کے امدادی کام میں ہمہ تن مشغول ہوجاتے ہیں، یہاں تک کہ لڑکے کی حالت نازک ہوئی، تار پر تار گئے، جواب میں علاج کرانے کی ہدایات دیتے رہے، آخر کار آدمی گیا اوران کو جبراً لایا گیا، جب گھر پہنچے تو یہ لڑکا سکرات میں مبتلا تھا، اور چند گھنٹوں میں انتقال کرگیا، اس حادثۂ جاں کاہ کا اتنا اثر بھی نہ لیا کہ دو ہفتہ بھی گھر بیٹھ کر غم والم کی گھڑیوں کو سکون سے گذارتے، اور تعزیت کرنے والوں کی آمدورفت اور کلمات صبر سے سہارا حاصل کرتے، صرف چار پانچ دن مکان پر بضرورت خاص ٹھہرے اور پھر اپنے کام پر چل کھڑے ہوئے، جس وقت وہ پھلواری شریف پہنچے اور میں نے ان کو دیکھا مجھے حیرت ہوگئی کہ جس کے باغ کا امید کا شاداب پھول ابھی خاک میں مل چکا ہے ان کے چہرے بشرے سے ذرا بھی غم کے آثار طاری نہیں ہیں۔ پھلواری میں بھی ٹھہرنا کیسا؟ دوسرے

یا تیسرے دن علاقہ چمپارن کے اطراف اپنے کام میں چلے گئے، اور یہ ایسی ہی
ذات سے ہو سکتا ہے جو راہ خدا میں خلوص مجسم ہو، جس کے دل میں اللہ اور
رسول کی محبت بال بچوں اور مال ومنال اور تمام چیزوں پر غالب ہو اور یہی
مومن کامل کی خصوصیت ہے۔

اخلاص کے ساتھ مولانا سجاد پیکر عمل اور کامل مدبر بھی تھے، مفید
تحریکات پیدا کرنا پھر اس کو عمل میں لانے کی صلاحیت جو رکھتے تھے، اس
صلاحیت کا دوسرا آدمی نظر نہیں آتا۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے خلافت کمیٹی جو
تمام ہندوستان پر چھاگئی تھی اور جس نے سلطنت کی بنیاد کو ہلا دیا تھا اس کی ابتدا
کرنے والوں میں مولانا عبد الباری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ وہ بھی شریک
تھے، خلافت کمیٹی بمبئی میں قائم ہوئی تھی، پھر مولانا لکھنؤ آئے، وہاں قائم
ہوئی، پھر صوبہ میں سب سے پہلے گیا میں آکر قائم کیا، اور اس کا دوسرا اجلاس
پھلواری میں کیا، اس کے بعد ہندوستان کے مختلف حصوں میں قائم ہوئی۔

جمعیۃ علمائے ہند کے قیام کے لئے ہندوستان کے اکثر صوبوں میں سفر
کرکے علماء میں اس کی تبلیغ کی، اور لوگوں کو آمادہ کیا، لیکن عمل کی طرف پہلا
قدم مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا تھا، اور پہلا اجلاس ہندوستان میں جمعیت کا بنام انجمن
علماء بہار شہر بہار میں بزمانۂ عرس حضرت مخدوم الملک منعقد ہوا[1]، اس کے بعد
جمعیۃ علمائے ہند قائم ہوئی اور کے بعد مختلف صوبوں میں شاخیں قائم ہوئیں، اور
پھر علماء نے مستعد ہو کر کام شروع کر دیا، اور الحمد للہ کہ آج ہندوستان کے ہر
صوبہ میں جمعیۃ العلماء قائم ہے، اور جس قدر مفید کام اسلام اور مسلمانوں کا

---

[1] بہار شریف میں پانچ شوال کو حضرت مخدوم صاحب کا عرس ہوتا ہے۔

انجام دیا وہ دنیا پر ظاہر ہے۔ اس وقت کہ ہندوستان کے بہترین دماغ انقلاب کی
نیم خفیہ تدبیریں سوچ رہے تھے مولانا نے وقت کی صحیح ضرورت کو سمجھا کر اور
شرعی تنظیم کے اصول علماء کو یاد دلائے اور اس طرح امارت شرعیہ کے قیام کی
تحریک تمام ہندوستان میں پھیلائی، اس کے لئے علماء وزعمائے ہند کے پاس متعدد
سفر کئے، جہاں تک مجھ کو یاد ہے سال دو سال تک پیہم مخصوص طور پر اس کے
لئے جدوجہد کرتے رہے، بالآخر علمائے صوبہ بہار کے ذریعہ زعماء اور علماء کی ایک
بڑی جماعت کو جمع کرکے اس کی بنیاد ڈالی، اور صوبۂ بہار میں امارت شرعیہ قائم
کیا، بعد کو اس میں اختلافات بھی پیدا کئے گئے، لیکن دنیا کی کوئی طاقت اس کوہ
عزم واستقلال کو اپنی جگہ سے متزلزل نہ کر سکی، اور بحمد اللہ امارت شرعیہ اپنا
کام کرتی رہی اور کر رہی ہے، اور ان شاءاللہ کرتی رہے گی، علیہ توکلت
والیہ انیب۔

سیاست پر گہری نظر رکھنا اور ہر ایسے موقع پر جب کہ کسی سیاسی
رفتار سے اسلام ومسلمین کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو اس کے مقابلہ میں کھڑے ہو
جانا اور تقریر وتحریر پر اور جس عنوان سے ہو سکے اس کی مدافعت کی سعی کرکے
دیگر علماء کے سر سے اس فرض کفایہ کو اتارنا انہی کا کام تھا۔ ہر سیاسی تحریک
کو مذہب کے مطابق کرکے چلانے کی سعی کرنی اور ایسی صورتیں اپنے کمال تدبر
اور غور وخوض سے پیدا کرنی کہ کوئی سیاسی تحریک مذہب اسلام کے مخالف نہ ہو
بلکہ اسلامی اصول کے مطابق کرکے چلائی جائے انہی کی ذات کی خصوصیت
تھی، جو آج اپنے اعلیٰ تدبر دماغ اور گنجینۂ جرات واستقلال دل کے ساتھ آغوش
لحد میں ہمیشہ کے لئے راحت وآرام کے ساتھ آسودہ ہے، اور روح پاک و متجلی "
علیین" سے اپنے پس ماندگان کی طرف نظر دوختہ ہے کہ جن کھیتوں کو میں نے

اپنے خون سے سینچا ہے ،یہ لوگ اس کی آبیاری بھی کرتے ہیں یا خو غرضی و تن آسانی کے بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔برد اللہ مضجعہ وطاب ثراہ ،انا للہ انا الیہ راجعون۔

میں بعجز نیاز دربار رحیم وکریم میں دست بدعا ہوں کہ مرحوم کو ان کے خلوص،اعمال اور نیکیوں کا اور خدمت اسلام و مسلمین کا نیک ثمرہ عطا کرے اور جزائے خیر دے اور جوار رحمت میں جگہ دے ،اور مغفرت فرمائے اور امت مسلمہ کے حال پر رحم کرکے اس کے دینی ودنیاوی فلاح ونجات کے لئے مرحوم کا بدل عطا کرے ۔وما ذلک علی اللہ بعزیز،آمین ،یامن اذا اراد بہ شیئا ان یقول لہ کن فیکون۔اللہ بیدہ ملکوت کل شیئ والیہ ترجعون۔[8]

[8] حیات سجاد ص۶۷

حضرت مولانا سجادؒ۔مشاہدات وارتسامات

حضرت علامہ سید مناظر احسن گیلانیؒ[9]

الحمد اللہ و کفی والصلاۃ والسلام علی عبادہ الذین اصطفی۔

[9] حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی شخصیت اور علمی مقام ومرتبہ کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ برصغیر کا ہر پڑھا لکھا آدمی عام طور پر ان سے واقف ہے،پیدائش نانیہال استھانواں بہار شریف میں ۹/ربیع الاول ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ میں ہوئی،والد کا نام حافظ ابو الخیر تھا،اور ان کے نانا کا نام فدا حسین تھا جن کے دو صاحبزادوں سید فضل الرحمن صاحب علیگ ایم اے اور سید یوسف صاحب کا ذکر اس مضمون میں آیا ہے،مولانا کی والدہ کا نام سیدہ کبری بنت فدا حسین تھا،ابتدائی تعلیم وتربیت اپنے عم بزرگوار سید ابو النصر گیلانی سے حاصل کی ،پھر ٹونک میں معقولات اور دیوبند میں منقولات کی تکمیل کی اور مختلف مقامات میں خدمت کے بعد جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں علوم اسلامیہ کے استاد ہوئے ،اور تیس سال اس خدمت پر مامور رہے ،اور اس دوران زبردست علمی خدمات انجام دیں،سبکدوشی کے بعد اپنے وطن گیلانی آگئے، جس کا اصل نام محی الدین پور گیلانی یا محی الدین گیلانی پور باختلاف روایات تھا،جو حضرت شیخ عبد القادر کی نسل کے ایک بزرگ شیخ منہاج الدین نے بہار شریف سے آکر اپنے جد اعلیٰ کے نام پر بسایا تھا،اب یہ گاؤں ضلع نالندہ (بہار شریف) میں شامل اور ضلع شیخپورہ کی سرحد پر ہے،مولانا نے اخیر میں یہیں چار چانچ سال گذار کر ۲۵ شوال ۱۳۷۵ مطابق ۵ جون ۱۹۵۶ کو وفات پائی اور گیلانی میں اپنے آبائی قبرستان میں دفن ہوئے۔ حالات کے لئے دیکھئے حیات گیلانی از مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحیؒ۔

میں ٹونک (راجپوتانہ) میں پڑھتا تھا، سیدی الاستاذ الامام مولانا الحکیم برکات احمد المیر نگری البہاری کے حلقۂ درس میں منطق اور فلسفہ کی ابتدائی کتابیں ہو رہیں تھیں، غالباً سنہ ۱۳۲ھ کے درمیانی مہینے تھے کہ الہ آباد سے ایک طالب علم خاص شکل و صورت، عادات و اطوار کے ہماری جماعت میں آکر شریک ہوئے، ان کا اصلی نام تو فضل الکریم تھا، لیکن بعد کو حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو بالشتر کا خطاب کثرت کلام کی وجہ سے دے رکھا تھا، بہار محلہ محل پر کے رہنے والے تھے، اس لئے اپنے نام کے آخر میں محل پروی اپنی نسبت بھی لکھتے، آج کل بحمد اللہ آگرہ کی جامع مسجد کے مدرسہ میں مفتی اور مدرس ہیں، یہی مولوی بالشتر پہلے آدمی ہیں، جن سے حضرت گرامی رفیع القدر مولانا محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ نائب امیر شریعت بہار کے نام نامی سے پہلی واقفیت ہوئی، مولوی بالشتر صاحب کا حافظہ اچھا تھا، اپنے استادوں کی خاص خاص باتیں ان کو خوب یاد رہتی تھیں۔ مولانا سجاد صاحب سے الہٰ آباد میں انہوں نے پڑھا تھا، ان کے لطیف نکات کا ذکر مجھ سے اکثر کیا کرتے تھے، باتیں گہری اور نازک ہوتی تھیں، دماغ اسی زمانہ سے چونک گیا تھا کہ اٹھنے والی ہستی معلوم ہوتی ہے، مولوی بالشتر حضرت کا، حضرت کی باتوں کا تذکرہ اتنا زیادہ کیا کرتے کہ اب مولانا سجاد صاحب میرے لئے اجنبی نہ تھے، ان ہی دنوں میں دارلعلوم ندوۃ العلماء کے مرکز سے مولانا شبلی نے وقف علی الاولاد کا مسئلہ اٹھایا، ٹونک کے علماء اور محکمہ شریعت وغیرہ سے دستخط حاصل کرانے کا کام میرے سپرد ہوا، بڑے جوش و خروش سے اس کام کو انجام دیا۔ تعطیل میں گھر (گیلانی [1] بہار)

---

[1] مولانا اور یہاں کے تمام اہل علم اسی نسبت سے اپنے آپ کو گیلانی لکھتے ہیں، حالانکہ اس

آیا، استھانواں جو میری ننھیال ہے وہاں بھی گیا، یہاں الفلاح" نامی انجمن تھی، جس کے سکریٹری میرے ماموں مولانا فضل الرحمن ایم اے (علیگ) تھے، جو

کالحاظ کرتے ہوئے گیلانوی ہونا چاہیے، جیسا کہ مولانا کے دادا کے نام ساتھ بہت سی جگہوں پر لکھا ہے، مولانا نے بعض قدیم علماء کے وطنی نسبتوں سے اس پر استدلال بھی کیا ہے، بقول مظفر گیلانی بہار شریف سے آکر ایک بزرگ شیخ منہاج الدین نے آباد کیا اور اپنے جد اعلی حضرت شیخ عبد القادر جیلانی (گیلانی) کے نام پر اس کا نام محی الدین پور گیلانی رکھا۔ مجلس آرائش وصفائی گیلانی کے نام سے ایک چند ورقی کتابچہ راقم کے پیش نظر ہے، جس کے اغاز میں لکھا ہے "حضرت محبوب سبحانی غوث صمدانی سیدنا شیخ محی الدین عبد القادر گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے نام نامی سے سعادت وبرکت حاصل کرنے کے لئے آباد کاروں نے ہندوستان کی اس اسلامی آبادی کا نام محی الدین پور گیلانی رکھا، سرکاری کاغذات میں اس کا یہی نام مندرج ہوا ہے، بعضوں کا خیال ہے کہ اس کا صحیح نام محی الدین پور گیلان تھا، بہاری لہجہ کے واو یا کے راحی اضافہ نے گیلان کو گیلانی کی شکل میں بدل دیا اور قرین عقل اور قیاس بھی یہی ہے، بہر حال اسی انتساب گرامی کا اس کو اثر وفیض خیال کرنا چاہئے، کہ تقریباً تین صدی سے یہ بستی واسطی زیدی سادات کرام کا وطن مالوف ہے، اس وقت سے قادری برکات وفیوض مختلف علماء، اولیاء حفاظ، ادباء شعراء، امراء، اطباء کی شکل میں بغیر کسی انقطاع کے جلوہ ریزیوں میں مصروف ہیں"۔

"انجمن الفلاح شرفائے استھانواں (بہار شریف) کی ایک قدیم علمی وثقافتی انجمن تھی، اس زمانہ میں شرفا کی تقریبا ہر بستی میں کوئی نہ کوئی اس قسم کی انجمن ہوتی تھی، جس کے تحت کسی علمی کتب خانہ کا بھی سراغ جابجا ملتا ہے، دسنہ اور استھانواں دونوں متصل بستیاں ہیں، اور دنوں کی علمی اور ثقافتی روایات یکساں ہیں، دسنہ میں الاصلاح اور استھانواں میں الفلاح کے نام سے یہ انجمن بہت سرگرم، فعال اور قابل قدر تھی، اہل وطن سال میں کسی موقعہ سے جمع ہوتے اور گاؤں کے مسائل پر تبادلہ خیالات کرتے، دونوں جگہ انجمن ہی کے نام

کچھ دن علی گڑھ کالج میں تاریخ کے پروفیسر بھی رہے تھے، انجمن الفلاح کا سالانہ جلسہ تھا، مجمع اچھا خاصہ تھا، منجملہ اور مسائل کے وقف علی الاولاد کی تجویز پاس ہونے کے لئے پیش ہوئی، ماموں مرحوم نے مسلمانوں کی جائیداد کی حفاظت کی اس قانون کو واحد شکل قرار دے کر ایک مبسوط تقریر کی، تقریر میں ان کو کمال تھا، پھول برستے ہوئے کم از کم ان کی تقریر کے سوا اب تک کسی دوسرے مقرر کی زبان سے میری آنکھوں نے نہیں دیکھا ہے۔ کاش! عمر پاتے تو غالباً سارا ہندوستان پھول کی اس بارش کا نظارہ کرتا۔ وکان امر اللہ قدرا مقدوراً۔

بہر حال تقریر جب ختم ہو چکی، اور میں سمجھے تھا کہ بحث بھی ختم ہو چکی، اور مسئلہ بلا اختلاف پاس ہو جائے گا کہ اچانک ایک دراز قد، چھریرے بدن، سانولے رنگ، کو سجون کی سی داڑھی والے آدمی کو دیکھا کہ تقریر کی میز

سے قلمی رسالے بھی نکلتے تھے، دسنہ کا کتب خانہ تو بین الاقوامی سطح پر مقبول ہوا لیکن استھانواں کے کتب خانہ کو وہ مقبولیت نہ حاصل ہو سکی، جب کہ یہ دسنہ کے کتب خانہ سے زیادہ قدیم تھا، اور نوادرات اور قدیم کتب کے لحاظ سے بھی اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے، ۱۸۸۵ میں اس کا قیام عمل میں آیا تھا، جس میں مولانا گیلانی کے مذکور الصدر ماموں سید فضل الرحمن صاحب پیش پیش تھے، دسنہ کی طرح اس نادر کتب خانہ کو بھی خدا بخش خان کے کتب خانہ میں ضم کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا لیکن افسوس کہ اہل وطن نے قبول نہیں کیا کہ وہ اس نادر سرمایہ سے مستفید ہوں گے لیکن ایسا نہیں ہو سکا اور کتب خانہ کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا، اسی انجمن کے تحت ۱۹۳۸ میں سید تقی الدین استھانوی (ڈپٹی کلکٹر ریاست حیدرآباد) کی تجویز پر ایک مدرسہ محمدیہ کا قیام بھی عمل میں آیا جو اب بورڈ سے ملحق ہے اور چل رہا ہے، حضرت گیلانی اس کی مجلس انتظامیہ کے صدر رہ چکے ہیں۔

کے سامنے کھڑا ہے اور ہکلا ہکلا کر چند باتیں کہہ رہا ہے، پہلے تو توجہ نہ ہوئی، لیکن جب بحث کے نکات سمجھ میں آنے لگے تو ذرا سنبھلا کہ یہ کوئی غیر معمولی گفتگو ہے، غور سے سننے لگا۔

> " شرعی وارثوں کے حرمان سے مسلمانوں کی جائداد کی حفاظت کا کام لینا، شریعت کے مقصد سے انحراف ہے۔ اس قانون (وقف علی الاولاد) کو پاس کرنے کے یہ معنی ہیں کہ خدا نے جن لوگوں کو وارث ٹھہرایا ہے، مورث چاہیں گے تو ان کو ان کے شرعی حق سے محروم کر دیں گے، یہ خدائی قانون میں دست اندازی ہے اس لئے اس کو پاس[12] نہ ہونا چاہیئے"

روایت بالمعنی کے باوجود حتی الوسع الفاظ کے دہرانے کی میں نے کوشش کی ہے

۔ گرچہ اس واقعہ پر تقریباً تیس سال سے زیادہ زمانہ گذر چکا ہے، مگر حافظہ کے غیر معمولی تاثر نے اب تک ان کو حتی الوسع محفوظ رکھا ہے۔ بین تقریر ہی میں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ پنہسا[13] کے مولوی سجاد یہی ہیں۔ بالشتر کے مولانا

---

[12] ترمیم کے مراحل سے گذر کر اب جس شکل میں قانون وقف علی لاولاد نافذ ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ اس سے مطمئن تھے۔ (عبدالصمد رحمانی)

[13] مولانا نے یونہی لکھا ہے ورنہ عام تلفظ اس کا پنہسہ " ہ" کے ساتھ ہے جس طرح دیگر مقامات کے ناموں کا مسئلہ ہے، اور اب یہ اردو زبان کی علامت اور اس کی پہچان بن گئی ہے، کہ اس طرح کے ہر نام کو الف کے بجائے "ہ" کے ساتھ لکھا جائے، انگریزی کے بہت سے نام بھی اسی طرح لکھے جاتے ہیں، جیسے امریکہ اور افریقہ وغیرہ جس کا عربی املا امریکا اور افریقا ہے لیکن اردو میں ہا کے ساتھ ہی لکھا جاتا ہے، شروع میں جب ان ہندوستانی

سجاد! دل نے فیصلہ کیا بڑی خوشی ہوئی، ملنے کی آرزو پوری ہوئی، میز سے اترے، جلسہ برخواست ہوا، مصافحہ کی سعادت حاصل ہوئی، کیا پڑھتے ہو؟ کہاں پڑھتے ہو، چند سوالات کے بعد یہ صحبت ختم ہوگئی۔ جس سنجیدگی، جس متانت، جس احتجاجی قوت کے ساتھ استھانواں کی یہ تقریریں سنی گئی تھیں، اس نے مقرر کے خیال کو دل سے ختم نہ ہونے دیا، اس پر زمانہ گذر گیا۔ اب میں دارالعلوم دیوبند سے حدیث کی صرف سند لے کر نہیں بلکہ دو پرچوں کی ادارت کی خدمت کرنے کے بعد بہار واپس لوٹا، حضرت مولانا محمد علی صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ مونگیر میرا مرکز قرار پایا۔ ابھی چند مہینے ہوئے تھے کہ وہی استھانواں کا الکن خطیب مونگیر اس غرض سے آیا ہوا تھا کہ علماء کی منتشر اور پراگندہ جماعت کو ایک نقطہ پر خاص سیاسی خیالات کے ساتھ جمع کیا جائے، اس وقت تک دلی کی جمعیۃ العلماء کا خواب بھی نہ دیکھا گیا تھا۔ طے ہوا کہ صوبہ بہار کے علماء کو پہلے ایک نقطہ پر متحد کیا جائے پھر بتدریج اس کا دائرہ بڑھایا جائے۔ صوبہ کی جمعیۃ العلماء کے پہلے اجلاس کے لئے قصبہ بہار [14] کا انتخاب عمل میں آیا۔ مونگیر کی خانقاہ کی طرف سے جمعیۃ کی شرکت کے لئے خاکسار کو بھیجا گیا۔ بہار میں تقریباً ہر ضلع کے علماء موجود تھے، حضرت شاہ سلیمان پھلواروی ؒ اس

ناموں کو فارسی رسم الخط میں ہ کے ساتھ لکھا گیا تو بہت سے اہل علم نے توجہ دلائی کے ہندی زبان میں ان الفاظ کے اخیر میں ہ نہیں لکھا جاتا اس لئے اردو میں بھی ہ کے بجائے الف ہی لکھنا چاہئے لیکن اس پر عمل نہیں ہو سکا اور اب اس کو بدلنا اور بھی مشکل ہے۔

[14] یعنی شہر بہار شریف۔ تفصیل کے لئے سوانح والے مضامین دیکھئے۔

جمعیۃ کے پہلے صدر مقرر ہو کر آئے، مسماۃ بی بی صغریٰ مرحومہ [15] کے وقف اسٹیٹ کے مکان میں مولانا پھلواروی کا قیام تھا، مجلس قائم انتظامی نے تجویزوں کا خاکہ تیار کیا، اب یاد نہیں ہے کہ کس پر غالباً حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی رہائی کی تجویز تھی کہ اس سے شاہ صاحب کو کچھ اختلاف ہوا، یعنی حکومت کی

---

[15] صغری وقف اسٹیٹ بہت بڑی وقف کی جائیداد ہے، اس کی واقفہ صغری بنت عبدالصمد مرحومہ ایک بہت ہی دیندار اور فیاض خاتون تھیں، صاحب جائیداد تھیں، ان کی ایک صاحبزادی تھیں، وہ بھی ان کی زندگی میں وفات پاگئی تھیں۔ موضع ہسوری ضلع مونگیر (موجودہ ضلع شیخ پورہ) ان کا آبائی وطن تھا، وہیں کے عبدالعزیز صاحب سے شادی ہوئی، جائیداد اکثر شوہر کی تھی جو ان کے حصہ میں آئی، ان کی فیاضیاں اسی وقت مشہور ہوگئی تھیں، انہوں نے ۱۸۹۶ میں اپنی پوری جائیداد جو بہار کے مختلف شہروں میں پھیلی ہوئی تھی وقف کر کے اس کا نظام بنایا اور تمام تفصیلات کی وضاحت کے ساتھ، متولی کے شرائط کی بھی وضاحت کر دی، اپنی زندگی تک خود ہی متولی رہیں ۱۹۰۹ھ مطابق ۱۳۲۷ء میں ان کا انتقال اپنے مستقر پر ہوا اور شاہی جامع مسجد پل پر بہار شریف کے صحن میں مدفون ہیں، ان کے شوہر بھی ساتھ ہی مدفون ہیں اور دونوں کے مزار کے سرہانے مولانا مبارک کریم (سابق سپرٹنڈنٹ اسلامک اسٹڈیز بہار متوفی ۱۹۵۵ء) کے اشعار تاریخ وفات لوح پر کندہ ہیں۔ اس کی اطلاع کے مطابق انہیں جائیداو وقف کرنے کا مشورہ ان کے داماد علی احمد صاحب نے دیا تھا جن کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا تھا، ان کی زندگی میں ان کے نائب خاندان گوہری کے رئیس شیخ موسی تھے جو ان کی وفات کے بعد اسٹیٹ کے پہلے متولی ہوئے، کتبہ کے اشعار میں خاندان گوہری لکھا گیا ہے، مولانا علامہ شمس الحق عظیم آبادی ڈیانوی کے خاندان کو بھی ان کے جد اعلی شیخ گوہر علی کے نام پر خاندان گوہری کہا جاتا ہے، عجب نہیں کہ اسی خاندان سے ان کا تعلق ہو۔ یہ معلومات اشعار لوح مزار کے علاوہ تذکرہ نسوان ہند از فصیح الدین بلخی سے ماخوذ ہیں جس میں بی بی صغریٰ کا ذکر ہے۔

برہمی کا اندیشہ ہو اور عین اس وقت پر صدارت کے فریضہ سے دست کشی کی دھمکی ان کی طرف سے آنے لگی۔ حضرت مولانا سجاد صاحب کی رفاقت میں ہم لوگ شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، یاد ہے اس وقت کا فقرہ، اس لئے ذکر کر دیتا ہوں کہ علماء اس وقت تک حکومت مسلطہ سے کس درجہ خوف زدہ کر دیئے گئے تھے، شاہ صاحب نے فرمایا کہ بھائی! تم لوگوں کو کیا، آزاد ہو، جو چاہو کہو۔ لیکن اولڈ ہم (شاید پٹنہ کے کسی انگریز کمشنر کا نام تھا) کی گرم نگاہوں کا مقابلہ تو مجھے کرنا پڑتا ہے، مگر ہم لوگوں کی منت وسماجت سے شاہ صاحب راضی ہو گئے، بارے جلسہ میں تشریف لائے اور خطبۂ صدارت بجائے تحریر کے تقریر کے ذریعہ سے پڑھا گیا، خاکسار کے شباب کا زمانہ تھا، جوش و خروش میں خوب دھواں دھار تقریریں کی گئیں، کیا معلوم تھا کہ آج ہمارے شاہ صاحب کے جس فعل کو ہم کمزوری قرار دے رہے ہیں، کل ان ہی کمزریوں کا ارتکاب کرنا پڑے گا، بلکہ پوری زندگی اسی کمزوری میں بسر ہو گی، خیر و خوبی سے جمعیۃ العلماء بہار کا پہلا اجلاس ختم ہو گیا، وقف کی جانب سے علماء کی خوب مدارتیں ہوئیں۔ یہاں سے جانے کے بعد ہی غالباً میرے دوسرے ماموں مولوی محمد یوسف مرحوم جو نائب دوم کے عہد کے لئے کھڑے ہوئے تھے، یعنی صغری وقف اسٹیٹ کی تولیت میں نائب دوم کا عہدہ اراکین مجلس وقف کے انتخاب سے ہوتا تھا، اس عہدہ کے لے ماموں مرحوم نے اپنے کو پیش کیا، مجھے ''گیا ''بھیجا گیا۔ مولانا سجاد صاحبؒ کو لے کر وہاں سے اراکین کے پاس پہنچے، مولانا مرحوم کی کوشش بار آور ہوئی، ماموں مرحوم نائب دوم مقرر ہو گئے۔ دوم سے اول، اول کے بعد متولی اعظم کے عہدہ پر پہنچے، ہر ترقی پر رکاوٹیں پیدا ہوئیں

، لیکن ان کو ایک ایسے مجسم عمل کی پشت پناہی حاصل تھی کہ مخالفوں کو ہمیشہ رسوائی ہوئی۔ مولانا سجاد صاحبؒ نے جس شخص کی تولیت کی حمایت کی تھی، دنیا نے اپنے آنکھوں سے دیکھا کہ صغریٰ وقف اسٹیٹ کو نہ ایسا متولی اس سے پہلے ملا تھا اور نہ بعد کو ملنے کی امید ہے، بقول مولانا تمنا کہ ٹھیک عمر بن عبد العزیز خلیفہ کی خلافت کا زمانہ جو ڈھائی سال تھا وہی ڈھائی سال ماموں مرحوم کو تولیت کے لئے ملے، تولیت کی مختصر مدت میں مدرسہ عزیزیہ[16] کی وہ عظیم الشان عمارت

[16] شہر بہار شریف کی مشہور دینی تعلیم گاہ جو ایک زمانہ تک ملک کے اہم مدارس اور صوبہ بہار کے چند ممتاز مدارس میں شمار کی جاتی رہی، وہاں جید اساتذہ مشغول خدمت تھے اور طلبہ کے بڑی تعداد مصروف استفادہ تھی، مولانا مسعود عالم ندوی بھی اس مدرسہ کے طالب علم رہ چکے ہیں، حضرت مولانا سجاد کی اس پر خصوصی نگاہ تھی، کچھ اس مدرسہ کا تذکرہ جابجا مولانا مسعود ندوی کے مضمون میں بھی آیا ہے، صغریٰ وقف اسٹیٹ کے تحت اس مدرسہ کا نام صغری مرحومہ کے شوہر عبدالعزیز صاحب بن فضل امام (متوفی ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۸۸۴) کی نسبت سے مدرسہ عزیزیہ رکھا گیا، اس کا قیام ۱۸۹۲ (۱۳۱۰ھ) میں عمل میں آیا، مولانا مبارک کریم صاحب اس کے پہلے صدر مدرس تھے، حضرت مولانا فخر الدین صاحب صدرالمدرسین دارالعلوم دیوبند اور مفتی نظام الدین صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند، مولانا محمد ناظم ندوی شیخ الادب دارالعلوم ندوۃ العلماء واستاذ جامعہ اسلامیہ مدینہ و شیخ الجامعہ جامعہ عباسیہ بھاول پور اور اس طرح کے بہت سے ممتاز اہل علم نے اس مدرسہ سے استفادہ کیا ہے۔۔ پہلے اس کی عمارت صغری مرحومہ کی قیام گاہ سے قریب ہی محلہ لہیری میں تھی، صغری مرحومہ کے مکان پر اب وقف اسٹیٹ کا دفتر اور سابقہ عمارتِ مدرسہ میں جو مولانا گیلانی کے بقول فسادات کا شکار ہو گئی تھی اب فیضان العلوم اسکول قائم ہے۔ مدرسہ کی موجودہ عمارت کی تعمیر کے بعد بھی کچھ سالوں تک قدیم عمارت طلبہ کے

بنی جو بعد کو غیظ قلوب کفار بن کر گذشتہ فتنہ بہار میں نشانہ بھی بنی، خزانہ میں کافی روپئے جمع ہوئے، مستقل مارکیٹ کی عمارت تیار ہوئی، قصبہ بہار اور وقف اسٹیٹ کے متعلقہ مساجد کی ترمیم و تجدید ہوئی، دیہاتوں میں بعض نئی مسجدوں کے قیام میں امداد کی گئی اور سب سے بڑی بات یہ ہے عربی مدارس میں کے طلبہ کی معاشی سہولتوں کے لئے یہ پرانی تجویز کہ ہر ہر مدرسہ میں کسی ایسی مقامی غیر مقابلاتی [ے۱] صنعت اور ہنر کی طلبہ کو تعلیم دی جائے، جس کے ذریعہ سے وہ اپنی روزی کے لئے مسلمانوں کے سینوں کے بوجھ یا غیر مسلموں کے مقاصد کے آلہ کار نہ بنیں۔ اس تجویز کا آغاز جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ اسی متولی کے ذریعہ سے بہ شکل خطاطی و کاپی نویسی مدرسہ عزیزیہ میں شروع ہوا جسے حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ کی نگاہ انتخاب نے اس عہدہ تک پہنچایا تھا۔ پس سچ یہ ہے کہ

دارالاقامہ کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔ موجودہ عمارت محلہ مرار پور میں شاہی مسجد سے متصل ہے۔

[ے۱] غیر مقابلاتی سے مراد ایسی صنعتیں ہیں جن میں یورپ امریکہ، جاپان وغیرہ کی میکانکی صنعتوں سے مقابلہ نہ ہو، مثلاً زر گری، آہن گری، نجاری، معماری، شیرنی سازی، طباخی، پولٹری (مرغبانی)، باغبانی، کاشت کاری وغیرہ کہ بہر حال ان چیزوں کے لئے ہندوستان کی دستکاری سے نفع اٹھانے پر مجبور ہونا پڑتا ہے، بخلاف پارچہ بافی وغیرہ میکانکی صنعتوں کے کہ ہندوستانیوں کی دستکاریاں مشین استعمال کرنے والے ممالک کا مقابلہ نہیں کر سکتیں، اس لئے بازار میں ہندوستان کا بنا ہوا سامان بغیر وعظ کے بک نہیں سکتا، تجارت کے فروغ کو اگر وعظ پر مبنی کیا جائے گا تو" فروغش معلوم" ہر تھان کے ساتھ کسی کا حکم یا کسی کا فتوی کہاں تک چل سکتا ہے، بازار میں چیزوں کی ارزانی، مضبوطی، حسن و خوبی، خریداری کی اصل ضمانتیں ہیں، ورنہ خرط القتاد۔ (گیلانی)

وقف اسٹیٹ کے دور یوسفی کے ڈھائی سال کے زمانہ کو اگر دور سجادی قرار دیا جائے تو یہ ایک واقعہ کا اظہار ہو گا۔ میرے ماموں مولوی محمد یوسف متولی مرحوم اپنی زندگی میں مولانا مرحوم کی ہدایتوں سے کس درجہ متاثر تھے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ باوجود صاحب حیثیت ہونے کے اپنی اکلوتی لڑکی کی شادی جس غیر معمولی سادگی سے انہوں نے انجام دی، جاننے والے جانتے ہیں کہ اس مشورہ میں پوشیدہ ہاتھ کس کا تھا، وہی مولوی محمد یوسف جو تولیت سے پہلے اپنی شاہ خرچی میں مشہور و معروف تھے، موروثی جائیداد کا بڑا حصہ ہزارہا ہزار روپے کی شکل میں انہوں نے اڑادیا تھا، دستر خوان کی وسعت میں مشہور تھے، لیکن تولیت کے بعد اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں جو وہ اس قدر مختصر ہو گئے تھے کہ لوگوں کو ان پر بخل کا شبہ ہونے لگا، کس کی نگاہ تھی جس نے اس زندگی پر ان کو آمادہ کیا تھا، زبان سے نہیں بلکہ عمل سے بہار کے نائب امیر شریعت نے کتنوں امیروں کو فقیری کا درس دیا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ باوجود میسر آنے کے جس نے بڑی بڑی سرکاری ملازمتوں کو ٹھکرا کر پوری زندگی فقر و فاقہ میں گذار دی، کیسا فقر و فاقہ؟ کہ مرنے کے بعد جس کے گھر میں دوسرے دن کا خرچ بھی نہ تھا اور علاج کے لئے اپنی دوا بھی نہیں خرید سکتا تھا! فقر و فاقہ کی ایسی زندگی اگر دوسروں میں صبر و استقامت کی قوت پیدا کر رہی تھی تو ایسے حالی کے مواعظ حسنہ کا نشانہ کب خطا ہوا ہے، قالی والوں کو اگر اپنی تذکیر اور تقریر کی بے اثری کا گلہ ہے تو یہ گلہ سننے والوں سے نہیں بلکہ کہنے والوں اور صرف کہنے والوں کو خود اپنے آپ سے کرنا چاہیئے، ورنہ جو کر کے وعظ سناتے تھے، ان کے وعظوں کو بے اثر ہوتے کس نے دیکھا ہے؟

بہر حال میں جمعیۃ العلما بہار کا قصہ سنا رہا تھا، جس میں خدا نے مولاناؒ کی ہمرکابی کی سعادت سے سرفراز فرمایا، پھر میرے گلے میں ملازمت کا طوق ڈال دیا گیا، جس کے بعد دیکھنے کے سوا زندگی کی ساری علامتیں مجھ سے مفقود ہو گئیں اور اب تو آنکھوں کی اس زندگی سے بھی محرومی کا وقت قریب آ گیا ہے، ملازمت کے بعد میں بہار ہی سے الگ ہو گیا، چہ جائیکہ بہار کی بہاروں سے کیا تعلق باقی رہتا، پھر کیا ہوتا رہا، سنتا رہا، دیکھنے[18] کی نوبت کم آئی، دلی میں بہار والی جمعیۃ، جمعیۃ العلماء ہند کے نام سے چمکی، اور ایسی چمکی کہ ایک زمانہ تک کم از کم مسلمانوں کی سیاسی جد وجہد کا وہ ایسا ممتاز ادارہ رہا، جس کا مقابلہ مدت تک کوئی اسلامی سیاسی ادارہ نہ کر سکا۔ حالانکہ خلافت کانفرنس کا بڑا زور تھا، لیکن گیا کے میدانوں میں آ کر دنیا نے تماشا کیا کہ جس جمعیۃ کی بنیاد بہار میں رکھی گئی تھی، وہ ایک خالص ہندو شہر اور بودھشٹ مرکز میں ایک ایسے چراغ کو اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے تھی، کہ اس کے سامنے کانگریس کا آفتاب اور خلافت کا ماہتاب بھی شرمانے لگا اور اس کا اعتراف اپنوں، غیروں، سبھوں نے کیا، اسی کا اعتراف نہیں، بلکہ اس کا بھی کہ سارے ہندوستان کا سب سے زیادہ نمایاں اجلاس جمعیۃ علمائے گیا کا اجلاس تھا، اور جمعیۃ العلماء گیا کا اجلاس صرف ایک واحد شخصیت (حضرت مولانا سجادؒ) کی عملی قوتوں کا مظہر تھا، جس کے معنی یہی ہوئے کہ اس وقت سارے ہندوستان کی بڑی نمایاں ہستی حضرت مولانا محمد سجادؒ کی تھی، جمعیۃ العلماء اس کے بعد بھی بڑھتی رہی، چمکتی رہی، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ

[18] میری سیاسی ناآشنائی کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ ہندی سیاست کے سب سے بڑے بازیگر مسٹر گاندھی کو دیکھنے کی نوبت اب تک نہ آئی۔ (گیلانی)

گیا ہی کا اجلاس نہیں، بلکہ جمعیۃ کے جتنے اجلاس ہوتے رہے، اس کی بولنے والی روح وہی خاموش زبان تھی، جو زندگی میں بھی خاموش رہنے کے باوجود سب سے زیادہ بولنے والی تھی اور ان شاء اللہ اس کی خاموش بولیاں ابد تک نہ چپ ہو نے والی بولیاں ہیں۔

انہی دنوں میں امارت شرعیہ کا بہار میں زور ہوا، اور کیسا زور؟ حکومت کے اندر ایک حکومت کا نظام تقریباً قائم ہو چکا تھا، جو "کُل" کی تلاش میں "کُل" کو کھو دینا دانشمندی سمجھتے ہیں، یا سب کچھ ملے یا کچھ نہ ملے، جن بزرگوں کا یہ مسلک تھا افسوس ہے کہ انہوں نے ساتھ نہیں دیا اور

در پئے دنیا دیں ہم رفت
آں ہم رفت وایں ہم رفت

خود ان مسائل سے کنارہ رہا ہوں، کوئی صحیح رائے شریک ہونے کی صورت میں نہیں دے سکتا تھا، تو جدائی میں کیا دے سکتا ہوں، پس ہوا جو کچھ ہوا، اور گیا جو کچھ گیا۔ ایک دن وہ بھی دیکھا تھا کہ کلکٹر صاحب کے چپراسیوں کی طرح امارت کے نقباء شرعی محاصل کے وصول کرنے کے لئے دیہاتوں میں پہنچے ہیں، مسلمان مرد اور عورتیں بزور نہیں بلکہ خود زاری کر کے ان محاصل کو ادا کر رہے ہیں، پھر وہ دن بھی میری آنکھوں نے دیکھا کہ مسلمان، مسلمان نقیبوں کو سب وشتم کے ساتھ پیش آ رہے تھے! فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

لیکن باجود اس سیاسی اور جماعتی علاحدگی کے حق تعالیٰ کا شکر کس منہ سے ادا کروں کہ جس کے ساتھ میں قرب کی تلاش میں رہتا تھا، انفرادی طور پر قدرت نے اس کو مجھ سے دور نہ رکھا۔ مولانا سجادؒ کی دوسری شادی گیلانی میں

ایک خاص بزرگ[۹۱] کی لڑکی سے ہوئی، اس لحاظ سے مولانا میرے داماد ہوگئے، ان کی آمد ورفت کا سلسلہ گیلانی میں مسلسل اسی وجہ سے جاری رہتا تھا، یہی نہیں

[۹۱] یعنی ابو العالی خان بہادر مولانا سید عبد العزیز، عالی گیلانی جو خاکسار کے نسبتی بھائی بھی ہیں۔(گیلانی) ۔۔یعنی مولانا کی بڑی ہمشیرہ ان سے منسوب تھیں، اور حضرت مولانا سجاد صاحب کی دوسری شادی پہلی اہلیہ (جو ان کی چچازاد بھانجی اور حضرت مولانا سید وحید الحق استھانوی کی صاحبزادی تھیں) کے انتقال کے بعد ان کی صاحبزادی سے گیلانی میں ہوئی تھی جو حضرت مولانا گیلانی کی بھانجی تھیں، ان کے والد حضرت میر واعظ الحق گیلانی قادری رحمۃ اللہ علیہ بڑے ممتاز بزرگوں میں تھے، مولانا عبد الغفار سرحدی ثم گیاوی خلیفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ ان کے خویش تھے، کیوں کہ ان کا قیام گیا ہی میں رہتا تھا، مولانا عبد الغفار صاحب کے نواسے مولانا فخر الدین صاحب ان کے حالات میں اپنے والد کے نانا حضرت میر واعظ الحق اور ان کے صاحبزادے حضرت عبد العزیز کے متعلق لکھتے ہیں "گیا میں میر واعظ الحق صاحب گیلانی کے رہنے والے ایک بزرگ بسلسلۂ تجارت رہتے تھے، کچہری میں ایک چادر بچھادیتے، اسی پر کچھ کتابیں رکھ کر بیچا کرتے، اور اسی آمدنی سے گذر بسر کرتے تھے، انہیں کے داماد مولانا عبد الغفار صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، میر صاحب کے بڑے صاحبزادے جو ایک شیخ وقت تھے، اور صاحب گنج سنتھال پرگنہ (موجودہ ایک شہر جو جھارکھنڈ میں بھاگلپور سے قریب ہے) میں جوانی سے آخر عمر تک قیام پذیر رہ کر دین کی خدمت کرتے رہے، ان کی قبر جامع مسجد صاحب گنج کے احاطہ میں ہے، بنگال تک ان کے مریدین، مسترشدین پھیلے ہوئے ہیں، ضلع مالدہ میں ان کے مریدین کی کثرت ہے،۔۔۔۔۔ مولانا عبد العزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے والد محترم کے پاس گیا میں رہ کر حضرت مولانا عبد الغفار صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تعلیم وتربیت حاصل کی اور اپنے والد سے شرف بیعت حاصل کیا اور انہیں سے اجازت وخلافت بھی حاصل کی "۔ (درس حیات از مولانا قاری فخر الدین گیاویؒ، مطبوعہ گیا، ص ۵۷)۔ حضرت عبد العزیز کی شاعری

ہوا بلکہ ان کے بھانجے مولوی خلیل صاحب بی اے کی شادی بھی اسی گھر میں ہوئی، مولانا گو مولوی خلیل کے ماموں تھے، لیکن تربیت و پرداخت کے لحاظ سے گویا وہ ان کے بیٹے ہیں۔ اسی تعلق نے رشتہ کو اور مضبوط کیا، حضرت سے تعلقات اتنے بڑھے کہ قدرت کو منظور نہ تھا، اس لئے نہ ہوا، ورنہ ان کے ایک مرحوم بھانجے محمد نعیم مرحوم کی شادی کا نظم خود میرے گھر میں میری حقیقی چھوٹی بہن سے ہو چکا تھا، لیکن عجیب اتفاق کہ عقد کو چند دن باقی تھے کہ دونوں بیمار ہوئے اور شاید ایک دو مہینہ آگے پیچھے دونوں کا انتقال ہوگیا، اللہم اغفر لہما۔ مولانا پر اس واقعہ کا سخت اثر تھا، اسی سلسلہ میں ایک تقریب کے حیلہ سے پنہسّا کی حاضری بھی میسر آئی تھی، اللہ اللہ! مولانا کی خاطر داریاں، ذرہ نوازیاں آج یاد آتی ہیں، دل آٹھ آٹھ آنسو روتا ہے۔ مولانا مرحوم رشتہ

،(نظم ومثنوی) کے تین چھوٹے چھوٹے مجموعے "نوائے اسلام"، "عرض حال" اور "شام غم" راقم کی نظر سے گذرے ہیں جو مطبع رحمانی مخصوص پور مونگیر میں منشی سراج الدین احمد رحمانی کے اہتمام میں شائع ہوئے، اس سے جہاں ان کے شاعرانہ ذوق اور مقام کا اندازہ ہوتا ہے وہیں، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس عہدہ پر فائز رہے، ان تینوں پر مصنف کی حیثیت سے ان کا نام ان الفاظ میں درج ہے "مولانا السید عبد العزیز صاحب عالی گیلانی آنریری مجسٹریٹ ومیونسپل کمشنر صاحب گنج کجروٹیہ" جس سے ان کے تخلص عالی ،کنیت ابو المعالی اور ان کے مشغلہ کا علم ہوتا ہے، شاید اسی عہدہ کی مناسبت سے ان کو حکومت برطانیہ کی طرف سے خان بہادر کا خطاب دیا گیا تھا۔ حضرت گیلانی کے برادر زادہ سید جمال احسن گیلانی کی اطلاع کے مطابق آزادی کے ایک دو سال بعد یعنی تقریباً ۱۹۴۹-۵۰ میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے چھوٹے بھائی سید یسین صاحب بھی اپنے بہنوئی کے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی علیہ الرحمۃ کے خادم ومسترشد تھے۔

داریوں کے ان تعلقات کی وجہ سے گیلانی جب کبھی تشریف لاتے اور میں بھی تعطیلوں کی وجہ سے گھر میں ہوتا، تو علمی، سیاسی، دینی مسائل پر رات دو دو بجے تک بحث و مباحثہ ہوتا رہتا، اس وقت ان کے علمی رسوخ، سیاسی شعور اور دینی اخلاص کے جو تجربات ہوتے تھے، وہ مجھے حیرت میں ڈال دیتے تھے، حالانکہ حق تعالی نے اپنے فضل و کرم سے علم و دین کی بڑی بڑی شخصیتوں تک پہنچنے کا مجھے موقع عطا فرمایا لیکن ان تینوں شعبوں کی جامعیت اور وہ بھی اس پیمانہ پر یہ واقعہ ہے کہ اپنے جاننے والوں میں کسی کے اندر نہیں پاتا، وہ جب منطق و فلسفہ کے نکات پر بحث کرتے تو پتہ کی ایسی بات کہتے کہ مسئلہ کی گرہ کھل جاتی تھی، پھر جب فقہی جزئیات کا ذکر آتا تو ایسے نوادر جزئیات کا پتہ دیتے کہ میں حیران ہو جاتا، لیکن کتاب جب کھلتی تو جو کچھ مولانا فرماتے اس کی توثیق کرنی پڑتی تھی اور سیاسی مہارت جو ان کو حاصل تھی اس کا تجربہ تو مجھ سے زیادہ ان لوگوں کو ہوتا رہا جن کی عمر گذری تھی اس دشت کی سیاحی میں۔ سیاسیات سے چونکہ میرا زیادہ لگاؤ نہ تھا، اس لئے اس پر کم گفتگو ہوتی، مجھ پر سب سے زیادہ جو چیز ان کی اثر انداز ہوتی وہ ان کا صادق اخلاص اور اپنے پیغمبر ﷺ کے ساتھ کامل وفاداری تھی، اس پہلو پر جب گفتگو ہوتی اور حسب دستور جب میں آپے سے باہر ہو جاتا تو خود روتا اور مولانا کو رلاتا تھا۔

یاد آتا ہے، اور وہ سماں کیا حافظہ سے نکل سکتا ہے، جاڑوں کے دن تھے، میں پاسیا (نفیح الدم) کی خطرناک بیماری سے شفایاب ہو کر گیلانی میں رخصت کے دن گذار رہا تھا، حضرت مولانا بھی گیلانی تشریف لائے، باتوں باتوں میں اپنی نعتیہ نظم "نیاز" جو مگھی زبان میں ہے اس کا ذکر بھی آیا، مولانا

رحمۃ اللہ علیہ نے سنانے کی فرمائش کی، اپنے خاص لَے میں سنانے لگا، جب اس بند پر پہنچا، سرور کائنات ﷺ کو مخاطب کر کے عرض کیا گیا تھا:

تمری دوار یا کیسے چھوڑوں
تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں
تمری گلی کی دھول بٹوروں
تمرے نگر میں دم بھی توڑوں
جی کا اب ارمان یہی ہے
اٹھوں پہر اب دھیان یہی ہے[20]

مولانا مرحوم بے قرار ہو گئے، دبے ہوئے آنسو تھم نہ سکے، سیلاب رواں ہوا، اتنا رواں ہوا کہ گھگھیاں بندھ گئیں۔

تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں

اس مصرعہ کو بار بار دہراتے تھے۔ عقلی بلند پردازی اور علمی تفتیش و تلاش کی آخری حد پر پہنچ کر پہنچنے والا جو کچھ کہہ سکتا ہے، چونکہ وہی کہا گیا تھا، بے تاب ہو گئے، تڑپ گئے، دنیا، اسی دنیا میں ایک گروہ ان کا بھی ہے جو لندن و پیرس کی مطبوعہ آرٹ پیپر کی مفصل و مبوب کتابوں کے مطالعے سے مسرور ہیں اور کچھ دیوانے وہ بھی ہیں جو پھٹے پرانے لیتھو پریس کے بادامی کاغذوں کی کتابوں کی ورق گردانی میں اس تصور سے منہمک ہیں کہ یہ بھی کسی کی گلی ہے، اسی گلی کا دھول بٹورنا زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ ہے، اور اسی علم کے نگر میں دم

[20] مولانا کی فرمائش پر یہ نظم مونگیر خانقاہ رحمانیہ میں طبع ہوئی، مگھی زبان میں اردو الفاظ کس طرح لکھے جائیں اس کی ترکیب بھی مولانا نے بتائی۔ (گیلانی)

توڑ کر مر جانا حیات مقصد اقصیٰ ہے، دین کے اسی دائرہ میں گھومنا، گھومتے رہنا ،اسی سانس میں آخری سانس پوری کرنی ہے، سمجھا جاسکتا ہے، اس پر یہ مصرعے تیر ونشتر بن کر اگر لگے ہوں تو کیا تعجب ہے ؟ شیر کو شیر (دودھ) کا ہم شکل دیکھ کر کتنوں کو دھوکہ لگا اور کتنے پاکوں کو ناپاکوں نے اپنے اوپر قیاس کر کے ان کی ناپاکی کا بھی حکم لگایا اور لوگ ہمیشہ یہ ناپتے ہیں کہ اس نے کیا کیا؟ حالانکہ جو سب کچھ کر سکتا ہے اور جب جی چاہتا ہے سب کچھ کر کے دکھا دیتا ہے، توپوں والے، بندوقوں والے، ہوائی جہاز اور انہیں جہاز والوں کی کھوپڑیوں کو ہاتھ میں لے کر ان ہی کی کھوپڑیوں پر دے مارتا ہے حالانکہ ان کے سر تو سر پاؤں چھونے کی صلاحیت بھی کڑورہا کڑور انسانوں میں نہیں ہوتی ہے، اس کی راہ چلنے والوں کے متعلق یہ دیکھنا قطعاً غلط ہے کہ اس نے کیا کیا؟ بلکہ دیکھنے کی اور سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس نے کس لئے کیا؟ کسی کے نگر میں مرنے ہی کے لئے جو جیتا ہو اس کی موت بھی قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں ہر ایک کی موت و حیات ہے، کہ اس کی موت بھی زندگی ہے اور زندگی تو زندگی ہے ہی، آخر اس دنیا میں سب ہی جیتے ہیں اور مر جاتے ہیں، جب تک جیتے ہیں زندگی کے چوبیس گھنٹوں کو کسی کام میں صرف کرتے ہیں، زندگی کی قیمت اگر صرف کام سے لگائی جائے تو ان میں ناکام کون ہے ؟ پھر قیمتوں میں تفاوت کیوں پیدا ہوتا ہے، اس لئے نہیں کہ چوبیس گھنٹوں کی حرکت کس کی کتنی ہے، حرکت تو سب کی تقریباً برابر ہے۔ یہ حرکت کس مقصد کے تحت سرانجام ہوئی، قیمت اس کی لگائی جاتی ہے جو اپنے پیٹ کے لئے، اپنے خاندان کے لئے، اپنی قوم کے لئے، ہر مقصد کے لئے جو بھی کام کرتا ہے انہیں چوبیس گھنٹوں میں کرتا ہے، پھر کیا جس کی

حرکت قوم کے لئے ہوئی، ملک کے لئے ہوئی اس کی برابری وہ کر سکتا ہے جس نے کام کے ان گھنٹوں کو اپنے بیوی بچوں کے لئے گذارا؟ اور جو صرف اپنے پیٹ کے لئے ان گھنٹوں میں گھومتا رہا، اس کو کیا اس بے چارے کے برابر کہا جا سکتا ہے جو اپنے ساتھ ساتھ اپنی بیوی، اپنے بچوں، اپنے ماں باپ، بھائی بہن کی پرورش و خدمت بھی اپنے پیش نظر رکھتا ہے۔ پس جو اپنی ذات، اپنے خاندان، اپنے ملک، اپنی قوم سے آگے بڑھ کر اس کے لئے جیتا رہا جس کے لئے آدمی جِلایا گیا ہے، تو تم اس سے ان کو کیوں ناپتے ہو، جو زندگی کے اس بلند مقصد کے مینار سے گر گئے یا گرا دیئے گئے ہیں، اتنے نیچے گرا دیئے گئے کہ خالق کا کام بھی مخلوق ہی کو خوش کرنے کے لئے کرتے ہیں، پر جو اپنا، اپنے خاندان، اپنے ملک ،اپنی قوم کا کام ان مخلوقات کو دکھانے کے لئے نہیں بلکہ خالق کا حکم بجالانے کے لئے کرتا ہے، اس کا ہم پلہ، ہم وزن کون ہو سکتا ہے، جب مخلوق سے بدلہ حاصل کرنے کا دن، بلکہ خالق سے مزدوری ملنے کا وقت آئے گا اس وقت کھلے گا کہ کون خالق کے لئے جیتا تھا اور کون مخلوق کے لئے، جنہوں نے خالق کے حکم سے نہیں بلکہ اپنے جی کی خواہش سے مخلوق کی خدمت کی تھی، اگر خالق کے پاس ان کو مزدوری نہ ملے، تو جس نے خالق کے لئے کام نہیں کیا تھا وہ اس سے مزدوری کا دعویدار کیوں ہو۔

خدا جانے میں کیا بکنے لگا، میں تو اپنا ایک مشاہدہ بیان کر رہا تھا، جو گیلانی میں مولانا کے متعلق پیش آیا تھا، پھر اس کے بعد بھی ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ میرا سوال کہ مسلمانوں کو بادشاہی دلانے کے ساتھ اگر بادشاہوں کو مسلمان یا مسلمانوں کو تاجر بنانے کے ساتھ تاجروں کو مسلمان یا مسلمانوں کو

کاشتکار بنانے کے ساتھ کاشتکاروں کو مسلمان بنانے کی کوئی طبقہ کوشش کرتا، تو
جو پہلی بات کا حاصل ہے، وہی تو پچھلی بات کا نتیجہ ہے، اس سوال کے جواب
میں میری اس مسئلہ کے ساتھ خاص دلچسپی کو پاکر مولانا اس راہ میں جو کچھ کرتے
تھے، اکثر اس کی رپورٹ سنا دیتے، فرماتے اخباروں میں اس کی اشاعت
مناسب نہیں، فتنہ کا اندیشہ ہے۔ مولانا مرحوم نے اس سلسلہ میں کیا کیا کیا، کیا
کیا کرنا چاہتے تھے، اس کی تفصیل تو ان کے رفقاء کار ہی جان سکتے ہیں، میں نے
اس کا ذکر اس لئے بھی کر دیا کہ جس پر کفر نوازی کا الزام تھا ان کو سنانا چاہتا
ہوں، ایسے کفر شکنوں میں کفر نوازی کی گنجائش کیا نکل سکتی ہے۔مالکم کیف
تحکمون، مجھے تو اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ پچھلے دنوں میں مولانا کے بعض
طرز عمل سے مجھے بھی اختلاف رہا ہے، اور مولانا اس سے واقف تھے، ادباً زیادہ
تو ان سے گفتگو کی ہمت نہ تھی، لیکن کبھی کبھی اختلافی نقاط پر بحث بھی ہو جاتی،
مولانا عبد الصمد رحمانی کے رسالہ "امارت شرعیہ" کو وفات سے چند دن پیشتر
میرے پاس تبصرہ نگاری کے لئے بھجوایا تھا، اس تبصرہ میں بھی اپنے ذاتی خیالات
کا اظہار کر دیا گیا تھا، غالباً میرا مسودہ وفات کے بعد پہنچا، اس کا علم نہ ہو سکا کہ وہ
تبصرہ شائع ہوا یا ضائع ہوا۔

لیکن ان کی نیت صالحہ پر ایک لمحہ کے لئے مجھے کبھی شک وشبہ نہیں
ہوا، میں ہر حال میں ان کو صادق ماننے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا رہا، اور سچ یہ
ہے کہ ہم جیسے غلط اور کاذب زندگی والوں کے لئے اس کے سوا چارۂ کار ہی کیا
تھا۔

میں ان کی خانگی زندگی سے واقف تھا، اس قدر واقف جتنا ایک گھر کا
آدمی واقف ہو سکتا ہے، ان کے ظاہر سے باطن ان کا بہتر اور بہت بہتر تھا۔ ان کا
اخلاص، ان کی صداقت، ان کا ادب، احترام آج ڈھونڈھے نہیں مل سکتا۔
گیلانی کے چند لوگ جو ان سے عمر میں ان کے لڑکے کے برابر ہیں، مگر رشتہ میں
اگر بڑے ہو گئے تو مولانا ہمیشہ ان سے وہی برتاؤ کرتے جو ایک عزیز اپنے بڑوں
سے کرتا ہے۔ میرے منجھلے بھائی مکارم احسن گیلانی سلمہ بھی رشتہ میں ان کے
ماموں خسر تھے، مگر مولانا ہمیشہ مولوی مکارم صاحب کے خطاب سے ان کو
خطاب کرتے تھے، جہاں کہیں مل جاتے وہی خردی بزرگی کا خیال رکھتے، لکھنؤ
میں یونیٹی کانفرنس کا اجلاس مولانا ابو الکلام کی صدارت میں ہو رہا تھا۔ مولانا اس
جلسہ میں سرگرم کارکن کی حیثیت رکھتے تھے، برادر مکارم احسن سلمہ، میری
تیمار داری کے سلسلہ میں لکھنؤ میں تھے، جلسہ میں گئے، مولانا کی نظر بھری
مجلس میں ان پر پڑی اور بے تحاشا ان کی طرف لپکے اور وہاں بھی اسی طرح ملے
جس طرح ایک داماد اپنے کسی بزرگ خسر سے مل رہا ہو۔ میری بیماری کا حال
معلوم ہوا، حالانکہ قیصر باغ جو مولانا کا مستقر تھا، وہاں سے میں کوئی آٹھ نو میل
دور رہتا تھا، لیکن جس طرح ممکن ہوا، عیادت کے لئے تشریف لائے اور وہی
سلوک کیا جو ایک عزیز اپنے کسی بزرگ سے کر سکتا ہے، حالانکہ واقعہ میں کسی
حیثیت سے مولانا کے شاگردوں کے شاگرد کی حیثیت بھی نہیں رکھتا۔

ڈاکٹر محمود صاحب وزارت تعلیمات کے زمانہ میں میرے اور سید
سلیمان صاحب کے بنائے ہوئے نصاب متعلقہ (مدرسہ)[21] شمس الہدیٰ پر بعض

[21] مضمون میں صرف شمس الہدی لکھا گیا ہے، پٹنہ کے مشہور مدرسہ کا ذکر ہے۔

جہات سے اعتراضات ہوئے، کمیٹی نظر ثانی کے لئے بنی، مولانا بھی اس کمیٹی
کے رکن تھے، مجھے کچھ اندیشہ تھا کہ شاید تعلیمی حیثیت سے مولانا کے قدیم نقطۂ
نظر میں تبدیلی نہیں ہوئی ہے، کہیں اعتراضات ان ہی کی طرف سے نہ ہوں،
خوف زدہ تھا کہ ان کی گرفتوں کا جواب آسان نہ ہوگا، لیکن جو شکلاً، صورۃً، لباساً،
ووضعاً بالکل ملا قدیم ملاؤں کے پختہ رنگ میں رنگین تھا، کمیٹی[22] کے وقت ان کی
دوررس نظر کو دیکھ کر اپنی جھوٹی روشن خیالی پر مجھے شرمندہ ہونا پڑا، ترمیم
نصاب کے مسئلہ میں مولانا کا قدم ہم سے آگے تھا، نتیجہ یہی ہوا کہ تحتانی کلاسوں
کی چند جزئی ترمیمات کے سوا مخالفین کی اس مطلوبہ کمیٹی کا کوئی نتیجہ برآمد نہ
ہوا، بحمد اللہ وہ نصاب اپنے موجودہ حال میں جاری ہے اور ان شاء اللہ پچیس تیس
سال کے اندر اندر ہندوستان کو ماننا پڑے گا کہ اسلامی علوم کے سلسلہ میں بہار کا
قدم تمام صوبوں سے آگے ہے، بشرطیکہ اس نصاب کو ان ہی شرائط کے ساتھ
پڑھایا جائے جو تدریس کے لوازم ذاتی ہیں۔

بیچ بیچ میں بات دوسری چھڑ جاتی ہے، ذکر مولانا کا ہو رہا تھا۔ یہ واقعہ
ہے کہ علاوہ قومی، علمی اور دینی صفات کے ان میں عام انفرادی اوصاف بھی
عجیب تھے، غربا پروری، عام ہمدردی میں ان کا دل بہت رقیق واقع ہوا تھا، گیلانی
کے مولوی عبد السلام مرحوم جنہیں خطاطی کی وجہ سے مولانا ہمیشہ منشی عبد
الستار کہا کرتے تھے، ان کے شاگرد تھے اور قیام امارت سے وفات تک اسی دفتر
میں ملازم رہے، آخر دنوں میں ان پر دق کا حملہ ہوا اس زمانہ میں مولانا نے ان

[22] یہ نجی کمیٹی کا غالباً ذکر ہے، ورنہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی حیات میں اس کمیٹی کی کوئی با ضابطہ نشست نہیں ہوئی۔ (عبد الصمد)

کے ساتھ جو ہمدردیاں کی ہیں، ان کا ذاتی واقف کار میں ہوں، باوجود معاشی تنگ
حالیوں کے مولانا دینے میں بڑے فیاض تھے اور لینے میں انتہائی غیور واقع ہوئے
تھے، ان پر سخت سے سخت زمانہ گزر گیا، باوجود اتنے گہرے تعلقات کے اپنے
حال سے انہوں نے کبھی مطلع نہیں فرمایا۔

آخری ملاقات:

ادھر کچھ دنوں سے گیلانی کا آنا جانا بند ہو گیا تھا، جس کا بڑا سبب اس
گاؤں کی ویرانی تھی، منجملہ اور مکانوں کے مولانا کی سسرال جس مکان میں تھی
ایسے قدرتی اسباب پیش آئے کہ وہ بھی مقفل ہو گیا، آنے جانے کا جو حیلہ تھا وہ
باقی نہ رہا، مجھ سے ادھر اُدھر

مجلس غیر میں گاہے سر راہ گاہے

ملاقاتیں ہو جاتی تھیں، لیکن جی بھر کے ملنے کا موقع میسر نہ آتا تھا،
لیکن شاید قدرت کی طرف سے یہ بات تھی کہ جس سال مولانا اس ناسوتی جدو
جہد سے اپنا تعلق توڑنے والے تھے، ٹھیک وفات سے چند مہینے پہلے مولانا لطف
اللہ[23] سجادہ نشین خانقاہ رحمانیہ (مونگیر) خلف اکبر حضرت مولانا محمد علی رحمۃ
اللہ علیہ بیمار تھے اور سخت بیمار، علاج کے لئے پٹنہ آئے، میں حیدرآباد سے گرمی
کی تعطیلوں میں گھر جا رہا تھا، مولوی لطف اللہ کی علالت کی خبر سن کر راستہ میں
پٹنہ چلا آیا، یہ عجیب اتفاق تھا کہ انہیں دنوں میں حضرت مولانا محمد سجاد رحمۃ اللہ
علیہ بھی مولانا لطف اللہ کی عیادت کے سلسلہ میں پٹنہ آئے اور اللہ نے یوں ایک

[23] حضرت گیلانی کی تیسری اور سب سے چھوٹی ہمشیرہ ان سے منسوب تھیں اس نسبت سے اوپر مذکور مولانا عبد العزیز گیلانی کے ہم زلف تھے۔

دور افتادہ مخلص کو حضرت کے قدموں میں چند دن گزارنے کا موقع دیا۔ ایک ہی کمرہ میں ہم دونوں کا قیام تھا، کھل کر گفتگو کا موقع ملا، مولانا منت اللہ (فرزند خورد مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ) اپنے بھائی کی تیمارداری کر رہے تھے، ہم تینوں آدمیوں کا یہ اتفاقی اجتماع تھا، بیسیوں مسائل پر خیالات کا تبادلہ عمل میں آتا تھا، مگر انہیں دنوں مولانا کی صحت جو میرے خیال میں ہر قسم کے موسمی تاثرات سے بالاتر تھی اور اکثر ان کی اس خصوصیت پر رشک بھی کرتا تھا، اپنی جگہ سے کھسکی نظر آئی، ماتھا اسی وقت ٹھنکا تھا، لیکن اس کا یقین نہ تھا کہ صحت کی یہ تبدیلی اتنا جلد رنگ لانے والی ہے۔ غرض چار پانچ دن یوں آخری دنوں میں حضرت کی قدمبوسی کی سعادت نصیب ہوئی اور خوب ہوئی، ان صحبتوں میں بھی اپنے عمل کے اصلی مقصد کو کبھی کبھی ظاہر فرمادیتے۔ یاد پڑتا ہے کہ ان ہی دنوں میں حضرت نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ان کے بڑے بھائی احمد سجاد صاحب جن کا شمار سلسلہ فقراء کے طائفۂ مجاذیب و بہالیل میں کیا جاتا ہے، ان کا قول نقل کرتے تھے کہ ان کو موجودہ مشاغل سے الگ ہو جانے کی تاکید فرماتے ہیں، شاید یہ اسی اضطراری علاحدگی کی طرف اشارہ تھا، ان ہی دنوں میں خانگی معاملات میں مولانا کی سوجھ بوجھ کا اندازہ ہوا، دنیا کو بھی خوب سمجھتے تھے، اس کے باوجود خود اس دنیا سے الگ رہنا اور اپنی سوجھ بوجھ سے محض دوسروں کو فائدہ پہنچانا مولانا کا واقعی کمال تھا ورنہ متروک الدنیا لوگوں کا تارک الدنیا بن جانا عموماً بے چارگی کی عصمت سے زیادہ قیمت نہیں رکھتا۔

میں حیدرآباد آچکا تھا، مشہور مصنف پروفیسر الیاس برنی کی

صاحبزادی کی شادی کی تقریب تھی، اس مجلس سے باہر نکل رہا تھا کہ اچانک ایک ملنے والے نے خبر سنائی۔

"بہار کے مولانا سجاد کا انتقال ہو گیا"

جوتے پہن رہا تھا، ہاتھ کانپنے لگے، پاؤں میں لغزش تھی، دُہرا کے پوچھا کیا کہتے ہو، پھر توثیق کی۔ تقریباً نصف کرور مسلمانان بہار کی یتیمی کا نقشہ آنکھوں میں گھومنے لگا، بار بار زبان پر عربی کا یہ مشہور شعر جاری تھا

وما كان قيس هلكه هلك واحد
ولكنه بنيان قوم تهدما

عجیب حال میں گھر آیا، چند مصرعے بے ساختہ دماغ میں چکر کھانے لگے، روتا جاتا اور لکھتا جاتا تھا۔ اسی زمانہ میں مولانا عبد الصمد رحمانی کو یہ اشعار لکھ کر بھیج دیئے گئے تھے، سنا کہ نقیب میں شائع ہوئے تھے، اب بھی آرزو ہے کہ بیان کا خاتمہ ان ہی اشعار پر ہو۔[24] جانے والے سے آخر میں مسنونہ فقرہ کہتا ہوا رخصت ہوتا ہوں

---

[24] نقیب سے یہ اشعار حیات سجاد میں نقل ہوئے، اب یہاں بھی پیش کئے جاتے ہیں:

قصہ ہی ختم ہو گیا دوستو سب بہار کا   بجھ گیا جو تھا دیا ایک اپنے مزار کا
روکے، جاکے اب کہاں، حال کسے بتایئے   سینۂ دل فگار کا، دیدۂ اشک بار کا
آج نہیں بہار میں ماتم نائب امیر   ماتم سخت بلکہ ہے ملت سوگوار کا
کس کی رہے گی اب نگاہ دشمنوں کی چال پر   کون بنے گا اب سپر مسلم فتنہ زار کا
کفر کی چیرہ دستیاں ہوں گی جو بیکسوں پہ اب   دے گا جواب کون ہائے ان کی ہر اک پکار کا
کس کہیں کہ کیا ہوا، آہ وہ ہم سے چھن گیا   تھا نہ جواب ہند میں جس کے سیاسی وار کا

اتاکم ما توعدون غدا مرحلون وانا ان شاء الله بکم لاحقون یغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین

(جس کا وعدہ تم سے کیا گیا وہ آ گیا، کل کا دن اٹھنے کے لئے مقرر رہے، ہم بھی تم سے آ کر ملنے والے ہیں، اللہ ہمارے تمہارے گناہ کو معاف فرمائے اور سب مسلمانوں کے)۔[25]

تھا نہ جو اب ہند میں جس کے سیاسی وار کا — دین کے احترام کا، علم کے بھی وقار کا

روزوں سے ہوں جو دور جو ہوں نمازوں سے نفور — آئے انہیں خیال کیوں دین کے ہر شعار کا

کس کے یہ بس کی بات، ہوتا ہے کیسے اب رفو — سینۂ چاک چاک کا، دامن تار تار کا

تھا علما کی جو چٹان گرچہ وہ اب اکھڑ گیا — پھر بھی مگر بھروسہ ہے خالق کردگار کا

[25] حیات سجاد ص ۴۹

حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ

تجربات و مشاہدات کی روشنی میں

حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ[26]

[26] مولانا حفظ الرحمن صاحب ۱۹۰۰ء میں سیوہارہ ضلع بجنور کے ایک تعلیم یافتہ معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ فیض عام سیوہارہ میں حاصل کی اور دورۂ حدیث کے لئے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے۔ ۱۹۲۲ء میں سندِ فراغت حاصل کی پھر دار العلوم دیوبند، ڈابھیل اور کلکتہ وغیرہ کے مدرسوں میں تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ نوعمری ہی سے آپ کے اندر خدمت خلق کا جذبہ موجزن تھا، چنانچہ جلد ہی سیاست کی خار دار وادی میں کود پڑے۔ ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی کی نمک سازی کی تحریک میں عملی طور پر حصہ لیا، جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس امروہہ میں جنگ آزادی میں کانگریس کے ساتھ اشتراک کا ریزولیشن پیش کیا جس کو منظور کیا گیا۔ آپ تا عمر بیک وقت جمعیۃ علماء ہند کے ایک سرگرم کارکن اور کانگریس کے ممبر رہے۔ بارہا جیل گئے مگر اپنی مذہبی شناخت کو ہمیشہ برقرار رکھا، مدتوں دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے اہم ترین رکن رہے۔ تقریر و خطابت کا خداداد ملکہ تھا۔ نیز تصنیف و تالیف کے بھی عظیم شہ سوار تھے۔ ۱۹۳۸ء میں "ندوۃ المصنفین" کی بنیاد ڈالی، بلاغ مبین، اسلام کا اقتصادی نظام، فلسفۂ اخلاق اور قصص القرآن (چار جلد) ان کی بلند پایہ علمی کتابیں ہیں۔ کانگریس کے ٹکٹ پر جنوری ۱۹۵۲ء میں حلقہ بلاری ضلع مراد آباد سے اور ۱۹۵۷ء اور ۱۹۶۲ء میں امروہہ سے پارلیمنٹ کا الیکشن لڑے اور بھاری ووٹوں سے کامیاب ہوئے۔ ۲/ اگست ۱۹۶۲ء کو دہلی میں انتقال ہوا، اور قبرستان مہدیان میں تدفین عمل میں آئی۔ حالات کے لئے دیکھئے مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی ایک سیاسی مطالعہ از ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری، و نیز دیگر کتب

پہلی ملاقات:

حضرت مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت بہار سے میر التعارف جمعیۃ علمائے ہند کے واسطہ سے ہوا، میں نے ان کو دہلی میں سب سے پہلے جمعیۃ علمائے کی ایک مجلس مشاورت میں دیکھا، اپنے قریب بیٹھنے والوں سے دریافت کیا تو انہوں نے مولانا مرحوم کا تعارف کرایا، اور نہ صرف یہ بلکہ میرے اور مولانا کے درمیان تعارف باہمی کا رشتہ بن گئے، اس وقت سے اور تا دم وفات حضرت مولانا سے انتہائی ربط وضبط قائم رہا اور ان کو بہت قریب سے دیکھنے کے ہزاروں مواقع ملتے رہے، مولانا محمد سجاد بہت کم گو تھے، مگر جس قدر بولتے تھے ان کی گفتگو پر مغز ہوتی تھی، گفتگو میں فطری حصر تھا اس لئے بات کرنے میں لکنت بھی کرتے تھے، اور مخصوص کلام "نہیں نہیں" کو درمیان گفتگو میں لاکر حصر اور عجز لسانی کو توڑ دیا کرتے تھے۔ مگر جب کسی مسئلہ میں جوش آجاتا تھا تو تعجب اور حیرت میں دیکھا کرتا تھا کہ وہی شخص مسلسل اور بے تکان بولتا نظر آتا تھا۔

ان کے تکیۂ کلام پر مولانا احمد سعید صاحب اکثر یہ کہہ دیا کرتے کہ مولانا سجاد پر گورنمنٹ کبھی مقدمہ چلا ہی نہیں سکتی، اس لئے کہ جب کوئی جملہ فرماتے ہیں تو ساتھ میں فرمادیا کرتے ہیں "نہیں نہیں" اب بتائیے کہ اگر یہ حکومت برطانیہ کے مظالم بیان فرمائیں اور پھر نہیں نہیں بھی کہتے جائیں تو حکومت بدبخت کیسے ان پر مقدمہ چلائے، مولانا مرحوم اس لطیفہ کو سنتے تو سنجیدہ ہنسی کے ساتھ ہنس دیتے، اور اس لطیفہ سے بہت محظوظ ہوتے تھے۔

علمی تبحر:

جمعیۃ علماء میں جب کبھی علمی مسائل پر بحث ہوتی تو مولانا سجاد صاحب کا اصل جوہر اس وقت کھلتا تھا، ہماری جماعت میں مشہور ہے کہ زبردست دلائل کے ساتھ کسی بات کو مدلل کر کے بیان کرنا حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کا خاص حصہ ہے، اور یوں بھی مفتی صاحب کو فقہ اسلامی میں بہت بڑا کمال حاصل ہے، لیکن جماعت کے ذمہ دار ارکان میں میں نے بارہا یہ منظر دیکھا ہے کہ جب کسی مسئلہ پر حضرت مولانا محمد سجاد صاحب دلائل وبراہین فقہی کے ساتھ بحث فرماتے ہیں تو حضرت مفتی صاحب بھی بے حد متاثر ہوتے اور ان کے علمی تبحر کا اعتراف کرتے ہوئے بے ساختہ ان کی زبان سے کلمات تحسین نکل جاتے، حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ مولانا سجاد "فقیہ النفس" عالم ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے مسائل کی روح سمجھنے کا ان کو فطری ملکہ عطا فرمایا ہے۔

حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ جو اس زمانہ میں علم حدیث کے مجدد گذرے ہیں کا یہ فرمانا میرے نزدیک مولانا سجاد صاحب کے تبحر علمی کے لئے ایک بہترین سند ہے۔ بعینہ یہی بات میں نے حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کی زبانی بھی سنی ہے۔

تحریک خلافت:

"فقہ" کے علاوہ بھی مولانائے مرحوم علوم عقلیہ ونقلیہ کے بہت بڑے عالم تھے اور تعلیم کے بعد عرصہ تک مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں درس وتدریس کا مشغلہ جاری رکھا۔ تحریک خلافت نے ان کے حساس دل کو بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا، اور مذہبی تعلیم کے ساتھ مسلمانوں کی سیاسی اور اجتماعی تحریک

میں بھی اپنے کمالات اور جوہر استعداد کو خدمت اسلامی کے لئے نمایاں کیا، اور
اس وقت سے سلسلۂ درس و تدریس ختم کرکے اسی خدمت میں آخر عمر تک
مصروف رہے، اور دن رات انتھک کام کرتے رہے۔

امارت شرعیہ:

ہندوستان کے علماء اور غیر علماء تمام مسلمانوں میں یہ شرف صرف
مولانا محمد سجاد صاحب کو حاصل ہے کہ انہوں نے یہ احساس کرتے ہوئے کہ
اس غیر اسلامی ملک میں مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسلامی
ماحول اور اسلامی تاثرات پیدا کرنے کے لئے امارت شرعیہ کے قیام کے بغیر
چارۂ کار نہیں، بہار کے صوبہ میں اس کی داغ بیل ڈال دی، اور امارت شرعیہ
صوبہ بہار کے لئے حضرت مولانا شاہ بدر الدین پھلواروی قدس سرہ العزیز کے
ہاتھ پر بیعت کی، اور اگرچہ وہاں کے بعض صوفیہ، بعض علماء اور انگریزی داں
طبقہ نے اپنے ذاتی مصالح کی بناپر اس کی کافی مخالفت کی، مگر مولانا کی سعی مشکور
ثابت ہوئی اور اسلامی نظم و تنظیم کے لئے بہار میں بہرحال ایک نمونہ قائم
ہوگیا، اور تبلیغ اسلام، اصلاح رسوم، تنظیم زکاۃ، اہل مصرف میں اس کی صحیح
تقسیم، مقدمات کے شرعی اصول پر طے کرنے کا سسٹم اور اس سلسلہ کے
دوسرے اہم شعبہ جات اس مقدس ادارہ کا مقصد قرار پایا، اور چونکہ مولانائے
موصوف نائب امیر شریعت منتخب ہوئے اس لئے اس ادارہ کی نگرانی اور اس
کے استحکام کی ذمہ داری تمام تر مولانائے موصوف ہی کے کاندھوں پر رہی، اور
صوبہ کے ان مسلمانوں نے جو پلیٹ فارم پر "اسلامی تحریک"، "اسلامی
حکومت" کا نام رٹتے رہتے ہیں اگرچہ پیہم اور مسلسل مخالفتوں سے اس کو بڑی

حد تک نقصان پہنچایا، اور اس مقدس تحریک میں مناع الخیر بنے رہے، اور اس
لئے یہ اسلامی ادارہ خاطر خواہ ترقی پذیر نہیں ہے تاہم اسلام اور مسلمانوں کی
اجتماعی خدمت انجام دینے کے لئے آج بھی زندہ ہے۔

سیاسی بصیرت:

حضرت مولانا کو جس طرح علوم عقلی و نقلی میں کمال حاصل تھا اسی
طرح بلکہ اس سے زیادہ سیاسی، اجتماعی مسائل میں بھی ان کو ید طولیٰ حاصل
تھا، ہندو مسلم یونیٹی کانفرنس لکھنؤ، الٰہ آباد میں انہوں نے جس بصیرت سیاسی کا
ثبوت دیا ہے اس کا اعتراف شرکائے کانفرنس ہندو مسلم دونوں نے کیا، اور بعض
سیاسی مبصرین نے خود مجھ سے یہ کہا کہ یہ شخص جب بات کرنا شروع کرتا ہے تو
لکنت اور عجز گفتگو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ خواہ مخواہ ایسے اہم مسائل میں
کیوں دخل دیتا ہے، لیکن جب بات پوری کرلیتا ہے تو یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ
اس شخص کا دماغ معاملات کی گہرائی تک بہت جلد پہنچ جاتا ہے، اور تہ کی بات
نکال لے کر آتا ہے۔

مراد آباد میں جب سالانہ جمعیۃ علمائے ہند کا سالانہ اجلاس ہوا اور مولانا
نے بحیثیت صدر خطبۂ صدارت سنایا تو زمیندار، انقلاب اور دوسرے اسلامی
اخبارات نے خطبۂ صدارت پر ریویو کرتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ مولانا سجاد کی
صورت اور گفتگو سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ایسا شخص بھی اسلامی سیاسیات
بلکہ سیاسیات حاضرہ کا اس قدر مبصر اور عمیق النظر ہو سکتا ہے۔ اور واقعہ بھی یہ
ہے کہ مولانا کا یہ خطبۂ صدارت سیاسیات اسلامی کی بہترین انسائیکلوپیڈیا
ہے، مولانا محمد سجاد جمعیۃ علمائے ہند کی نشأۃ کے ابتدائی دور ہی سے ذمہ دار رکن

رہے اور اپنی فطری صلاحیتوں کے ذریعہ جمعیۃ علمائے ہند کے عملی نظام کی ترقی
دینے میں برابر ساعی رہے، اور ان کے قلم اور ان کے عمل دونوں نے جمعیۃ علماء
کے مقاصد کو چار چاند لگائے، اور اس کے اسلامی نظریوں کو بروئے کار لانے میں
بہت زیادہ خدمات انجام دیں، یہ ان ہی کی خصوصیت تھی کہ خاموش زندگی
رکھنے کے باوجود دن اور رات اکثر حصوں میں مسلمانوں کی مذہبی وسیاسی اجتماعی
برتری کے لئے سوچتے رہتے، اور یا پھر قلم کو حرکت دے کر اپنے صحیح افکار سے
انقلاب پیدا کرنے کی سعی فرماتے یا عملی جد وجہد سے اس مقصد کو منصۂ شہود پر
لانے کی کوشش کرتے، گویا یہ ان کی زندگی کا معمول بن گیا تھا۔

جنگ آزادی

جمعیۃ علمائے ہند نے اس اکیس سالہ سیاسی دور میں ہندوستان کے اندر
اسلام کی سربلندی اور ملک ووطن کی آزادی کے لئے برٹش حکومت کے مقابلہ
میں جب بھی "دائرہ حربیہ" قائم کر کے سول نافرمانی کا آغاز کیا تو ہمیشہ مولانائے
موصوف ہی اس ادارہ کے امیر یا انچارج مقرر ہوئے اور مولانا نے اس بے سرو
سامان مجلس کے جھنڈے کے نیچے ہندوستان کے مختلف صوبوں کے ہزاروں
مسلمانوں کی بہترین قیادت انجام دی اور "دائرہ حربیہ" کے کام کو اس خوبی سے
انجام دیا کہ اس سے بہتر اس اہم اور مشکل مہم کو انجام دینا دوسروں کے لئے
بہت مشکل تھا۔

مولانا یوں تو عام سیاسی افکار و آراء میں بھی اگرچہ کافی بصیرت رکھتے
تھے مگر آئین کانسٹی ٹیوشن کی ترتیب میں مولانا کا دماغ بہت رسا تھا اور وہ اس
سلسلہ میں بہت عمیق حقیقتوں پر بہت جلد پہنچ جایا کرتے تھے۔ چنانچہ جس زمانہ

میں کانگریس نے اپنا فارمولا پیش کر کے یہ اعلان کیا تھا کہ اس کے علاوہ دوسری
جماعتیں اگر اس سے بہتر نعم البدل پیش کر سکتی ہیں تو وہ مرتب کر کے ہمارے
پاس بھیج دیں تاکہ غور وخوض کے وقت وہ بھی زیر بحث آئے تو اس سلسلہ میں
جمعیۃ علماء نے جو بہترین فارمولا تیار کر کے شائع کیا ہے اس کی ترتیب میں بھی
مولانائے موصوف کی دماغی کاوش کو بہت بڑا دخل ہے۔

آخر میں سال گذشتہ جونپور کے سالانہ اجلاس کے بعد جمعیۃ علمائے ہند
کے جدید دستور العمل کے پیش نظر جب حضرت مولانا کا انتخاب ناظم اعلی کے
عہدہ کے لئے کیا گیا تو اگرچہ مولانائے موصوف نے امارت شرعیہ بہار اور جمعیۃ
علمائے بہار کے مشاغل و مصروفیتوں کی وجہ سے اس کو قبول کرنے میں بہت
زیادہ پس و پیش کیا، مگر ورکنگ کمیٹی کے اصرار پر جب قبول فرمالیا تو اس وقت
سے اور وفات کے وقت تک زندگی کے اس تھوڑے وقفہ میں اندرونی اور
بیرونی نشر واشاعت کے علاوہ جمعیۃ علماء کی یہ نمایاں خدمت انجام دی کہ جمعیۃ
علماء کی بیس سال تبلیغی، دینی، سیاسی، اجتماعی خدمات اور عملی جد وجہد کا ایک
مرقع تالیف فرمایا جو "تذکرہ جمعیۃ علمائے ہند" کے نام سے معنون کیا گیا، اور یہ
عجیب بات پیش آئی کہ باوجود اس امر کے کہ اس "تذکرہ" میں جمعیۃ علماء ہند کی
گذشتہ خدمات کی فہرست مرتب کرنے اور مسلمانان ہند کے سامنے ان خدمات
کی تفصیل کو یکجا کر کے ان کی توجہ کو جمعیۃ علمائے ہند کی طرف زیادہ متوجہ کرنے
کے سوا اور کچھ نہ تھا مگر حکومت دہلی اس کو بھی برداشت نہ کر سکی، فوراً اس کو
ضبط کر لیا، اور دفتر کی تلاشی لے کر اس کی تمام کاپیاں حاصل کر لیں اور ساتھ
ہی حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب صدر جمعیۃ علمائے ہند کا وہ معرکۃ الآراء

خطبۂ صدارت ضبط کر لیا جو جون پور کے اجلاس کی بہترین یادگار ہے۔ میں بلا شائبۂ مبالغہ نہ صرف اپنی بلکہ اپنے تمام رفقاء کار کی متفقہ رائے کے مطابق یہ کہہ سکتا ہوں کہ حضرت مولانا محمد سجاد صاحب کی شخصیت جمعیۃ علمائے ہند کے مقاصد کی تکمیل میں زبردست معین و مددگار رہی اور ان کی وفات سے جمعیۃ علمائے ہند کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔

صوبہ بہار میں آئینی حکومت

۱۹۳۶ء میں جب حکومت برطانیہ کی جانب سے ہندوستان کی تمام پارٹیوں کی مرضی کے خلاف ناقص اور بدترین آئین ہندوستان کے سر تھوپا گیا تو اس سلسلہ میں سیاسی جماعتوں نے الیکشن لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ بہار میں بھی مختلف پارٹیوں نے اس کے لئے ہاتھ پاؤں چلائے اور جدوجہد کی۔ کانگریس کے علاوہ مسلمانوں میں ان حضرات کی جانب سے جو " ہمیشہ سیاست کو اپنا پیدائشی حق سمجھتے اور مولوی اور عالم کے لئے شجر ممنوعہ قرار دیتے ہیں" دو پارٹیاں سامنے آئیں، ایک مولوی شفیع داؤدی صاحب کی پارٹی جس نے اپنا نام احرار پارٹی رکھا اور دوسری سید عبد العزیز صاحب کی پارٹی، جو بہار کے وزیر تعلیم رہ چکے تھے اور اب حکومت حیدرآباد میں معزز عہدہ پر فائز ہیں۔

ان سیاسی اجارہ داروں کے مقابلہ میں اس غریب " ملا" نے بھی اپنی پارٹی کی ترتیب دی جس کا بنیادی لائحۂ عمل یہ قرار دیا کہ وہ تمام مذہبی و سیاسی امور میں امارت شرعیہ کی قیادت کو تسلیم کرتی ہے اور اس پارٹی کا نام انڈی پینڈنٹ پارٹی رکھا گیا۔ مولانا محمد سجاد صاحب کے خلوص، دیانت، اسلامی خدمات کا اس صوبہ کے مسلمانوں پر کتنا اثر تھا یہ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ

اجارہ داروں کی ہر قسم کی دراندازیوں کے باوجود کانگریس کے بعد انڈی پنڈنٹ پارٹی اسمبلی کی دوسری طاقت قرار پائی اور احرار پارٹی تو دفن ہی ہو کر رہ گئی اور میاں سید عبد العزیز صاحب کی پارٹی کو بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

طرفہ ماجرا یہ ہوا کہ انتخابات میں کامیاب ہونے کے بعد جب کہ کانگریس اور حکومت کے درمیان وزارت کے قبول وعدم قبول کے بارے میں رسہ کشی ہو رہی تھی تو مولانا سجاد صاحب نے اپنی پارٹی کی میٹنگ طلب فرمائی ،اس پارٹی کا پارلیمنٹری بورڈ جن ارکان پر مشتمل تھا اس کی صدارت مولانائے مرحوم کے سپرد تھی اور لیڈر پارٹی مسٹر یونس تھے، پارٹی نے بحث ومباحثہ کے بعد یہ طے کیا کہ بہار میں چونکہ حکومت کے پچھلے ریکارڈ میں بعض ایسے امور موجود ہیں جو مسلمانوں کے لئے بحیثیت ایک قوم کے عرصہ سے نقصان دہ ہیں اس لئے عارضی وزارت کو قبول کر لینا مناسب ہے، لہذا یونس صاحب نے وزارت ترتیب دے کر قلمدان وزارت سنبھال لیا اور اس طرح بہار کی حکومت اگرچہ یونس صاحب کی وزارت کے ہاتھ میں تھی مگر در اصل پارٹی کے پارلیمنٹری بورڈ کے صدر حضرت مولانا محمد سجاد صاحب اس حکومت کے روح رواں تھے، ظاہر میں تو یہ ایک معمولی واقعہ تھا جو ہو گذرا، لیکن کیا یہ کم حیرت و تعجب کی بات ہے کہ جن صوبائی وزارتوں کا یہ حال رہا ہے اور آج بھی یہ حال ہے کہ مسلم لیگ کے اس زور وشور اور مسٹر جناح کی قیادت کے اس ہنگامہ کے دور میں بقول مسلم لیگ جمہور مسلمان لیگ کے ساتھ ہیں، آج تک ایک صوبہ میں بھی مسٹر جناح اور ان کی مسلم لیگ کو خالص لیگی وزارت حاصل نہ ہو سکی اور کسی صوبائی لیجسلیٹو پر بھی ان کو کامل اقتدار نہیں ہے، ایک صوبہ میں ایک

بوریہ نشین کی معمولی جد و جہد سے اس کی پارٹی کو اگرچہ عارضی سہی مگر وہ اقتدار حاصل ہو گیا جس کے ذریعہ ان سے بہار میں ہندی رسم الخط کے سرکاری رسم الخط ہونے کے ساتھ ساتھ اردو رسم الخط کو بھی سرکاری حیثیت دے دی، اور بعد میں کانگریس گورنمنٹ کو بھی اس حیثیت کو برقرار رکھنا پڑا، اور اس کو مضبوط بنا دیا۔ اسی طرح بعض ایسے مسائل بھی طے کئے جو مسلمانوں کے جائز حق تھے اور برٹش گورنمنٹ کے عمال بہار نے ان کو کبھی منظور نہیں کیا تھا۔

شرکت کانگریس:

یہ واقعہ ہے کہ حضرت مولانا محمد سجاد صاحب بھی ان بزرگوں میں سے ایک بزرگ ہیں جو اپنی سیاسی بصیرت کے ساتھ تحریک آزادی میں کانگریس کے ساتھ اشتراک کو مسلمانوں کے لئے مفید سمجھتے تھے، اس لئے ان کا نظریہ یہ تھا کہ نظام اسلام کے لئے ہندوستان میں باسباب ظاہری اس وقت تک کوئی صورت نہیں بنتی جب تک ہندوستان کی قومیں مل کر برٹش حکومت کے جوئے کو اپنے کاندھوں سے اتار کر نہ پھینک دیں اور یہ تشریح فرماتے تھے کہ جمعیۃ علمائے ہند کے اس اصول کا پابند ہو کر جائیے کہ ہماری سیاست ہمارے مذہب کے تابع ہے۔

چنانچہ مولانا محمد سجاد صاحب مرحوم کی عملی زندگی جمعیۃ علمائے ہند کے اس نظریہ کے ماتحت ہمیشہ نمایاں رہی اور انہوں نے جس طرح ملک اور وطن کی آزادی کے تمام مسائل میں خصوصاً جنگ آزادی میں کانگریس کا ساتھ دیا اسی طرح جب اور جس موقع پر بھی کانگریسی حکومتوں نے کوئی ایسی ٹھوکر کھائی جس سے مسلمانوں کے کاز کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو فوراً مولانا نائے مرحوم

نے ڈٹ کر اس کا مقابلہ کیا اور بالآخر کانگریس حکومت کو اپنے مطالبۂ حق کے سامنے جھکا لیا، بہار کانگریس گورنمنٹ کے زمانہ میں ٹینسی ایکٹ (زمینداری قانون) کے ماتحت جائدادوں پر ٹیکس کا جب مسئلہ پیش ہوا تو مولانا نے اپنی پارٹی کے ارکان سے یہ ترمیم پیش کرائی کہ اوقاف اسلامی کو اس ٹیکس سے مستثنیٰ رکھا جائے مگر اس اسلامی نقطہ کو کانگریس منسٹری میں کوئی نہ سمجھ سکا اور بالآخر حضرت مولانا ابوالکلام آزاد تشریف لائے اور انہوں نے بحث و تمحیص کے بعد کانگریس حکومت کو یہ حکم دے دیا کہ وہ اس مطالبہ کو تسلیم کرلے کیونکہ بلاشبہ یہ مسلمانوں کا مذہبی مطالبہ ہے۔ اسی طرح قربانی گاؤ کے معاملہ میں بھی انہوں نے بہار کانگریس حکومت سے اسلامی مطالبات منوانے میں اپنی فطری جرأت کا ثبوت دیا۔

یوپی کانگریس حکومت کے زمانہ میں جب شیعہ سنی قضیہ چل رہا تھا اور جس کی بنیاد دراصل برٹش حکومت کے عمال نے رکھی تھی یعنی السپ کمیٹی کی رپورٹ میں جو فیصلہ کیا گیا تھا، اس نے سنیوں کے جائز اور واجبی حق پر ظلم کی چھری چلادی تھی اور جب چھتاری وزارت عارضی وزارت کی شکل میں مرتب ہوئی تو اس نے بھی السپ کمیٹی کی رپورٹ کے ان الفاظ کو " جو تبرا اور مدح صحابہ دونوں کو ایک حیثیت میں رکھتے تھے " بدل کر جرأت حق کا ثبوت نہ دیا کہ تبرا کو بداخلاقی اور جرم قرار دے کر مدح صحابہ کے جائز حق کو تسلیم کیا اور رپورٹ کے ان جملوں کو مسترد کر دیا تھا جو قطعاً ناواجب اور صریح ظلم تھے۔ اور اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ یہ جو کچھ ہوا حضرت مولانا آزاد کے تدبر اور احقاق

حق کی بدولت ہوا، لیکن اس کے باوجود اس نے بھی سنیوں کا یہ حق عملی شکل میں لانے کی کوئی سہولت بہم نہیں پہنچائی۔

چنانچہ اس سلسلہ میں لکھنؤ میں سنیوں کی مختلف جماعتوں کی جانب سے اضطراب وبے چینی شروع ہوئی اور آخر کاران تمام امور سے متاثر ہو کر جو اس معاملہ میں تیس بتیس سال سے ہو رہے تھے حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب صدر جمعیۃ علمائے ہند نے جن کے علمی تبحر، دیانت، تقویٰ، صداقت وخلوص کا دوست و دشمن دونوں کو اعتراف ہے، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر ہونے کے باوجود جب یوپی کانگریس نے گورنمنٹ کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور سول نافرمانی کا ارداہ کیا تو اس وقت بھی مولانا سجاد صاحب ہی ان کے دست وبازو اور مشیر کار تھے۔

سادگی اور ایثار نفس

ان تمام خوبیوں کے باجود جو ابو المحاسن کے "محاسن" کا لب لباب ہیں اس بزرگ ہستی کی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ ایک نہایت سادہ اور منکسر المزاج انسان تھے۔ قناعت کا یہ عالم تھا کہ کھانے پینے اور پہننے، غرض معاشرتی زندگی میں پندرہ بیس روپیہ ماہانہ کی حیثیت کے انسان سے زیادہ گذران نہ رکھتے تھے، اخلاق کا پیکر تھے، انکسار فطرت بن گیا تھا مگر جرأت حق اور اعلاء کلمۃ اللہ کے بارے میں ایک بپھرے ہوئے شیر اور مرد مجاہد تھے، اصابت رائے اور فکر بلند کے حامل اور علم وعمل کی چلتی پھرتی مشین تھے۔

وفات حسرت آیات

جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ جمعیۃ علمائے ہند کی نظامت اعلی کو سنبھالے ہوئے ابھی چند ہی مہینے ہوئے تھے اور جمعیۃ علماء کے نظام کی تنظیم میں اپنے عہدہ کے پیش نظر ابھی تھوڑا ہی قدم بڑھایا تھا کہ پیغام اجل آپہنچا اور اس مرد حق نے اپنے رفقاء کار کو ماہی بے آب کی طرح تڑپتا ہوا چھوڑ دیا۔ میں ایک صبح کو راولپنڈی جیل میں بیٹھا ہوا اخبار پڑھ رہا تھا کہ انقلاب اور ملاپ میں جمعیۃ علمائے ہند کا یک برقیہ نظر سے گذرا جس میں یہ حسرت زدہ الفاظ درج تھے "کل پھلواری شریف (پٹنہ) میں حضرت مولانا ابو المحاسن سید محمد سجاد صاحب ناظم اعلی جمعیۃ علمائے ہند کا چند روز علیل رہ کر انتقال ہو گیا" ۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون کہتا ہوا دل پکڑ بیٹھ گیا، اور پھر دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے اپنے اکابر واحباب کے نام خدا جانے مرثیہ خوانی میں کیا کچھ لکھا گیا اور اس طرح دل کے بوجھ کو ہلکا کیا۔ اب تو اس دعا پر اس نامکمل مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

اللہ تعالی حضرت مرحوم کو فردوس عطا فرمائے اور اپنی تجلیات ورحمت بیکراں کی آغوش سے ان کو نوازے۔ آمین۔[۲۷]

---

[۲۷] حیات سجاد، ص ۱۴۷

مولانا ابو المحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ
کی تعلیمی وسیاسی زندگی پر ایک نظر

حضرت مولانا محمد اصغر حسین بہاریؒ[28]

---

[28] محاسن سجاد میں ان کے نام کے ساتھ "نائب پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ" لکھا گیا ہے۔ مولانا کا شمار بہار کے ممتاز علماء میں ہوتا ہے، بہار شریف کا محلہ بنولیہ ان کا آبائی وطن تھا، وہیں ۱۸۸۴ مطابق ۱۹۰۲ء میں ان کی پیدائش ہوئی، مکتبی تعلیم کے بعد مولانا رفیع الدین صاحب محدث شکرانوی رئیس شکرانواں ضلع نالندہ سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، پھر مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں میر زاہد تک کی تعلیم حاصل کی اس کے بعد مدرسہ سبحانیہ الہ آباد اور مدرسہ احیاء العلوم الہ آباد میں قدوری تک تعلیم حاصل کی، پھر دار لعلوم دیوبند جاکر تکمیل کی ،۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء میں فراغت کے بعد کچھ دنوں ملا چک بھاگلپور میں مدرس رہے اس کے بعد پھر مدرسہ شمس الہدیٰ میں تدریسی خدمت میں زندگی گذاری، اس سے قبل کچھ دن مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں بھی تدریسی خدمت انجام دی، اپریل ۱۹۴۱ سے ۱۹۴۸ تک مدرسہ شمس الہدی میں پرنسپل کے عہدہ پر فائز رہے، عربی میں قابل ذکر علمی کام ترمذی کو سولات کی شکل میں ترتیب تھی، جس سے طلبائے مدارس کو امتحانات اور مطالعہ میں سہولت ہوئی اس لئے یہ کتاب مدارس میں مقبول ہوئی، نیز علامہ رشید رضا مصری کی تفسیر المنار کا بھی ترجمہ شروع کیا تھا، مقدمہ اور ابتدائی مباحث ایک جلد میں شائع ہوئے، ارمغان حرمین کے نام سے حرم شریف کا سفر نامہ بھی لکھا تھا جو شائع ہو چکا ہے، ریٹائرڈ ہونے کے بعد اپنے وطن بہار شریف میں مقیم ہو کر دعوت و تبلیغ کے کاموں میں مشغول رہے، اور ایک سال کے بعد ۶ ذی الحجہ ۱۳۷۶ مطابق اکتوبر ۱۹۴۹ میں وہیں وفات پائی، ان کی سوانح حیات کے کچھ جزوی اشارے خود اس مضمون میں موجود ہیں، بقیہ معلومات مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی کے مقالہ شائع شدہ

دائرہ شاہ اجمل الہ آباد میں مولوی عبد الحمید جونپوری[29] کی کوٹھی ہے جس کے ایک گوشہ میں چھپر کا ایک سائبان ہے اس میں چند طلبہ کے ساتھ حضرت مولانا مولوی ابو المحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ قیام پذیر ہیں، اور درس نظامی کی انتہائی کتابوں کی تحصیل میں حضرت مولانا حافظ عبد الکافی قدس سرہ اور مولوی عبد الحمید جونپوری مرحوم کو دلیل راہ بنائے ہوئے ہیں، حضرت مولانا ابو المحاسنؒ کے ساتھ دو تین بزرگ اور بھی شریک درس ہیں۔ لیکن مولانا کی شان نرالی ہے، بستر کے سرہانے کروٹ میں کتابیں قطار در قطار رکھی ہیں جن کے مطالعہ میں انہماک ہے، یا بعض طلبہ کے درس دینے سے سروکار ہے۔

حافظ عبد الکافی قدس سرہ نے چوک الہ آباد کی مسجد کے احاطہ میں مدرسہ سبحانیہ قائم کر رکھا ہے، جس میں عموماً طلبہ پڑھتے ہیں لیکن حضرت سجادؒ کے سامنے زانوئے تلمذتہ کرنے کے شوق میں کم از کم ایک سبق بھی ضرور رکھنا چاہتے ہیں، اور جنہیں موقع ملا پڑھ رہے ہیں، اس کشش سے ظاہر ہے کہ طلب علم ہی کے زمانے سے آپ کی تعلیم میں مقناطیسی اثر تھا۔ ادھر اساتذہ کی عنایات وتوجہات سے عیاں ہو رہا تھا کہ ان حضرات کے لئے حضرت سجادؒ کی شاگردی ایک نعمت غیر مترقبہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کی خاص توجہ اور قدر دانی بالکل بجا تھی، گو اس وقت یہ معلوم نہ تھا کہ اس شمع طالب سے علمی نور

معارف نومبر ۱۹۴۹اور مولانا ابو سلمہ شفیع احمد بہاری (جو مولانا موصوف کے شاگرد اور خویش تھے) کے حالات زندگی مرتبہ مولانا رشید احمد فریدی (ساکن بہار شریف مقیم بھروچ، گجرات) مطبوعہ ادارہ ترجمہ و تالیف کلکتہ ۲۰۰۹ سے ماخوذ ہیں۔

[29] افسوس کہ ان کے حالات کا علم نہ ہو سکا

پھیلنے کے علاوہ اس کے ناخنِ فکر و تدبر سے سیاسی و اجتماعی عقدوں کا بھی حل ہونے والا ہے، اور اسلامی ہند کے مفکر اعظم ہونے کی حیثیت سے مذہبی سیاست کی گتھیوں کے ایک ایک تار کو سلجھا کر رکھ دینے والا ہے۔ لیکن ذہانت ،فطانت ، قوت حافظہ ، شوق مطالعہ ،سلامت روی ،سادگی ،محنت ، اور اطاعت شعاری جو صفتیں جاذب توجہ ہو سکتی ہیں ،حضرت سجادؒ میں بدرجہ کمال موجود تھیں، اس لئے ان کی عنایات و توجہات کا منعطف ہونا ناگزیر تھا۔

اس ہنگام طالب علمی کے شاگردوں میں مولانا فرخند علی مرحوم سہسرامی کی ذات بابرکات تھی، جن کے علم و عمل کا فیض مدرسہ خیریہ سہسرام کی شکل میں اب بھی جاری ہے ،اور جو عمر بھر سیاسیات میں اپنے استاذ محترم حضرت مفکر اعظمؒ کے دست و بازو رہے ،اور اسی دور کے تلامذہ میں سے مجی مولانا حافظ عبد الرحمن بادشاہ پوری جونپوری (فی الحال مدرس اول مدرسہ امدادیہ دربھنگہ) اور جناب حکیم مولوی محمد یعقوب صاحب ساکن کڑا (گیا)[30] بھی ہیں۔ میں بھی اسی اثناء میں قطبی وغیرہ پڑھتا ہوا تعلیمی غرض سے الہ آباد پہنچا تھا اور شریک درس ہونے والا تھا، لیکن بعض اسباب کی بنا پر مجھے اپنے وطن بہار شریف واپس ہونا پڑا اور اس وقت حلقہ درس میں شامل نہ ہو سکا۔ غالباً یہ ۱۳۲۰ یا۱۳۱۹ھ کا واقعہ ہے۔

جب حضرت مولاناؒ فارغ ہو کر پنہسہ اپنے دولت خانہ تشریف فرما ہوئے تو مدرسہ اسلامیہ بہار شریف کے ناظم حکیم حافظ وحید الحق مرحوم اور

[30] اب اس گاؤں کو کڑا کے بجائے کارا کہا جاتا ہے ، اورنگ آباد ضلع اور تھانہ اوبرا ہے۔(م)

مدرس اول جناب خان بہادر مولانا مبارک کریم صاحب مدظلہ نے مدرسۂ موصوفہ میں درس دینے کے لئے ان خصوصیات کی بنا پر جو حضرت موصوف کو مدرسہ سے تھیں زور دیا۔

حضرت کی ابتدائی تعلیم اسی مدرسہ میں ہوئی تھی اور حضرت جامع کمالات مولانا سید وحید الحق استھانویؒ بانی مدرسہ اسلامیہ کے خاص رشتہ دار[31] ہونے کے علاوہ چھوٹے داماد بھی تھے، وقت و مقام کے لحاظ سے درس و تدریس کے دلی جذبات کے اظہار کا موقع مدرسہ اسلامیہ سے کوئی بہتر نہ تھا۔ اہل جوار کی علمی خدمت کے ساتھ اپنے مخلص بزرگ کے شجر علم کی آبیاری اور قرب مکان کی وجہ سے خانگی ضروریات کی نگرانی میں آسانی متصور تھی۔ غرض یہ کہ دونوں بزرگوں کی خواہش پر مدرسہ اسلامیہ تشریف لے آئے اور درس جاری فرمادیا۔ مزاج کی نرمی اور عفو و درگذر کی طبیعت اور طلبہ کی ہمدردی کے ساتھ اپنی طباعی اور انہماکی شان سے شب و روز درس و تدریس کی مہم شروع کی تو تھوڑے ہی عرصہ میں مدرسہ کے تعلیمی قالب میں نئی روح پھونک دی۔ ایک مدت سے مدرسہ قائم تھا لیکن شرح وقایہ، جلالین شریف ، قطبی، میر قطبی وغیرہ سے اوپر پڑھنے ولے طلبہ کبھی نہ رہے، جہاں ملا حسن وغیرہ پڑھنے کی نوبت آئی اور یوپی کی راہ لی، مگر حضرت ابو المحاسنؒ کے پُر محبت درس نے ایسی سحر کاری کی کہ اب طلبہ مدرسہ میں جمنے لگے، چنانچہ میں بھی میر زاہد رسالہ اور ترمذی شریف تک پہنچ گیا۔

[31] حضرت مولانا وحید الحق کی اہلیہ مولانا مرحوم کی چچازاد بہن تھیں۔(م)

ہر اسلامی مدرسہ کے دستور کے مطابق اس مدرسہ میں بھی سالانہ تقریری امتحان شہر کے خاص خاص علماء لیتے تھے، لیکن مفکر اعظمؒ نے اس سلسلہ میں عامۂ مسلمین کی توجہ مدرسہ کی طرف منعطف کرانے کے لئے ایک خاص تدبیر کی بنیاد ڈالی، مدرس اول و ناظم مدرسہ کے مشورہ سے سالانہ امتحان کے موقع پر ممتحنین کے علاوہ دیگر حضرات اہل علم و فضل اور عامہ خلائق کو بھی دعوت دینی شروع کی اور امتحانات کے مناظر کا مشاہدہ کرانے کے ساتھ ان کی دلچسپی و کشش کے لئے چائے بسکٹ سے تواضع کرنے کا سلسلہ قائم کیا، جس کی وجہ سے ایک دو روز مدرسہ میں خاصی چہل پہل ہونے لگی۔ ممتحن و طلبہ کے گرد اگر دوسرے حضرات اہل علم امتحان کی کیفیت کا تماشہ کرنے کو بیٹھ جاتے تو اس وقت تعلیمی نمائش کا قابل دید منظر ہوتا تھا۔ مولانا محمد احسن استھانوی[32] غفرلہ تلمیذ مولانا ہدایت اللہ خان صاحب مرحوم جو کسی زمانہ میں مدرسہ اسلامیہ کے مدرس اول بھی رہ چکے تھے امتحان کے لئے تشریف لائے اور میر

[32] استھانواں میں مولانا احسن نام کے دو بزرگ گذرے ہیں، یہ بزرگوں میں تھے جو بہار شریف ہی میں مقیم رہ کر درس و تدریس کے ساتھ علمی خدمت انجام دیتے رہے، ان کے نام کے ساتھ معقولی لکھا جاتا ہے جس سے ان کی اس فن میں مہارت کا اندازہ ہوتا ہے، لیکن مزید حالات اور تاریخ وفات کا علم نہیں، بہار شریف خانقاہ محلہ سے ایک اخبار اشرف نکلا تھا جس کے مدیر کا نام محمد احسن بہاری تھا، ممکن ہے کہ وہ یہی ہوں۔ دوسرے ایک نوجوان فاضل حضرت تھانوی اور مولانا احمد حسن کانپوری کے شاگرد تھے اور علامہ سید سلیمان ندوی کے پھوپھی زاد بھائی تھے، احسن البیان فی خواص القرآن ان کی کتاب ہے، نیز حضرت مونگیری کے جاری کردہ رسالہ تحفۂ محمدیہ کے ایڈیٹر بھی تھے، جوانی ہی میں انتقال ہوگیا۔

زاہد رسالہ مع حاشیہ غلام یحیٰ بہاری کے امتحان کے سلسلہ میں، میں اور مولانا حافظ عبدالرحمن جونپوری[33] پیش کئے گئے تو انہوں نے فرمایا کہ آج ایک عجیب منظر دیکھنے میں آرہا ہے کہ بہار شریف میں ان کتابوں کے پڑھنے والے طلبہ موجود ہیں۔ پھر انہوں نے اپنی منطقیانہ شان سے امتحان لینے کے دوران سوالات شروع کئے اور ہم دونوں جوابات دینے لگے تو اس دن کے اس منظر کی لذت آج بھی اہل علم بزرگوں کے کام و دہن میں باقی ہے، مولانا سید شاہ اسمٰعیل غفرلہ[34] (مدرس فقہ مدرسہ عالیہ کلکتہ) سے جب ملنے کا اتفاق ہوتا تو اس امتحانی مظاہرہ کا تذکرہ مزہ لے لے کر فرمایا کرتے پھر اتنی تعلیمی ترقی ہوئی کہ درس نظامی سے پوری فراغت اس مدرسہ میں ہونے لگی، مگر میں خانگی وجوہ کی بنا پر مولاناؒ سے الگ ہو کر الہ آباد مدرسہ سبحانیہ چلا گیا اور یہاں ایک سال رہ کر مدرسہ احیاء العلوم الہ آباد میں مولانا منیر الدین ناروی الہ آبادی غفرلہ تلمیذ رشید حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ کے حلقۂ درس میں داخل ہوگیا۔ اس عرصہ میں مدرسہ اسلامیہ بہار شریف کے کچھ طلبہ فارغ ہوگئے جن کی دستار بندی کے جلسہ میں شرکت کے لئے دیگر علمائے کرام کے علاوہ استاذ محترم مولانا منیر الدین غفرلہ کو بھی دعوت دی گئی اور حضرت مفکر اعظمؒ کی تجویز و تحریک سے مجھ کو بھی استاذ مکرم مولانا منیر الدین الہ آبادی کے خادم کی حیثیت سے بلا

[33] مولانا عبدالرحمن جونپوری آج کل قدیم طرز کے معقولی علماء میں خاص امتیازی حیثیت کے مالک ہیں۔ (م)

[34] مولانا سید شاہ محمد اسمٰعیل صاحبؒ بہار شریف (پٹنہ) کی ایک ممتاز عالم و دیندار بزرگ تھے چند سال ہوئے کہ وفات پائی۔ (م)

لیا گیا، چنانچہ میں بھی جناب استاذؒ کے ساتھ اس جلسۂ دستار بندی میں شریک ہوا۔ بہار شریف میں مدرسہ قائم ہونے کے مدتوں بعد یہ پہلا زریں موقع تھا جس میں درس نظامی کے فارغین کو سند تکمیل عطا ہوئی اور بیضاوی شریف میں امتحان لئے جانے کے بعد ان کے سروں پر دستار فضیلت باندھا گیا، اس جلسہ میں عمائدین شہر اور عوام بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوئے۔ یہ حضرت سجادؒ ہی کی محنت و کاوش کا نتیجہ تھا جو بہاری طلبہ کے دماغوں سے خواہ مخواہ یوپی جانے کی ہوس دور ہوئی۔ ورنہ بہاریوں میں اب تک بیرون بہار کی بڑی مانگ ہے۔ خصوصاً عربی پڑھنے والے بغیر کانپور، دہلی وغیرہ سے فراغت کئے ہوئے علمائے معتبر کی صف میں جگہ نہیں پاتے، ایسی صورت میں طلبۂ عربی کو فراغت تک پہنچانا یہ حضرت سجادؒ کی کرامت تھی۔

درس و تدریس میں جن امور کی رعایت سے طلبہ کو پوری تشفی ہو سکتی ہے مولاناؒ اس میں کسی طرح کی کمی جائز نہ رکھتے، مطالب کتاب کو خوب کھول کر سامنے رکھنے کی سعی فرماتے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے کس قدر گہرے مطالعہ اور توسیع معلومات کی محنت برداشت کرنے کی ضرورت ہے، پھر ایک بار کی تقریر سے تشفی نہ ہوتی تو دوبارہ سہ بارہ تقریر کرنے میں چیں بہ جبیں نہ ہوتے، اور اگر اوقات مدرسہ میں آسودگی نہ ہوتی تو خارج وقت دینے میں کوئی دریغ نہ فرماتے حتیٰ کہ شروح و حواشی دکھلا کر تشفی کرانے میں بھی بے نفسی کا ثبوت دیتے، پھر طلبہ کے اسباق کا اس قدر احساس تھا کہ شہر کی آب و ہوا کی ردائت کے باعث مدرسہ ہفتہ دو ہفتہ کے لئے بند ہو جاتا تو پندرہ بیس طلبہ کو بنفسہ اپنے مکان لے جاتے اور سب کے ناشتے کھانے کے خود کفیل ہو کر مکان ہی میں پر درس

دینے میں مشغول ہوتے، مجھے بھی ایک مرتبہ ایسا موقع ملا ہے، اس وقت مولاناؒ کے یہاں خوب کاشتکاری ہوتی تھی، کھانے پینے میں بڑی وسعت تھی، خدم و حشم سب ہی کچھ تھے لیکن آپ نے درس و تدریس کے شوق میں اس طرف سے توجہ ہٹالی اور آپ کے بڑے بھائی مولوی احمد سجاد صاحب بھی مجذوبانہ کیفیت سے متکیف ہو کر الگ ہو گئے، نوکروں پر مدار رہ گیا، اس واسطے کاشتکاری کی حالت زبوں ہو گئی۔ بہر حال مولاناؒ کی سعی اور محنت و قربانی کا جو نتیجہ ہونا چاہیے ہو کر رہا، ایک طرف تو طلبہ گرویدہ ہو کر آپ ہی کے ہو رہے اور دوسری طرف خود حضرت مفکر اعظمؒ تحقیقات و معلومات کے بحر زخار ہو گئے۔ جس نے دیکھا ہے کہ حافظ صاحب الہ آبادیؒ کی تعلیم و تدریس محض ایک تبرک کی حیثیت رکھتی تھی تو اس کے لئے مولاناؒ کی اس علمی ترقی میں حیرت کی اور بھی کوئی حد نہیں رہتی، چنانچہ میں نے اپنے اس تحیر کو عرض بھی کیا، فرمایا کہ:

"نہیں وہاں بھی روشنی ملتی ہے، علاوہ اس کے میں ایک گونہ صلاحیت پیدا کر کے پہنچا تھا، مولانا عبد الشکور صاحب مظفرپوری (فی الحال مدرس مدرسہ شمس الہدی پٹنہ) سے سُلم وغیرہ پڑھ کر کتاب فہمی کی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی"۔

حضرت مفکر اعظمؒ کی تہذیب وغیرہ پڑھنے کے زمانے میں کانپور سے دیوبند تشریف لے گئے تھے، لیکن ایک تبتیؔ سے لڑائی ہو جانے کے قصہ میں بہاری طلبہ کو جس کے سرخیل مولانا عبد الشکور صاحب تھے، دیوبند کو خیر باد کہنا پڑا۔ مگر حضرت سجادؒ کو دیوبند کی یاد تازہ رہی، اکثر دیوبند کا ذکر فرمایا کرتے، اسی قلبی تاثرات نے سیاسیات کے سلسلہ میں دیوبندیوں سے ایسا ملایا کہ ایک فرد

متصور کئے جانے لگے اور اکابر علمائے دیوبند نے بھی آپ کے تبحر علمی کے ساتھ
ایثار و قربانی، استقلال و فکری جد وجہد کی قدر دانی کرتے ہوئے اپنی مشن کا وزیر
بنا لیا، بلکہ حقیقت میں جزو کل مان لیا۔ آپ ہی کے بار بار تذکرۂ دیوبند نے
میرے دل میں تحریک پیدا کر دی جو مدرسہ اسلامیہ بہار شریف کے جلسہ دستار
بندی کی شرکت کے بعد عملی جامہ پہن سکی۔ شوال ۱۳۲۶ھ میں الہ آباد ہوتا ہوا
بمعیت محبی جناب حافظ عبد الرحمن صاحب بہاری (مدرس مدرسہ شمس الہدی)
دیوبند پہنچا، اور حضرت مولاناؒ بھی مدرسہ سبحانیہ الہ آباد تشریف لے گئے۔ پھر
وہاں سے گیا تشریف لا کر مدرسہ انوار العلوم کو زندہ کیا اور اپنے فکر و عمل سے
مدرسہ کو خوب ترقی دی، دستار بندی کے متعدد جلسے دھوم دھام سے کرتے رہے
اور ہندوستان کے مشہور علماء مقررین و واعظین کو بلا کر تبلیغ کے فرائض انجام
دیتے رہے، ان مشغولیتوں کے باوجود مدرسہ اسلامیہ بہار شریف سے برابر
تعلق قائم رہا اور قدیم ہمدردی میں کمی واقع نہ ہوئی۔ مدرسہ کا سالانہ جلسہ
خصوصاً آپ کی قائم کردہ سنت کے موافق فارغین کی دستار بندی کا جو جلسہ ہوتا
تھا اس موقع پر آپ تشریف لا کر جلسہ کو پُررونق بنانے کی پوری سعی
فرماتے، مدرسہ کے ناظم و مدرس اول بھی ان مواقع میں آپ کی شرکت کو
ضروری سمجھتے، جلسہ کی تاریخ سے بہت پیشتر خط وکتابت کر کے وعدہ لے لیتے۔
غرض طرفین میں باہم خلوص و اعتماد تھا اور مدرسہ کی ترقی و بہبودی پیش نظر
رہی۔ میں دو برس کے قریب دیوبند رہ کر واپس آیا اور مدرسہ اسلامیہ میں
مدرس ہو گیا۔ حضرت مولاناؒ کی مجھ پر کچھ خاص عنایتیں تھیں، ان جلسوں کے
فارغ اوقات کی نجی نشستوں میں قوم وملت کی اصلاحات و ترقیات کے بارے

میں باتیں ہوتی تھیں۔ خصوصاً مولویوں کے سیاسیات سے الگ ہو جانے کے
باعث اسلامی حقوق کی پامالی دیکھ کر اصلاحی صورتوں پر دیر تک بحث رہتی تھی
، آخر جمعیۃ علمائے بہار کی تشکیل کا عزم ہوا، اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے
بہار شریف تشریف لا کر تگ ودو شروع کی، مسٹر سید محمد قاسم مرحوم (متولی
صغریٰ وقف اسٹیٹ بہار) کو راضی کر کے مدرسہ عزیزیہ میں جلسہ کرنے کی
اجازت لی۔ اور استقبالیہ کمیٹی قائم کر کے اس ناچیز کو صدر استقبالیہ مقرر فرمایا
، پھر اس کے ماتحت کاروائی شروع کی، تاریخ جلسہ معین کر کے علمائے بہار کی
خدمات میں دعوتی رقعے ارسال کئے، شوال ۱۳۲۶ھ میں حضرت مخدوم الملک
شاہ شرف الدین احمد قدس سرہ کے عرس کے موقع پر یہ جلسہ طلب کیا گیا اور
مدرسہ عزیزیہ کے وسیع صحن میں شامیانے کے تلے علمائے مدعوین اور عوام کے
جلسہ میں جمعیۃ علمائے بہار کی بنیاد رکھ دی گئی، حضرت مولانا شاہ سلیمان
پھلواروی غفرلہ مع اپنے صاحبزادہ شاہ حسین میاں کے شریک تھے، اس میں
حسین میاں سلمہ نے چند اشعار ایسے دل گداز لہجے میں ترنم کے ساتھ پڑھے
تھے جس سے مجلس میں بے خودی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ پھر دوسرے سال
پھلواری شریف میں بڑے پیمانے پر اس کا جلسہ ہوا، مولانا آزاد سبحانی کو دعوت
دے کر بلا گیا، انہوں نے اپنی زبردست تقریر و سحر بیانی سے حاضرین میں جوش
وولولہ کی روح پھونک دی، جلسہ نہایت کامیاب رہا اور اس میں شک نہیں کہ
اس کامیابی میں حضرت شاہ سلیمان مرحوم کا بڑا ہاتھ تھا۔

پھر جب حضرت استاذ نے امارت شرعیہ بہار کی تمہید اٹھائی تو حضرت
شاہ صاحب مرحوم نے اس کی تاسیس و تعمیر میں ساتھ دیا، لیکن امارت کے

دوسرے دور کے بعد خیال نے پلٹا کھایا جس کے باعث دونوں ہستیوں کے درمیاں مخالفت کی خلیج حائل ہوگئی۔

۱۳۳۸ھ میں جب کہ علماء کی یہ سیاسی تحریک نومولود ہی کی حیثیت میں تھی، میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں مدرس ہو گیا، اور جس سیاسی میدان میں مجھے کھینچ کر لایا گیا تھا وہاں سے واپس ہونا پڑا، مگر حضرت مولاناؒ کی مُدبرانہ طبیعت نے حالات ومقتضیات وقت کا لحاظ کر کے کبھی بھی اپنے مشن میں حصہ لینے پر زور نہیں دیا، بلکہ مجھ کو ایسے دائرہ عمل میں داخل کرتے رہے جہاں خدمات مفوضہ سے ٹکر نہ ہو۔ اسی سال ۱۹۴۰ء کا واقعہ ہے کہ محبی مولانا سید شاہ عبید اللہ صاحب امجھری مدرس مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کی وفات سے انجمن محمدیہ پٹنہ سیٹی کی مستقل صدارت کی جگہ خالی ہو گئی تھی اس کے سالانہ جلسہ میں جو ہر سال امارت شرعیہ کی نگرانی میں ہوا کرتا ہے ناچیز کی غیر موجودگی میں صدارت کے لئے اس کا انتخاب کروادیا گیا، اس انجمن کا نصب العین اصلاح و تبلیغ ہے اور میری خدمت کے مزاحم نہیں۔

غرض یہ کہ حضرت مفکر اعظم فکر و عمل کے ساتھ تدبیر کے بھی مالک تھے، اپنے تدبر و عمق نگاہی سے انجام کو بھانپ لیتے تھے اور جو پُرزہ جہاں کا کام دے سکتا تھا وہیں اس سے کام لینے کی سعی فرماتے تھے۔

حضرت استاذ محترم مفکر اعظمؒ مذہب و عمل میں حنفی تھے، لیکن تنگ نظروں کی طرح اہل سنت کے دوسرے فرقوں سے جنگ آزمانہ تھے، بلکہ فرماتے تھے کہ نماز کی مختلف صورتیں جو احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں، ایک ایک مرتبہ بھی سب پر عمل کر لینا چاہئے تاکہ کسی سنت کی برکات سے محرومی نہ

رہ جائے۔ اس بیان سے ظاہر ہے کہ حضرت مولاناؒ کے نزدیک احادیث مختلفہ میں اختلاف نسخ نہ تھا بلکہ اختلاف اباحیت یا رخصت و عزیمت کا اختلاف تھا، اور حقیقت یہ ہے کہ اس تحقیقی مسلک کے ماتحت بہتیرے مذہبی اختلافات کا قلع قمع ہو جانا روشن ہے، مگر مسلمانوں کی بدنصیبی ہے کہ فروعات و اجتہادیات مسائل (جن میں بڑی وسعت تھی) کو معرکۃ الآراء بنا کر لا تنازعو کی نہی صریح اور اسی شغل میں رہ کر واعدوا کے امر ناطق کو چھوڑ بیٹھے جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی زبوں حالی کا نقشہ سامنے ہے۔

حضرت ابوالمحاسنؒ اوائل عمر ہی میں مرید بھی ہو چکے تھے۔ حضرت قاری سید احمد شاہجہاں پوری نقشبندی قدس سرہ ایک متقی و متشرع بزرگ تھے، جن سے آپ کے خسر معظم حضرت مولانا سید وحید الحق بانی مدرسہ اسلامیہ بہار شریف رحمۃ اللہ علیہ اور بہار شریف و اطراف کے بہتیرے خوش خیال حنفی مرید تھے، حضرت مولاناؒ کے بڑے بھائی صوفی احمد سجاد صاحب جو مجذوبیت کے عالم میں مست ہیں سید قدس سرہ کے خاص مریدوں میں ہیں۔

حضرت مولاناؒ کا مشرب عقل و شرع کے مطابق ان ارباب تصوف سے جداگانہ تھا، جنہوں نے نوافل و اوراد کے سلسلۂ دراز میں الجھ کر اجتماعی شیرازہ کو پراگندگی سے محفوظ رکھنے کی نہ صرف ذمہ داری کا احساس ضائع کر دیا بلکہ اسی طریق عزلت کو حقیقت اسلام سمجھ کر عام دعوت و تلقین اور دعا و تسخیر کے ذریعہ وسیع کرنا شروع کر دیا۔ حضرت ابوالمحاسنؒ کو اپنی فطری صلاحیت کے ساتھ ماحول بھی ایسا ملا، جہاں نوافل و اوراد کے اشغال شبانہ یوم، قومی و ملی و جانی قربانیوں کے مقابل نہ صرف مرجوح بلکہ سنت کے طریق سے جدا متصور ہوتے

پھر تبحر علمی و نکات فہمی کی مزید تائید، آخر ان سب روشنیوں میں اصل حقیقت روشن ہو گئی کہ اسلام میں عبادت کی مانگ سے کہیں زیادہ اور شدید مانگ صداقت و امانت، تقوی و طہارت، مالی و جانی قربانی کی ہے، اسی واسطے حضرت مولاناؒ عبادات کے سلسلہ میں فرائض و موکدات پر اکتفا کر کے شب و روز فکر و عمل اور اعلائے کلمۃ اللہ میں لگے رہے۔

بعض اعتدال پسند دوستوں نے مولاناؒ کو ان تمام خوبیوں کا حامل تسلیم کرتے ہوئے بتایا کہ ان سے ایک بڑی غلطی ہوئی کہ امارت شرعیہ کو پارٹی الیکشن میں استعمال کر کے امارت کو صدمہ پہنچایا کیونکہ امارت ایک ہمہ گیر ادارہ ہے اس کی شان مسلمانوں کی پارٹی بندیوں کی لعنت دور کرنا تھی نہ کہ خود ایک فریق کی حیثیت اختیار کرنا۔ اس میں شک نہیں کہ ظاہر میں یہ اعتراض وقیع معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں یہ ایک بڑا مغالطہ ہے جس کے ہمارے دوست شکار ہو گئے۔ بے شک پارٹی بندیوں اور تفرقہ اندازیوں کو ختم کر کے یا کم سے کم سب پارٹیوں میں ہم آہنگی پیدا کر کے وحدت قائم کرنا امارت کا نصب العین ہے، لیکن ساتھ ہی اسلامی قوانین و شعائر کے احترام کو باقی رکھنا بھی امارت کا اولین فریضہ ہے، اور آئین شرع کو اغراض پرستوں کے ہاتھ کھلونا ہونے سے بچانا عین مقصد امارت ہے۔ اب دیکھئے کہ موجودہ حکومت نے نمائندگان عوام کو ملکی قوانین بنانے کا اختیار دے رکھا، مگر بد قسمتی سے مسلمانوں کا نمائندہ کونسلوں میں جا کر اسلامی آئین، مذہبی قوانین کے خلاف بلوں پر مہر تصدیق ثبت کر کے توہین اسلام کا مظاہرہ پیش کرتا ہے اور جب علمائے مذہب کی جمعیت تنبیہ کرتی ہے تو لبیک کہنے کے بجائے اس کو ٹھکرا دیتا

ہے تو کیا آئین اسلام کے استحفاظ کے لئے کونسلوں میں ایسے ممبران بھیجنا ضروری نہیں جو اسلامیات کے متعلق علماء دین کے فیصلہ کو شاہراہ عمل قرار دیں؟ اور ایسے افراد کو ممبر ہونے سے روکنا فرض نہیں جو کونسلوں میں پہنچ کر بلوں کے پاس کرنے میں شریعت کا پاس نہ رکھیں؟ اب اگر اس سلسلہ میں پارٹی بندی لازم آتی ہے تو امارت اس کی ذمہ دار نہیں ہے بلکہ وہ مطلق العنان امیدوار ذمہ دار ہے۔ اس واسطے پارٹی بندیوں کے الزام و جرم سے امارت کا دامن بالکل پاک ہے۔

امسال حضرت نائب امیر شریعتؒ کو جمعیت علمائے ہند نے ناظم اعلی مقرر کیا تھا اور اگرچہ آپ کی ذات اس عہدہ سے پیشتر بھی جمعیت کے لئے روح رواں تھی، لیکن جب کہ ارکان جمعیت کے اصرار سے اس عہدۂ نظامت کی باگ ہاتھ میں لی تو ایک جدید اسکیم کے ماتحت نئے اسلوب سے جمعیت کے چلانے کا کام شروع کر دیا تھا کہ ایسے نازک وقت میں ایثار و عزم کا یہ پیکر مجسم ہمیشہ کے لئے ہم سے رخصت ہو گیا۔

قوم و ملت کی اس سے زیادہ کیا بد نصیبی ہو سکتی ہے، مگر مشیت ایزدی میں صبر ہی واحد علاج ہے۔ آپ نوروز بخار میں علیل رہ کر ۱۷ر شوال ۱۳۵۹ھ کو دوشنبہ کے دن شام کے وقت رفیق اعلی سے جا ملے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ آپ کی مساعی جمیلہ کو قبول فرمائے اور اپنے مقام قرب کے انعامات سے نوازے۔[۳۵]

---

[۳۵] محاسن سجاد۔ ص ۱۷

مختصر سوانح حیات[۳۶]

حضرت مولانا حافظ عبد الحکیم صاحب اگانویؒ[۳۷]

مولاناؒ کی زندگی، خدمات اور فکر و عمل کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس پر روشنی نہ ڈالی گئی ہو، اور جو معرض خفا میں ہو، تمام سوانح منظر عام پر آچکے ہیں[۳۸]

---

[۳۶] محاسن سجاد میں حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ لکھا ہے، تکرار کی وجہ سے ہم نے یہ عنوان درج کیا ہے۔

[۳۷] افسوس کے مولانا عبد الحکیم اگانوی کے حالات کا بہت زیادہ علم نہ ہو سکا، مولانا مسعود عالم ندوی کے بقول مدرسہ انوار العلوم گیا کا سارا بار انہیں کے کندھے پر تھا، اور وہ اس کے مہتمم تھے، بظاہر لگتا ہے کہ مولانا مسعود عالم صاحب سے ہم وطنی کے ساتھ قرابت بھی تھی، مولانا کے خانوادہ میں اکثر اہل علم کے نام اسی طرح کے ملتے ہیں اور شاید اسی نسبت سے حضرت مولانا سجاد سے بھی قرابت ہو اور یہی قرابت ان پر اعتماد کا ذریعہ بنی ہو، مضمون میں جابجا ذاتی اشارے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حضرت مولانا کے شاگرد خاص تھے اوران سے الہ آباد میں استفادہ کیا تھا، اور وہیں تکمیل بھی کی تھی۔ مضمون کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حضرت مولانا پر اولین لکھنے والوں میں ہیں اور اس سے قبل ان کے حالات پر ان کے مضامین شائع ہوئے ہیں، محاسن سجاد کی اشاعت سے قبل ہی ان کا انتقال ۵ ربیع الاول ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۹۴۱ء کو ہو گیا تھا جیسا کہ مولانا نے مقدمہ میں ذکر کیا ہے۔

[۳۸] افسوس کہ وہ مضامین اب ہماری دسترس میں نہیں، سب سے پہلے مولانا کی حیات پر مرتب ہونے والی کتاب ہمارے علم کے مطابق "محاسن سجاد" ہے، اس سے پہلے مولانا کے متعلق مضامین کن مجلات ورسائل میں لکھے گئے اس کا علم نہیں، البتہ نقیب ترجمان امارت

میں نے بھی "مولاناؒ کی زندگی کا پہلا ورق" کے عنوان سے مولاناؒ کی خاص ابتدائی خدمات اور کارنامے حوالہ قلم کئے ہیں اور آپ کی پیدائش، وطن اور طرز زندگی پر روشنی ڈالی ہے، جو عصر جدید وغیرہ میں آگیا ہے، مگر دل چاہتا ہے کہ آپ کے ساتھ سعادت میں شریک ہوں اور حکم کی تعمیل میں مختصر پھر کچھ لکھوں

اعدذکر نعمان لنا ان ذکرہ
هو المسک ما کررته یتضوع

آپ کی پیدائش ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۳/ ۸۴) میں موضع پنہسہ ضلع پٹنہ میں ہوئی اور یہی آپ کا آبائی وطن ہے۔ ابتدائی تعلیم آپ نے گھر ہی پر پائی۔ قرآن اور اردو فارسی سے فارغ ہونے کے بعد آپ کو تحصیل علم عربی کا شوق ہوا اور اپنے اطراف ہی میں غالباً مولانا وحید الحق مرحوم استھانوی اور مولانا عبدالوہاب مرحوم بہاری[۳۹] سے عربی پڑھی اور جب متوسطات کے قریب پہنچے تو آپ دیوبند تشریف لے گئے، لیکن وہاں آپ کی علمی پیاس

شرعیہ اور پٹنہ کے دوسرے معاصر رسائل میں ضرور آئے ہوں گے، لیکن بعد میں تلاش کے باوجود نہیں مل سکے، نقیب کی پرانی فائلیں بھی پٹنہ کے کتب خانوں میں دستیاب نہ ہو سکیں، مزید تلاش کا موقع نہیں مل سکا، بعض مضامین ملے جو اس مجموعہ میں اپنی جگہ شامل کئے گئے ہیں۔

[۳۹] مولانا عبد الوہاب صاحب سے باضابطہ استفادہ کی تصدیق نہیں ہوتی۔(م) مولانا عبدالوہاب صاحب سربہدوی بہاری بڑے ممتاز معقولی عالم تھے، سربہدی ضلع نالندہ (نزد استھانواں، بہار شریف) ان کا وطن تھا، کچھ لوگوں نے غلطی سے سربہدہ (نزد اسلام پور مضافات راجگیر ضلع نالندہ، بہار شریف) کو ان کا وطن لکھا ہے لیکن صحیح سربہدی ضلع نالندہ ہے، ان کے بعض اعزہ اور اہل وطن اس کی تصدیق کرتے ہیں، معقولات میں کمال

نہیں بجھی، اس لئے تھوڑے ہی دنوں کے بعد آپ دیوبند سے الہ آباد مدرسہ سبحانیہ چلے آئے اور حضرت مولانا عبدالکافی مرحوم کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے جو علوم عربیہ میں کامل دستگاہ رکھتے تھے اور ایک جیدّ اور متبحر عالم تھے۔ مولاناؒ اپنی ذہانت، فطانت، استعداد اور قوت مطالعہ کے باعث تمام طلبہ پر نمایاں فوقیت اور امتیاز رکھتے تھے اور مولانا عبدالکافی صاحب آپ پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ آپ نے شرح جامی اور قطبی سے لے کر بالاستیعاب تمام کتابیں مولانا ہی سے پڑھیں اور ۱۳۲۰ھ (۱۹۰۲ء)[40] میں مدرسہ سبحانیہ ہی سے سند فراغ اور تکمیل آپ نے حاصل کی۔ یہ غلط ہے جیسا کہ مولانا عظمت اللہ ملیح آبادی نے آپ کے سوانح کے سلسلہ میں "مدینہ"[41] میں لکھا ہے کہ مولانا

حاصل تھا، ان کے بعض ہم وطن کا کہنا ہے کہ ان سے استفادہ کے لئے بیرون ہند کے طلبہ ان کے وطن حاضر ہوتے تھے، مولانا سید صاحب دہلوی سے بھی استفادہ کیا تھا لیکن اصل تلمذ علامہ عبدالحی فرنگی محلی سے تھا، حیدرآباد، مدرسہ عالیہ کلکتہ اور مدرسہ انوار العلوم گیا میں تدریسی خدمت انجام دی، طلاق ثلاثہ پر ایک رسالہ اور معقولات پر چند کتابیں یادگار ہیں، ندوۃ العلماء کی تحریک میں بھی پیش پیش تھے، اس کی تائید میں " صدف بہاری " لکھی تھی جس کا رد مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے "بارش بہاری بر صدف بہاری " کے نام سے لکھا، ربیع الثانی ۱۳۳۵ مطابق فروری ۱۹۱۷ میں وفات ہوئی۔ حال میں شائع ہونے والی ایک کتاب دبستان نذیریہ از تنزیل الرحمن صدیقی (کراچی) میں ان کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ یہ کتاب مولانا نذیر حسین کے شاگردوں کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔

[40] مدرسہ سبحانیہ سے فراغت ۱۳۲۲ھ (۱۹۰۴ء) میں ہوئی جیسا کہ مولوی شاہد حسین صاحب سوزؔ (نبیرہ مولانا عبدالکافی مرحوم) کی ایک اطلاع سے پتہ چلتا ہے۔ (م)

[41] بجنور سے شائع ہونے والا مشہور روزنامہ جو علماء کے افکار و خیالات کا ترجمان تھا۔

مرحوم نے حضرت شیخ الہند علیہ الرحمۃ سے درس لیا اور آپ کے علمی اور روحانی فیوض و برکات سے مستفیض ہوئے۔ مولانا جس وقت دیوبند گئے تھے متوسطات بھی نہیں پڑھتے تھے، پھر حضرت شیخ الہندؒ کی بارگاہ اور حلقۂ درس تک کیونکر رسائی ہوئی، منتہی طلبہ کا مقام اور ہے اور غیر منتہی کا اور، معلوم ہوتا ہے کہ مولاناؒ کے علم و فضل، تبحر و قابلیت اور افکار و اعمال سے متاثر ہو کر ملیح آبادی صاحب نے وہم کر لیا ہے کہ یہ حضرت شیخ الہندؒ ہی کے شاگرد ہوں گے اور ان ہی سے فیض پایا ہوگا، حالانکہ یہ محض فضل اللہ ہے، جس کو چاہے اپنے فضل سے نواز دے۔ حضرت مولانا ابوالکلام نے کس شیخ الہندؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور کس علامۂ وقت سے پڑھا؟ مگر ان کے فضل و کمال، علم و ادب، فہم و فقاہت، فکر و تدبر میں کون آپ پر فوق ہے؟ جس طرح مولانا عظمت اللہ کا یہ خیال غلط ہے اسی طرح ان کا یہ خیال بھی غلط ہے کہ جس زمانہ میں شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا حسین احمد صاحب گرفتار ہو کر مالٹا میں قید ہوئے اسی زمانہ میں مولانا سجاد علیہ الرحمۃ کے رفقائے کار بھی نظر بند کر دئے گئے اور مولانا پر اس کا یہ اثر ہوا کہ انہوں نے اپنی علمی زندگی کو خیر باد کہا اور درس و تدریس سے علاحدہ ہو گئے اور مدرسہ انوار العلوم کو چھوڑ دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ مولاناؒ کے رفقاء کار میں بجز ہم دو چار آدمیوں کے اور کوئی نہ تھا اور آپ کا کوئی رفیق[42] کار کبھی بھی نظر بند نہیں ہوا۔ البتہ مولاناؒ کے نو عمر مگر پُر جوش صاحبزادے حسن سجاد مرحوم

---

[42] مولوی عظمت اللہ صاحب نے شیخ الہند مرحوم کے شاگردوں اور رفیقوں ہی کو مولانا کے رفقاء سے تعبیر کیا گو یہ صحیح نہیں۔ رفقاء شیخ الہند سے مولانا مرحوم کا تعارف بعد کی سیاسی تحریکوں کے سلسلہ میں ہوا۔ (م)

تحریک خلافت کے سلسلے میں باڑھ میں ایک تقریر کے جرم میں اسیر فرنگ ہوئے، غالباً چھ مہینے کی سزا ہوئی، واقعات کو صحت کی روشنی میں پیش کرنا چاہیئے اور قیاس اور وہم سے بچنا چاہیئے۔

بہر حال مولاناؒ ۱۳۲۰ھ [۱۹۰۲ء] میں مدرسہ سبحانیہ سے فارغ ہو کر اپنے مکان تشریف لائے اور چند دنوں کے بعد مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں ملازم ہوئے اور درس دینے لگے، آپ کی قابلیت، استعداد اور تبحر علمی کا شہرہ سن کر طلبہ جوق جوق آنے لگے اور تھوڑے دنوں میں یہ اچھا خاصا مرکز علم بن گیا۔ پھر چند سال کے بعد آپ کو مولانا عبدالکافی صاحب نے اپنے مدرسہ سبحانیہ کے لئے الہ آباد میں بلوالیا اور صدر مدرس کی نائبیت کے عہدہ پر آپ کو سرفراز کیا، میں اس زمانے میں کانپور میں پڑھتا تھا، جب یہ معلوم ہوا کہ مولاناؒ الہ آباد تشریف لے آئے ہیں، تو میں کانپور سے الہ آباد چلا آیا اور مولاناؒ کے سلسلۂ تلمذ میں داخل ہو گیا، اور اپنی بقیہ کتابیں مولاناؒ ہی سے تمام کیں اس لئے آج مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں مولانا کا شاگرد ہوں، اگرچہ حقیر اور کمترین ہوں۔ یوں تو مولانا جامع العلوم تھے، مگر جن علوم میں کافی بلکہ کافی سے زیادہ دستگاہ رکھتے تھے وہ منطق، فلسفہ، بلاغت اور علم ادب تھا۔ کانپور میں کوئی عالم آپ کے پایہ کا نہ تھا اور الہ آباد میں بھی بجز مولانا منیر الدین مرحوم الہ آبادی کے کوئی مدرس عالم آپ کا ہمسر نظر نہ آیا۔ مولاناؒ کے درس تدریس کا یہ حال تھا کہ بڑی محنت اور کاوش سے پڑھاتے تھے اور کتاب کے مطالب مع مالہ وماعلیہ اس آسانی سے طلبہ کے دماغ میں اتار دیتے تھے کہ دماغ چمک اٹھتا تھا، مولاناؒ کے طرز تدریس کی بڑی شہرت اور دھوم رہی، اور بہت سے تشنہ کامان علم اس چشمہ سے سیر اب

ہوئے اور اپنی پیاس بجھائی۔ مولاناؒ مسلسل پانچ چھ برس تک درس تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے اور مشغول خدمت ہی تھے کہ مولانا عبدالکافی صاحب کی ہدایت یا اجازت سے کفرستان گیا میں تشریف لائے جہاں پوری جہالت اور بے دینی چھائی ہوئی تھی اور مدرسہ انوار العلوم قائم کیا۔ یہ ۱۳۲۹ھ [۱۹۱۱ء] کا واقعہ ہے، مدرسہ کے قیام کے سلسلہ میں کن کن مشکلات اور موانع کا سامنا ہوا اور کیا تکلیفیں اور صعوبتیں اٹھانی پڑیں یہ ایک داستان لرزہ خیز اور حیرت انگیز ہے، جن کو کچھ میں ہی جانتا ہوں، کیونکہ میں مولانا کا رفیق اور ساتھی تھا۔ آخر کسی طرح مدرسہ قائم ہوا، چلا اور علم دین کی روشنی پھیلی اور اجالا نظر آیا۔ تقریباً بارہ برس تک مولانا انوار العلوم میں درس دیتے رہے اور اس درمیان میں سیاست حاضرہ کا بھی مطالعہ فرماتے رہے، چنانچہ تحریک خلافت کے زمانے میں سیاسیات میں داخل ہوئے اور آپ کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا، اس کے بعد ہندوستان اور خصوصاً بہار میں کوئی سیاسی تحریک ایسی نہیں تھی جس میں آپ شریک نہ ہوئے ہوں اور عملی حصہ نہ لیا ہو بلکہ کامیاب نہ بنایا ہو اور کامیاب بنانے کی کوشش نہ کی ہو۔ لیکن انوار العلوم کے بعد سب سے پہلا اہم اور نمایاں کام گیا میں خلافت کمیٹی کی تاسیس تھی، مولانا نے قاضی احمد حسین صاحب وغیرہ کی معاونت سے گیا میں خلافت کمیٹی کی بنیاد رکھی جو صوبہ میں پہلی خلافت کمیٹی تھی اور ہزاروں ہزار روپیہ ٹرکی کو بھجوایا اور خوب چندہ ہوا، مجھے یاد ہے کہ غالباً یوم انقرہ کے سلسلہ میں میں نے گیا کے ایک چھوٹے سے محلہ سے ڈیڑھ سو روپیہ وصول کر کے دفتر میں داخل کیا تھا۔

مولاناؒ نے بھی عجیب دل ودماغ پایا تھا۔ مدرسہ میں پڑھاتے بھی تھے، مدرسہ کی نگرانی اور اس کا نظم بھی کرتے تھے، پھر وقتی سیاست، مسلمانوں کی زبوں حالی، آپس کے نفاق اور شقاق اور علماء کے تفرق وانتشار اور لامرکزیت کو گہری نظر سے دیکھتے تھے اور ان کی اصلاح کی تڑپ بھی دل میں رکھتے تھے، اور چاہتے تھے کہ کسی طرح عوام اور علماء کی کچھ بھی اصلاح ہو جائے اور یہ اپنے فرائض سمجھنے لگیں، یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ مولاناؒ نے چند علماء کے مشورہ سے بہار میں ۱۳۳۵ھ [۱۹۱۶ء] میں جمعیت علمائے صوبۂ بہار قائم کیا اور بہت جلد اس کو ترقی اور افادیت کے مرتبہ پر پہنچایا، صوبہ کے مختلف شہروں میں اس کے عظیم الشان پیمانہ پر اجلاس ہوتے رہے اور عوام اور علماء کی بتدریج تنظیمی اصلاح ہوتی گئی، یہ بھی ایک اہم خدمت تھی جس کو مولاناؒ نے انجام دیا اور تکمیل کو پہنچایا ، لیکن جو چیز زیادہ تڑپا رہی تھی اور سوہان روح بنی ہوئی تھی وہ مسلمانوں کی غیر اسلامی اور غیر شرعی زندگی تھی، آخر بہت غور وخوض کے بعد امارت شرعیہ کی اسکیم آپ کے ذہن میں آئی، اس سلسلے میں مولانا مرحوم نے رانچی میں حضرت مولانا ابولکلام صاحب سے جو اس وقت وہاں نظر بند تھے ملاقات کی اور اس مسئلہ پر باہمی مشورہ اور تبادلہ خیال ہوا۔ مولانا عبد الباری فرنگی محلی اور دیگر سر بر آوردہ علماء سے بھی ملے اور رائے عامہ کو تیار کیا اور جب یہ مرحلہ ختم ہو گیا تو غالباً ۱۳۴۱ھ [۱۹۲۰ء] میں پٹنہ میں ابو الکلام صاحب کی صدارت میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا جس میں تمام علماء اور عمائدین مدعو کئے گئے اور کافی بحث وتمحیص کے بعد امارت شرعیہ کے قیام کی تجویز پاس ہوئی اور اسی جلسہ میں حضرت شاہ بدر الدین صاحبؒ پھلواری امیر شریعت منتخب ہوئے۔ بعد کو مولانا

مرحوم نائب امیر شریعت مقرر ہوئے اور دفتر وغیرہ قائم ہوا، اس کے بعد بہار کے مختلف شہروں میں مولانا سید شاہ محی الدین اور مولانا مرحوم کی سرکردگی میں امارت کا وفد گشت لگاتا رہا اور مسلمانوں سے شرعی اور اسلامی زندگی بسر کرنے کا عہد وپیمان اور قول و قرار لیتا رہا اور دیکھا گیا کہ مسلمانوں نے پوری عقیدت اور خلوص کے ساتھ وفد کا خیر مقدم کیا اور اطاعت اور فرماں برداری کا یقین دلایا۔

بہر کیف! اب مولاناؒ کے لئے ناگزیر ہو گیا کہ گیا اور مدرسہ کی علمی زندگی کو چھوڑیں اور پھلواری شریف میں اقامت اختیار کر لیں۔ چنانچہ مولاناؒ نے مدرسہ کو میرے حوالہ کر کے پھلواری تشریف لے گئے اور افسوس کہ وہیں پیوند خاک ہوئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولاناؒ نے دو بیوہ اور ایک بچہ، ایک بچیؓ اور دو لڑکیاں چھوڑ کر رحلت فرمایا، خدا ان کو سلامت رکھے اور معاشی تکلیف سے بچائے۔ آمین۔

مولانا مرحوم کی تین یادگاریں ہیں جو خالص دینی ہیں، مدرسہ انوار العلوم، جمعیۃ العلماء صوبۂ بہار اور امارت شرعیہ۔ کوشش کرنی چاہیے کہ یہ یادگاریں قائم اور برقرار رہیں اور ان کی خدمات اور افادیت عام سے عام تر ہوتی جائیں تاکہ مولاناؒ کی روح مطمئن اور مسرور رہے۔

مولاناؒ کے سیاسی کارنامے اور خدمات مثلاً نہرو رپورٹ پر بحث وتنقید، سائن کمیشن کے بائیکاٹ کی تائید، انڈپینڈنٹ پارٹی کا قیام اور پارٹی کی طرف سے الیکشن کی مانگ اور اسمبلیوں اور کونسلوں کی نگرانی کہ کوئی قانون مذہب اور مسلمانوں کے مفاد کے خلاف پاس نہ ہو، یہ وہ چیزیں ہیں جو روشنی میں آگئی ہیں

اس لئے ان مسائل پر مزید لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لہذا مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ والسلام۔[۴۳]

[۴۳] محاسن سجاد، ص ا

مولانا سجاد عارف باخدا تھے

حضرت شاہ ابوطاہر قاسم عثمانی فردوسیؒ[۴۴]

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو لوگ تو عموماً ایک متبحر عالم بے مثل مدبر اور وقت کا ایک زبردست مفکر اسلام سمجھتے ہیں مگر میں تو مولانا کو ان محامد کے ساتھ ایک عالم باعمل، صوفی باصفا اور عارف باخدا

[۴۴] حضرت شاہ قاسم عثمانی فردوسی سملوی، اپنے بڑے صاحبزادے شاہ طاہر عثمانی کی نسبت سے ابوطاہر کنیت لکھتے تھے، پیدائش ۹ صفر ۱۳۰۷ھ (تقریبا ۱۸۹۰۔۹۱) اور وفات ۲۹ شعبان ۱۳۶۶ھ (۱۹۴۷) کو سملہ میں ہوئی۔ سلسلۂ نسب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ۳۸ویں پشت میں جا کر ملتا ہے، تعلیم زیادہ تر انگریزی کی پائی، علی گڑھ میں اعلی تعلیم حاصل کی لیکن اس کے بعد دو سال پھلواری کے دور قیام میں دینی علوم کی بھی تحصیل کی، مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ الہلال کی تحریک میں شامل رہے، حضرت شیخ الہند اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد جیسے بزرگوں کے ساتھ ان کی تحریکات میں سرگرم عمل رہے، کچھ دنوں پھلواری شریف میں دینی وعلمی مطالعہ میں وقت گذارا، اس دوران وہاں سے نکلنے والے رسالہ معارف کے مدیر بھی رہے، امارت شرعیہ کے بارے میں ان کے صاحبزادے شاہ طیب عثمانی صاحب ندوی نے لکھا ہے اس کے عناصر ثلاثہ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد، قاضی احمد حسین صاحب اور مولانا شاہ محمد قاسم صاحب عثمانی تھے، اگرچہ ان کا نام بہت کم نظر آتا ہے۔ خانقاہ سملہ کے سجادہ نشین تھے، ان کے بعد ان کے صاحبزادے شاہ طاہر صاحب عثمانی صاحب سجادہ ہوئے، حالات کے لئے ان کے صاحبزادے شاہ طیب عثمانی کا مضمون دیکھئے جو ان کی کتاب "شخصیات" میں شامل ہے۔

سمجھتا ہوں۔ ہماری آنکھوں نے تو ان کو تلاوت قرآن کے وقت مکیف اور بے خود دیکھا ہے۔میں نے دیکھا ہے کہ ایک ایک آیت کو بار بار پڑھتے ہیں اور آنکھوں سے آنسو رواں ہے ، میں نے دیکھا ہے کہ وہ قبلہ رخ جانماز پر دونوں پاؤں اٹھائے ہوئے بطور احتوا تشریف فرماہیں، پاؤں کے گرد ہاتھوں کا حلقہ ہے ، آنکھیں بند ہیں ،ساکت بے حس و حرکت بیٹھے ہیں ، آنکھیں اشکبار ہیں اور محویت کا عالم طاری ہے۔

یہ تو معلوم ہے کہ وہ طریقۃً اور مشرباً نقشبندی تھے مگر کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ صاحب ارشاد بھی تھے۔ ایک سفر میں میں ریل میں ساتھ تھا آپ نے بیگ سے قرآن مجید نکالا اور اس کے جزودان سے چند اوارق نکال کر مجھے عنایت فرمایا اور خود تلاوت میں مشغول ہو گئے ،ان اوارق میں تمام مکمل نقشبندی تعلیمات مرقوم تھے ،جو ان کو ان کے شیخ سے پہنچے تھے۔ جب وہ تلاوت سے فارغ ہوئے تو میں نے عرض کیا، کیا میں ان تعلیمات کو لکھ لوں؟ آپ نے فرمایا لکھ لیجیے، اللہ برکت عطا فرمائے۔

مولانا مرحوم بیعت طریقت بھی لیتے تھے ، مگر بہت کم ، جب کسی نے بہت اصرار کیا تو لے لیا، مولانا کے علمی و دینی ، سیاسی کارناموں میں صرف آئینی جد وجہد کو عموماً اہمیت دی جارہی ہے ، مگر میری دانست میں صرف آئینی جد و جہد میں آپ کے کارناموں کا انحصار صحیح نہیں ہے ،اس میں شک نہیں کہ اسلامی اقتدار کے حصول کے لئے حسب استطاعت آئینی جد وجہد کو اختیار فرمایا اور اس میں آپ کو بفضلہ تعالی خلاف امید گو نہ کامیابی بھی ہوئی مگر آپ اس کے بھی خواہشمند تھے کہ اگر موقع آئے اور دشمنان اسلام کا تمرد اور ان کی سرکشی سد

راہ آئے تو جہاد بالسیف کو بھی کام لایا جائے ، اور اس سے ان کے رفقاء کار واقف نہیں ہیں ، چنانچہ قاضی احمد حسین صاحب کے مقالہ میں جو غالباً الہلال میں شائع ہوا تھا اشارہ کیا گیا ہے ، اور امارت کے ذریعہ سے مسلمانوں کو سپاہیانہ فنون کے سکھلانے کا جو نظم کیا گیا تھا وہ بھی اس پر شاہد ہے ، نیز ایک واقعہ جو غالباً میرے ساتھ مختص ہے یعنی میرے سوا کوئی نہیں جانتا ہے اور غالباً قاضی احمد حسین صاحب بھی اس سے واقف نہیں ہیں، حالانکہ صرف ان ہی کی ایک ذات ہے جو مولانا کی ہر تحریک میں ان کی قوت بازو رہی۔ گیا میں جب مولانا کا قیام رہا سملہ ہر عرس میں تشریف لایا کئے، ایک موقع پر جب کہ آپ کو یہ معلوم ہوا کہ یہاں ارکان اسلام کے ساتھ جہاد پر بھی بیعت ہوتی ہے تو آپ نے مجھ سے فرمایا کہ بیعت کے ساتھ اہتمام جہاد بھی کرنا چاہیئے، میں نے عرض کیا تو آپ ہی امیر بنیں ، میں امیر تسلیم کرتا ہوں ، اس گفتگو کے چند دن بعد میں چند احباب کے ساتھ گیا مدرسہ میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے تو امیر تسلیم ہی کر لیا ہے ، ہمارے یہ مخلص احباب بیعت جہاد کے لئے حاضر ہوئے ہیں ، چناچہ آپ نے ان لوگوں سے بیعت جہاد لیا، ان میں سے جن لفظوں میں آپ نے بیعت لی ان کے ماثورہ الفاظ یہ ہیں۔ بایعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی السمع والطاعۃ فی العسر و الیسر والمنشط والمکرہ و ان لا انازع الامراہلہ و ان نقول بالحق حیث کنا و لا نخاف لو مۃ لائم۔

اس وقعہ کے کچھ ہی دنوں کے بعد امارت کی تحریک شروع ہوئی اور اللہ نے آپ کو نائب امیر شریعت بنایا۔ مولانا کے علمی، دینی، سیاسی خدمات کو میں کیا لکھوں، حقیقت ہے کہ امارت کی دینی، علمی، سیاسی خدمات مولانا مرحوم

ہی کی خدمات ہیں۔ ضرورت ہے کہ امارت کی تفصیلی روئداد از ابتدائے تاسیس تا روز وفات مولانا قلمبند کی جائے۔ آمین۔[45]

[45] حیات سجاد، ص ۷۱

حضرت مولانا سجادؒ ایک جامع کمالات شخصیت

سحبان الہند مولانا حافظ احمد سعید دہلویؒ[46]

میں نے بجنور کے جلسہ میں اپنا خطبہ صدارت پڑھتے ہوئے حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کے متعلق چند کلمات کہے تھے آج اسی اجمال کی تفصیل کرنا چاہتا ہوں، اگرچہ یہ تفصیل بھی ایک قسم کے اجمال سے زیادہ نہ ہو گی، کیونکہ مولانا مرحوم کے فضائل اس قدر کثیر ہیں کہ ان کے تذکرے کے لئے دفتر بھی ناکافی ہیں۔ ایک صحیح انسان میں جو خوبیاں اور کمالات ہونے چاہئیں، اللہ تعالی نے مولانا کی ذات میں وہ سب جمع کر دیئے تھے۔

ابتدائی ملاقات:

مولانا مرحوم سے سب سے پہلی ملاقات جہاں تک مجھے یاد ہے خلافت کانفرنس میں ہوئی۔ یہ خلافت کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی تھی، اسی خلافت کانفرنس میں بعض اہل علم نے یہ مشورہ کیا کہ ہندوستان کے علماء کی تنظیم ہونی

[46] نائب صدر جمعیۃ علمائے ہند دہلی کتاب میں درج ہے جو اس وقت کا منصب ہے۔ مولانا کا وطن دہلی تھا، بعد میں جمعیۃ العلماء کے صدر بھی رہے، حافظ قرآن اور ممتاز عالم دین تھے، مدرسہ امینیہ دہلی میں تعلیم پائی، ۱۹۲۰ سے قومی تحریکات میں حصہ لینا شروع کیا اور آٹھ مرتبہ جیل گئے، خوش بیان مقرر تھے اور سحبان الہند کہلاتے تھے، مولانا حسین احمد مدنی کی وفات کے بعد جمعیت العلماء ہند کے صدر مقرر ہوئے۔ اس سے قبل آپ اس جماعت کے ناظم اعلٰی تھے۔ دینی اور علمی موضوعات پر تقریباً بیس کتابیں یادگار چھوڑیں، ۱۹۵۹ میں وفات پائی۔

چاہئے، چنانچہ علماء کی ایک مختصر اور مخصوص جماعت کا خفیہ اجتماع دہلی کے مشہور بزرگ سید حسن رسول نما رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ پر منعقد ہوا۔ اس میں تمام حضرات نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ حضرت مولانا سجاد صاحب نے بھی اس جلسہ میں ایک مختصر تقریر فرمائی تھی۔ اس تقریر کا ایک ایک لفظ مولانا کے جذبات ایمان کا ترجمان تھا۔ حاضرین کی تعداد اگرچہ دس بارہ آدمیوں سے زیادہ نہ تھی، لیکن کوئی آنکھ اور کوئی دل ایسا نہ تھا جس نے اثر قبول نہ کیا ہو۔

مجلس اگرچہ دو گھنٹے سے زیادہ کی نہ تھی۔ ایک گھنٹہ بحث و مباحثہ میں خرچ ہوا اور ایک گھنٹہ عہد و پیمان میں صرف ہوا، لیکن اسی جلسہ کا یہ اثر تھا کہ جمعیۃ علمائے ہند قائم ہوئی اور اس کا پہلا اجلاس امرتسر میں خلافت کانفرنس کے ساتھ منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی رہائی کے متعلق ایک تجویز پاس ہوئی۔ جمعیۃ علماء کے اس پہلے اجلاس میں بھی حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد شریک ہوئے اور انہوں نے اپنے خیالات کا پھر اعادہ فرمایا۔ اس اجلاس کے صدر حضرت مولانا عبد الباری رحمۃ اللہ علیہ تھے۔

جمعیۃ علماہند کا دوسرا اجلاس

یہ جلسہ دہلی میں منعقد ہوا۔ اس جلسہ کے صدر حضرت مولانا محمود الحسن قدس سرہ تھے، ہر چند کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ علالت کی وجہ سے اجلاس میں شریک نہ ہو سکے اور اجلاس کی تمام کاروائی کا اکثر حصہ حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب مدظلہ کی زیر صدارت انجام پذیر ہوا۔ لیکن تمام کاروائی کا علم حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو ہوتا رہا اور ہر تجویز پیش ہونے سے قبل حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بغرض منظوری پیش کی جاتی رہی۔ اس

اجلاس کی یہ خصوصیت تھی کہ اس میں تمام ہندوستان کے علماء کی نمائندگی تھی۔

ہندوستان کا کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا، جہاں سے علماء تشریف نہ لائے ہوں، اس اجلاس میں حکومت برطانیہ سے عدم تعاون کی تجویز کے سلسلے میں جو فتویٰ مرتب کیا گیا اور جس کا نام آگے چل کر پانچ سو علماء کا متفقہ فتویٰ ہوا وہ حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مرتب کیا ہوا تھا۔ یہ فتویٰ اگرچہ گورنمنٹ برطانیہ سے عدم تعاون کے سلسلے میں تھا، لیکن اس فتویٰ سے مولانا کے اس تبحر علمی کا پتہ چلتا ہے، جو مولانا کو قدرت کی جانب سے عطا ہوا تھا۔ اس اجلاس کے بعد مولانا سے تعلقات وسیع ہو گئے۔ جمعیۃ علماء کے اس تاریخی اجلاس کی سبجیکٹ کمیٹی میں بھی مولانا نے ایک تقریر فرمائی تھی اور وہ تقریر اپنی آپ ہی نظیر تھی۔

مولانا ابو المحاسن محمد سجاد کا نظریہ

حضرت مولانا ابو المحاسن مرحوم سے جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے ۱۹۲۰ سے میرے تعلقات وسیع ہوئے اور تعلقات نے اتنی محبت اور وسعت پیدا کر لی کہ بلاشبہ اگر ان تعلقات کو باپ بیٹے کے تعلقات سمجھا جائے، تو مبالغہ نہ ہو گا۔ مولانا مجھ سے اپنی اولاد کی طرح محبت کرتے تھے، اور میں بھی ان کی عزت اور ان کا احترام باپ کی طرح کرتا تھا، اور بعض جلسوں میں ان کی موجودگی میں ان تعلقات کا اظہار بھی کیا تھا، اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کے خدام میں مجھ سے زیادہ کوئی ان کا رازدار نہ ہو گا، سفر اور حضر میں مولانا سے صدہا بار تبادلۂ خیالات کا موقع میسر آیا، اور بعض موقع پر میں نے اور انہوں نے

ایک ماہ سے زائد سفر کیا ہے اور مجھے ان کی ہمرکابی کا شرف حاصل رہا ہے۔ اس بیس سالہ زندگی میں بارہا ان سے مختلف مسائل پر گفتگو ہوئی ہے، فقہ، حدیث، قرآن، تینوں چیزوں میں میں نے ان کی نظر کو وسیع اور ان کے علم کو مستحضر پایا۔

اگر مولانا کی زندگی کے واقعات کو میں قلم بند کروں تو اس کے لئے بڑے وقت کی ضرورت ہے۔ اس لئے میں اس موضوع پر قلم اٹھانے میں ہچکچاتا ہوں، کہ ان سب باتوں کو قلم بند نہ کر سکوں گا، جو مجھ کو سفر اور حضر میں مولانا کے ساتھ پیش آتی رہیں۔

بہار کا زلزلہ

بہار میں جب ہولناک زلزلہ کا حادثہ پیش آیا تو جمعیۃ علماہند کے ایک وفد نے حضرت مولانا محمد سجاد کی رہنمائی میں تمام برباد شدہ رقبہ کا دورہ کیا۔ اس دورے میں مجھے مولانا کی معیت کا شرف حاصل ہوا۔ یہ لوگ تقریباً ہر قصبے اور موضع میں گئے، یہ دورہ کم وبیش ایک ماہ تک جاری رہا۔ ہر ایک مقام پر تقریریں بھی ہوتی رہیں۔ حضرت مولانا محمد سجاد صاحب نے بھی مختلف مقامات پر متعدد تقریریں کیں، شب ورز کی اس پیہم اور مسلسل صحبتوں میں مولانا کے خیالات سنے اور ان کے نظریات پر بارہا تبادلہ خیالات ہوا۔ بعض قرآن کی آیتوں کی تفسیر اور شرح بھی مولانا نے بیان کی۔ ان کا نظریہ اور ان کا نقطۂ نگاہ بالکل صاف اور روشن تھا، ان میں کوئی بناوٹ نہ تھی، وہ تصنع سے بالکل بری تھے۔ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی کو بغیر امیر کے غیر شرعی زندگی سمجھتے تھے۔ کسی اسلامی ملک پر کفار کے تسلط کو وہ

نہایت خطرے کی نظر سے دیکھتے تھے اور اس غیر شرعی زندگی پر وہ قرآن وحدیث سے استدلال کرتے تھے، اور بعض دفعہ اس زندگی کی خرابیاں ذکر کرتے کرتے رونے لگتے تھے اور اس قدر روتے تھے کہ ان کی ہچکی بندھ جاتی تھی اور فرمایا کرتے تھے کہ قیامت کے دن جو سوال ہم لوگوں سے ہوگا اس کا جواب سمجھ میں نہیں آتا، ہم خدا کے سامنے کس طرح عہدہ بر آہوں گے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ کفر کے اس بے پناہ غلبہ اور سطوت کو جس قدر کم کیا جاسکے کم کرنا چاہیے۔ اس راستے میں جس قدر قربانیاں پیش کرنے کی ضرورت ہو اس سے دریغ نہ کیا جائے، جن چیزوں میں حکومت متسلطہ مداخلت نہیں کرتی اور جو چیزیں اس کی دست برد سے باہر ہیں، ان میں اپنا مکمل نظام قائم کیا جائے، وہ فرمایا کرتے تھے اسلام ایک تنظیمی مذہب ہے، اس مذہب کی روح ڈسپلن اور نظم چاہتا ہے، اگر مسلمان منتشر رہیں اور کسی ایک شخص کی اطاعت نہ کریں اور اپنا کوئی امیر منتخب نہ کریں تو یہ زندگی غیر شرعی زندگی ہوگی۔ ہر ایک پیغمبر جو دنیا میں آیا ہے، اس نے اپنی ابتدائی تقریر میں دو باتیں لازمی طور پر کہی ہیں۔ فاتقو اللہ و اطیعون یعنی اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اور یہی اطاعت وہ چیز ہے جس پر قوموں نے مخالفت کی ہے، عام طور سے قومیں خدا کی قوت اور طاقت تسلیم کرنے کو آمادہ ہو جاتی تھیں، لیکن پیغمبر کی اطاعت پر رضامند نہ ہوتی تھیں، پیغمبر کی اطاعت کو وہ اپنی عزت، برتری اور اپنی سرداری کے منافی سمجھتی تھیں، اس وجہ سے کہتے تھے ماھذا الابشر مثلکم یرید ان یتفضل

علیکم، یعنی یہ پیغمبر بھی ہم تم جیسا آدمی ہے ، یہ اپنی بڑائی منوانا چاہتاہے ، اور ہم پر حکومت کرنا چاہتا ہے ۔ یہی وہ چیز ہےجو مکہ کے سرداروں کو کھٹکتی رہی اور یہی وہ امر ہے ، جس نے اہل کتاب کو نبی آخر الزماں ﷺ پر ایمان لانے سے باز رکھا، اسی نقطہ پر قوموں سے مخالفت ہوئی ،لیکن پیغمبر اس حق سے دست بردار ہونےپر آمادہ نہ ہوئے اور انہوں نے صاف کہہ دیا کہ خدائی مذہب کی یہ بنیادی چیز ہے ۔ جب تک پیغمبر کی اطاعت پر تیار نہ ہو خدائی مذہب کی تکمیل نہیں ہو سکتی اور تنظیمی زندگی بھی میسر نہیں آسکتی۔اس نظریہ کے پیش نظر انہوں نے امارت شرعیہ کی بنیاد ڈالی تھی ، ان کا نظریہ یہی تھا کہ جب تک حکومت کا فرہ مسلمانوں پر متسلط ہے ،اور جب تک مسلمان اس ابتلا میں مبتلا ہیں اور جس وقت تک مسلمان سیاسی اقتدار کے مالک نہیں بنتے ، اس وقت تک اپنے اقتصادی اور معاشرتی کاموں کے لئے اپنا ایک امیر منتخب کریں اور اس کی اطاعت وفرمانبرداری پر بیعت کریں ، تا کہ اس کفرستان میں جس قدر ممکن ہو سکے مسلمان اپنی زندگی کو شرعی بنا سکیں، وہ اس مسئلے پر فقہاء حنفیہ کی تصریحات پیش کرتے تھے ۔ اس پر انہوں نے ایک مفصل فتویٰ بھی مرتب کیا تھا ، اور جمعیۃ علماء نے جو تجویز امارت شرعیہ کے سلسلے میں پیش کی تھی، وہ بھی انہی کی سعی کا نتیجہ تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ زکاۃ اور عشر کا صحیح انتظام ہو سکے اور مسلمانوں کے صدقات و خیرات شرعی طریقہ پر صحیح مصارف پرخرچ ہو سکیں۔ یہ حقیقت ہے کہ حضرت مولانا محمد سجاد صاحب کی یہ خواہش ایک شرعی خواہش تھی

اور ۱۸۵۷ کے اس انقلاب کے بعد جو ہندوستان میں ظہور پذیر ہوا اور جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی دولت ،ان کی عزت اور ان کی شرعی زندگی اور ان کا سیاسی اقتدار ملیا میٹ اور تباہ و برباد ہو گیا ، اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا کہ مسلمان مسجدوں کی امامت کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں ایک امیر بھی منتخب کریں۔ حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد علماء کی جماعت میں وہ پہلے عالم تھے جنہوں نے وقت کی مناسبت کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کام کو شروع کیا ، اس کی حمایت میں آواز بلند کی اور اگر تمام ہندوستان میں نہیں تو کم از کم ایک صوبہ میں اس کی تشکیل کی اور ہندوستان کے مسلمانوں کو بتایا کہ کفر کے تسلط اور غلبہ کے بعد مسلمانوں کی مذہبی زندگی کا یہی طریقہ ہے۔ مولانا محمد سجاد کی اس خالص مذہبی اور شرعی تحریک کی پوری قوت کے ساتھ اپنوں اور پرایوں نے مخالفت کی ،ایک طرف حکومت متسلطہ نے اور دوسری طرف اس ملک کی بد قسمت اکثریت نے اس کو خطرے کی نگاہ سے دیکھا، سب سے زیادہ تعجب یہ ہے کہ ملک کے اس تعلیم یافتہ طبقے نے جس کو آج کل سب سے زیادہ مسلمانوں کی نمائندگی کا شوق ہے ، اور جو مسلمانوں کی تہذیب اور کلچر کی حفاظت کا مدعی ہے، اس نے بھی اس مذہبی تحریک کو اپنے اقتدار اور اپنی مزعومہ لیڈری کے خلاف سمجھا ۔ جو حضرات غیر شرعی قوانین کے ماتحت زندگی بسر کرنے کے عادی ہو چکے تھے ، اور صرف نام کے مسلمان بن کر اسلامی قومیت کے حقوق کابٹوارا کرانا جن کا مقصد زندگی ہو چکا تھا ، اور جو اسلامی احکام کی پابندی کو آزادی ضمیر کے

مخالف سمجھے ہوئے تھے ، انہوں نے اس تحریک کو دقیانوسی اور تیرہ سو سالہ پرانی تحریک کہنا شروع کیا ، اور مولانا سجاد کی یہ کہہ کر مخالفت شروع کی کہ یہ ہم کو روشنی اور آزاد خیالی سے ہٹا کر پھر ملاازم پھیلانا چاہتے ہیں ،اور ہم کو مولویوں کے اقتدار کے ماتحت کرنا چاہتے ہیں ،ان سب مخالفتوں سے زیادہ حیرت انگیز ان علماء کی مخالفت تھی ، جن کا یہ فریضہ تھا، اور قیام امارت جن کا شرعی اور قانونی فرض تھا، ان تمام مخالف قوتوں اور طاقتوں کی موجودگی میں مولانا محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ نے خدا کے بھروسہ پر اس کام کو شروع کیا۔

عزم اور ہمت

حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد میں جہاں بے شمار خداد قابلیتیں موجود تھیں، ان تمام خوبیوں اور قابلیتوں میں ان کی پختہ کامی، عزم بالحزم ، مستقل مزاجی ،اور ہمت اور ارادے کی طاقت ضرب المثل ہے۔ وہ بڑی سے بڑی مشکل کا ان تمام قوتوں کے ساتھ مقابلہ کرتے تھے، وہ کام کرنے سے تھکتے نہ تھے ، یہی وجہ ہے کہ ان تمام طاغوتی قوتوں کا مقابلہ کرنے کے بعد ان کو کامیابی نصیب ہوئی ۔ اگر علماء میں مداہنت اور منافست نہ ہوتی اور صوفیا میں اربابا من دون اللہ بننے کا شوق نہ ہوتا تو آج تمام ہندوستان ایک امیر کے ماتحت شرعی زندگی بسر کر رہا ہوتا،اور اسلام کی حقیقی برکات سے متمتع ہوتا اور ان کی روح حکومت برطانیہ کی غلامی سے آزاد ہوتی ، اگرچہ جسم غلامی میں مقید ہوتا ،لیکن پھر بھی اس جواں مرد سے جتنا ہو سکا اس نے کیا ، وہ خدا کے

سامنے اپنی نجات کا سامان مہیا کر کے لے گیا۔ اب دیکھنا ہے کہ ملک میں یہ سعادت کس کی قسمت میں لکھی ہے ، اور وہ کون شخص ہے جو مولانا کی اس تحریک کو کامیاب بنانے میں سعی کرتا ہے ، اور خدا کے سامنے سرخرو ہو کر جانا چاہتا ہے۔

کانگریس میں شرکت کی حمایت

حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد مرحوم کا نظریہ ذکر کرتے ہوئے میں نے عرض کیا تھا کہ وہ موجودہ تسلط اوراستبدادیت کو زیادہ سے زیادہ کمزور کرنے کی فکر میں تھے ، ایک جانب ان کی تعمیر کی طرف مائل تھی،اور زندگی کا دوسرا پہلو اس نظام حکومت کی تخریب پر منعطف تھا۔ان کے سامنے ۱۸۵۷ کی پوری تاریخ تھی ، اسلامی حکومت کی تباہی، مسلمانوں کی بربادی کا تمام نقشہ ان کی آنکھوں میں تھا۔ پٹنہ کی وہابی تحریک اور اس کا ناکامی کا بھی ان کو علم تھا۔سرحدی علاقہ میں حضرت شہید رحمۃ اللہ علیہ کی بچی کھچی جماعت کا جو حشر ہوا، اس کووہ جانتے تھے،حضرت شیخ الہندؒ کی آخری نہضت اور مولانا عبید اللہ سندھی کی جلا وطنی اور ریشمی رومال کی تحریک کا انجام بھی ان کو معلوم تھا ۔ وہ ان تمام تحریکات کی ناکامی کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اس ملک میں نظام حکومت کی تخریب تنہا مسلمانوں کے ہاتھوں سے نہیں ہو سکتی ۔نظام حکومت کی تخریب جب ہی ہو سکتی ہے جب دونوں قومیں مل کر اس کام کو کریں اور دونوں قوموں کا پورا پورا اشتراک عمل ہو ۔ یہ رائے انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر قائم کی تھی ۔ انہوں نے الہ آباد کی یونیٹی کانفرنس

میں ڈاکٹر منجے کی ایک تقریر کا جواب دیتے ہوئے صاف کہا تھا، کہ جہاں تک ملک کی آزادی کا سوال ہے،مسلمان کانگریس کے ساتھ شریک ہیں ، اور پوری قوت کے ساتھ کانگریس کی حمایت کرنے کو آمادہ ہیں ،لیکن جہاں تک مسلمانوں کی مذہبی اور شرعی زندگی ہے اور ان کے شوشل معاملات کا تعلق ہے ، وہ ایک امیر کے ماتحت ہی رہ سکتے ہیں ، اور ان کی شرعی زندگی بدون امیر کے نہیں رہ سکتی ۔ یہی وہ بات تھی جو باربار سمجھانے کے باوجود ڈاکٹر منجے کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ حضرت مولانا محمد سجاد مرحوم کا یہ خیال تھا کہ جب تک ہندو مسلمانوں کی جد و جہد کامیاب ہو اور ہندوستان میں نیشنل گورنمنٹ قائم ہو۔ اس وقت تک مسلمانوں کا اندرونی نظام اور ان کی شرعی تنظیم مکمل ہو جائے ، تاکہ نیشنل گورنمنٹ کے زمانے میں مسلمانوں کی معاشرت ، ان کا کلچر ، ان کی سوشل تہذیب ، ان کے اوقاف ، ان کے نکاح اور طلاق وغیرہ ان کی زکاۃ اور ان کا عشر یہ تمام باتیں ایک شرعی امیر کے ماتحت ہوں ، اور ان تمام امور میں یہ ایک امیر کے ماتحت ہوں، اور اس شرعی تنظیم کو آئندہ ہندوستان کے دستور اساسی میں مسلمانوں کے ایک شرعی حق کی حیثیت سے تسلیم کرا لیا جائے ،تاکہ مسلمانوں کے اندرونی اور اصلاحی معاملات حکومت کی مداخلت سے محفوظ ہو جائیں ۔ یہ ان کی اسکیم کا مختصر خلاصہ ہے جو میں نے عرض کیا ، کاش اس مفید اور خالص مذہبی تحریک کو مسلمان سمجھتے۔

حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد کی بے شمار خدمات مذہبی و ملی

میں سے میں نے صرف ایک بات ذکر کی ہے ، اور وہ بھی وقت کی قلت اور اپنی عدیم الفرصتی کے باعث مضمون کو بہت ہی مختصر کر دیا ہے ۔ ورنہ جمعیۃ علماء ہند کا قیام اور مسلم حقوق کے متعلق ان کے فارمولے اور تجاویز، کمیونل معاملات میں ان کی دور بینی ،ہندو مسلم فسادات میں ان کی انتھک مساعی سے کون واقف نہیں ہے ۔ ان کی زندگی میں صوبہ بہار فرقہ وارانہ فسادات میں کئی بار مبتلا ہوا ۔ بتیا کے فساد کو زیادہ زمانہ نہیں گذرا لیکن مولانا نے اس فساد میں جو خدمت بتیا کے مسلمانوں کی انجام دی، اس سے نہ صرف صوبہ بہار کے مسلمان ہی واقف ہیں ،بلکہ تمام ہندوستان کے مسلمان اس سے آشنا ہیں، قانون کی سمجھ اللہ تعالی نے ان کو ایسی صحیح عطا فرمائی تھی کہ وہ قانون کو خوب سمجھتے تھے ۔انڈپینڈنٹ پارٹی کا قیام اسی آئین شناسی کا نتیجہ تھا ۔انہوں نے قانون کو سمجھ کر بر وقت پارٹی کی تشکیل کی اور الیکشن میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی ۔ آخری زمانہ میں جمعیۃ علماء ہند کے جنرل سکریٹری منتخب ہو ئے ، اور صرف دو دن میں انہوں نے جمعیۃ علماءکی بیس سالہ زندگی کی ایک مختصر تاریخ لکھ دی ۔حضرت مولانا سجاد ان تمام علمی اور عملی خوبیوں کے ساتھ انتظامی قابلیت ایسی رکھتے تھے کہ وہ اپنی آپ ہی نظیر تھے ، ان کی صحیح سوانح لکھنے کے لئے دفتر کا دفتر چاہئیں۔ اس وقت ان کے متعلق جو کچھ لکھا گیا وہ سچ جانئے کہ سمندر میں سے ایک قطرے کی حیثیت بھی نہیں ہے ۔ ان کا علم ، ان کی ذہانت ، ان کا تقوی ، ان کا صبر اور ان کا عزم ، ان کے اخلاق کی بلندی اور ان کا کیرکٹر، خدا کا خوف اور نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ، مسلمانوں کی اصلاح کا شوق ، ممالک اسلامیہ کی آزادی، اور ان کی بقا کا خیال یہ سب باتیں وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں ، جنہوں نے مولانا محمد سجاد کو قریب سے دیکھا ہے ۔ مسلمان قوم کے سر پر سے ایک ایسے بزرگ کا سایہ اٹھ گیا ، جس کا بدل مستقبل قریب میں نظر نہیں آتا۔ اناللہ و انا الیہ راجعون ۔ اللھم اغفر لہ و ارحمہ۔[47]

[47] حیات سجاد، ص ۱۰۱

مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ ایک صاحب نظر مفکر

(علمائے ہند کو جگانے والا آغوش لحد میں سو گیا)

مولانا سید ریاست علی ندویؒ[48]

[48] مولانا کا آبائی وطن آبگلہ شہر گیا سے متصل سادات کی ایک بستی ہے، وہیں ۲۰ صفر ۱۳۲۳ ھ مطابق ۱۸ ابریل ۱۹۰۴ میں پیدا ہوئے، وطن کے مختلف اداروں اور عصری تعلیم گاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۱۶ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا، اور ۱۹۲۴ میں فراغت حاصل کی، اس کے بعد علامہ سید سلیمان ندوی کی دعوت پر دارالمصنفین آگئے اور علمی کاموں میں مصروف ہوگئے، ۱۹۳۷ میں گیا آگئے اور ماہنامہ ندیم گیا کی ذمہ داری سنبھالی ،اس کے بعد ۱۹۴۲ میں پھر واپس دارالمصنفین چلے گئے اور معارف کی تدوین وترتیب میں شامل رہے، ۱۹۴۹ میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں پرنسپل کی حیثیت سے پٹنہ چلے آئے اور پھر اسی عہدہ سے سبکدوش ہوئے، اسی مدرسہ سے ملحق ادارہ تحقیقات عربی وفارسی کے ڈائریکٹر بھی رہے اور اور ایک تصنیفی ادارہ بھی قائم کیا، مولانا کا تصنیفی کام مسلسل جاری رہا، مولانا نے جو کتابیں دارالمصنفین کے دوران قیام تصنیف کیں ہیں ان میں مغربی اسلامی ممالک کی تاریخ کی کئی جلدیں ہیں جن کی ترتیب ان کے ذمہ کی گئی تھی اور انہوں نے تاریخ اندلس کی چار جلدیں اور تاریخ صقلیہ مرتب کی، مولانا کی تاریخ پر وسیع اور گہری نظر تھی، عہد اسلامی کا ہندوستان بھی ان کی اہم تصنیف ہے، اسلامی نظام تعلیم پر بھی انہوں نے لکھا ہے۔ ۱۴ نومبر ۱۹۶۷ کو وفات پائی اور اپنے آبائی قبرستان آبگلہ میں دفن ہوئے۔ مولانا کے علمی کاموں کے شایان شان ان پر کام نہیں ہو سکا ہے، کچھ حالات مختلف مجلات ورسائل میں شائع ہوئے ہیں، جن میں معارف، الشمس، پٹنہ، ماہنامہ رفیق پٹنہ وغیرہ ہیں لیکن مستقل و مفصل کام کی ضرورت ابھی باقی ہے۔

یہ جانکاہ خبر پورے ہندوستان میں بجلی کی طرح دوڑ چکی ہے کہ علماءِ ہند کی جماعت میں زندگی و عمل کی روح پھونکنے والے ذی اقتدار عالم دین مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نے مختصر علالت کے بعد ۱۸/ نومبر ۱۹۴۰ کو داعی اجل کو لبیک کہا، اناللہ وناالیہ راجعون۔

مولانائے مرحوم کے غم میں صرف بہار غمگین نہیں، ہندوستان کا پایہ تخت دہلی بھی ماتم کناں ہے، اور حق ہے کہ ان کے غم میں ملت اسلام سوگوار ہو، کہ ان کی زندگی ملت اسلام ہی کی خدمت کے لئے وقف تھی۔

مولانائے مرحوم قصبہ بہار کے اطراف میں سے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے، ابتدائی تعلیم قصبہ بہار میں حاصل کی، پھر علم کی طلب میں الہ آباد پہنچے، اور اس عہد کے مشہور فقیہ، محدث وواعظ مولانا عبدالکافی الہ آبادیؒ کے حلقۂ درس میں جو مدرسہ سبحانیہ میں قائم تھا زانوئے تلمذ تہ کیا، تحصیل علم کے بعد مدرسہ اسلامیہ بہار میں مدرس ہوئے، پھر استاذ کی یاد فرمائی پر دوبارہ الٰہ آباد تشریف لے گئے، اور مدرسہ سبحانیہ میں مسند درس بچھائی جہاں تلامذہ پروانہ وار ارد گرد جمع ہو گئے۔

لیکن مولانائے مرحوم میں فکر و عمل کی جو صلاحیتیں ودیعت کی گئی تھیں وہ انہیں کسی مدرسہ کے گوشے میں تنہا درس و تدریس کی خدمت انجام دینے پر قانع نہ رکھ سکیں، اس وقت ندوۃ العلماء کی تحریک کی صدائے بازگشت موجود تھی، مرحوم نے اپنے دائرۂ عمل کے لئے ایک ایسے شہر کو منتخب کیا جہاں کسی معقول اسلامی درس گاہ کی ضرورت باقی تھی، چنانچہ آپ ہمارے شہر گیا میں تشریف لائے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے وزن پر انوار العلوم کے نام سے

ایک مذہبی درس گاہ کی بنیاد ڈالی اور اس کو ندوۃ العلماء سے ملحق کرنے کا اعلان فرمایا، ندوۃ العلماء نے بھی سند الحاق عطا کی، یہ واقعہ ۱۳۳۲ہجری کا ہے ، مولانائے مرحوم نے اپنی جدوجہد سے بہت تھوڑی مدت میں اس دینی درس گاہ کو ترقی کے عروج پر پہنچایا، ایک مخیر دین دار خاتون نے اپنا وسیع باغ اور بنگلہ اس کے لئے وقف کر دیا، اور یہ مدرسہ ایک مستحکم بنیاد پر جاری ہو گیا۔

اس اثناء میں پچھلی جنگ عظیم کے خاتمہ کے ساتھ ہندوستان میں تحریک خلافت کا طوفان اٹھا، اور مولانائے مرحوم درس و تدریس کے اس خموش گوشہ کو بھی خیرباد کہنے پر مجبور ہوئے، مدرسہ کو اپنے ایک ممتاز شاگرد سید عبدالحکیم صاحب کے سپرد کیا، اور خود اسلامی وملی جدوجہد کے ایسے میدان میں آ گئے جس کی سرحد ملکی تحریک سے ملی ہوئی تھی۔

اسی زمانہ میں علماء کی جماعت میں غیر محسوس طریقہ سے جنبش پیدا ہوئی، مولانائے مرحوم کی دوررس نگاہوں نے اس کو تاڑ لیا، وہ علماء کو بیدار کرنے کے لئے آگے بڑھے، ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے ایک جمعیۃ علمائے ہند کی بنیاد ڈالنے والوں کے رفیق کار ہوئے،، جمعیۃ علمائے ہند نے ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے امارت شرعیہ کا نظام عمل پیش کیا، مولانائے مرحوم نے سبقت کی اور امیر ہند کے انتخاب کا انتظار کئے بغیر امارت شرعیہ صوبہ بہار و اڑیسہ کی داغ بیل ڈال دی، حضرت مولانا سید شاہ بدرالدین پھلواروی امیر شریعت اور مولانائے مرحوم نائب امیر شریعت منتخب کئے گئے، رفتہ رفتہ امارت شرعیہ صوبہ بہار کا محکمہ ایسے وسیع پیمانہ پر آ گیا، کہ ایسا اس صوبہ میں کوئی دوسرا مذہبی ادارہ موجود نہیں۔ ہمارے صوبہ میں امارت شرعیہ کے ادارہ نے جو غیر

فانی جلیل القدر خدمات انجام دی ہیں ان کا تذکرہ کرنا تحصیل حاصل ہے، وہ تمام کی تمام خدمات مولانا مرحوم کی مجاہدانہ زندگی کے پائیدار نقوش ہیں۔

سیاسیات میں مولانا مرحوم اپنے چند خاص زاویہ ہائے نگاہ رکھتے تھے:

۱) وہ ملکی تحریک میں ہندوستان کی آزادی کے طلب گاروں کی صف اول میں تھے۔

۲) وہ اس مقصد کے حصول کے لئے اسلامیت کی انفرادیت کو برقرار رکھ کر برادران وطن کی وطنی جدوجہد میں شریک تھے۔

۳) اسلام، اسلامی آبادیوں یا مسلم طبقوں کے خلاف اگر کسی جانب سے جارحانہ گلے کئے جاتے تو ان کی مدافعت میں پیش پیش رہنا فرض اولین جانتے تھے۔

۴) وہ مرکزی وصوبہ وار مجالس قانون ساز میں شریک ہو کر اسلامی حقوق ومفاد کی نگرانی رکھنا ضروری سمجھتے تھے۔

۵) مسلمان اراکین قانون ساز سے اس مفاہمت کے طلب گار تھے کہ:

الف۔ جو قوانین غالب حیثیت سے سیاسی نوعیت کے ہوں ان میں مسلمان اراکین مجالس اپنی مناسب راہ جو بھی چاہیں اختیار کریں لیکن وہ اصولی حیثیت سے ملکی مفاد اور وطنی تحریک کے مخالف نہ ہو۔

ب۔ جن قوانین کی غالب نوعیت مذہبی ہو یا جن کے مابعد اثرات اجتماعی یا انفرادی حیثیت سے مسلمانوں کی مذہبی زندگی یا دینی مراسم واعمال پر پہنچیں، ان میں مسلمان اراکین مجالس جماعت علماء کی اقتداء قبول کریں۔

پچھلے الیکشن کے موقعہ پر تقریباً اسی مفاہمت کے مطابق مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی کا وجود عمل میں آیا، ایک الیکشن کی گرما گرمی میں مولانائے مرحوم کی عملی شرکت ان کے بہت سے مخلصوں کی نظر میں ان کی دوسری غیر صحیح روش تھی، لیکن بہر حال اس وقت وہ صوبہ کی اسلامی سیاسیات کی کشتی کے ناخدا تھے۔ کسی کشتی کا سمندر کے مدوجزر اور حوادث کے تھپیڑوں سے دوچار ہونا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ حق کی حمایت میں آواز بلند کرنے میں کبھی وہ پیچھے نہیں رہے، ابھی ہندوستان کے پچھلے دور حکومت میں واردھا اسکیم کے خلاف صوبہ میں سب سے پہلی آواز انہی نے اٹھائی۔ ودیا مندر اسکیم کی برائیاں سب سے پہلے انہیں نے آشکارا کیں، صوبہ کے مختلف گوشوں میں ستم رسیدہ مسلمانوں کی پکار انہوں نے سنی اور ان کی حمایت میں دوڑ کر ان کے پاس پہنچے، ان کی یہ خدمات فراموش کئے جانے کے لائق نہیں۔

مولانائے مرحوم میں دو اوصاف بیک وقت شان امتیازی کے ساتھ جمع تھے، ایک طرف وہ اپنی اعلیٰ دماغی صلاحیتوں سے اسلامی ہند کے بہترین صاحب نظر مفکر تھے، اور دوسری طرف وہ اپنی جانفشاں جدوجہد میں ایسے مصروف تھے کہ کسی لمحہ وہ خالی نہیں رہتے تھے۔

مولانائے مرحوم ہندوستان میں اسلامی محکمۂ قضا کے سب سے بڑے داعی تھے، اسکیمیں سونچنا اور لائحۂ عمل بنانا ان کی زندگی کا محبوب مشغلہ تھا۔ گیا کانگریس کے موقع پر "حریم شریعت" میں ان کے حسن وجمال کے جو شاہد ہیں وہ اس کے نظارہ کو کبھی فراموش نہ کریں گے، وہ ان دنوں جمعیۃ علمائے ہند کے ناظم اعلیٰ تھے، معلوم نہیں کتنی مفید اسکیمیں ان کے ذہن سے نکلیں اور کس

کس شکل میں ہو کر وہ کامیابی سے ہم کنار ہوئیں، ان خدمات کی تفصیلات میں جانے کے لئے ایک دفتر درکار ہے، خصوصا مرکزی اسمبلی اور صوبہ کی مجلس قانون ساز میں جن مباحث اور بل کا تعلق اسلامیات سے ہوتا ہے ان کی تشکیل پر نقد و نظر اور ان کے حسن و قبح کو پرکھتے اور مستقل خدمات انجام دیتے تھے، اور ان کی فکر و نظر سے بہتر نتائج بر آمد ہوتے تھے۔

مولانائے موحوم سے راقم سطور کے مراسم دیرینہ تھے، جب ملتے تو غیر معمولی محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے، میری محبت کے ساتھ انہیں ندیم سے بھی انس تھا، اور جب گیا آنے کا اتفاق ہوتا تو دفتر میں ضرور تشریف لاتے، ندیم کی ترقی و توسیع کے لئے خود معلوم نہیں کتنی مرتبہ فرمایا، لیکن ندیم کی محرومی کہ کبھی اس کو ان کے فیوض سے بہرہ اندوز ہونے کا اتفاق پیش نہ آیا۔

مرحوم حسن عمل اور صدق نیت کے مجسمہ تھے، ذاتی اخلاق، مروت، علم، بردباری، تواضع وانکسار ان کے گراں مایہ اوصاف تھے، ان کا سیاسی مطالعہ وسیع تھا، اسلامی ممالک کے حالات سے باخبر رہتے تھے، کسی یورپی زبان پر قدرت نہ رکھنے کے باوجود یورپ کے دستوری نظام حکومت کی تفصیلات پر حیرت انگیز عبور رکھتے تھے، سیاسیات کے مطالعہ کے لحاظ سے جماعت علماء میں اب کوئی ایسا دوسرا صاحب فضل موجود نہیں۔ ان کی غیر متوقع موت نہ صرف صوبہ بہار بلکہ اسلامی ممالک کے لئے ایک عظیم سانحہ ہے، جس سے نہ صرف ہندوستان کے علماء میں سے ایک رکن کی کمی ہوئی، بلکہ اسلامی ہند کی اصلاحی تحریک کو ایسا سخت صدمہ پہنچا کہ بظاہر اس کی تلافی کا سردست کوئی امکان نہیں۔ ہم بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہیں کہ وہ ہمیں ان کا نعم البدل

عطا فرمائے، جو ان کی جانشینی کرے، اور ان کے ادھورے کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے۔ ہماری دلی تعزیت ملت اسلامی کی خدمت میں پیش ہے کہ مرحوم کا رشتہ پوری ملت اسلامی سے وابستہ تھا۔

خداوندا! مرحوم کے اعمال حسنہ قبول فرما، لغزشوں کو بخش دے اور اپنی رحمت و شفقت سے درجات اعلیٰ سے سرفراز فرما (آمین) [۴۹]

[۴۹] ماہنامہ ندیم (گیا) نومبر ۱۹۴۰ء۔

حضرت مولانا سجادؒ: کمالات وخصوصیات

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ [50]

ہندوستان میں بہت کم لوگ اس سے واقف ہیں کہ مولانا کو اگرچہ علمی حلقوں میں وہ شہرت اور ناموری حاصل نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے لیکن میرے محدود علم میں ان کا جیسا دقیق النظر اور عمیق العلم عالم دور دور نہ تھا، فقہ بالخصوص علم فقہ پر ان کی بڑی گہری نظر تھی، سیاست وتمدن اور تاریخ کا بھی انہوں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا، خاص طور پر قانونی ودستوری باریکیوں اور ہندوستان کے دستور اور سیاسی نظاموں سے وہ گہری دلچسپی رکھتے تھے، اور ان کا انہوں نے بہ نظر غائر مطالعہ کیا تھا، ان کے تکلم وخطابت اور تحریر وانشاء کے حصہ کی صلاحیت وقوت بھی (جس سے ان کے بہت سے معاصرین نے عام

[50] عالم اسلام کی معروف شخصیت، عربی اور اردو میں سیکڑوں کتابوں کے مصنف، ممتاز داعی اور عظیم المرتبت مرشد ورہنما۔ ان کی شخصیت کے تعارف کے لئے پچاسوں کتابیں لکھی گئی ہیں، جن میں اولیت ان کے شاگرد رشید حضرت مولانا عبداللہ عباس ندویؒ کی تصنیف "میر کارواں" کو حاصل ہے، جو حضرت مولانا کی زندگی ہی میں شائع ہوئی تھی، پیدائش ۱۹۱۴ ۱۳۳۳ھ میں تکیہ کلاں رائے بریلی میں اوروفات ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ مطابق ۱۴۲۰ میں تکیہ ہی میں ہوئی۔ یہ تحریر حضرت مفتی ظفیرالدین صاحب کی کتاب "امارت شرعیہ دینی جدوجہد کا روشن باب" کے مقدمہ سے ماخوذ ہے۔ اور عنوان مرتب کا وضع کردہ ہے۔

طور پر بڑی فیاضی سے کام لیا) مسلمانوں کے موجودہ حالات، مستقبل کے خطروں اور ہندوستان میں ان کا مقام کے تعین کے مسئلہ پر صرف ہوئی تھی، وہ بدلتے ہوئے ہندوستان کو اپنی چشم بصیرت سے اس طرح دیکھ رہے تھے جیسا کہ ہم میں سے بہت سے لوگ اس وقت چشم بصارت سے بھی نہیں دیکھ پارہے ہیں۔ وہ اقبالؔ کی زبان میں اس وقت زبان حال
سے گویا تھے،

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

مجھے دارلعلوم دیوبند میں مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے دولت کدہ پر ۱۳۵۰ھ/۱۹۳۱ء میں پہلی بار ان کی مجلسوں اور صحبتوں میں شرکت اور یکجائی کی سعادت حاصل ہوئی، میں نے مولانا مدنیؒ کو کسی کا ان سے زیادہ احترام کرتے ہوئے نہیں دیکھا، یہ میری نوعمری اور طالب علمی کا زمانہ تھا، اس لئے میں ان کے علمی وذہنی مقام کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا تھا۔ پھر جب خوش قسمتی سے ان کا مولانا مدنیؒ کی رفاقت میں دو تین ہفتے برادر معظم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب کے مکان پر لکھنؤ میں مدح صحابہؓ کی تحریک کے سلسلہ میں ۱۹۳۸ء میں قیام رہا، تو میں نے ان کو اور زیادہ قریب سے اور علم شعور کی اس منزل کو دیکھا جب مطالعہ اور تجربہ آگے بڑھ چکا تھا پھر اپنے محبوب و مخلص دوست مولانا مسعود عالم صاحب ندوی جو ان کے نہایت گرویدہ اور معتقد تھے، اور جنہوں نے ان کے حالات وکمالات کے تعارف میں "محاسن سجاد" کے نام سے کتاب لکھی ہے، جو ان کی سب سے بہتر سوانح کہی جاسکتی ہے، ان سے ان کے متعلق بہت کچھ سنا،

ان کے علاوہ فاضل گرامی مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ اور حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ سے ان کے متعلق بلند کلمات سنے۔ رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر ”الفرقان“ بھی مولانا کے متعلق میری معلومات کا ذریعہ ہیں، اور وہ دین وعلم کے بعض شعبوں میں ان کی انفرادیت کے قائل ہیں

غرض امارت شرعیہ کے قیام کی تحریک اور اس کا علمی و فقہی و دستوری خاکہ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دل دردمند، و فکر ارجمند کا نتیجہ ہے، اللہ تعالی نے ان سے اس عہد اخیر میں وہ عظیم ملی خدمت لی جس کی نظیر (مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت و تبلیغ کو چھوڑ کر) اس نصف صدی میں نہیں ملتی، ان کے ذریعہ سے ہندوستان کی ایک اہم اور مردم خیز ریاست صوبہ بہار واڑیسہ امارت شرعیہ کے برکات سے متعارف و مستفید ہوئی۔

آنچہ از من گم شدہ گر از سلیماں گم شدے

حضرت مولانا منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ [51]

آپ نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ کے متعلق اپنے تاثرات آپ کے مجموعۂ مضامین کے لئے لکھوں۔ میرا ارداہ تھا کہ ولی اللہ نمبر کی اشاعت کے بعد الفرقان کے پہلے شمارہ میں حضرت مرحوم کے متعلق اپنے تاثرات بلکہ اپنی معلومات کچھ تفصیل سے لکھوں گا، ممکن ہے کہ اس ارادہ کی تکمیل کا موقع بھی ملے، اس وقت آپ کی فرمائش کی تعمیل میں یہ چند سطریں حوالۂ قلم کر رہا ہوں۔

[51] محاسن سجاد میں مدیر الفرقان بریلی، لکھا گیا ہے، مولانا کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، مشہور وممتاز عالم ومصنف اور مشہور مناظر بھی تھے، سنبھل ضلع مراد آباد (اب امروہہ) وطن تھا، دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فضلاء میں ہیں، فراغت کے بعد پہلے بریلی میں ایک مدرسہ میں مدرس ہوئے اور یہیں سے اپنا مشہور زمانہ رسالہ الفرقان جاری کیا جو بعد میں لکھنؤ منتقل ہو گیا اور مولانا بھی لکھنؤ آ گئے اور وہیں اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں، متعدد بلند پایہ علمی وادبی تصانیف کے مصنف ہیں جن میں معارف الحدیث کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ ۱۹۹۷ میں لکھنؤ میں وفات پائی اور عیش باغ کے قبرستان میں دفن ہوئے، حالات کے لئے ان کے فرزند مولانا عتیق الرحمن نعمانی کی کتاب مولانا منظور نعمانی اور الفرقان کا نمبر دیکھیں۔

جب سے حضرت مرحوم کی وفات کی خبر ملی ہے، ایک دن، بلکہ شاید کسی دن کا ایک پہر بھی ایسا نہ گذرا ہوگا کہ حضرت مرحوم کی یاد نہ آئی ہو، ان کو یاد کرتا ہوں اور مرحوم اقبال کا یہ شعر پڑھتا رہتا ہوں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مجھے حضرت مرحوم سے ایسی ملاقات کا شرف (جس کو ملاقات کہا جاتا ہے) پہلی بار غالباً ۲۸ء میں حاصل ہوا، یہ وہ زمانہ تھا کہ جمعیۃ العلماء نے اپنی راہ نہرو رپورٹ کے مسئلہ پر کانگریس سے الگ کرلی تھی۔

مرادآباد میں جمعیۃ مرکزیہ کی مجلس منتظمہ کا اجلاس تھا، اس سے فارغ ہوکر میں اپنے اس وقت کے اقامتی وطن امروہہ کے لئے مرادآباد سے دہلی کی ٹرین میں سوار ہوا، اسی گاڑی سے حضرت مفتی صاحب مدظلہ [52] اور حضرت مولانا محمد سجاد مرحوم بھی دہلی کے لئے روانہ ہوئے، مرادآباد سے امروہہ تک راستہ تقریباً صرف ایک گھنٹہ کا ہے، اتنے ہی وقت میں وقتی مسائل کے متعلق جو گفتگو رہی، جس میں زیادہ حصہ مولانا سجاد صاحب مرحوم ہی کے افادات کا تھا اس سے میں نے پہلی بار یہ اندازہ کیا کہ یہ شخص اپنی شان کا نرالا عالم ہے۔

اسی دن سے میرے قلب پر ان کی عظمت کا سکہ بیٹھ گیا اور میں ان کو دور حاضر میں کم از کم طبقۂ علماء میں اسلامی سیاست کا اعلیٰ ماہر سمجھنے لگا۔ میں صاف کہتا ہوں کہ پھر اس کے بعد سے آج تک اس باب میں حلقۂ علماء میں سے کسی کی بھی عظمت و جلالت کا اس درجہ قائل نہ ہو سکا۔ پھر اس پہلی صحبت کے

[52] غالباً حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب مراد ہیں۔

بعد ہر صحبت اور ہر ملاقات ان کی عظمت کے اس احساس میں اضافہ ہی کرتی رہی۔ مجھے حضرت مرحوم کی جس خصوصیت نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہ ہے کہ "پارٹی فلنگ" اور جماعتی مسلک" سے بالاتر ہوکر وہ ہر مسئلہ پر غور کرتے تھے۔ پہلے کوئی رائے قائم کرکے یا کسی جماعت کے فیصلہ کو سامنے رکھ کر خواہ مخواہ اس کی تائید میں مواد فراہم کرنے کے وہ عادی نہ تھے بلکہ پہلے ملی ضروریات اور واقعات و حالات پر غور کرتے اور تہ میں ڈوب کر غور کرتے تھے اور پھر جس نتیجہ پر پہنچتے اس کو مسلک بنانے اور اپنے رفقاء سے منوانے کی کوشش کرتے تھے، ہندوستان کے سیاسی مسائل میں بھی بس اسلام اور مسلمانوں کی مذہبی ضروریات ہی آپ کے غور و فکر کا مرکز اور محور تھے۔

آپ کے قلم سے نکلی ہوئی چند متفرق چیزیں اب بھی لوگوں کے ہاتھوں میں موجود ہیں، مثلاً جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس منعقدہ مرادآباد ۱۹۲۵ء کا خطبۂ صدارت، مسلم انڈی پنڈنٹ کانفرنس کا خطبۂ صدارت، کچھ نقیب میں شائع شدہ متفرق مقالات، نظامت امور شرعیہ کی مختصر اسکیم اور مسلم انڈپینڈنٹ پارٹی کی وہ مفصل تجویز جو مسلم آزاد کانفرنس کے اجلاس دہلی منعقدہ مارچ ۱۹۴۰ء کے لئے مولانا مرحوم ہی نے مرتب کی تھی، ان ہی چیزوں سے سیاسی دُور بینی اور ہندوستانی مسلمانوں کے اصل مسئلہ کی گرفت اور اس کے ممکن العمل اور متوقع الحصول صحیح حل کے دریافت میں دوسرے حضرات پر آپ کی سابقیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اس تحزب الاحزاب کے زمانے میں ہمارے علمی اور دینی حلقوں میں بھی جو "رشتے" مثلاً ہم استاذی، ہم شیخی، یا کسی ایک خاص سلسلہ میں انسلاک

وغیرہ وغیرہ جو عموماً اتحاد وارتباط میں موثر سمجھے جاتے ہیں، مجھے حضرت ممدوح سے کوئی ایک بھی ان میں سے حاصل نہ تھا، لیکن ان کے اخلاص ورع وتقوی ،دین کی بے لوث فدائیت اور سب سے زیادہ سیاسیات میں ان کے پختہ اسلامی انداز فکر نے مجھے ان سے اس قدر وابستہ کر دیا تھا کہ اپنے جن محترم بزرگوں سے مجھے اس قسم کی نسبتیں بھی حاصل ہیں ان کے ساتھ بھی مجھے اس سے زیادہ وابستگی نہیں ہے۔

کوئی چھپی حقیقت نہیں، اور کم از کم جمعیۃ علماء سے تعلق رکھنے والوں میں تو سب ہی کو معلوم ہوگا کہ کانگریس منسٹری قبول کر لینے کے بعد سے راقم الحروف کی ذاتی رائے شرکت کانگریس کے مسئلہ میں جماعت کے عام رجحان کے خلاف رہی، اسی زمانے میں حضرت مرحوم نے جو اس وقت اس مسئلہ میں بہ نسبت دوسرے اکابر کے مجھ سے قریب الخیال تھے، منظم شرکت کی ایک خاص شکل تجویز فرمائی اور "نظام ملت" کے عنوان سے ایک مفصل اسکیم اس کے لئے مرتب فرمائی، فی الحقیقت شرکت کا یہ صحیح راستہ تھا، اور اس نظام کے ماتحت جو شرکت ہوتی وہ یقیناً بہت وزن دار ہوتی، مولانا مرحوم نے وہ اسکیم مطالعہ کے لئے مجھے بھی عطا فرمائی، میں نے دیکھ کر عرض کیا کہ اگر آپ اس کو جماعت سے منوالیں تو میں اس اصول پر شرکت کا سب سے بڑا حامی ہوں، اور اس نظام کو بروئے کار لانے کے لئے چھ مہینے کے لئے اپنی خدمت بھی پیش کر سکتا ہوں ،لیکن بد قسمتی کہ اس وقت غالباً ہمارے تیز رو طبقہ کے اس سے متفق نہ ہونے کی وجہ سے وہ اسکیم بس یوں ہی رہ گئی اور بعد میں حالات بھی اس کے لئے ساز گار نہیں رہے۔

۱۹۳۷ء سے آخر ۱۹۳۹ء تک اسلامی ہند کی سیاست میں جو بحرانی دور گزرا جس میں ہر خیال کے کارکنوں کا دماغی توازن بگڑ چکا تھا، اس وقت جو چند چیدہ حضرات اس رو میں بہنے سے محفوظ رہے، ان میں ایک ممتاز ہستی حضرت مولانا مرحوم کی تھی، میں اس دور میں ان کے خیالات سے اگرچہ کلیۃ یعنی سو فی صدی تو متفق نہ تھا بلکہ صرف قریب تر تھا، لیکن اگر کسی کی رائے کو اپنے شرح صدر کے بغیر ماننا ہوتا ہے تو حضرت مرحوم کی رائے کو یقیناً میں اس کا مستحق سمجھتا تھا۔

میں عرض کر چکا کہ ہر معاملے میں دینی مصلحت کو وہ ہر چیز پر مقدم رکھتے تھے، اس لئے اس بارے میں ان سے چوک اور غفلت عموماً نہیں ہوتی تھی۔ کانگریس سے اشتراک کے باوجود مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلہ میں بہار کی کانگریسی حکومت کے غلط اور مسلمانوں کے لئے دینی حیثیت سے سخت مضرت رساں رویہ کی مصلحانہ مخالفت انہوں نے جس ایمانی شان کے ساتھ کی، اور پھر جس طرح وزارت کو اپنے رویہ کی تبدیلی پر مجبور کیا، وہ صرف انہی کی بے لاگ عزیمت اور دانشمندی کا کرشمہ تھا۔

اخبار بیں طبقہ کو یاد ہوگا اسی ۱۹۴۰ء کے شروع مہینوں میں ''واحد قومیت'' کے مسئلے پر گاندھی جی نے اپنے اخبار "ہریجن" میں مسلسل مضامین لکھنے شروع کئے اور ان میں ''ایک قوم'' کے نظریے کو ایسے انداز میں انہوں نے پیش کیا، جس کو اسلام کسی طرح بھی برداشت نہیں کر سکتا، بلکہ اگر مسلمان اس کو قبول کر لیں تو یقیناً ان کو دین کے بڑے حصہ سے ہاتھ دھونا پڑے گا ،کانگریس سے تعلق رکھنے والے ذمہ دار حضرات میں حضرت مولانا مرحوم نے

ہی سب سے پہلے پوری تفصیل کے ساتھ گاندھی جی کو ان کی غلطی پر متنبہ کیا اور بتلایا کہ ''واحد قومیت'' کا جو تصور آپ رکھتے ہیں، وہ مسلمانوں کے لئے نا قابل قبول ہونے کے علاوہ واقعات کے لحاظ سے بھی محض غلط ہے اور ایسی ''متحدہ قومیت'' کا کوئی تصور اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک ہندوستان میں ایک مسلمان بھی باقی ہے۔ بلکہ گاندھی جی یا ان کے چیلوں کا اس غلط مفروضہ پر اصرار ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کو بجائے آسان کرنے کے اور زیادہ مشکل کر دے گا۔

اسی طرح جب ایک مرتبہ گاندھی جی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اسلام میں ''اہنسا'' کا تصور ہے، تو اپنے حلقہ میں مولاناؒ ہی نے پوری جرأت وعزیمت کے ساتھ سب سے پہلے اس کے خلاف قلم اٹھایا اور بتلایا کہ سیاسی حیثیت سے بلند مرتبہ رکھنے کے باوجود گاندھی جی کی معلومات اسلام کے بارہ میں ایک طفل مکتب سے زیادہ نہیں ہیں۔

غرض مولاناؒ اپنے سیاسی انہماک کے باوجود اپنی ایمانی ذمہ داریوں سے کسی وقت بھی غافل نہیں ہوتے تھے، اور جب کوئی چیز اسلام یا مسلمانوں کے مذہبی مفاد کے خلاف سامنے آتی تھی تو اپنی جماعت میں سب سے پہلے اکثر انہی کا قلم حرکت میں آتا تھا، اور چونکہ اللہ تعالی نے ان امور کی خاص بصیرت بھی عطا فرمائی تھی، اس لئے معاملہ کے مخفی سے مخفی گوشوں کو بھی وہ دیکھ لیتے تھے۔

ایک واقعہ اور یاد آیا، لکھنؤ میں مدح صحابہ ایجی ٹیشن جاری تھا، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدظلہ اور مولانا مرحوم اس کی قیادت فرما رہے تھے، جمعہ کا دن تھا، جس دن کہ قانون امتناع مدح صحابہ کی خلاف ورزی کر کے

اجتماعی سول نافرمانی کی جاتی تھی، ٹیلے کی مسجد اس جنگ کا محاذ تھا، نماز جمعہ کے بعد وہیں پر پہلے جلسہ ہوتا تھا، اس کے بعد سول نافرمانی کی جاتی تھی، مردوں کے علاوہ عورتوں کا بھی بڑا مجمع ہو جاتا تھا اور ان کے لئے قناتوں کے ذریعہ پردہ کا انتظام کیا جاتا تھا، جب گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا تو پردہ نشین عورتوں کے مجمع میں سے ایک خط ایک بچہ کے ذریعہ صدر جلسہ کے نام پہنچا، اس میں ایک عورت نے اپنے دینی ولولہ کا اظہار کیا تھا اور لکھا تھا کہ ''اس ایجی ٹیشن میں عملی حصہ لینے کا موقع مجھ کو اور میری بہنوں کو بھی دیا جائے''۔ اس کے لئے اس خط میں صحابیات کی شرکت غزوات کا حوالہ دیا گیا تھا، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدظلہ نے جو اس دن جلسہ کے صدر تھے، راقم الحروف سے فرمایا کہ لاوڈ اسپیکر کے پاس جا کر تم اس خط کا میری طرف سے زبانی جواب دیدو اور ان بہنوں کو بتلا دو کہ ابھی تو ہم لوگ باقی ہیں، جب تک ہم میں سے ایک بھی موجود ہے، یہ گوارہ نہیں ہو سکتا کہ آپ اس راہ میں کوئی تکلیف اٹھائیں، میں چلنے لگا تو حضرت امیر صاحب مرحوم نے فرمایا کہ اس کے علاوہ مستورات کو یہ بھی سمجھا دینا کہ ''حرب سلمی'' (یعنی آئینی جنگ یا سول نافرمانی) اور تلوار کی جنگ کے احکام شریعت میں جداگانہ ہیں۔ تلوار کی لڑائی میں تو خاص حالات میں عورتوں کے لئے بھی شرکت کا موقع ہو جاتا ہے، مگر آئینی جنگ جس میں اپنے آپ کو گرفتار ہی کرایا جاتا ہے، اس میں شرکت کے لئے کوئی موقع نہیں ہوتا، بلکہ شرعاً ان کے لئے یہ ناجائز ہے کہ وہ اپنے کو غیر آدمیوں کے ہاتھوں گرفتار کرا کے قید خانہ میں جائیں، لہذا ان بہنوں کا جذبۂ قربانی تو قابل قدر ہے، لیکن سول نافرمانی

میں عملی شرکت کے خیال کو قطعی طور پر دل سے نکال دیں کہ ان کے حق میں یہ معصیت اور خدا کی نافرمانی کا باعث ہے۔

یہی حضرت مرحوم کی وہ خصوصیات تھیں جنہوں نے مجھے ان کا فریفتہ کر دیا تھا، اور واللہ العظیم اگر میرے بس میں ہوتا تو میں سیاسی کام آنے والے کم از کم نوجوان علماء کے لئے تو فرض قرار دیتا کہ وہ پہلے کچھ دنوں حضرت مرحوم کی زیر نگرانی ٹریننگ حاصل کریں۔

حضرت مرحوم سے میری آخری ملاقات گزشتہ جولائی کے اواخر میں دہلی میں ہوئی، دوران گفتگو میں میں نے مختلف سیاسی کانفرنسوں میں بڑھی ہوئی بعض سخت درجے کی شرعی بے عنوانیوں کا ذکر کے عرض کیا کہ اس قسم کی سیاسی مجالس میں بعض اوقات بڑی کھلی ہوئی اور خدا کو انتہائی ناراض کرنے والی منکرات بھی دیکھی جاتی ہیں، ان کا بقدر استطاعت انسداد اور کم از کم نکیر تو نہایت ہی ضروری ہے، لیکن ہم لوگ اس میں اکثر کمزوری دکھاتے ہیں اور بے دینوں کے "تنگ خیالی" کے طعنہ سے ڈر کر خاموش رہتے ہیں، حالانکہ اس سے ایک بڑا ضرر یہ پہنچ رہا ہے کہ عوام ہم لوگوں کو بھی ان منکرات میں شریک سمجھتے ہیں، پھر یا تو دین کے معاملہ میں وہ ہم کو متہم اور نا قابل اعتماد سمجھنے لگتے ہیں اور یا ان کے دلوں سے ان منکرات کی بُرائی کا احساس زائل ہو جاتا ہے۔

فرمایا" میں تو اس بارہ میں ادنی رواداری کو مداہنت سمجھتا ہوں" پھر ایک سیاسی کانفرنس کا حوالہ دے کر (جو چند ہی روز پہلے دہلی میں ہو چکی تھی) فرمایا کہ اس میں ایک اہم واقعہ پیش آیا، ہم نے خاموشی جائز نہ سمجھی اور فوراً کہہ دیا کہ یہ چیز غلط اور معصیت ہے، پھر یک لخت آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور

فرمایا کہ " فسق والحاد کے عموم وشیوع کی وجہ سے ہماری دینی حس بڑی حد تک ماؤف ہو چکی ہے، اور مجھے تو بسا اوقات شبہ ہو جاتا ہے کہ ہم لوگوں کا ایمان ادنی درجہ کا بھی ہے یا نہیں، حدیث میں فرمایا گیا کہ ہاتھ یا زبان سے بُرائی اور گناہ کو روکنے کی طاقت نہ ہونے کی صورت میں اس سے قلب میں نفرت اور عند الاستطاعت اس کے خلاف عملی یا قولی جہاد کی نیت ہر مسلمان کا فرض ہے اور یہ ایمان کا ادنیٰ درجہ ہے جس کے بعد کوئی اور درجہ ہے ہی نہیں (ولیس وراء ذالک مثقال حبۃ خر دل من ایمان اوکما قال علیہ الصلوۃ والسلام)۔ اور ہم ملاحدہ اور فساق بلکہ کھلے کفار ومشرکین کو علانیہ فسق والحاد اور کفر وشرک کرتے دیکھتے ہیں، اور بسا اوقات ہمارے قلب میں بھی اس کے خلاف کوئی غیظ وغضب پیدا نہیں ہوتا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کے اس ادنیٰ اور آخری درجے سے بھی اس وقت شاید ہم خالی ہوتے ہیں"۔

در حقیقت اپنے ایمان پر یہ خوف وخشیت ہی روح ایمان ہے، یہی تقویٰ ہے جس کو ابن ابی ملیکہ نے صحابۂ کرامؓ سے بایں الفاظ نقل کیا ہے (فی البخاری تعلیقاً) قال ابن ابی ملیکۃ لقیت ثلاثین من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم کلھم یخشی علی نفسہ النفاق۔

یہ تو تھے حضرت مرحوم کے متعلق میرے تاثرات اور منتشر معلومات، اب مجھے دوکلمے حضرت مرحوم کے ان احباب ورفقاء اور ان عقیدت کیشوں ونیاز مندوں سے بھی عرض کرنے ہیں، جو ان کی وفات سے غم زدہ اور اس حادثہ سے سوگوار ہیں۔

میرے بزرگو اور بھائیو! دنیا میں یہ دن تو سبھی کے لئے آنا ہے جو یہاں آتا ہے اس کے لئے یہاں سے چلا جانا بھی مقرر ہے، تاہم حضرت مولاناؒ کی جدائی کا رنج ضرور ہے اور وہ برحق ہے، اور خود میں اس کو اس درجہ محسوس کرتا ہوں کہ

انچہ از من گم شدہ گر از سلیماں گم شدے
ہم سلیماں ہم پری ہم اہرمن بگریستے

لیکن کفران نعمت ہوگا اگر اس کا احساس نہ کیا جائے کہ جانے والے نے آپ کو اندھیرے میں نہیں چھوڑا ہے۔ ان کو پہچاننے والوں اور ان سے تعلق رکھنے والوں کو معلوم ہوگا کہ ملت اسلامیہ ہندیہ کے دو مسئلے اس آخری زمانے میں بلکہ ان کی سیاسی زندگی کے آغاز ہی سے ان کی توجہ کا خاص مرکز تھے اور خدا کی قسم اگر قدرت کی طرف سے آج بھی ان کو بولنے اور آواز ہم تک پہچانے کا موقع مل جائے تو مجھے یقین ہے کہ وہ قبر سے پکار کے انہی دو چیزوں کے متعلق عہد حاضر کے مسلمانوں کو وصیت فرمائیں گے، ایک قیام نظام امارت اور نصب امیر فی الہند، دوسرے کم از کم مسلمانوں کی حد تک نظام شرعی کو اپنی پوری وسعت کے ساتھ ہندوستان میں مستقل آئینی حیثیت حاصل ہو جانا۔

ان دونوں کاموں کے متعلق حضرت مرحوم نے روشنی حاصل کرنے والوں کے لئے کافی سامان چھوڑا ہے، اب حضرت مرحوم کے ساتھ عقیدت و نیاز مندی کا جن کو تعلق ہے یا کم از کم ان دونوں مسئلوں میں وہ حضرت مرحوم کے نقطۂ نظر سے متفق ہیں، ان کا فرض ہے کہ ان دونوں کی تکمیل کی طرف وہ بیش از بیش توجہ کریں اور مرحوم کے نامکمل کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہچانا اپنی

زندگی کا نصب العین بنالیں، یہی چیز حضرت مرحوم کی رُوح پاک کو یہاں کی فکروں سے مطمئن اور متوسلین کی طرف سے خوش کر سکتی ہے۔

آخر میں تعزیت مسنونہ اور دعائے رحمت پر اختتام کرتا ہوں۔ ان فی اللہ عزا ءمن کل مصیبۃ ودرکاً من کل فائت فباللہ فاتقو وایاہ فارجو، وانما المصاب من حرم الثواب۔ اللھم اغفرلہ و ارحمہ و اجعل جنۃ الخلد مثواہ برحمتک یا ارحم الراحمین۔[۵۳]

[۵۳] محاسن سجاد، ص۶۱

وہ اپنی ذات سے اک انجمن تھے

کچھ یادیں کچھ باتیں

مولانا سید مسعود عالم ندویؒ [۵۴]

[۵۴] مولانا مسعود عالم ندوی بن مولانا حکیم سید عبد الشکور اگانوی، ملک کے ممتاز علماء اور عربی زبان و ادب کے ان باکمالوں میں ہیں جنھوں نے اہل عرب سے اپنی عربی دانی تسلیم کروائی ہے، ہندوستان میں عربی صحافت کے قافلہ سالار ہیں، ان کی شخصیت اور علمی مقام مسلم ہے، نیز شہرت بھی ملک و بیرون ملک میں خوب حاصل ہے، بالخصوص عربی ادباء کے حلقہ میں امتیازی حیثیت کے مالک ہیں، اگانواں (بہار شریف) میں ۱۹۰۸ء یا ۱۹۱۰ء (۱۳۲۷ـ۲۸ھ) میں ان کی پیدائش ہوئی، بہار شریف میں والد سے نیز ایک اسکول میں ابتدائی تعلیم کے بعد مدرسہ عزیزیہ بہار شریف میں داخلہ لیا اور تکمیل کے بعد دار لعلوم ندوۃ العلماء میں دو سال عربی ادب کی تکمیل میں صرف کئے، پھر وہاں سے نکلنے والے عربی مجلہ الضیاء کے مدیر رہے، اور اس کے ذریعہ عالم عربی میں اس ملک کا ادبی وقار اور عربی شناسی میں مرتبہ بلند کیا، چار سال کے بعد مجلہ بند ہو گیا تو صرف مدرس کی حیثیت سے کام کرتے رہے پھر ۱۹۳۷ء میں خدا بخش لائبریری پٹنہ میں مخطوطات کے مرتب فہرست ہو کر پٹنہ چلے آئے اور انگریزی میں عربی و فارسی مخطوطات کی کئی جلدیں مرتب کیں، یہیں جماعت اسلامی کے قیام کے بعد اس سے تعلق ہو گیا، چنانچہ ۱۹۴۴ء میں عالم عربی میں اس کام کے تعارف اور ایک عربی مجلہ کی اشاعت کے لئے پٹھانکوٹ اور راولپنڈی میں مقیم رہے بالآخر راولپنڈی میں اس مقصد کی تکمیل کے لئے دار العروبہ للدعوۃ الاسلامیہ قائم کیا اور تقریباً دس سال اسی میں خدمت کرتے رہے، ۱۹۴۹ میں دعوت کے تعارف کے لئے عالم عربی کا سفر بھی کیا، اور عراق کے مختلف شہروں، کویت، اور نجد و حجاز کی سیر کی، مارچ

راقم نے جس گھر میں آنکھیں کھولیں، وہاں چار بزرگوں کے نام بڑے احترام سے لئے جاتے تھے، ان میں دو زندہ تھے، اور دو ابدی نیند سو چکے تھے۔ میری والدہ اپنے والد ماجد مولانا عبد الصمد اگانوی [۵۵] (متوفی ۱۳۱۸ھ) اور اپنے خالو مولانا وحید الحق استھانوی (م ۱۳۱۵ھ) کے نام بڑے احترام سے لیا کرتیں، ان کے کارنامے سناتیں، ان کے دینی جوش اور قومی خدمات کا ذکر پُر خلوص سادگی اور سچے ولولے کے ساتھ کیا کرتیں، زندوں میں وہ اپنی نانیہال پنہسہ (ضلع پٹنہ) کے دو بزرگ کا ذکر بہت اخلاص سے کرتیں، بڑے بھائی جو صوفی و مجذوب تھے (اور اب تک ہیں) بڑے مولوی صاحب اور چھوٹے بھائی جو اس

۱۹۵۴ء (۱۳۷۷ھ) میں کراچی ایک اجلاس میں شرکت کے لئے حاضر ہوئے تھے کہ وہیں ۴۴ سال کی عمر میں وفات پائی اور قبرستان سوداگراں کراچی میں آسودۂ خاک ہوئے۔ بیسیوں کتابیں اور پچاسوں مقالات اردو اور عربی میں یادگار ہیں۔ انگریزی پر بھی قدرت حاصل تھی، نیز جرمن زبان سے بھی کچھ واقفیت تھی۔ تفصیل کے لئے ان کے حالات پر میرا عربی رسالہ "الاستاذ مسعود عالم الندوی" دیکھیں۔ نیز ماہنامہ چراغ راہ کراچی کا مسعود عالم ندوی نمبر مئی ۱۹۵۵۔ ڈاکٹر عبد الحمید فاضلی کی مولانا مسعود عالم ندوی حیات اور کارہائے نمایاں بھی قابل ذکر ہیں۔

[۵۵] مولانا عبد الصمد اگانوی پر خود ان کے نواسے صاحب مضمون کا ایک مضمون ماہنامہ ندیم گیا میں شائع ہوا تھا جو مشاہیر بہار شائع کردہ خدا بخش لائبریری میں بھی موجود ہے۔ مولانا نے سید جمال الدین افغانی کی صحبت اٹھائی تھی، ممتاز علمائے اہل حدیث میں تھے، دو کتابیں یادگار ہیں، ۴۴ سال کی عمر میں وفات پائی، مولانا سید نذیر حسین دہلوی کے تلامذہ میں تھے۔

وقت بھی (یعنی آج سے بیس پچیس سال پہلے) بڑے عالم کی حیثیت سے مشہور
تھے چھوٹے مولوی صاحب کے نام سے یاد کئے جاتے۔

اچھی طرح یاد نہیں کہ چھوٹے مولوی صاحب کی خدمت میں مجھے
پہلی بار کب نیاز حاصل ہوا، تحریک خلافت کے ہنگامہ خیز دنوں میں راقم ایک
انگریزی اسکول کا طالب علم تھا، والد ماجد مقامی خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلماء کے
خاص کارکن تھے، اسکول چھوڑ کر مدرسہ آنا پڑا، والد ماجد کے ہاں آئے دن
خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلما کی گشتی چٹھیاں آتی رہتی تھیں، خیال آتا ہے کہ
سب سے پہلے انہی مراسلوں میں "ابوالمحاسن محمد سجاد کان اللہ لہ" نظر سے
گذرا، انہی دنوں ایک "روداد انجمن علمائے صوبۂ بہار ۱۹۱۷ء کہیں پڑی ہوئی ملی
، بے سمجھے بوجھے پڑھ گیا، اس روداد سے کوئی اور فائدہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو پر اس
وقت حافظہ پر زور دینے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ مولانا محمد سجاد مرحوم کا نام
ذہن و دماغ پر پہلے پہل اسی روداد کے ذریعہ مرتسم ہوا۔

غالباً ۱۹۲۳ء کا ذکر ہے، بعض عزیزوں کے بلاوے پر پہلی مرتبہ پنہسہ
جانا ہوا، وہاں خاندانی نشست گاہ میں ایک چوتھائی حصہ گھرا ہوا ملا، معلوم ہوا کہ
یہ مولوی صاحب کی بیٹھک ہے، اور لوگوں کے فسق و فجور سے آنکھیں بچانے
کے لئے انہوں نے پردہ کی دیوار کھڑی کردی ہے۔ اس کے بعد کئی سال تک
مسلسل اور بار بار پنہسہ جانا ہوا، لیکن مولانا ایک ہی دو مرتبہ دکھائی دیئے اور
شاید ایک آدھ بار میں نے سلام کرنے کی بھی ہمت کی، ایک بزرگ نے بلا کر
مولانا کے پاس بٹھایا بھی، پر کوئی گفتگو یاد نہیں۔

مدرسہ کی تعلیم کے دوچار زینے طے ہوچکے تھے کہ مدرسے (مدرسہ
عزیزیہ بہار شریف) ہی کے احاطہ میں اصلاح نصاب تعلیم کے متعلق علماء کی
ایک کانفرنس منعقد ہوئی، شوال کی ابتدائی تاریخیں تھیں، مدرسہ ۸/شوال کو
کھلتا تھا لیکن جلسہ کے شوق میں وقت سے پہلے بہار آگیا اور تمام نشستوں میں
حاضر رہا۔ اس وقت مجھے پہلی مرتبہ مولانا کی عظمت کا احساس ہوا، بڑے بڑے
علماء کا مجمع تھا، مولانا عبدالوہاب صاحب مہتمم مدرسہ امدادیہ دربھنگہ صدر نشین
تھے، حصہ لینے والوں میں مولانا ابونعیم محمد مبارک کریم صاحب (سپرٹنڈنٹ
اسلامک اسٹڈیز بہار) اور مولانا حکیم شرف الحق صاحب بہاری خاص طور پر
قابل ذکر ہیں، لیکن اجلاس کے روح رواں مولانا محمد سجاد علیہ الرحمۃ ہی
تھے، مولانا چاہتے تھے کہ صوبۂ بہار کے تمام عربی مدرسے ایک نظام کے ماتحت
آجائیں اور ایک نصاب تعلیم پر ہر جگہ عمل درآمد ہو، اس تجویز کے ذریعہ
درحقیقت وہ مدرسہ اگزامنیشن بورڈ کے نئے فتنہ (جو اس وقت نیا تھا) کا سد
باب کرنا چاہتے تھے، ان کی خواہش تھی سرکاری امتحانات کے بدلے آزاد قومی
امتحانات ہوں، تجویز یہ تھی کہ مدرسہ عزیزیہ کو اس نئے قومی تعلیمی نظام کا مرکز
قرار دیا جائے، اور اپنی پائیدار مالی حیثیت کی وجہ سے وہ اس کا اہل بھی
تھا، اجلاس تو کامیاب رہا اور ہم ناسمجھ تو بڑی امیدیں لے کر اٹھے تھے، لیکن کچھ
ہی دنوں بعد معلوم ہوا کہ خود ہمارا مدرسہ سرکاری اگزامنیشن بورڈ سے ملحق
کردیا گیا، جب حریفوں نے مجوزہ مرکز ہی کو توڑ لیا تو پھر کیا امید ہوسکتی تھی۔

اس اجلاس کا راقم کے دل و دماغ پر بڑا اثر رہا، اور مولانا کی اس مفید
تجویز کی ناکامی کا داغ آج تک دل سے محو نہ ہو سکا۔ اس کے بعد دن گذرتے چلے

گئے ، اخباروں میں مولاناؒ کے کاموں کی رودادیں پڑھتا رہا، جریدۂ امارت کا خریدار بھی تھا، گھر پر بھی مولانا کا ذکر خیر رہتا۔ لیکن عرصہ تک کوئی تفصیلی گفتگو یا ملاقات کی سعادت حاصل نہ ہوسکی۔ جولائی ۱۹۲۷ کے لگ بھگ راقم دہلی جارہا تھا، کسی عربی مدرسہ میں تکمیل کا قصد تھا، والد ماجد نے مولانا کو خط لکھا، مولانا دورے میں تھے، کچھ تعویق سے ان کا گرامی نامہ ملا اور اس میں ایک طویل مکتوب مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کے نام تھا، جس میں راجپال ایجی ٹیشن اور وقت کے دوسرے مسئلوں پر اظہار رائے کے علاوہ راقم کے لئے سفارش کی گئی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مولاناؒ کو اس خادم کی ذات سے دلچسپی پیدا ہوئی جو روز بروز بڑھتی گئی اور آخر وقت تک قائم رہی لیکن تفصیلی گفتگو اور بلاواسطہ نیاز مندی اب بھی حاصل نہیں تھی۔

دلی کا ماحول راس نہ آیا تو میں ندوہ چلا آیا۔ سن اچھی طرح یاد نہیں، غالباً میں تکمیل ادب میں تھا، ۲۹ء یا ۳۰ء ہو، چھٹیوں میں وطن آرہا تھا ، بختیارپور میں مولانا پر نظر پڑی، مشتاقانہ ان کی طرف بڑھا، وہ بھی تیسرے ہی درجہ میں سوار ہوئے اور بہار شریف تک کامل دو گھنٹے شرف صحبت حاصل رہا ، یہ پہلا موقع تھا کہ مولانا سے کسی ملکی و ملی مسئلہ پر کھل کر گفتگو کا موقع ملا، عاجز نے خوب خوب سوال کئے، اور وہ میری تسکین و تسلی کے ساتھ معلومات میں اضافہ فرماتے رہے، دہلی جاکر میں نے مولویوں اور ان کے علم کے بارے میں جو رائے قائم کی تھی اس میں کچھ ترمیم کی ضرورت محسوس ہونے لگی، وہ بار بار یہی فرماتے رہے تھے ''اب تمام توقعات تم ہی لوگوں سے ہیں'' آؤ اور یہاں رہ کر کچھ کام کرو۔

غالباً گرمیوں کا موسم تھا اور ''نمک'' کی تحریک چل رہی تھی، چھٹیوں میں راقم بھی وطن آیا ہوا تھا۔ مولاناؒ ایک وفد کے ساتھ بہار شریف تشریف لائے۔ مولوی منظر علی مرحوم اور پروفیسر عبدالباری بھی ساتھ تھے، جامع مسجد میں جلسہ ہوا، مولاناؒ نے دو گھنٹے تقریر کی، سارا مجمع پتھر کی مورت بنا رہا، میں نے اپنی زندگی میں خطابت اور اس کی تاثیر کا بالکل نیا نمونہ دیکھا، زبان میں لکنت اور بیان میں سادگی، نہ ابوالکلام کی خطابت، نہ بخاری کے چٹخارے، نہ احمد سعید کی زبان، مگر مجمع ہے کہ دم بہ خود ہے، اور ہاں، ہاں کر رہا ہے، اور مجمع بھی کیسا؟ تحریک کے مخالفوں کا! میں بار بار مولاناؒ کی طرف حیرت سے دیکھتا اور دل میں ان کی عظمت بیٹھتی جاتی تھی، اس تقریر سے میری معلومات میں بڑا اضافہ ہوا اور "لا تلقو بایدیکم الی التہلکۃ" کے شان نزول سے پہلی مرتبہ کان آشنا ہوئے۔

۱۹۳۲ء کے آغاز میں راقم نے ''الضیاء'' (عربی ماہنامہ) نکالنا شروع کیا، تو مولاناؒ نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا، رسالہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور وہ ایک نظر اس پر ضرور ڈال لیتے، لکھنؤ تشریف لاتے تو خادم کو ضرور پوچھتے۔ مسلم یونیٹی بورڈ کے جلسے غالباً ۱۹۳۲ء کے اواخر میں ہوئے اور اس سلسلہ میں مولاناؒ کا لکھنؤ میں ہفتوں قیام رہا، اس دوران راقم برابر حاضر ہوتا، اور ان کے افادات سے اپنی کم مائگی دور کرنے کی کوشش کرتا، مولاناؒ کی نوازش سے راقم یونیٹی بورڈ کی مجلس مضامین میں برابر شریک ہوسکا، اور حقیقت میں یہی یونیٹی بورڈ کے جلسے تھے جہاں مولاناؒ کے سیاسی تدبر کا لوہا موافق و مخالف سب ماننے پر مجبور ہوئے، یوں کہنے کو تو جمعیت کی پوری مجلس انتظامی موجود

تھی، بورڈ میں اس کے نمائندے بھی موجود تھے، پر دماغ ایک تھا اور سب جسم محض کی حیثیت رکھتے تھے ۔ مولاناؒ لکھواتے ،نوٹ کراتے ،بتاتے اور ایک انگریزی داں[56] بورڈ کے سامنے ان کی ترجمانی کرتا اور ساری مجلس عاملہ حاضرین کا منہ دیکھا کرتی ،یونیٹی بورڈ کے مشورے لکھنؤ میں دوسری مرتبہ مسلسل تین روز تک ہوتے رہے، سارا اسلامی ہند کا عطر کھنچ کر آ گیا تھا، قابل ذکر شخصیتوں میں صرف علامہ اقبال مرحوم نہیں تھے، خالص قانونی موشگافیوں سے لے کر ٹھیٹھ فقہی مسائل بھی بساط بحث پر آ جاتے، پورے مجمع میں دو شخصیتیں سب پر بھاری تھیں، ایک ظاہری طور پر باوقار اور وجیہ صدر کے بغل میں کرسی نشین ہوتا اور دائیں بائیں دو وزیر (ڈاکٹر سید محمود اور مسٹر آصف علی) اپنی جگہ لیتے، میرا اشارہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہ کی طرف ہے، اور دوسرا ظاہری طور پر خستہ حال، ایک کنارے معمولی لباس میں، کاغذوں کا ایک بستہ لیے ہوئے لکھنے لکھانے میں منہمک ہوتا، میری مراد مولانا مرحوم سے ہے۔ مولانا ابوالکلام صرف ہدایات (direction) دیتے، آصف علی صاحب مسودے تیار کرتے اور ہمارے مولاناؒ سب کچھ خود ہی کرتے ،البتہ زبان کی لکنت کے باعث اپنا ترجمان ہلال احمد صاحب زبیری کو بتاتے ،مشوروں میں بسا اوقات قاضی سید احمد حسین صاحب بھی شریک ہوتے، بڑے بڑے شیریں مقال بیرسٹر اور لیڈران دونوں بزرگوں کی طرف دیکھتے ،ان کی نکتہ آفرینیاں سنتے اور انگشت بدنداں رہ جاتے۔

[56] ہلال احمد صاحب زبیری سابق مدیر "الجمعہ" (م)

۱۹۳۴ء کی گرمیوں کا واقعہ ہے ، لکھنؤ سے وطن جا رہا تھا، درمیان میں چار گھنٹوں کے لئے پٹنہ اتر پڑا، حسب معمول اسٹیشن سے سیدھے بھائی منظر علی ندوی مرحوم کے گھر کا رخ کیا، راستہ میں ہی منظر مرحوم بدحواس ملے، میں نے پوچھا خیریت؟ بولے "پنہسّہ جا رہا ہوں" ، میں نے کہا "پنہسہ"؟ انہوں نے کہا "ہاں ، حاسو (حسن سجاد) کا انتقال ہو گیا ،مولانا کے یہاں تعزیت کو جا رہا ہوں" خبر کیا تھی ، ایک بجلی، سر پکڑ کر رہ گیا، میرا بچپن کا کھیلا ہوا دوست اور بھائی، جس کی تقریب شادی رچائی جا رہی تھی، وہ آن کی آن میں رخصت ہو گیا !مولاناؒ کو تار پر تار دئے گئے ، لیکن قومی ضروریات پر اکلوتے نونہال کی قربانی انہوں نے خوشی خوشی گوارہ کر لی ، پہنچے بھی تو اس وقت جب نوخیز ہونہار لڑکا اس دنیائے دنی پر آخری حسرت بھری نگاہیں ڈال رہا تھا، بار بار یہی سوچتا تھا کہ "مولاناؒ کا کیا حال ہو گا؟ ان کی دنیا تو ختم ہو گئی"، دل میں آیا منظر صاحب کے ساتھ پنہسہ چلا چلوں، لیکن ہمت نہ بندھی۔ ہفتہ عشرہ کے بعد استاذی مولانا عبد الحلیم صدیقی تعزیت کو تشریف لائے، میں بھی بہار سے ساتھ ہو لیا۔

مولاناؒ اپنی نشست گاہ میں تشریف رکھتے تھے، صدیقی صاحب لپک کر بغل گیر ہوئے، یہ خادم بھی اس سعادت میں شریک رہا۔ ہم لوگ (کم از کم راقم تو ضرور ہی) سراسیمہ تھے، لیکن مولاناؒ صبر و وقار کا مجسمہ نظر آئے، چہرہ زرد، قدم لڑکھڑا رہے تھے، پر زبان پر اف نہیں، باتیں ہوتی رہیں، لیکن کیا مجال کہ مایوسی کی پرچھائیں بھی دکھائی پڑے، اللہ رے صبر ! اور واہ رے ضبط!۔

میں جب تک ندوہ میں رہا، نیاز مندی اور استفادہ کا موقع بہت کم ملا ،البتہ جب بھی وہ لکھنؤ تشریف لاتے خادم کو ضرور پوچھتے ، کبھی کبھی خاص کر

دارالعلوم تشریف لاتے ،بسا اوقات ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب (ناظم ندوۃ العلماء) اور علی میاں (مولانا ابو الحسن علی حسنی ندوی) کی زبانی اطلاع ملتی کہ مولانا تمہیں پوچھتے تھے۔ لیکن جب دسمبر سنہ ۱۹۳ء میں لکھنؤ چھوڑ کر پٹنہ آنا ہوا، تو پھر مولاناؒ کو بہت قریب سے دیکھنے اور ان کی نجی مجلسوں میں بیٹھنے کا موقع ملا ،اور جوں جوں قربت بڑھتی گئی، محبت و عقیدت میں زیادتی ہوتی گئی۔ میں نہ کانگریس کا سرگرم حامی، نہ جمعیۃ العلماء کی پالیسی کا کامل مؤید اور نہ امارت ہی سے کوئی ایسی خاص وابستگی تھی، پر مولاناؒ میں جانے کیا بات تھی کہ دل ان کی طرف بے اختیار کھنچتا تھا۔ اب تک جن لوگوں سے ملا، دو چار مستثنیات کو چھوڑ کر تعلقات کی زیادتی سے بدگمانی ہی بڑھی، بڑے بڑے عالموں کی مجلس میں جا کر بیٹھا، بعضوں کے نام سن کر دور دراز کے سفر بھی کئے پر نزدیک جا کر معلوم ہوا کہ ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی، لیکن مولاناؒ کا حال اس سے بالکل جدا تھا ،ان سے پہلی نظر میں بُعد محسوس ہوتا تھا، دو چار ملاقاتوں میں جا کر ان کے ذہن و دماغ کی بلندی کا صحیح احساس ہو پاتا، اور اگر یہیں انہوں نے آپ کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تو بے اختیار جی چاہتا کہ علماء اور زعماء کی ساری جماعت اس فرد واحد پر نچھاور کر دی جائے۔ خوش نصیبی سے راقم بھی ان مخصوص نیاز مندوں میں تھا، جن سے مولاناؒ اپنے منصوبے بہت کم چھپاتے تھے ،وہ بڑی سادگی سے بتایا کرتے کہ بساط سیاست پر تمام مہروں کو چھوڑ کر کس طرح پیدل شہ مات دی جاتی ہے اور کب فرزیں دے کر کھیل شروع کیا جاتا ہے؟ میں یہ جانتا ہوں کہ اسی پٹنہ میں دو چار ایسے بزرگ بھی ہیں جن کے سامنے مولاناؒ اپنے وہ خاکے اور منصوبے بھی کھول کر رکھ دیتے تھے، جنہیں راقم جیسے

تازہ واردان بساط ہوائے دل سے بیان کرنا مناسب نہیں خیال کرتے، پھر بھی انہوں نے اس خادم سے مختلف صحبتوں میں جو کچھ اور جتنا کچھ بیان کیا ہے کھول کر بیان کرنے کی کوشش کی جائے تو نہ سننے والے تاب لا سکیں گے اور نہ کہنے والا ہی اپنے دل و دماغ کا توازن برقرار رکھ سکے گا۔

راقم کو آج کی صحبت میں نہ مولاناؒ کے خدمات گنانے ہیں اور نہ ان کی سیاسی بصیرت اور علمی دقیقہ سنجی پر روشنی ڈالنا ہے، کہ یہ چیزیں اس مجموعہ کے دوسرے مضمونوں میں آگئی ہیں، اس تحریر میں صرف ان دھندلے نقوش میں رنگ بھرنے کی کوشش کی گئی ہے جو مرحوم سے ملنے اور ان کی صحبتوں میں بیٹھنے کے بعد دل و دماغ پر مرتسم ہو گئے تھے۔ یہ نقوش بھی بہت ہیں اور ان میں باتیں کہنے اور سننے کی بہت ہیں پر ابھی کہ داغ تازہ ہے، ضبط و تحریر کی بھی تاب نہیں، موقع ملا تو پھر کسی تقریب سے تفصیل کی کوشش کی جائے گی۔ سردست اس قدر پر اکتفا کرتا ہوا رخصت ہوتا ہوں۔[۵۷]

---

[۵۷] محاسن سجاد، ص ۶۶

حضرت مولانا سجادؒ کے حالات زندگی[۵۸]

حضرت مولانا سیّد منت اللہ رحمانیؒ[۵۹]

---

۵۸ عنوان از مرتب، حضرت مولانا رحمانی علیہ الرحمۃ نے یہ مضمون دیگر متعدد مضامین کے منظر عام پر آجانے کے بعد لکھا ہے، اس لئے اس میں دیگر مضامین سے زیادہ معلومات ہیں، لیکن بعض جگہ ان قدیم مضامین کی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں۔

۵۹ ایم. ال. اے. مونگیر، یہ الفاظ حیات سجاد کے ہیں۔ مولانا کا ایک مضمون اس کے بعد محاسن سجاد کا بھی ہے، اس اعتبار سے مولانا تنہا آدمی ہیں جنہوں نے حیات سجاد اور محاسن دونوں کے لئے مضامین لکھے۔ حضرت مولانا منت اللہ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، وہ ملک کے ان عظیم المرتبت علماء اور قائدین میں ہیں جن کے کارناموں سے باشندگان ملک بخوبی واقف ہیں، حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ بانی ندوۃ العلماء کے فرزند ارجمند ہیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء اور دارالعلوم دیوبند دونوں جگہ تعلیم حاصل کی، تحریک آزادی کے سلسلہ میں دارالعلوم دیوبند کے قیام کے دوران ہی کچھ دن جیل میں بھی رہے، حضرت مدنیؒ سے اس دوران خصوصی تعلق رہا، پھر اپنے وطن مونگیر واپس آگئے اور یہاں مطالعہ میں مشغولیت اور تدریسی خدمت کے ساتھ تحریری و تصنیفی کاموں اور الجامعہ مجلہ کی ادارت کی خدمت انجام دی، اس کے بعد حضرت مولانا محمد سجاد علیہ الرحمۃ کے زیر نگرانی عملی میدان میں آئے، خود مولانا کا اعتراف ہے کہ سب سے زیادہ ان کی شخصیت پر حضرت مولانا سجاد ہی کی صحبت کا اثر پڑا، اور سیاسی شعور کی بیداری میں یہ رفاقت وتربیت بہت موثر ثابت ہوئی، چنانچہ حضرت مولانا سجاد ہی کے حسب مشورہ انہوں نے سیاست میں قدم رکھا، اور انہیں کی پارٹی کے ماتحت ایم ایل اے اور پھر ایم ایل سی ہوئے۔ اور بہار میں قومی وملی خدمات انجام دیتے رہے، ۱۹۵۷ء میں امیر شریعت ثالث کے انتقال کے بعد امارت کے

صوبہ بہار کا پٹنہ ہندوستان کے قدیم ترین شہروں میں ہے۔ اور ہندوستان کے ہر تاریخی دور میں پٹنہ کو مرکزیت حاصل رہی ہے، ہندو راجاؤں کے زمانہ میں بھی پٹنہ علم وسیاست کا مرکز تھا، اور مسلمان بادشاہوں کے دور میں بھی اس نے اپنی خصوصیت کو باقی رکھا۔ جس زمانہ میں علوم مشرقیہ کا عروج تھا ہر فن کے بہتر سے بہتر اساتذہ اور اچھے سے اچھے ماہر یہاں پیدا ہوئے۔ اور عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ان کی تصنیفات کو آج وہی قبولیت اور اہمیت حاصل ہے، جو اس وقت تھی۔

اسی ضلع میں ایک قصبہ بہار شریف ہے۔ جس کے نام پر یہ صوبہ "صوبہ بہار" کہلاتا ہے، جس کو ہندوستان کے مشہور بزرگ حضرت شیخ شرف الدین رحمۃ اللہ علیہ کے مسکن ہونے کی عزت بھی حاصل ہے۔ جنہیں عام

لئے نگاہ انتخاب مولانا کی طرف اٹھی، اس وقت تک آپ کی خدمات اور علمی وروحانی عظمت سے اہل بہار اچھی طرح آشنا ہو چکے تھے، اور اس سے قبل آپ اپنے برادر بزرگ مولانا شاہ لطف اللہ صاحب کے انتقال کے بعد ۱۹۴۰ ہی میں اپنے والد کے مسند نشیں بھی ہو چکے تھے اس لئے باتفاق آراء آپ کا انتخاب ہوا اور امیر شریعت کے منصب پر فائز ہوئے، اور تقریبا ۳۴ سال اس منصب پر رہ کر اس ادارہ کو مضبوط و مستحکم کر دیا، پھر مسلم پرسنل لا بورڈ جیسا ادارہ بھی آپ ہی کی تحریک پر وجود میں آیا اور اس کے پہلے سکریٹری حضرت مولانا ہی ہوئے، ۱۹۹۳ میں خانقاہ رحمانی میں مولانا کی وفات ہوئی اور وہیں مدفون ہوئے، مولانا نے ملک وملت کے لئے جو عظیم خدمات انجام دی ہیں وہ چند سطروں میں نہیں بیان کی جاسکتیں، چند اہم کتابیں بھی مولانا کی علمی یادگار ہیں۔ مزید تفصیلی حالات اور کارناموں کے لئے دیکھئے، نقیب (امارت شرعیہ پھلواری شریف کا ہفتہ وار اخبار) امیر شریعت رابع نمبر، اور حضرت امیر شریعت نقوش وتاثرات از مولانا عطاء الرحمن قاسمی۔

طریقہ سے لوگ حضرت مخدوم بہاری کہا کرتے ہیں۔

اس قصبہ سے کچھ فاصلہ پر ”راجگیر“ ایک فرحت افزا اور صحت بخش مقام ہے۔ جہاں حضرت مخدوم بہاری ریاضت اور چلہ کشی وغیرہ کیا کرتے تھے۔

بہار شریف سے راجگیر سڑک جاتی ہے اسی سڑک پر چھ میل کے بعد پنہسہ ایک گاؤں ہے۔ شہروں کی چہل پہل سے دور، اور بازاروں کی رونق سے محروم چھوٹی سی آبادی کا ایک ٹھیٹھ دیہات ہے، جہاں نہ شہری تہذیب وتمدن سے واسطہ ہے، اور نہ بازاری بناؤ سنگار سے کوئی تعلق۔ گاؤں پر سرسری نظر ڈالئے تو معلوم ہو گا کہ یہاں لوگ غریب مگر ایمان دار اور قانع، لوگوں کا پیشہ کاشت کاری ہے، اور ہر شخص اسی میں مشغول ہے۔ لیکن اسی گاؤں کے شمال میں ایک اونچی دہلیز کا مکان ہے، جو پورے گاؤں میں ممتاز معلوم ہوتا ہے۔ صاحب خانہ مولوی سیّد حسین بخش صاحب ہیں، آدمی دین دار اور متقی اور مولوی سے زیادہ صوفی مشرب ہیں۔ مولوی حسین بخش صاحب نے عربی کی تعلیم حاصل کی تھی، لیکن تمام کتابیں پوری نہ ہو سکی تھیں، موصوف نے سن شعور کو پہنچنے کے بعد کچھ دنوں تک تو پڑھانے کا سلسلہ رکھا لیکن اس میں دل نہ لگا، پڑھانا چھوڑ کر گھر آئے۔ کاشت کاری اور ٹھیکہ داری میں مشغول ہو گئے، جو ذریعۂ معاش تھا، اور پھر پوری زندگی اسی میں صرف کر دی۔

صوفی مشرب تو تھے ہی اس پر اخلاق بھی وسیع تھا، اس لیے کبھی گھر مہمانوں سے خالی نہ رہتا، راجگیر جانے والے اور پھر وہاں سے واپس آنے والے

کم از کم ایک وقت ضرور مہمان ہوتے، اس طرح گھر کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی تھی۔

ماہ صفر ۱۳۰۱ھ (مطابق ۱۸۸۲)[۶۰] میں مولوی حسین بخش صاحب کے یہاں لڑکا پیدا ہوا، گھر میں خوشی منائی گئی، گاؤں والوں نے آکر مبارک باد دی، باپ نے بیٹے کا نام "محمد سجاد" رکھا۔ کنیت ”ابوالمحاسن“ ہوئی، یہ معلوم نہیں کہ کنیت کس نے رکھی۔ لیکن یہ کنیت گویا الہامی تھی جو محمد سجاد کے مستقبل پر پوری طرح صادق آئی، اور بالکل صحیح اتری جس کی تصدیق اس ”مجموعہ“ سے بآسانی ہو سکتی ہے۔

مولانا سجاد کے بچپن کا زمانہ تھا۔ ابھی عمر صرف چار سال ہوئی تھی کہ ۱۳۰۴ھ میں

حسین بخش صاحب کا انتقال ہو گیا، اور اس طرح شفیق باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، اب مولانا کے سرپرست اپنے بڑے بھائی مولوی احمد سجاد صاحب تھے، جو ما شاء اللہ اب تک بقید حیات ہیں اور اپنے زہد وتقویٰ کے باعث ”صوفی صاحب“ کہلاتے ہیں۔

مولاناؒ نے جب زندگی کے چھٹے سال میں قدم رکھا، تو مولاناؒ اپنے ہی مکان پر گھر کے مولوی صاحب کے پاس پڑھنے کے لیے بٹھلائے گئے۔ اور وہیں اُردو، فارسی اور قرآن کریم کی تعلیم حاصل کی۔

عربی کی ابتدائی تعلیم کے لیے ۱۳۱۰ھ میں مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں داخل کئے گئے، اس وقت مدرسہ کے ناظم مولانا حافظ سیّد وحید الحق

---

[۶۰] سوانح کے دیگر مضامین از مولانا زکریا فاطمی اور عبدالحکیم اگانوی میں ۱۲۹۹ درج ہے۔

صاحب استھانوی تھے۔ مدرسہ اسلامیہ کا انتخاب اس لیے ہوا کہ ایک تو بہار شریف پنہسہ سے صرف چھ میل پر تھا، اور دوسری بات یہ بھی تھی کہ ناظم صاحب موصوف مولاناؒ کے رشتہ دار تھے۔ ناظم صاحب کی شادی مولانا کی چچیری بہن سے ہوئی تھی، اس لیے نگرانی کے فرائض بھی وہ بہت اچھی طرح انجام دے سکتے تھے۔

مولانا بچپن میں پڑھنے سے بھاگتے تھے، اور زیادہ وقت کھیل کود میں صرف ہوا کرتا تھا۔ مدرسہ اسلامیہ میں بھی یہی حال رہا۔ کچھ دنوں کے بعد بڑے بھائی مولوی احمد سجاد صاحب کے ساتھ کانپور تشریف لے گئے۔ اور مولانا احمد حسن صاحب کانپوریؒ کے حلقۂ درس میں داخل ہوگئے۔

مولوی احمد سجاد صاحب کانپور میں علیل ہوگئے اس لیے دونوں بھائی مکان واپس آئے، ان دنوں مولانا کی عمر کا پندرہواں سال تھا۔ لیکن تعلیم کے سلسلہ میں اب تک وہی حال تھا۔ پڑھنے سے بھاگتے تھے۔ ایک روز بڑے بھائی نے سخت تنبیہ کی اور زدوکوب کیا۔ مولانا اُسی روز گھر سے غائب ہوئے، کچھ دنوں تک تو پتہ ہی نہ چلا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کانپور میں ہیں اور پڑھتے ہیں۔ اس طرح گویا یہاں سے مولانا کی تعلیم شروع ہوتی ہے۔ تین برس کے بعد مکان واپس آئے تو اس وقت شرح وقایہ وغیرہ پڑھ رہے تھے۔

جب مولانا میں پڑھنے کا شوق پیدا ہوا تو کانپور ہی سے دیوبند کا قصد کیا، دیوبند پہنچے اور پڑھنے لگے۔ تقریباً چھ ماہ تک دیوبند میں قیام رہا ہوگا کہ تبت کے ایک لڑکے سے لڑائی ہوگئی، اور مولانا کو مجبوراً دیوبند چھوڑنا پڑا۔ ۱۳۱۷ھ میں مولانا کانپور سے الٰہ آباد چلے آئے، مدرسہ سبحانیہ میں داخل ہوئے، اور مشکاۃ

المصابیح، تفسیر جلالین، ملّا حسن مولانا عبدالکافی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھنے لگے۔ مدرسہ سبحانیہ میں مولانا کا قیام ۱۳۲۲ھ تک رہا۔ اور اس دوران میں عربی کے مروّجہ نصاب کو مولاناؒ نے پورا کرلیا۔

۱۷/۱۸/۱۹/ ربیع الاوّل ۱۳۲۲ھ مطابق ۳/۴/۵/ جون ۱۹۰۵ء کو مدرسہ سبحانیہ میں دستار بندی کا جلسہ بڑی شان و شوکت سے ہوا۔ اسی میں مولانا کی رسم دستار ہوئی۔ خداداد ذکاوت اور قوت حافظہ اور بے مثل اخلاق و عادات کی وجہ سے الہ آباد میں مولانا کا زمانہ طالب علمی بہت شاندار اور کامیاب رہا۔ مولاناؒ ہمیشہ اساتذہ اور طلبہ کی نگاہ میں محترم رہے۔

مدرسہ سبحانیہ سے فراغت کے بعد مولانا سیّد وحید الحق [61] صاحب کی طلبی پر مدرسہ اسلامیہ بہار شریف چلے گئے، اور وہاں مدرس ہوگئے۔ یہاں مولانا کا قیام تین سال رہا پھر اپنے استاذ محترم مولانا عبدالکافی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طلبی پر الٰہ آباد تشریف لائے۔ یکم محرم ۱۳۲۵ھ کو مدرسہ سبحانیہ میں مولانا کا تقرر مدرس کی حیثیت سے ہوگیا۔ لیکن چار ہی ماہ کے بعد مولانا پھر مدرسہ اسلامیہ بہار شریف چلے آئے۔ اس دفعہ مولاناؒ کا قیام بہار شریف میں ڈیڑھ سال رہا کہ استاذ محترم کی شفقت نے پھر اپنی طرف کھینچا۔ اور ذی قعدہ ۱۳۲۶ میں مولانا پھر مدرسہ سبحانیہ میں بحیثیت مدرس کے تشریف لے آئے۔ اور ۱۳۲۹ھ تک پڑھانے کے فرائض انجام دیتے رہے۔

شعبان ۱۳۲۹ھ میں مولانا نے الٰہ آباد کو چھوڑا اور اب قیام کے ارادہ

[61] حضرت مولانا وحید الحق صاحب کا ۱۳۱۵ مطابق ۱۸۹۸ میں انتقال ہو چکا تھا یہ حافظ حکیم وحید الحق تھے۔

سے گیا تشریف لائے، اور گیا پہنچ کر مدرسہ انوار العلوم کو دوبارہ قائم کیا[۶۲]۔ مولانا صوبہ بہار کیوں تشریف لائے اور انوارالعلوم کیوں قائم کیا اس کی وجہ آگے آئے گی۔ بہر حال تھوڑے ہی عرصہ میں انوارالعلوم علوم عربیہ کا مرکز ہو گیا۔ گرچہ مولانا کو اس سلسلہ میں بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے پہلی ضرورت غریب طلبا کے کھانے کی ہوتی ہے۔ سرمایہ زیادہ تو تھا نہیں کہ کفایت کرسکے ۔اس لیے تھوڑے ہی روپیہ میں زیادہ طلبا کو کھلاتا تھا۔ بعض دفعہ کئی کئی روز تک طلبا اور مولانا بھی صرف چنے کھا کر گزارا کرتے۔ لیکن تکلیف نے کبھی بھی ارادہ میں ضعف یا قدموں میں لغزش نہیں پیدا کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا کی کوششیں کامیاب ہوئیں۔ مدرسہ کے لیے ایک شان دار عمارت بن گئی۔ طلبہ کو ہر قسم کی آسانیاں میسر آئیں، اور آج بھی یہ مدرسہ مولاناؒ کی یاد تازہ کررہاہے۔

فراغت کے بعد مولانا نے تقریباً سترہ اٹھارہ سال تک درس دیا۔ مولانا کا زمانۂ تدریس بہت شان دار اور کامیاب رہا۔ جس مدرسہ میں پڑھانے پہنچے وہاں کی حالت ہی بدل دی، مولانا کا پہنچ جانا مدرسہ کی کامیابی کی ضمانت تھی۔ فراغت کے بعد سب سے پہلے مولانا مدرسہ اسلامیہ بہار شریف آئے۔ اس وقت مولاناؒ کی عمر صرف ۲۳؍سال کی تھی، لیکن آتے ہی مدرسہ کا رنگ بدل گیا۔ طلبہ کا شوق، مدرسین کی جدوجہد اور مقامی حضرات کی توجہ اور دلچسپی ،ہر چیز میں اضافہ ہو گیا۔ یوں تو مدرسہ ایک عرصہ سے قائم تھا، مگر نہ کبھی طلبہ

[۶۲] مدرسہ انوارالعلوم مولانا عبدالوہاب صاحب فاضل بہاری مرحوم نے قائم کیا تھا لیکن مولانا موصوف کی علاحدگی کی وجہ سے مدرسہ ختم ہوگیا تھا۔ (رحمانی)

کی تعداد زیادہ رہی، اور نہ کبھی جلالین شرح وقایہ اور میر قطبی سے اونچے پڑھنے والے مدرسہ میں آئے، لیکن ایک ہی سال میں مولاناؒ کے درس کا ایسا شہرہ ہوا کہ طلبہ جوق در جوق آنے لگے۔ اور دوسرے ہی سال عربی کے نصاب کی آخری کتابیں ہونے لگیں۔ چنانچہ مولانا اصغر حسین صاحب نے ترمذی شریف وغیرہ مدرسہ اسلامیہ میں مولانا ہی سے پڑھی۔ پھر جب مولاناؒ بہار شریف سے مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد تشریف لے گئے۔ تو چند ہی دنوں بعد آپ کے درس کا ایسا چرچا ہوا کہ طلبہ کانپور چھوڑ کر الٰہ آباد تشریف لے گئے۔۔ باوجود یکہ کانپور میں اچھے اچھے فضلاء موجود تھے، چنانچہ مولانا کے شاگرد رشید مولوی عبدالحکیم صاحب مرحوم (مہتمم مدرسہ انوارالعلوم) کانپور میں پڑھتے تھے۔ محض مولاناؒ کے درس کی شہرت سن کر کانپور سے الٰہ آباد آگئے اور پھر ساری کتابیں مولانا ہی سے پڑھیں۔

مولاناؒ کا سلوک طلبا کے ساتھ اس درجہ بہتر تھا کہ ان دنوں اس کا تصور مشکل ہے، کھانے پینے، رہنے سہنے، پہننے، اوڑھنے میں مولانا نے کبھی امتیاز روا نہ رکھا۔ یہ ناممکن تھا کہ مولانا کھائیں، اور طالب علم بھوکا رہ جائے۔ بیمار طلبہ کے علاج کا نظم خود مولانا کیا کرتے تھے۔ حکیم کے یہاں لے جانا، دوالانا، دوا پلانا، تیمارداری کرنا۔ ان میں سے زیادہ کام مولانا خود اپنے ہاتھوں سے انجام دیا کرتے تھے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ طلبہ مولانا پر اپنی جان قربان کرنے کو تیار رہتے تھے، آج بھی مولانا کے جو شاگرد موجود ہیں، وہ اس وقت بھی مولانا کی شفقت اور مہربانیوں کو ہمیشہ یاد کرتے ہیں اور انھیں اس کا اعتراف ہے کہ جتنی خدمت مولانا نے ہماری کی ہوگی، اتنی خدمت ہم مولانا کی نہیں کرسکے ہیں۔

بہر حال یہ سترہ برس کا زمانۂ تدریس بھی مولانا کی زندگی میں بہت کامیاب وشاندار زمانہ ہے۔ ہندوستان میں بڑے فضلا اور کامیاب ترین درس دینے والے گذرے ہیں، اور آج بھی کچھ موجود ہیں، مگر کم لوگوں کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس قدر جلد علمی صفوں میں نمایاں ہوئے ہوں، جس قدر جلد اور جتنی کم سنی میں مولانا کے علم و تبحر کو اہل علم نے تسلیم کیا، اگر مولانا نے اپنی زندگی کا رخ دوسری طرف نہ پھیر دیا ہوتا، اور وہ برابر پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے تو بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہندوستان کے سب سے زیادہ کامیاب مدرس اور سب سے زیادہ شفیق استاد ہوتے۔

میں نے اوپر لکھا ہے کہ ۱۳۲۹ھ میں مولانا نے الٰہ آباد کو خیر باد کہا، اور گیا آکر مدرسہ انوارالعلوم میں روح پھونکی، اور اصل یہیں سے مولانا کی زندگی پلٹی کھاتی ہے، دھارے کا رُخ دوسری طرف پھرتا ہے۔

واقعہ اس طرح ہے کہ جب مولانا الٰہ آباد میں پڑھایا کرتے تھے تو ایک شخص رحیم خاں دریاآبادی مولانا سے پڑھنے آیا کرتے تھے۔ وہ صاحب انگریزی پڑھے ہوئے تھے، انگریزی اخبارات برابر لاکر مولانا کو سنایا کرتے تھے۔ جس میں ممالک اسلامیہ کے بارے میں بہت ہی تشویش ناک خبریں ہوا کرتی تھیں۔ جن سے مولانا کے دل و دماغ بہت متأثر ہوا کرتے تھے۔ اسی تاثر نے مولانا کے غوروفکر کے موضوع کو بدلا، وہ دماغ جو اب تک برابر مختلف علوم وفنون کی باریکیوں پر صرف ہوا کرتا تھا، اور وہ فکر رسا جو اب تک مشکل سے مشکل علمی مسائل کی گتھیاں سلجھانے میں کام آیا کرتی تھی وہ مسلمانوں اور ہندوستان کے دوسرے اہم مسائل تک بھی پہنچنے لگی۔ اور درس وتدریس کے

ساتھ ساتھ، مسلمانوں کے دوسرے مسائل پر غوروفکر میں بھی وقت صرف ہونے لگا۔ ایک مصلح کی تمام خوبیاں پہلے سے موجود تھیں، خداداد صلاحیت، ذکاوت وتدبر اور فکر رسا کی کمی نہ تھی۔ ان سب چیزوں میں قدرت نے کم از کم مولانا کے ساتھ بخل نہیں کیا تھا بلکہ وافر عطا کی تھیں۔ ایسے دل ودماغ کے لیے مدرسہ کی چہار دیواری کافی نہیں ہوسکتی، اور نہ ایک ہی کتاب کا ہر سال پڑھتے پڑھاتے رہنا دلچسپی کا باعث ہوسکتا ہے، اُسے وسعت کی ضرورت تھی، جب دوسرے مسائل سامنے آگئے تو وسعت مل گئی۔ پہلے مولانا کے سامنے صرف مدرسہ کے مدرسین، طلبا یا اس کے ہمدرد ومتعلقین تھے۔ اب ان کی نگاہ کے سامنے دنیا میں بسنے والا ہر ایک مسلمان اور ہندوستان میں رہنے والا ہر ایک انسان تھا۔ پہلے ان کے دماغ کی خوراک مروّجہ علمی مسائل تھے، اب دنیائے اسلام میں عموماً اور ہندوستان میں خصوصاً روزانہ پیدا ہونے والے نئے نئے معاملات تھے۔ بس اب کیا تھا، مولانا نے وہ چیز پالی جس کی انھیں ضرورت تھی، ضرورت ہی نہیں جس کے لیے وہ پیدا کیے گئے تھے۔ چند ہی روز کے غور وفکر کے بعد دماغ نے فیصلہ کیا اور صمیم فیصلہ کیا کہ درس وتدریس سے بھی زیادہ اہم ملک وملّت کے دوسرے کام ہیں۔ ان ہی حالات میں گیا آئے، اور مدرسہ کھولا۔ مدرسہ کھولنے کے دو مقصد تھے، ایک تو یہ کہ اپنی زندگی کے اس دور کی یادگار ہمیشہ کے لیے باقی رہ جائے اور صحیح معنوں میں تعلیمی سلسلہ جاری رہے۔ دوسرے یہ کہ لوگوں میں تعارف ہوجائے، لوگوں کو اس کا موقع ملے کہ مولانا کو جانچیں اور پرکھیں۔ اور مولانا قومی اور سیاسی کاموں کے لیے فضا کو ہموار اور راستہ کو صاف کرسکیں، چنانچہ مولانا نے گیا پہنچ کر قومی اور ملکی کاموں میں حصّہ

لینا شروع کر دیا۔ علماء کی تنظیم، جمعیۃ علماء کا قیام، تمام مدارس عربی میں ایک اصلاحی نصاب کا اجرا، امارت شرعیہ کی اسکیم وغیرہ، یہ سب چیزیں مولانا کے دماغ نے گیاہی میں پیدا کیں۔ اور اسی زمانہ میں مولانا نے اپنی اسکیموں کو عملی شکل بھی دینا شروع کر دی۔ چنانچہ ۱۹۱۷ء میں مولانا نے انجمن علماء قائم کی جس کے دو برس کے بعد ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علماء ہند دہلی کا قیام عمل میں آیا۔ بہر حال گیا آنے کے بعد مولانا رفتہ رفتہ تعلیمی مشغلہ سے کنارہ کش ہوتے گئے۔ اور قومی میدان میں مولانا کا قدم بڑھتا گیا۔ پھر ایک زمانہ وہ آیا کہ مولانا کی زندگی کا ہر لمحہ قومی و ملکی کاموں کے لئے صحیح معنی میں وقف ہو گیا، سیاسی زندگی میں آنے کے بعد مولانا خود اپنے سے، بیوی گھر اور جائداد سے بالکل بے پروا ہو گئے۔ جیسے کوئی چیز ان کی نہ ہو۔ بچوں کی بیماری کی علالت، رشتہ داروں کی مصیبت، خود اپنی تکلیف، حد یہ کہ جگر پاروں کی موت غرض یہ اور اسی قسم کی تمام چیزوں پر قومی کام مقدم تھا۔

مولانا کا بڑا لڑکا ''حسن سجاد'' میرا ہم عمر، میں نے اور حسن نے حدیث شریف کی کتابیں ساتھ پڑھیں، دیوبند سے بیمار ہو کر مکان پہنچا۔ یہ واقعہ زلزلہ کے بعد کا ہے۔ مولانا زلزلہ زدہ علاقوں کا دورہ فرما رہے ہیں۔ حضرت مولانا احمد سعید صاحب بھی ساتھ ہیں۔ تار ملتا ہے کہ ''حسن'' بیمار ہے۔ مولانا خط کے ذریعہ جواب دے دیتے ہیں، پھر تار آتا ہے کہ "حالت خراب ہے"، مولانا بذریعہ تار ہدایت فرماتے ہیں۔ کہ میڈیکل کالج پٹنہ کے شفاخانہ میں داخل کرکے علاج کراؤ۔ پھر تار آتا ہے کہ "زندگی کی کوئی امید نہیں"، غور فرمایئے، جوان بیٹا ہے، ابھی ابھی تعلیم سے فارغ ہوا ہے۔ اور موت وحیات کی کشمکش میں

مبتلا ہے لیکن اسی اصول پر کہ سب کاموں پر قومی کام مقدم ہے، مولانا سفر فرما رہے ہیں، جب مولانا احمد سعید صاحب وغیرہ مجبور کر کے گھر روانہ کرتے ہیں تو آتے ہیں۔ مگر ایسے وقت پر کہ مولانا بیمار بیٹے پر صرف حسرت کی نگاہ ڈال سکے، اور بیٹا تو یہ بھی نہ کر سکا۔ اسی پر بس نہیں، شام کو تجہیز و تکفین سے فارغ ہوئے، اور صبح ہی سفر پر روانہ ہو گئے۔ شاید ایک یا دو دن کے بعد۔

مولانا کے سیاسی کیرکٹر میں بہت ہی اہم اور نمایاں پہلو خلوص وللّٰہیت کا ہے۔ مولانا نے بڑے سے بڑا اقتدار ہاتھ میں آنے کے بعد کبھی بھی اپنی یا اپنے قرابت مندوں کی نفع رسانی کی طرف توجہ نہیں کی۔ ذرا غور کیجیے کہ مولانا سجاد کا صوبہ بہار کے چوالیس لاکھ مسلمانوں پر پورا اقتدار ہے۔ بیسیوں کو اسمبلی اور کونسل کا ممبر بنواتے ہیں۔ ممبروں کو وزارت اور وزارتِ عظمیٰ کے عہدوں پر فائز کرتے ہیں، صوبہ بہار کی حکومت مولانا اور صرف مولانا کی ہے۔ وزراء کو مولانا کا حکم خوشی سے یا ناخوشی سے بجالانا ضرور پڑتا ہے، سب کچھ ہے، لیکن وہی مولانا اپنے پریشان حال داماد مولوی علی حسن صاحب [63] رونق کو پانچ روپے

[63] علی حسن رونق استھانوی کا وطن استھانواں بہار شریف ہے جو حضرت مولانا کی سسرال تھی، کنیت ابوالجمال تھی اور رونق تخلص تھا، والد کا نام سید ابوالحسن اور دادا کا وارث علی تھا، علمی خانوادہ سے تعلق تھا، دادا کی نسبت سے اب تک اہل خاندان وارثی لکھتے ہیں، ان کے والد بہار شریف میں خانقاہ محلہ میں معلم تھے اور چچا مولانا ابوالبرکات استھانوی بھی سجادہ نشیں خانقاہ مخدوم الملک بہار شریف حضرت شاہ امین فردوسی کے خلیفہ اور ممتاز عالم تھے، اور ایک بھائی مولانا عبدالغفور شر راستھانوی ندوی ندوۃ العلماء میں معاون ناظم تھے، ایک بھائی حافظ صدرالحسن صاحب فاضل مدرسہ عزیزیہ بہار شریف ایک سرکاری اسکول میں مدرس تھے۔ منشی حبیب الرحمن بہاری سے مدرسہ عزیزیہ میں فن خطاطی سیکھی، پنجاب میں

تعلیم حاصل کی، اس کے بعد مدرسہ امینیہ دہلی ، اور ندوہ میں بھی کچھ عرصہ رہے، پھر گیا تشریف لائے اور اپنے رضاعی بھائی مولانا خیر الدین صاحب گیاوی سے عربی اور حکیم محمد ابراہیم صاحب گیاوی سکریٹری طبیہ کالج گیا سے طب کی تحصیل کی اور علامہ اسماعیل رساؔ گیاوی سے شاعری میں بھی اصلاح لی، پھر مدرسہ انوارالعلوم گیا میں پڑھا، عجب نہیں کہ یہیں حضرت مولانا سجاد صاحب سے تلمذ حاصل ہوا ہو، پھر مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں داخلہ لے کر ۱۹۲۸ء میں فاضل کی سند حاصل کی، اور پٹنہ ہومیو پیتھک نیشنل کالج سے ہومیو پیتھک علاج کی سند بھی حاصل کی، اس طرح قدیم وجدید طب اور علوم اسلامیہ کی تکمیل کی، اور عالم، شاعر خطاط اور اچھے حکیم بنے، کچھ دنوں اورنگ آباد دکن میں بھی رہے، اور نواب فصاحت جنگ جلیل مانک پوری سے اصلاح لی، وہیں مشہور شاعر دردؔ کاکوروی (نذرالرحمن یا میر نذر علی درد) سے بھی ان کے مراسم رہے، درد کے ہدیہ کے ہوئے اپنے کئی مجموعہائے اشعار کتب خانہ الفلاح میں موجود ہیں جن پر " حضرت مولانا علی حسن رونق استھانوی زید لطفہ۔ درد کاکوروی" لکھا ہے، نیز دیگر شعراء کے ساتھ بھی دکن میں صحبتیں رہیں، تمناؔ عمادی سے بھی شاعری میں اصلاح لی، اور انہوں نے ان کی تحسین فرمائی، شروع میں اخبارات ورسائل میں مضامین بھی لکھے لیکن بعد میں صرف اپنا کلام اخبارات میں شائع کرانے پر اکتفا کر لیا، راقم کی نظر سے جامعہ رحمانی مونگیر کے ترجمان الجامعہ کے ۱۹۳۰ کے شماروں میں ان کے متعدد مضامین گذرے ہیں، جن میں ان کے نام کے ساتھ استاد جامعہ رحمانی لکھا ہے، جس سے ان کی وہاں تدریس کا پتہ چلتا ہے، اپنے وطن میں مدرسہ محمدیہ کے قیام کے بعد وہاں بھی کچھ دنوں تدریسی خدمت انجام دی۔ اخیر میں مدرسہ عزیزیہ میں مدرس ہوگئے تھے اور تقریباً بیس سال خدمت انجام دے کر ۱۹۸۰ کے قریب ملازمت سے سبکدوش ہوئے، اور دس سال بہار شریف میں محلہ لہیری کے ایک چھوٹے سے حجرہ میں گذار کر ۱۹۹۳ میں وفات پائی، ان کی شاعری اہم اخبارات ورسائل میں شائع ہوتی رہی ہے لیکن صرف چند اشعار ہی یکجا ہوسکے، اگر پورا کلام محفوظ رہتا تو ضخیم دیوان ہوتا، چند چھوٹے چھوٹے مجموعے شائع ہوئے، جن میں "دیوان رونق" نامی ایک ستر اسی صفحہ کا

کتابچہ ہے جو بہت پہلے ہی بھیروپٹی چک بہاؤ الدین دربھنگہ سے مطیع الرحمن غوثی صاحب نے ۱۹۳۶ میں شائع کیا تھا، اس کے علاوہ لمعات رونق اور ضرب رونق مسمی بہ اشک رونق اور اسی طرح کے دو تین چھوٹے چھوٹے مجموعے شائع ہوئے ہیں، جس میں دوسروں کا بھی کچھ کلام شامل ہے۔ لیکن بقیہ کلام کا بڑا حصہ اخبارات ورسائل کے دفینوں میں گم ہوگیا، ایک چند اوراق کی " مثنوی یاد وطن " بھی ان کی یادگار ہے جو وطن کے اہل کمال کے اجمالی حالات اور اس سے اظہار محبت کے جذبات پر مشتمل ہے۔ درحقیقت یہ مثنوی حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی کی مثنوی " خواب وطن " کی تقلید میں اور اسی نہج پر لکھی گئی ہے۔ اوپر مذکور کچھ حالات دیوان رونق کے دیباچہ سے ماخوذ اور کچھ شنیدہ ہیں، ان کے ایک شاگرد جناب پروفیسر سید امتیاز صاحب علیگ سابق پروفیسر علامہ اقبال کالج بہار شریف ساکن محلہ بارہ دری (بہار شریف) ہیں جو ایک اچھے شاعر اور ممتاز اہل صلاح بزرگوں میں اور تبلیغی جماعت کے سرگرم رکن ہیں، انہوں نے مولانا موصوف سے شاعری میں اصلاح لی ہے، موصوف ان کی وفات پر اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں:

"۱۹۹۳۔۴۔۵۔ سموار ـــــ آج حضرت مولانا رونق صاحب اس دنیائے رخصت ہوگئے ، آج رات عشاء کے قریب مائک سے اعلان ہوا تھا، موصوف ایک عرصہ سے ذی فراش تھے ، انتقال کہنہ سرائے میں فیروز نیر کے مکان پر ہوا جہاں وہ ادھر چند مہینوں سے مقیم تھے، وہ ہمارے استاد تھے ، غالباً ۱۹۶۰ سے ہی میرا ان کا تعلق تھا، جس زمانہ میں مجھ پر شاعری کا بھوت سوار تھا، اصلاح کی غرض سے میرا اکثر مولانا سے ملتا ہوتا رہتا تھا، اس زمانہ میں لہیری محلہ میں رہا کرتے تھے ، مدرسہ عزیزیہ سے سبکدوش ہوجانے کے بعد ایک زمانہ تک جامع مسجد میں مقیم رہے، مولانا ایک جید عالم اور عربی اور فارسی زبان پر کامل عبور رکھتے تھے ، اس کے علاوہ ایک پختہ اور کہنہ مشق شاعر ، طبیب اور ہومیو پیتھ ڈاکٹر بھی تھے ، لیکن مزاج میں بہت زیادہ آزادی تھی، کہ کسی پابندی کو قبول نہیں کرسکتے تھے ، اسی لئے ایک عرصہ سے باوجود اہل وعیال کی موجودگی کے تنہا ہی رہا کرتے تھے۔ اگلے دن ۶ تاریخ منگل کی ڈائری میں لکھتے ہیں: "آج مولانا رونق کی نماز ۹ بجے دن میں جامع مسجد میں

کی نوکری نہیں دلواسکتے۔ آپ نے دیکھا، دوسروں کے معاملہ میں اتنا بااختیار اور اپنے معاملہ میں اتنا بے بس! یہ تھا مولانا کا سیاسی کیرکٹر جس کو انھوں نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ ایک دو نہیں چھوٹے بڑے ملاکر سیکڑوں قائد ور ہنما ہندوستان میں موجود ہیں۔ لیکن انہیں ذرا اس کسوٹی پر تو پرکھ کر دیکھئے۔

یوں تو مولاناؒ میں سیاسی خیالات کی نشوونما ۰۹۔ ۱۹۰۸ء ہی سے ہو رہی تھی۔ لیکن ۱۹۱۵ء سے وہ زمانہ شروع ہو گیا۔ جہاں سے مؤرخ "مولانا کی سیاسی خدمات" کا باب شروع کر سکتا ہے۔ ابتداءً دو چار برس مولانا نے سیاسی زندگی کے ساتھ تعلیمی مشغلہ کو بھی جاری رکھا۔ لیکن پھر مولانا تمام چیزوں سے علاحدہ اور کنارہ کش ہو گئے۔ اور پوری طرح اپنی اسکیموں کو کامیاب بنانے میں اپنا وقت صرف کرنے لگے۔ اس طرح کم و بیش چوبیس پچیس برس مولانا نے قومی وسیاسی زندگی گزاری۔ اس میں مولانا نے تمام نشیب وفراز دیکھے۔ سخت سے سخت مصیبتیں جھیلیں۔ لوگوں کی زبان سے گالیاں بھی سنیں۔ اور پھر ان ہی کے ہاتھ سے پھولوں کے ہار بھی پہنے۔ ایسا بھی ہوا کہ گاؤں والوں نے تقریر نہیں کرنے دی اور گویا نکال دیا۔ اور یہ بھی دیکھا کہ مولانا کی سواری کے ساتھ دو دو کوس تک

گاؤں والے خوشی میں نعرہ لگاتے، دوڑے چلے جارہے ہیں۔

ہوئی، شہر کے لوگ باوجود اعلان کے بہت کم جمع تھے، نماز قاری طیب صاحب پیش امام جامع مسجد نے پڑھائی، بعدہ جنازہ بذریعہ ٹرک موضع پنہسہ لے جایا گیا، جہاں دوسری جماعت ہوئی اور وہیں مسجد کے احاطہ میں مدفون ہوئے"۔

مولانا کی سیاسی زندگی پر جو بھی قلم اٹھائے گا، وہ یہ لکھنے پر مجبور ہوگا کہ مولانا نے کامیاب اور شاندار سیاسی زندگی گزاری۔ ایک طرف مولانا نے امارت قائم کرکے اس اہم ترین مسئلہ کو حل کیا کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں کس طرح رہنا چاہیے۔ دوسری طرف مولانا نے اسمبلی اور کونسل پر قبضہ کرکے وزارت قائم کی، سیاسی اقتدار و قوت اپنے ہاتھ میں لی۔ اور یہ بتلایا کہ طاقت و قوت کا کیا مصرف ہے، اور دنیا کس طرح چلائی جاتی ہے۔

بہرحال یہ چند باتیں تو جذبات کی رو میں قلم سے نکل گئیں۔ ورنہ "مولانا کی سیاسی زندگی"، میری تحریر کا موضوع نہیں۔ جن کا یہ موضوع ہے اس پر لکھنے کے وہی حق دار ہیں اور وہ اس حق کو مجھ سے بہتر انجام دے سکتے ہیں۔ لیکن اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مجھے بہت سے رہبروں اور رہنماؤں سے شرف ملاقات حاصل ہے۔ لیکن وہ مولانا کی طرح مذہب کی لگن، قوم و ملک کا جنون، کام کا سودا، اور پھر اس سلسلہ میں پوری طرح "خود فراموشی" میں نے کسی اور میں نہیں دیکھی۔

مولانا کی تین شادیاں ہوئیں۔ پہلی شادی انیس برس کی عمر میں (۱۳۲۰ھ [۱۹۰۲] میں) مولانا سیّد وحید الحق مرحوم ناظم مدرسہ اسلامیہ بہار شریف کی صاحبزادی سے ہوئی۔ یہ بیوی چودہ برس تک زندہ رہیں۔ ان سے پانچ اولادیں ہوئیں۔ دو لڑکے تین لڑکیاں۔ جن میں سے اب صرف صاحبزادی موجود ہیں۔

پہلی بیوی کے انتقال کے دو برس بعد (۱۳۳۶ھ [تقریباً ۱۹۱۸ء]) گیلانی میں خان بہادر مولانا سیّد عبدالعزیز صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی۔ ان

سے چھ اولادیں ہوئیں۔ تین لڑکے، تین لڑکیاں۔ اب صرف دو موجود ہیں۔

مولانا کی دوسری اہلیہ جن کا ابھی ذکر ہوا۔ وہ کچھ عرصہ کے بعد بہت
علیل رہنے
لگیں۔ اور آنکھوں سے بالکل مجبور ہو گئیں۔ گھر کا کام اور بچوں کا کام بھی ان
سے ناممکن ہو گیا، اس وقت مولانا نے تیسری شادی گیا میں ایک بیوہ سے کی، ان
سے بھی ایک اولاد ہوئی تھی۔

مولانا ایک خوش حال کاشت کار گھرانے کے فرزند تھے، زمین داری
بھی تھی مگر مختصر، مولانا کے والد مرحوم ٹھیکہ داری بھی کرتے تھے، جس سے
انھوں نے اپنی جائداد کو ترقی دی تھی جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، مولانا کے والد کا
انتقال تو ۱۳۰۴ھ [۱۸۸۸ء] میں ہو چکا تھا اس وقت مولانا کے بڑے بھائی مولوی
احمد سجاد صاحب بھی کچھ زیادہ بڑے نہ تھے۔ لیکن جائداد کا نظم وہی کرتے
رہے۔ پھر جب مولانا فراغت کے بعد مدرسہ اسلامیہ میں مدرس ہوئے تو مکان
صرف چھ میل کے فاصلہ پر تھا، خود دیکھ بھال کرتے رہے۔ اس طرح دونوں
بھائیوں کی توجہ سے کچھ عرصہ تک جائداد کا نظم اچھی طرح ہوتا رہا۔ گھر میں ہر
طرح کی خوش حالی رہی۔ لیکن پھر صورتِ حال یہ ہوئی کہ ایک طرف مولوی
احمد سجاد صاحب پر مجذوبانہ کیفیت طاری ہوئی، انھوں نے گھر چھوڑ کر راجگیر کی
پہاڑیوں کی راہ لی۔ اور مولانا کی قومی وسیاسی مشغولیت روز بروز بڑھنے لگی۔
نوکروں پر جائداد کا مدار رہا اس لیے کاشت کاری وغیرہ کی حالت خراب ہوتی
گئی۔ پھر مولانا کی مشغولیت نے یہ معلوم کرنے کی فرصت بھی نہ دی کہ کس

زمین کا "مال" یا "مال گزاری" ادا ہوئی، کس کی باقی ہے۔ اور کونسی نیلام ہو چکی،
کونسی نیلام ہونے والی ہے۔ ایک دفعہ پٹنہ میں مولانا ایک وکیل صاحب کے
یہاں جارہے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ وہاں کیا کام ہے؟ فرمانے لگے کہ
چوبیس بیگہہ زمین مال گزاری ادانہ کرنے کے باعث نیلام ہو گئی۔ مجھے پہلے کوئی
اطلاع نہ تھی اس لیے وکیل صاحب کے پاس جارہا ہوں کہ اب اس کے بچانے
کی کوئی شکل ہو سکتی ہے یا نہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد مولانا واپس ہوئے تو میں نے
دریافت کیا کہ کیا ہوا؟ فرمایا کہ نیلام ہوئے کچھ عرصہ ہو گیا۔ اب اس کی واپسی
مشکل ہے، مجھے جواب دے کر دوسرے کاموں میں لگ گئے۔ میں حیران تھا کہ
ذرا اس مرد مجاہد کے ایثار اور استغناء کو تو دیکھئے، کم از کم پانچ ہزار روپے کی
جائداد ہاتھ سے نکل گئی، اور ذرا خیال بھی نہ آیا۔

آخر زمانہ میں مولانا کو تصوف سے کچھ زیادہ ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ تسبیح
برابر ہاتھ میں رہا کرتی تھی، جہاں موقع ملا، ٹہل ٹہل کر یا بیٹھے بیٹھے تسبیح پڑھا
کرتے تھے، اور بعض تصوف کے مسائل پر گفتگو بھی فرماتے، اور خاص لوگوں
کو کبھی کبھی تعویذ بھی دے دیا کرتے تھے۔

روحانی تعلیم

مولانا پہلی شادی کے بعد ہی حضرت قاری سیّد احمد صاحب شاہ جہاں
پوری سے مرید ہو چکے تھے، موصوف خاندان نقشبندیہ کے ایک متشرع بزرگ
تھے۔ مولانا کے خسر مولانا سیّد وحید الحق صاحب اور اطراف بہار کے بہت سے
لوگ جناب قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی سے مرید تھے۔ مولانا کے والد ماجد
جناب قاری صاحبؒ کو پہنہسہ لا کر خود بھی مرید ہوئے تھے۔ اور خاندان کے

دوسرے لوگ بھی، مولوی احمد سجاد صاحب کو بھی موصوف ہی سے بیعت حاصل ہے۔

مولانا کا سراپا

مولانا کا قد لانبا تھا۔ میرے خیال میں چھ پونے چھ فٹ سے کم نہ ہوگا۔ دبلے پتلے، سانولا رنگ، چوڑا دہانہ، لانبی اور کچھ اونچی ناک، متوسط درجہ کی آنکھیں، جن میں ہر وقت محبت بھری رہتی تھی۔ لانبا چہرہ، اس پر کشادہ پیشانی، سر کے بال بہت نرم، ہوا میں ریشم کی طرح اُڑتے تھے۔ پیشانی کے اوپر کے بال غور وفکر کی نذر ہوگئے تھے۔ مونچھیں گھنی اور داڑھی ہلکی، رخساروں پر کم اور ٹھڈی پر زیادہ تھی۔

مولانا ہمیشہ بہت سادہ اور معمولی لباس پہنتے۔ پیر میں پرانی وضع کا معمولی جوتا جو اکثر پھٹا رہتا تھا۔ پرانے ہی وضع کا کھدر کا پائجامہ، کھدر کا لانبا کرتا، جس میں گریباں کے دونوں طرف بڑی جیبیں جو ہر وقت کاغذ سے بھری رہتی تھیں، اس کے اوپر ایک بنڈی۔ سر پر کھدر کا ایک بڑا سا عمامہ جو خراب طریقہ سے بندھا رہتا تھا۔ یہ تو گرمی کا لباس ہوا۔ جاڑے میں عمامہ کے علاوہ یہی سب چیزیں موٹے اور معمولی اونی کپڑے کی ہوا کرتی تھیں۔ داہنے ہاتھ میں ایک بھاری اور موٹی سی لکڑی، جس کے نیچے وزنی لوہا لگا ہوا تھا، بائیں ہاتھ میں چھوٹا سا اٹیچی، جس میں کاغذ، روشنائی اور ضروری کاغذات بھرے رہتے تھے۔

مولانا کی سادہ زندگی

مولانا کھانا بھی بہت سادہ اور معمولی کھاتے تھے۔ میرے علم میں اپنے اختیار سے مولانا نے کبھی بھی اپنے لیے اچھے کھانے کا نظم نہیں کیا۔ اگر حساب

لگایا جائے تو مولانا نے برسوں ہوٹل کی خمیری روٹی اور گائے کا کباب کھایا ہے۔ ایک دفعہ مجھے مولانا کے یہاں کھانے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت مولانا پھلواری شریف میں کرایہ کا مکان لے کر اہل وعیال کے ساتھ مقیم تھے۔ دستر خوان بچھا۔ گھر سے جو کھانا آیا اس کی فہرست یہ تھی: موٹے اور لال چاول کا پکا ہوا بھات، تیل میں بگھری ہوئی پتلی دال، اور آلو کا بھرتا جس میں پیاز پڑی تھی مگر بگھارا نہیں گیا تھا۔ مولانا نے محض میری وجہ سے ہوٹل سے گوشت منگوالیا تھا۔

مجھے کبھی پنہسہ جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اس لیے مولانا کے مکان کی صحیح تصویر تو نہیں کھینچ سکتا، معتبر ذرائع سے اتنا ضرور سنا ہے کہ پہلے تو اچھی حالت میں تھا لیکن آٹھ دس برس سے وہ بھی بری حالت میں ہے، لیکن ۱۹۳۷ء میں جب مولانا نے وزارت قائم کی تھی تو میں پٹنہ آیا ہوا تھا، اور نواب عبدالوہاب خاں وزیر مالیات کا مہمان تھا۔ میں اور نواب صاحب کے بھائی مسٹر وصی احمد خاں وکیل مولانا سے ملنے پھلواری شریف گئے۔ کچھ عرصہ سے مولانا نے پھلواری ہی میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ مکان کرایہ کا تھا۔ مٹی کی دیواریں، اور کھپریل کی چھت۔ اندر کتنی وسعت تھی اس کو تو میں نہیں کہہ سکتا، لیکن باہر جس میں مولانا تشریف فرماتے۔ وہ دو دروازوں کی ایک کوٹھری تھی، ایک باہر سے آنے کے لیے، اور ایک زنان خانہ میں جانے کے لیے۔ کوٹھری میں ایک طرف مٹی ہی کا اونچا چبوترا تھا۔ اس پر ایک چارپائی پڑی ہوئی تھی جس کے سرہانے مولانا کا بستر بندھا ہوا رکھا تھا۔ چارپائی کے نیچے کھجور کی چٹائی بچھی تھی۔ اس پر قلم ودوات، کچھ کتابیں اور مولانا کی وہی اٹیچی رکھی تھی۔ ایک طرف موٹے ٹین کے دو بکس تھے۔ ایک میں کتابیں، دوسرے میں

کپڑے، چبوترے سے نیچے ایک کونے میں مٹی کا گھڑا، وہیں پر تانبے کا ایک بڑا
لوٹا، اور دوسرے کونے میں مولانا کی وہی لکڑی کھڑی تھی، غرض یہ تھا صوبہ
بہار میں حکومت قائم کرنے والے کے گھر کا اثاثہ۔ خیر مجھے تو کوئی حیرت نہ
ہوئی، کہ میں مولانا سے واقف تھا، لیکن مسٹر وصی احمد خاں تو حیرت سے
کھڑے رہ گئے۔ مولانا اسی کھری چارپائی پر بستر کا تکیہ لگائے کتاب کا مطالعہ کر
رہے تھے۔ اُٹھے، اخلاق سے ملے، اسی چٹائی پر ہم سب بیٹھے۔ لوٹتے وقت راستہ
میں مسٹر وصی کہنے لگے۔ کہ اس قسم کے لوگوں کے متعلق کتابوں میں ضرور
پڑھا تھا، مگر دیکھا آج ہی ہے۔ اس منظر کو وصی صاحب آج تک بھول نہیں
سکے۔

آخر وہی ہوا جو برابر ہوتا چلا آیا ہے۔ اور ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ مولانا
امارت شرعیہ کے کام سے ضلع چمپارن کا دورہ فرمارہے تھے۔ وہیں ملیریا میں مبتلا
ہوئے۔ پھلواری واپس آئے، نوروز بخار میں رہ کر ۱۷ر شوال ۱۳۵۹ھ مطابق
۱۸ر نومبر ۱۹۴۰ء روز دوشنبہ پونے پانچ بجے شام کو رفیق اعلیٰ سے جاملے۔ اِنا للہ
واِنا اِلیہ راجعون۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ۵۹ برس ساڑھے آٹھ ماہ عمر پائی۔ جسے مولانا
کے ساتھ رہنے کا کچھ بھی موقع ملا ہے، وہ مولانا کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔
ہر وہ شخص جس نے مولانا کی زندگی کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ اس اعتراف پر مجبور ہے
کہ اتنے بہتر دل ودماغ کا مالک، فکر وعمل کا ایسا جامع، ایثار وقربانی کا ایسا پتلا، علوم
وفنون کا ایسا ماہر، خلوص وللّٰہیت کا ایسا مجسمہ، اور پھر ان ساری بڑائیوں کے ساتھ
ایسا منکسر اور متواضع شخص کم دیکھا گیا ہے۔

حضرت مولاناؒ کے محاسن کو بتلانے اور آپ کی سوانح کے ہر پہلو کو
نمایاں کرنے کا کام چند اوراق میں نہیں ہو سکتا، اس کے لیے اچھی خاصی کتاب
لکھنے کی ضرورت ہے، خدا کرے یہ آرزو جلد پوری ہو جائے۔

خدا مولانا کے مراتب بلند فرمائے، اور ہم لوگوں کو ان کے نقش قدم
پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

میں نے اس مضمون میں بڑی حد تک اپنی ذاتی معلومات پر بھروسہ کیا
ہے اور اس سلسلہ میں کافی مواد مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے بھانجے مولوی خلیل احمد
صاحب کے اس تفصیلی خط سے ملے، جو دریافت حالات پر موصوف نے مولانا
عبد الصمد صاحب رحمانی ناظم امارت شرعیہ کو لکھا تھا، اور مولانا موصوف سے
مجھ کو ملا۔[۶۴]

[۶۴] حیات سجاد، ص،۷

مولاناؒ اور مجلس قانون ساز[65]

حضرت مولانا سیّد منت اللہ رحمانیؒ

۱۹۳۴ء میں مرکزی اسمبلی کا انتخاب ہوا۔ بہار سے تین مسلمانوں کی نشستیں تھیں، مولاناؒ نے امارت شرعیہ بورڈ کی طرف سے اس الیکشن میں حصّہ لینے کا فیصلہ کیا۔ امارت کے تین امیدواروں میں دو تو بلا مقابلہ کامیاب ہوگئے۔ صرف ترہت کی نشست میں مقابلہ ہوا۔ امارت کے امیدوار جناب عبدالحمید خان صاحب تھے، اور ان کے مقابلہ میں جناب مولوی شفیع داؤدی صاحب تھے۔ ذاتی حیثیت سے ان دو امیدواروں میں کوئی نسبت ہی نہ تھی۔ ترہت میں مولوی شفیع داؤدی کے اثرات بہت تھے، اور اُن کے مقابلہ میں مولوی عبدالحمید خاں صاحب کی کوئی شخصیت ہی نہ تھی۔ پھر بھی مولاناؒ کے تدبر نے اس انتخاب کو بہت اہم بنادیا۔ اگرچہ امارت کو تقریباً ایک سو ووٹ سے ناکامی ہوئی لیکن وہ نتیجہ تھا اپنی غلطیوں کا، کاش مولاناؒ کی ہدایتوں پر عمل کیا جاتا تو یہاں

[65] مجالس آئین ساز اور ان کے ذریعہ ملکی وملّی مسائل کے سلجھانے کے سلسلہ میں مولانا سجاد رحمۃ اللہ علیہ نے جو خدمات انجام دیں، ان کی فہرست طویل ہے۔ مولانا سیّد منت اللہ صاحب نے اس مضمون میں صرف ان کاموں کی نشان دہی کی ہے، جو ۱۹۳۴ء اور اس کے بعد صوبہ بہار کی مجلس قانون ساز اور بہاری نمایندوں کے انتخاب کے سلسلہ میں مولاناؒ کے ہاتھ انجام پائے۔ مضمون گو مختصر ہے، پھر بھی اس سے مولاناؒ کے آئینی دماغ اور اس کے "ثمرات" کا اجمالی اندازہ ہوجاتا ہے۔ (م)

بھی کامیابی قدم چومتی۔ اِس انتخاب کے سلسلے میں مجھے بھی کام کرنے اور مولاناؒ کے ہمراہ دورہ کرنے کا اتفاق ہوا۔ اس دوران میں انتخاب کے متعلق مولاناؒ کے خیالات معلوم کرنے کا موقع ملا۔ مولاناؒ انتخاب میں اپنے امیدوار کی کامیابی یا ناکامی کو کوئی اہمیت ہی نہ دیتے تھے۔ مولانا علیہ الرحمۃ تمام کام کرنے والوں کو یہی سمجھایا کرتے کہ الیکشن میں اصل چیز امیدوار کی کامیابی نہیں، بلکہ اپنے مقاصد کی نشرواشاعت ہے۔

۱۹۳۶ء ہی سے بہار میں مجلس قانون ساز کے عام انتخابات کی تیاریاں ہونے لگیں، مولانا علیہ الرحمۃ نے بھی بہار مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کی بنیاد ڈالی، جس کا سیاسی نقطۂ نگاہ ہندوستان کی مکمل آزادی اور مذہبی نقطۂ نگاہ امارت شرعیہ کے فیصلوں کی پابندی تھی۔

پارٹی کے قیام کے دوران میں مولانا سے تفصیلی گفتگو کے مواقع آئے اُس وقت میں نے محسوس کیا کہ مولاناؒ مسلمانوں اور ہندوستان کے تمام مسائل پر اسلامی نقطۂ نگاہ سے غور فرمایا کرتے ہیں۔ مولاناؒ کا ایمان تھا کہ اسلامی نظام حکومت وزندگی ہی بنی نوعِ انسان کے دینی اور دنیاوی فلاح کا ضامن ہوسکتا ہے۔ چنانچہ وہ ہر مسئلہ کو اسی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ وہ ہندوستان کی آزادی کے اس لیے خواہاں تھے کہ اسلام غلامی کا سب سے بڑا دشمن ہے، وہ سرمایہ پرستی کے اس لیے مخالف اور کمزوروں اور غریبوں کے حامی تھے کہ اسلام کے مقرر کردہ معاشی نظام کے ذریعہ غربت کو خوش حالی اور کمزوری کو قوت سے بدلا جاسکتا ہے۔ میرے خیال میں مولاناؒ کا یہ نظریہ ہی ان کی بڑی خصوصیت تھی جس میں وہ شاید منفرد تھے۔

الیکشن میں حصّہ لینے کے سوال پر مولانا علیہ الرحمۃ نے مجھ کو بتلایا کہ ہر قوم یا جماعت کی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ سیاسی اور آئینی طاقت حاصل کرے، خصوصاً اس آئینی دَور میں تو اس کے بغیر کسی سیاسی جماعت کا زندہ رہنا ہی مشکل ہے۔ مولانا علیہ الرحمۃ کا خیال تھا کہ مسلمانوں کا اصل مقصد تو ہندوستان میں اسلامی حکومت کا قیام ہے۔ اس لیے کہ موجودہ تمام طریق حکومت میں اسلامی حکومت ہی کا نظام مکمل ہے۔ لیکن چوں کہ بحالات موجودہ براہِ راست اسلامی حکومت کے قیام کی راہ میں مشکلات ہیں۔ اس لیے سردست کم از کم ایک ایسی مشترکہ حکومت کے قیام کی کوشش کی جائے جہاں مسلمانوں کے لیے مخصوص نظام ہو۔ مولاناؒ کا خیال تھا کہ جس حکومت میں یہ بھی نہ ہو وہ آزاد حکومت نہیں کہی جاسکتی۔

مولانا علیہ الرحمۃ نے آزاد حکومت میں مسلمانوں کے مخصوص نظام کی جو تفصیلات پیش کی تھیں اُن کا ماحصل یہ ہے کہ اسلامی نظام حکومت کے دو حصّے ہیں۔ پہلا حصّہ تو وہ ہے، جس میں مسلم و غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں اور جو اسلامی حکومت کے اندر بلاامتیاز مذہب و ملّت نافذ کیے جائیں گے۔ ان احکام کا تعلق جان، مال، عزت اور امن عامہ سے ہو گا۔

دوسرا حصّہ وہ ہے جسے آج کل کی زبان میں ''پرسنل لا'' کہہ سکتے ہیں (موجودہ اصطلاح میں ''پرسنل لا'' کے معنی بہت محدود ہیں اور مولاناؒ کے نظریہ پر حاوی نہیں) اس سے مراد وہ مسائل ہیں جن کا تعلق صرف مسلمانوں سے ہے، اور جو اسلامی حکومت میں بھی صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص ہوں گے۔ مولاناؒ فرمایا کرتے تھے کہ ملکی آزادی کی جدوجہد میں ہمارا ایک مذہبی مقصد

یہ بھی ہے کہ آزاد جمہوری حکومت میں مسلمانوں پر کم از کم اسلامی نظام حکومت کا وہ حصّہ تو پوری طرح نافذ ہو سکے جس کا تعلق صرف مسلمانوں سے ہے۔ چنانچہ انتخابات میں حصّہ لینے سے مولاناؒ کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ رفتہ رفتہ آئینی طریقہ پر مذکورۂ بالا مقاصد کی طرف قدم بڑھایا جائے۔ اور مرکزی وصوبائی مجالس قانون ساز سے ایسے قوانین مرتب کرائے جائیں جو صحیح اسلامی اصول پر مرتب کیے گئے ہوں اور جن کا تعلق صرف مسلمانوں سے ہو۔ چنانچہ مولاناؒ نے اسی مخصوص نظریہ کے ساتھ بہار مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی قائم کی۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو پارٹی کا منشور عام اور پارٹی کانفرنس کا خطبۂ استقبالیہ)

پارٹی کے قیام کے بعد مولاناؒ کو سب سے زیادہ دشواریاں امیدواروں کے انتخاب میں ہوئیں۔ مولاناؒ علیہ الرحمۃ کو ضرورت تھی ایسے امیدواروں کی جن کے دلوں میں ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے کا جذبہ، مسلمانوں کا سچا درد اور مذہبی عقائد واحکام پر پورا اعتقاد ہو، ساتھ ہی ساتھ اتنا سرمایہ بھی ہو کہ انتخاب کے تمام اخراجات کو برداشت کر سکیں۔ ظاہر ہے یہ معیار کتنا دشوار تھا؟ اِن مجبوریوں کے ساتھ پارٹی کے امیدواروں کا انتخاب عمل میں آیا۔

میں اکثر مولانا علیہ الرحمۃ سے کہا کرتا کہ "آپ نے ایک گاڑی میں مختلف نسل کے گھوڑے لگا دیئے ہیں، اب وہ گاڑی چلے گی کیوں کر؟"۔ مولاناؒ مجھے سمجھاتے اور فرماتے اچھا، اِن امیدواروں کو علاحدہ کر کے، اُن لوگوں کے نام بتاؤ جو مناسب بھی ہوں، اور انتخابات میں مقابلہ بھی کر سکیں، میرے پاس اس کا کیا جواب ہو سکتا تھا، ظاہر ہے، لیکن دنیا نے دیکھا کہ مولاناؒ نے اپنے

غور و تدبر، بے پناہ قوتِ عمل اور زبردست شخصیت سے پارٹی کا شیرازہ بکھرنے
نہ دیا، اور اُن سے وہ وہ کام کرائے، جو دوسرے کسی صوبہ میں نہ ہوسکے۔

جب انتخابات شروع ہوئے تو مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کا مقابلہ، بہار
یونائٹیڈ پارٹی، بہار احرار پارٹی، کانگریس پارٹی اور آزاد امیدواروں سے
ہوا۔ یونائٹیڈ پارٹی کے روح رواں مسٹر سیّد عبدالعزیز صاحب (بالقابہ) تھے۔
موصوف اُس وقت حکومت بہار کے وزیر تعلیم تھے، اس لیے یونائٹیڈ پارٹی کو
حکومت کی تائید اور امداد حاصل تھی، خود وزیر موصوف نے اپنے نمائندوں کی
کامیابی کے لیے دورے کیے اور وہ سب کچھ کیا جو ممکن تھا۔ لیکن جب انتخاب کا
نتیجہ منظر عام پر آیا تو دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔ ۳۳؍ امیدواروں میں صرف
۶؍ کامیاب۔ شاید اسی پسپائی کا نتیجہ تھا کہ مسٹر سیّد عبدالعزیز پارٹی لیڈر ہونے
کے باوجود اسمبلی سے مستعفی ہوگئے۔ گرچہ بعد میں پھر مسلم لیگ کے آغوش
میں انھوں نے پناہ لی۔

احرار پارٹی نے اپنی سرگرمی ترہت ڈویزن ہی تک محدود رکھی، کوئی
دس بارہ امیدوار کھڑے کیے۔ اس پارٹی کے روح رواں مولوی شفیع صاحب
داؤدی تھے۔ مولوی صاحب موصوف ترہت میں کافی اثر ورسوخ رکھتے تھے۔
لیکن اس انتخاب نے انھیں بھی چرکہ دیا۔ کسی نہ کسی طرح تین امیدوار تو
کامیاب ہوگئے لیکن خود پارٹی لیڈر مولوی محمد شفیع صاحب داؤدی ناکام رہے۔

کانگریس نے مسلم امیدواروں کے انتخاب سے پہلے مولاناؒ سے
مصالحت کی گفتگو کی اور تجویز پیش کی کہ انڈیپنڈنٹ پارٹی ۱۴؍ حلقوں میں اپنے
امیدوار کھڑا نہ کرے، اور وہاں کانگریسی امیدوار کی مدد کرے۔ مولاناؒ اس

تجویز پر راضی نہ ہوئے۔ آپ نے چند امیدواروں کے نام گنائے اور کہا، ہم ان
کی مدد صرف اِس شرط پر کرسکتے ہیں کہ وہ اس بات کا عہد کریں کہ مجالس قانون
ساز میں تمام مذہبی معاملات میں امارت شرعیہ کے احکام کی پابندی کریں گے۔
چنانچہ اپنی شرائط کے ساتھ سیّد شاہ محمد عمیر صاحب گیا، سعید الحق صاحب
دربھنگہ، اور ڈاکٹر سیّد محمود صاحب سابق وزیر تعلیم کی حمایت کی گئی۔ بلکہ ڈاکٹر
صاحب کے لیے تو دو دو حلقے خالی کردیئے گئے۔ مولوی سعید الحق ابتداءً
انڈیپنڈنٹ پارٹی کے امیدوار تھے لیکن بعد میں مولانا علیہ الرحمۃ کو معلوم ہوا
کہ انھوں نے کانگریس کے عہد نامہ پر بھی دستخط کردیا ہے، مولاناؒ نے خود سعید
صاحب کو بلاکر تصدیق کی۔ تصدیق کے بعد آپ نے اس عہد نامہ کو جس پر
امیدوار موصوف کے دستخط تھے چاک کردیا۔ اور امارت شرعیہ کے عہد نامہ پر
دستخط کرانے کے بعد ان کی تائید کی۔

کانگریس کے ایسے امیدواروں سے جنھوں نے امارت کے عہد نامہ پر
دستخط کیے پارٹی کا مقابلہ بھی ہوا، جہاں بجز ایک کے تمام امیدوار کامیاب رہے۔
مولاناؒ شرکت کانگریس کے حامی تھے اور تحریک سول نافرمانی وغیرہ کے زمانے
میں کانگریس کے باضابطہ ممبر بھی بن جایا کرتے تھے، لیکن جہاں تک مجالس
آئین ساز کا تعلق ہے، مکمل سمجھوتہ کے بغیر کانگریس ٹکٹ پر انتخاب لڑنے کے
وہ حامی نہیں تھے۔

مولاناؒ نے پارٹی کے ضوابط میں ایک طرف تو یہ دفعہ رکھی کہ مذہبی
معاملات میں امارت شرعیہ کے فیصلہ کی پابندی کرنی ہوگی، اور دوسری طرف یہ
کوشش کی کہ زیادہ سے زیادہ امیدوار امارت شرعیہ کے عہد نامہ پر دستخط

کریں۔ مولاناؒ کا یہ طریق کار آئینہ دار ہے ان کے رجحان فکری کا، وہ چاہتے تھے کہ موجودہ طریق حکومت میں جس قدر قوانین اسلامی اصول کے ماتحت بن سکتے ہوں ان میں زیادہ سے زیادہ مسلمان ممبروں کی تائید حاصل کی جاسکے۔

بہر حال انتخابات ہوئے اور نتیجہ نے یہ بتایا کہ انڈیپنڈنٹ پارٹی کو تقریباً ۸۰ رفی صدی کامیابی ہوئی۔ انتخاب کے نتائج ظاہر ہونے کے بعد انڈیپنڈنٹ پارٹی اور اس کے کامیاب ممبروں کا ایک جلسہ منعقد ہوا۔ اُس جلسہ میں مولاناؒ نے جو تقریر کی وہ اُن کے مخصوص تدبر و فراست کی حامل تھی، آپ نے اپنے نظریہ کے مطابق ہندوستان کی آنے والی حکومت کے اصول بتائے، اور ممبروں کو اُن کا طریق کار۔

مولاناؒ نے اُس وقت اپنے تمام ممبروں کو دو مشورے دیئے، ایک اندرونی اور دوسرا بیرونی، اندرونی مشورہ یہ تھا کہ ہر ممبر کسی ایک خاص شعبہ کا ذمہ دار ہو۔ وہ اس شعبہ کی تمام معلومات حاصل کرے اور اس پر پوری طرح تیار ہو، بیرونی کام یہ تھا کہ کوئی ممبر اپنے حلقۂ انتخاب سے غافل نہ ہو۔ وہ اپنے حلقہ میں یا خود کام کرے یا اس کے اخراجات برداشت کرے۔ افسوس ہے کہ پارٹی کے ممبران مولاناؒ کے اِن مفید مشوروں پر کاربند نہ ہوسکے، ورنہ آج اسمبلی کے اندر پارٹی کا مقام بہت بلند ہوتا۔

اسی جلسہ میں مولاناؒ کی مرتب کی ہوئی ایک تجویز بھی منظور ہوئی تھی، جس میں اپنے مقاصد کو برقرار رکھتے ہوئے کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل کا اعلان کیا گیا تھا لیکن کانگریس نے اس طرف کوئی توجہ نہ کی۔ غالباً اُس وقت کانگریس کا نظریہ اکثریت والے صوبوں میں خالصاً پارٹی گورنمنٹ قائم کرنا

تھا۔ چنانچہ اس کی مخالفت میں پنڈت جواہر لال جو اس وقت کانگریس کے صدر تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد نے بیانات شائع کیے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہاں تک کہا کہ ایک شاگرد، دو مختلف استادوں کو کیوں کر خوش رکھ سکتا ہے؟ اس مسئلے میں مولاناؒ مشترکہ وزارت کے قیام کے حامی تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ انھوں نے اپنے اس خیال کو ایک مشہور رہنما کے سامنے پیش کیا۔ مولاناؒ نے فرمایا: ”نظری اور عملی سیاست کے فرق کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہیے۔ مختلف ملکوں کی پارلیمنٹری تاریخ کو دیکھئے۔ مختلف الخیال جماعتیں ایک متحدہ اسکیم بناکر مشترکہ وزارتیں مرتب کرتی ہیں اور کامیابی کے ساتھ چلاتی ہیں، ہاں! ایسے مسائل بھی پیش آجاتے ہیں جن پر اتفاق نہیں ہوتا۔ تو پھر وزارتیں ٹوٹ جاتی ہیں اور اُن کی جگہ نئ بنتی ہیں۔ مولاناؒ نے یہ بھی فرمایا کہ آج تو کانگریس گریز کرتی ہے، لیکن اگر کانگریس کو موقع ملا تو وہ اقلیت والے صوبوں میں مشترکہ وزارتیں ضرور مرتب کرے گی۔ چناچہ ہم نے مولاناؒ کی زندگی ہی میں اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ھر اور آسام میں مولاناؒ کا خیال حرف بحرف صحیح ثابت ہوا۔ خود یہاں کی صوبائی کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ کے ذمہ دار اراکین نے ۱۹۳۹ء میں مولاناؒ کے سامنے انڈیپنڈنٹ پارٹی کی شرکت سے وزارت مرتب کرنے کی تجویز پیش کی۔ جسے مولاناؒ نے بعض وجوہ کی بنا پر قبول نہ فرمایا۔ یہی ہے "عملی و نظری سیاسیات" کا فرق!

مارچ ۱۹۳۷ء میں وزارت قبول کرنے کا سوال سامنے آیا۔ میں قبول وزارت کا مخالف تھا، اور مولاناؒ اس کے حامی۔ میں نے اپنی رائے مولاناؒ کے سامنے عرض کردی، اس پر کئی دنوں تک باتیں ہوتی رہیں۔ میں بھی اپنے

پورے علم وواقفیت کے مطابق بحث کرتا رہا۔ شاید کسی اور موقع پر میں نے مولاناؒ کا اتنا وقت ضائع نہ کیا ہوگا۔ مولاناؒ مجھے پوری شفقت کے ساتھ برابر سمجھاتے رہے۔

صورتِ حال یہ تھی کہ کانگریس نے ۱۹۳۷ء سے پہلے اپنے اجلاسوں میں اور ورکنگ کمیٹی نے اپنی تجویزوں میں صاف اعلان کر دیا تھا کہ دستورِ جدید ناقص اور قابل استرداد ہے لیکن کانگریس نے چھ صوبوں میں اکثریت حاصل کرتے ہی یہ اعلان کیا کہ اگر گورنر اپنے اختیارات خصوصی کو استعمال نہ کرنے کا یقین دلادیں تو کانگریس وزارت مرتب کرنے کے لیے تیار ہے۔

مولاناؒ کا خیال تھا کہ کانگریس کی یہ شرط صحیح نہیں ہے، کیوں کہ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ اگر گورنر کانگریس کی شرط تسلیم کر لیتے ہیں تو یہ قانون قابل عمل ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ کانگریس کے نقطۂ نگاہ سے یہ قانون قطعی ناقابل عمل تھا۔ اس قانون سے کانگریس کا جو سب سے بڑا اصولی اختلاف تھا وہ گورنر کی مداخلت یا عدمِ مداخلت کا نہ تھا، وہ یہ تھا کہ قانون بنانے کا حق ہندوستان کے بسنے والوں کو حاصل تھا نہ کہ برطانوی پارلیمنٹ کو، اس لیے بہر حال وہ قانون قابل استرداد ہی تھا۔

مولاناؒ کے خیال میں ایسی انقلابی جماعتوں کے لیے جو کانسلوں میں قانون مسترد کرانے کی غرض سے پہنچی ہوں، دو ہی عملی صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ اس قانون کے خلاف غیر آئینی جدوجہد شروع کر دی جائے، اور دوسری یہ کہ وزارت مرتب کر کے عوام کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کی کوشش کی جائے اور اس طرح اس قانون کے مسترد کرنے کا سامان

فراہم کیا جائے۔

چنانچہ انہی خیالات کی بنا پر مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی نے وزارت قبول کی، لیکن وزارت قبول کرنے کے وقت ہی پارٹی نے ایک تجویز کے ذریعہ یہ بات صاف کر دی کہ اصولی طور پر اس صوبہ میں وزارت کانگریس کو مرتب کرنی چاہیے تھی لیکن چوں کہ کانگریس اور گورنر کی جنگ ہے اور فی الحال کانگریس کوئی جدوجہد بھی نہیں کرتی ہے، اس لیے یہ پارٹی اس صوبہ میں وزارت بنا کر اور عوام کی خدمت کر کے قانون کو آئینی طور پر مسترد کرانے کا مواد فراہم کرے گی، ساتھ ہی ساتھ پارٹی کی دلی خواہش ہے کہ کانگریس اور گورنر کے درمیان سمجھوتہ ہو جائے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انڈیپنڈنٹ پارٹی کی وزارت نے بعض ایسے کام کیے جن کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں اس کی پہلی خدمت سرکاری دفاتر میں اردو زبان کا اجرا ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس میں مولاناؒ کی کن کن کوششوں کا دخل تھا۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اگر مولانا مرحوم اس کے لیے کوشاں نہ ہوتے تو آج بھی یہاں اردو کے ساتھ اچھوت ہی جیسا سلوک ہوتا۔

پارٹی کی دوسری اہم ترین خدمت جس سے صوبہ کے تمام کسان آج تک مستفید ہو رہے ہیں وہ دفعہ ۱۱۲/ر کی ترمیم ہے۔ جس سے کسانوں کو کئی طرح پر تخفیف لگان کا فائدہ پہنچا۔ آج کانگریسی حضرات کسانوں کی بھلائی اور فلاح و بہبود کا دم بھرتے پھرتے ہیں۔ لیکن حقیقتاً یہ کارنامہ ہے انڈیپنڈنٹ پارٹی کا۔ اور یہ سب کچھ مولانا مرحوم ہی کی اشارہ پر ہوا تھا۔

کانگریس کے قبول وزارت کے بعد ہم لوگوں کو مولاناؒ کے اس عقیدہ کی صحت کا کافی ثبوت ملا کہ مکمل سمجھوتہ کے بغیر مسلمانوں کو کانگریس ٹکٹ پر اسمبلی نہ جانا چاہیے۔

ایک مثال ملاحظہ ہو: نمائندہ اسمبلی والی تجویز جب پیش ہوئی تو مولاناؒ کے حکم سے پارٹی کی طرف سے دو ترمیمیں پیش کی گئیں (۱) نمائندہ اسمبلی کے نمائندے جداگانہ مذہبی حلقوں سے منتخب ہوں۔ (۲) نمائندہ اسمبلی میں کثرت رائے پر فیصلہ نہ ہو، بلکہ باہمی رضامندی شرط قرار دی جائے۔ ان ترمیموں کی معقولیت ظاہر ہے۔ لیکن پھر بھی ان ترمیموں پر کئی دنوں تک مباحثے ہوتے رہے۔

وزیر اعظم نے اپنی جوابی تقریر میں اور ایوان سے باہر وزیر مالیات نے ہمیں بتایا کہ یہ تجویز کانگریس ورکنگ کمیٹی کی منظور شدہ ہے، اس لیے کسی ترمیم کی گنجائش نہیں۔

میں نے مولاناؒ سے ساری روداد کہی اور اپنی ذاتی رائے ترمیمیں واپس لے لینے کے حق میں دی۔ لیکن مولاناؒ کو ان ترمیموں پر برابر اصرار رہا اور وہ یہ کہتے رہے کہ یہ سارے بہانے ہیں ورنہ اگر وزیر اعظم چاہیں تو ابھی چند منٹوں کے اندر صدر کانگریس سے فون پر طے کر سکتے ہیں۔ مولاناؒ کے اس مضبوط رویہ نے بالآخر وزیر اعظم کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ فون پر صدر کانگریس سے مشورہ کریں، چنانچہ صدر کانگریس پنڈت جواہر لال کی مرضی سے یہ ترمیمیں بہار اسمبلی میں منظور ہوئیں۔

یہ تجویز تمام کانگریسی صوبوں میں پیش کی گئی۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت

ہوتی ہے کہ بہار کے علاوہ تمام صوبوں میں یہ تجویز من وعن منظور ہوگئی۔ صرف سندھ کے ہندو ممبران اپنے نقطۂ نگاہ سے ایک ترمیم منظور کرا سکے۔

مولاناؒ کی قانونی نکتہ سنجی کی ایک اور مثال پیش ہے:

بہار اسمبلی میں کانگریس کی طرف سے زراعتی آمدنی پر ٹیکس کا مسودۂ قانون پیش ہوا۔ مولاناؒ کو شبہ ہوا کہ کہیں اِس قانون کے تحت میں اوقاف بھی نہ آجائیں۔ چنانچہ انہوں نے پورا مسودہ پڑھوا کر سنا۔ سننے پر مولاناؒ کا خدشہ صحیح نکلا۔ ابتداءً مولاناؒ کی یہ کوشش رہی کہ اربابِ حکومت سے مل کر اس مسئلہ کو باہمی طور پر طے کر لیا جائے۔ لیکن جب وہ اس پر راضی نظر نہ آئے تو مولاناؒ کو اخبارات میں بیانات اور پھر سول نافرمانی کی دھمکی دینا پڑی۔ اسی دوران میں مولانا ابوالکلام مدظلہ مسئلہ کو سلجھانے کے لیے پٹنہ تشریف لائے اور اُن کے مشورہ سے حکومت بہار نے ہم لوگوں کی ترمیم منظور کر لی اور زراعتی آمدنی پر ٹیکس کا قانون اوقاف پر عائد نہ ہو سکا۔

اِنکم ٹیکس کے قانون میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد مولاناؒ نے پارٹی کی طرف سے مسلم وقف بل، لوکل باڈیز (ڈسٹرکٹ بورڈوں سے متعلق) اور میونسپلٹی کا ترمیمی مسودۂ قانون مرتب کیا۔

جب حکومت کو ان مسودوں کی اطلاع ملی تو خود اس نے اپنے طور پر مسلم وقف بل اور میونسپلٹی کا ترمیمی بل پیش کیا۔ سب سے پہلے مسلم وقف بل سامنے آیا۔ مجوزہ بل نہایت ناقص تھا، چنانچہ اس پر غور کرنے کے لیے ایک منتخبہ کمیٹی بنی۔ کمیٹی نے اپنے جلسوں میں مولاناؒ کو بھی طلب کیا اور ان کی رائے سے بجز دو چار مقامات کے ہر جگہ اتفاق کیا۔ چنانچہ رائے شماری کے وقت پارٹی

نے مجموعی طور پر بل کی حمایت کی، البتہ ان مقامات پر جہاں اتفاق نہ ہو سکا تھا، مخالفت کی۔ پھر بھی یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ صوبۂ بہار کا وقف بل، ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے وقف بلوں سے کئی درجہ بہتر ہے۔

ایک دفعہ اس منتخبہ کمیٹی میں ایک اصول مقرر ہوا۔ الفاظ پٹنہ ہائی کورٹ کے مشہور وکیل مولوی حسن جان صاحب کے تھے۔ لیکن ایڈوکیٹ جنرل نے اس پر قانونی حیثیت سے اعتراض کیا۔ پھر اسی اصول کی ترتیب مسٹر محمد یونس بیرسٹر پٹنہ نے کی، ایڈوکیٹ جنرل نے قانونی مجبوریوں کی بنا پر اُسے بھی نامنظور کیا۔ اخیر میں مولاناؒ نے اسے خود مرتب کیا۔ اُردو داں ہونے کے سبب سے ایڈوکیٹ جنرل نے اسے خود اور بلا تأمل منظور کر لیا۔[۲۶]

اس کے کچھ ہی دنوں بعد ایک غیر سرکاری مسودۂ جہیز بل (ڈاوری بل) کے نام سے پیش ہوا۔ مولاناؒ کی دور بین نگاہوں نے اس کے مضر اثرات کا فوراً اندازہ کر لیا۔ اور یہ مولاناؒ ہی کی محنتوں کا نتیجہ تھا کہ اس بل سے مسلمان بَری کر دیئے گئے۔

مولاناؒ کا عقیدہ تھا کہ ہندو اور مسلمانوں کی دو جداگانہ معاشرتیں ہیں، اس لیے ان کی اصلاح بھی جداگانہ قوانین کے ذریعہ ہونی چاہیے۔ مولاناؒ اس بات کے برابر کوشاں رہے کہ یہ اصول اسمبلی میں رواج پا جائے۔ مولاناؒ کا یہ بھی خیال تھا کہ اصولاً ایک فرقہ کے معاشرتی قانون میں دوسرے فرقہ کے رکن کو ووٹ دینے کا بھی حق نہ ہونا چاہیے۔

[۲۶] جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب بالقابہ کے مضمون میں بھی اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے(م)

غرض یہ کہ صوبہ جاتی اور مرکزی اسمبلی میں حج بل، معلم بل اور اور مسودۂ قانون انفساخ نکاح وغیرہ کے سلسلہ میں جو خدمات مولاناؒ نے انجام دی ہیں، ان کی داد کوئی ماہر قانون ہی دے سکتا ہے۔ کاش کوئی اللہ کا بندہ ان کی تفصیلات کو قلمبند کر لیتا، تو اسلامی قانون کی ایک بڑی خدمت ہو جاتی۔

افسوس! مولاناؒ اس ناپاک دنیا کو چھوڑ کر اُس عالم کو سدھارے، جہاں کی زندگی ابدی اور سرمدی ہے، اور کم سے کم اس صوبہ کی مذہبی اور سیاسی زندگی اپنے ساتھ لیتے گئے۔

اس قحط الرجال کے زمانہ میں، مولاناؒ کے ایسے سرپرست کا اُٹھ جانا مسلمانوں کی شومیِ قسمت کا آخری نشان ہے، اب کون ہے، جو مسلمانوں کی ہر تکلیف پر بے چین ہو، ان کی ہر صدا پر لبیک کہے، اور اُن کے ہر آڑے وقت پر کام آئے؟

حقیقت یہ ہے کہ جانے والا، بقول مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مسلم قوم کے سرِ مزار کا آخری چراغ تھا۔ حق جل مجدہٗ اپنے سچّے خادم پر ہمیشہ رحمتوں کی بارش برسائے، اور ہم لوگوں کو اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق دے۔[۲۷]

[۲۷] محاسن سجاد ص ۱۲۲

حضرت استاذ کی یاد

علمی وروحانی مقام، تعلیمی نظریات وخدمات

حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی[۶۸]

[۶۸] حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی صاحب ملک کے ممتاز علماء میں ہیں، متبحر عالم، وسیع النظر فقیہ اور عظیم المرتبت محقق اور کثیر التصانیف اہل قلم تھے، ان کا روحانی مقام بھی مسلم ہے، جنگ آزادی میں بھی ان کا نمایاں کردار رہا، شہر بہار شریف سے متصل شہر باڑھ (جو پہلے قصبہ تھا، متعلقہ ضلع پٹنہ) کا ایک محلہ بازید پور (غالباً صحیح نام بایزید پور ہو) جو پہلے ایک مضافاتی قریہ تھا اب گاؤں ہے ان کا مرز بوم اور آبائی وطن ہے، وہیں تقریباً ۹۳-۱۸۹۲ کے قریب ان کی پیدائش ہوئی، لیکن شادی کے بعد اپنی سسرال مانڈر ضلع مونگیر (حال ضلع کھگڑیا) میں سکونت اختیار کرلی تھی، ابتدائی تعلیم اپنے وطن ہی میں حاصل کی پھر کانپور کے مدرسہ جامع العلوم میں داخل ہوئے، اس کے بعد مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں حضرت مولانا سجاد صاحب علیہ الرحمۃ سے استفادہ کرکے تکمیل کی، معقولات کی تکمیل غور غشتی پشاور میں کی، روحانی استفادہ حضرت مولانا محمد علی مونگیری سے کیا اور ان ہی کی رہنمائی میں رد قادیانیت میں نمایاں حصہ لیا، نیز جامعہ رحمانی کی تدریس اور وہاں کے ماہنامہ الجامعہ کی ادارت کی ذمہ داری بھی انجام دی، اس کے بعد حضرت مونگیریؒ کے انتقال کے بعد حضرت سجادؒ کی دعوت پر امارت شرعیہ منتقل ہوگئے، اور اس کو منظم کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا اور اپنے استاذ کے دست وبازو بن کر رہے، اور ان کے انتقال کے بعد ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹۴۰ء میں ان کے جانشین یعنی نائب امیر شریعت مقرر ہوئے، اور پورے ۳۳ سال

۱۳۲۷ھ میں "ہدایۃ النحو" پڑھتا ہوا میں حضرت استاذ مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں الہ آباد حاضر ہوا تھا، یہ میری زندگی کا پہلا سفر تھا جو بغیر کسی قائد اور سائق کے دفعۃً اور بغتۃً ہوا تھا۔

اب تک میں نے جو کچھ پڑھا تھا وہ استاذی حضرت مولانا حکیم محمد صدیق صاحب مدظلہ کے فیض صحبت کا اثر تھا۔ مولانا قصبہ باڑھ میں مطب کرتے تھے، اور میں اپنے گھر "بازید پور " سے روزانہ پڑھنے کے لیے حاضر ہوا کرتا تھا، اور کبھی کبھی اثناء گفتگو میں کانپور اور کانپور کے مدارسِ عربیہ کا حال سنا کرتا تھا۔ اس زمانہ کے ماحول میں عموماً عربی طلبہ میں "ثم خیراً" کی بیماری عام تھی اور اس سے میں بھی بری نہ تھا۔ اسی کے بحران میں یکہ وتنہا گھر سے نکلا تو کانپور کا ٹکٹ لے کر سیدھا جامع العلوم پہنچا۔ مگر وہاں ٹک نہ سکا اور طبیعت غالباً اس وجہ سے گھبرائی کہ ان دنوں وہاں بہاری طلبہ بہت کم تھے۔

قدرت کی جانب سے نہ معلوم کس طرح الہ آباد کا قلب میں القا ہوا، اور میں اُلٹے پاؤں الہ آباد واپس آیا تو یہاں حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کو

اس عہدہ پر فائز رہ کر امارت کی خدمت انجام دی اور اس کو آگے بڑھایا، اسی سال کی عمر میں ۱۴/ مئی ۱۹۷۳ء میں جامعہ رحمانی میں ان کا انتقال ہوا اور جامعہ ہی کے قبرستان میں دفن ہوئے، سیکڑوں چھوٹی بڑی کتابیں ان کی علمی یادگار ہیں، الہلال پٹنہ جو انڈپنڈنٹ پارٹی کا ترجمان تھا مولانا مسعود عالم ندوی کے ساتھ اس کے مدیر بھی رہے۔ حالات کے لئے دیکھئے ہمارے امیر، تذکرہ علماء بہار اور نقیب کا معاصر شارہ وغیرہ۔ مولانا کی شخصیت اپنے علمی وملی کارناموں کی وجہ سے مستقل توجہ کی مستحق ہے جس کی طرف اب تک خاطر خواہ توجہ نہیں ہوسکی ہے، اور ان کی غیر معمولی شخصیت دوسرے بزرگوں کے سامنے دب کررہ گئی۔ ان کے کچھ سوانحی اشارات اس مضمون میں بھی شامل ہیں۔

پایا۔

یہاں کی دنیا ہی دوسری تھی۔ مدرسہ سبحانیہ کا دارالطلبہ بہار کا ایک گاؤں معلوم ہوتا تھا۔ یہاں بھی گرچہ کوئی جانی پہچانی صورت نہ تھی، مگر دیارِ غربت جیسی اجنبیت نہ تھی۔ چوں کہ وسط سال میں پہنچا تھا۔ اس لیے کسی جماعت میں شریک نہ ہو سکا۔ مولاناؒ نے امتحان لے کر خارج از مدرسہ میری تعلیم کا انتظام فرما دیا۔ کافیہ تک پڑھ کر شرح جامی سے میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ درس میں داخل ہو گیا۔

مولانا کا طریقۂ تعلیم

میں جس دور میں حضرت استاذ کے حضور میں حاضر ہوا تھا طریقۂ تعلیم میں عجب قسم کی افراط و تفریط تھی جو تمام مدارس عربیہ میں اِلاّ ماشاء اللہ عام تھی، درس کے وقت اساتذہ کا معمول یا تو یہ تھا، کہ پڑھنے والا ایک انداز کردہ مقدار میں عبارت پڑھ جاتا تھا، اور پڑھانے والا اس کے متعلق ایک زوردار تقریر میں اس کے مطالب کو پیش کر دیتا تھا، اور اسی سلسلہ میں اعتراض وجواب اور اس کی ضروری تنقیحات کو بیان کر دیتا، اس کے بعد پڑھنے والا عبارت کا ترجمہ کرتا تھا، اور اس طرح پر وہ سبق ختم ہو جاتا تھا۔ یا یہ دستور تھا کہ پڑھنے والا ہونے والے سبق کی ایک دو سطریں پڑھ کر ترجمہ کرتا تھا، اور پڑھانے والا اس کا مطلب بیان کرتا۔ پھر اس عبارت پر جو ایراد واعتراض ہوتا اس کو بیان کرکے جواب دیتا۔ پھر اسی طرح دو چار سطریں پڑھی جاتیں، اور ان کا ترجمہ اور مطلب اور ایراد واشکال اسی طرح بیان کیا جاتا۔ یہاں تک کہ اندازہ کردہ مقدار میں عبارت پوری ہو جاتی، اور یہاں پہنچ کر سبق ختم ہو جاتا۔

پہلی صورت میں عملاً یہ نقص ہوتا تھا کہ طلبہ میں محاکات اور نقل کی استعداد تو تام ہو جاتی تھی۔ اور کتاب کے ہر مسئلہ پر وہ ایک رواں دواں تقریر کے عادی تو ہو جاتے تھے مگر کتاب سے خصوصی مناسبت نہیں ہوتی تھی اور نہ قوت مطالعہ قوی ہوتی تھی، اور بسا اوقات پڑھنے والا اس فہم پر بھی قابو نہیں رکھتا تھا کہ وہ جو کچھ سمجھ رہا ہے عبارت اس کی متحمل ہے یا نہیں؟ اور اگر متحمل ہے تو اس کے لیے سبق کی کون سی عبارت منشاء، اور ماخذ ہے۔ پھر اس کے علاوہ اگر اس کی محاکاتی تقریر پر بیچ میں اگر کوئی اشکال پیش کر دیا جاتا، تو میں نے دیکھا کہ یہ ساری تقریر اس طرح اُلجھ کر رہ جاتی تھی کہ اس کا سمجھنا مشکل اور دشوار ہو جاتا تھا کہ اس کی تقریر کے جس ٹکڑے پر یہ ایراد ہو رہا ہے۔ یہ کیوں ہو رہا ہے اور اس کا جواب خود عبارت میں موجود ہے یا نہیں ہے؟

دوسری صورت میں عموماً عملاً یہ تو محسوس ہوتا تھا کہ طلبہ میں کتاب سے کافی نسبت بھی ہے، قوتِ مطالعہ بھی ہے، وہ عبارت کا صحیح مفہوم بھی سمجھتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بڑی کمی دیکھنے میں آتی تھی کہ وہ اپنے دماغ میں کسی مسئلہ کے متعلق کوئی خاص روشنی نہیں رکھتا ہے، اور نہ اسی پر قدرت رکھتا ہے کہ وہ کتاب سے الگ ہو کر ایک سلجھی ہوئی تقریر میں اس چیز کی ترجمانی کرے جو صاحبِ کتاب کا مقصد ہے، اور جو خود اس کے پڑھنے کا مطلوب ومقصود ہے۔

حضرت استاذ کا طریقۂ تعلیم اس افراط وتفریط سے الگ بین بین تھا، وہ طلبہ کو کتاب سے اخذ مطلب پر زور دیتے تھے، اور اس طرح ان کی قوت مطالعہ میں ترقی ہو جاتی تھی، اور کتاب سے خاصی مناسبت پیدا ہو جاتی تھی۔ استاذ مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ پڑھنے والے کے سامنے دو باتیں رہنی ضروری

ہیں، ایک تو یہ کہ جس جملہ کو تم کتاب میں پڑھ رہے ہو، پہلے اس کو کتاب سے سمجھو کہ صاحبِ کتاب اس جملہ کے متعلق کیا کہہ رہا ہے، اور اس سمجھنے میں جو کچھ سمجھو اس کی عبارت سے سمجھو۔ کسی خیال کو اپنی طرف سے زبردستی اس میں نہ ٹھونسو۔ اس کے سمجھ لینے کے بعد دوسری چیز یہ ہے کہ یہ سمجھو کہ اصل مسئلہ کی حقیقت ہے کیا؟ اور جب اصل مسئلہ کی حقیقت سمجھ لو، تو اس کے بعد یہ بھی دیکھو کہ صاحبِ کتاب سے اس حقیقت کے سمجھنے میں چوک تو نہیں ہوئی ہے، پس حضرت استاذ پہلے کتاب کی تفہیم فرماتے۔ پھر نفسِ مسئلہ کی طرف رہنمائی فرماتے، اس طرح پڑھنے والے میں تحقیق، تلاش، محنت، مطالعہ، فکر کا جذبہ پیدا کر دیتے تھے، اور پڑھنے والے کے دماغ کی تربیت فرماتے تھے۔ حضرت استاذ طلبہ کو نہ تو بے محابا، بگ ٹٹ، ایسا رواں دواں دیکھنا چاہتے تھے کہ بے خبری میں ہر موڑ اس کے لیے خطرناک خندق بن جائے اور اس کے لیے مغالطہ کا باعث ہو، اور نہ وہ طلبہ کے لیے یہ پسند فرماتے تھے کہ صرف کتاب کا رٹو ہو کر رہ جائے، اور دماغ اس جوہر لطیف سے خالی رہے، جو علم کا مقصود و مطلوب ہے۔

استاذ رحمۃ اللہ علیہ کے طریقۂ تعلیم کی ایک خصوصی خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ عمیق تعلیمی تجربہ اور تبحر کی بنا پر اوّل نگاہ میں پڑھنے والے کی صلاحیت، اس کی استعداد، اس کی خامی اور اس کے نقص کو بھانپ لیتے تھے۔ اور سبق کے وقت سب سے پہلے اس کی اس خامی کا ازالہ فرمادیتے تھے، جس کا ہونے والے سبق سے تعلق ہوتا تھا، تاکہ فہم سبق کی راہ میں دشواری نہ رہے اور اس کے لیے ایسا لطیف پیرایہ اختیار فرماتے تھے، کہ دوسرے ہم سبق کو اس

کا پتہ بھی نہیں چلتا تھا، اور اس کے دل کی گرہ کھل جاتی۔

مولانا کی ایک عجیب خصوصیت جو مرتے دم تک ان کے ساتھ رہی، وہ ان کی علو ہمتی تھی۔ وہ کثرتِ مشاغل سے نہ گھبراتے تھے، نہ تھکنا جانتے تھے۔ مدرسہ کے اوقات میں درس دینے کے علاوہ کثرت اسباق کے باعث صبح کی نماز کے پہلے اور نماز کے بعد بھی پڑھاتے تھے، پھر عصر کے بعد مولانا ایک شیعہ صاحب کو ریاضی اور معقولات پڑھاتے تھے۔ یہ باوجود رئیس ہونے کے روزانہ پابندی سے آیا کرتے اور اس کی وجہ مولانا کی وہی تعلیمی خصوصیت تھی، جو میں اوپر عرض کر آیا ہوں۔ یہ مولانا کے طرزِ تعلیم کے دل دادہ تھے، اور اکثر مسند درس سے استفادہ کے بعد مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر مولانا کے قریب ہو رہے تھے۔ مولانا بھی ان سے بہت خوش رہتے تھے کہ یہ انگریزی داں تھے، مولانا کو روز روز کی خبریں اور ممالک اسلامیہ کے حالات سے مطلع کرتے تھے، پھر اسی کے ساتھ مولانا کے ذمہ افتاء کی خدمت بھی تھی، اکثر دن کے گذرنے کے بعد کتب خانہ میں جو دارالطلبہ کی نیچے کی منزل میں تھا، تشریف لے آتے اور اہم استفتا کا جواب تحریر فرماتے تھے۔

مولانا کا علم و فضل

اس دور میں عموماً طلبہ میں معقولات کا ذوق زیادہ تھا، اور اس کی جانب دلچسپی میرے خیال میں افراط کی حد سے زیادہ تھی۔ اسی بنا پر عموماً اس دور میں طلبہ میں مولانا کی ممتاز حیثیت معقولی ہونے کی تھی، اور یہ واقعہ ہے کہ مولانا اس فن میں ناقدانہ نظر رکھتے تھے اور ہر مسئلہ میں مولانا کی رائے قول فیصل کا درجہ رکھتی تھی۔

مگر حقیقت یہ تھی کہ مولانا کو قدرت کی جانب سے ایسی صلاحیت واستعداد کی نوازش ہوئی تھی کہ وہ بلاغت، معانی، ادب میں بھی یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ مجھ کو یاد ہے کہ داراگنج[69] کے مدرسہ کے ملاحظہ کے لیے (جس کو مولانا نے داراگنج کی وسیع جگہ پر شوکت شاہی مسجد میں جو لبِ دریا واقع ہے، قائم کیا تھا اور ارادہ یہ تھا کہ اس کو تعلیم کے ساتھ صنعتی مدرسہ بنایا جائے) جب ایک جج صاحب (جن کا نام نامی شاید "کرامت حسین" یا اسی طرح کا کوئی دوسرا نام تھا) تشریف لائے تھے اور مولانا کو ان کی تشریف آوری کی اطلاع کل پندرہ بیس منٹ پہلے ہوئی تھی، اس لحاظ سے کہ وہ ذی علم تھے، اور عربی ادب سے خاص ذوق رکھتے تھے، مولانا نے ارتجالاً عربی کا ایک بلیغ قصیدہ لکھا تھا، جس کو سن کر جج صاحب ممدوح بہت متأثر ہوئے تھے۔

مولانا کا قرآن مجید سے شغف

قرآن مجید سے مولانا کو طبعی ذوق تھا وہ مجھ سے اکثر فرماتے تھے، کہ میں جب قرآن مجید تلاوت کرنے بیٹھتا ہوں تو بمشکل گھنٹہ آدھ گھنٹہ میں ایک صفحہ کی تلاوت کرتا ہوں۔ قرآن کی بلاغت، اس کا عمق، پھر اس کے احکام، پھر احکام کی روح اور اس کا مناط، پھر اس کے ماتحت اس کے فروع، پھر اس فروع

[69] -غالباً یہ دیدارگنج پٹنہ کی شاہی مسجد (جو مدرسہ والی مسجد کے نام سے مشہور ہے) کا واقعہ ہے، جو سہواً یا کتابت کی غلطی سے داراگنج ہو گیا، اس لئے کہ داراگنج کے نام سے کسی ایسے مقام کا پتہ نہیں چلتا جہاں مولانا نے مدرسہ کی بنیاد ڈالی ہو، داراگنج کے نام سے ایک مشہور مقام الٰہ آباد کے قریب واقع ہے، لیکن بہار سے باہر کہیں بھی مولانا کا مدرسہ قائم کرنا ثابت نہیں، اور آپ کے کسی سوانح نگار نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے (اختر امام عادل)

کے تنوعات، پھر ان میں باہمی تفاوت کی بوقلمونی اس طرح ایک ساتھ سامنے آنے لگتی ہیں کہ میں اس میں کھو جاتا ہوں، اور اکثر ایک ہی دو آیت میں وقت ختم ہو جاتا ہے، اور تھک کر میں تلاوت ختم کر دیتا ہوں۔

ایک دفعہ فرمانے لگے کہ جب یہ مسموم ہوا چلنے لگی، کہ ہر مسئلہ کا ثبوت قرآن سے طلب کیا جانے لگا تو اس زمانہ میں تلاوت کے وقت جزئیاتِ فقہ اور فرامین اسلامی کے ماخذ کی طرف ذہن کا امالہ ہو گیا، تو کچھ دنوں کے مطالعہ کے بعد خدا کی جانب سے یہ نوازش ہوئی کہ جب میں فقہ کے کسی باب کے فروعی مسائل کے ثبوت کی طرف توجہ کرتا تو آسانی سے ماخذ کی طرف رہنمائی ہو جاتی۔ ذلک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء، واللّٰہ ذو الفضل العظیم۔

زرعی بل کے موقع میں جب اسمبلی میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ اوقاف پر شرعاً زرعی ٹیکس عائد نہیں کیا جا سکتا ہے، تو میں نے پوچھا کہ حضرت! اس کے لیے قرآن مجید میں کیا ماخذ ہے؟ مولانا نے فرمایا کہ اس کا ماخذ "فَمَنْ بَدَّلَہٗ بَعْدَ مَا سَمِعَہٗ فَاِنَّمَا اِثْمُہٗ عَلَی الَّذِیْنَ یُبَدِّلُوْنَہٗ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ"[70] ہے، کیوں کہ کسی طرح کی تبدیلی جب وصیت میں جائز نہیں ہے جو مرض الموت کی حالت میں خالصاً لوجہ اللہ کرتا ہے تو پھر وقف میں بدرجۂ اولیٰ جائز نہیں ہوگی، جو صحت اور طمانیت کی حالت میں خدا کی راہ میں وقف کرتا ہے۔ اسی اصول پر "شرط الواقف کالنص" کا ضابطہ ہے۔

مولانا کی نکتہ سنج اور دقیقہ رس ذہانت حقیقت رسی میں سحر طرازی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ مجلسی گفتگو، نجی صحبتوں میں بسا اوقات اس طرح کے

[70] سورہ بقرۃ:۲۲

اشارات کر جاتے تھے کہ حیرت ہو جاتی تھی۔ ایک دفعہ فرمایا کہ مغضوب اور ضالین کی جماعت جس سے یہود ونصاریٰ مراد ہیں کفار بت پرست کے مقابلہ میں ان سے تبری کو اس قدر اہمیت کیوں دی گئی ہے، کہ سورۂ فاتحہ کا اس کو جزء قرار دیا گیا ہے، جس کو رات دن میں ۳۲؍ مرتبہ ہم نماز میں پڑھتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ وجہ یہ ہے کہ قرآن کی نظر میں ان کی جماعتی فطرت یہ ہے کہ ان میں حق کے قبول وانفعال کی استعداد نہیں ہے، اور مشرکین کی جماعتی فطرت میں حق کے قبول وانفعال کی استعداد ہے، یہود ونصاریٰ کے متعلق تو قرآن کا نظریہ یہ ہے کہ:

"وَلَنْ تَرْضىٰ عَنْکَ الْیَهُوْدُ ولاَ النَّصارىٰ حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ"۔[71]

(یہود اور نصاریٰ تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے دین کے پیرو نہ ہو جاؤ)۔

اور مشرکین کے متعلق قرآن کا نظریہ یہ ہے کہ:

"وُدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَیُدْهِنُوْنَ"۔[72]

(وہ چاہتے ہیں کہ اگر تم نرم ہو تو وہ بھی نرم ہو جائیں)۔

ایک دفعہ میں نے عرض کیا کہ "اِنَّ زَلَلْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَ تْکُمُ الْبَیِّنَاتُ فَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ"[73] کے متعلق علاّمہ زمخشری نے یہ واقعہ لکھا ہے کہ کسی نے غلطی سے "عزیز حکیم" کی جگہ

---

[71] سورۃ البقرۃ:۱۴

[72] بقرۃ:۱۴

[73] بقرۃ:۲۵

"غفور رحیم" پڑھ دیا تو ایک بدوی نے سن کر کہا کہ یہ خدا کا کلام نہیں ہو سکتا ہے، وجہ اس کی علاّمہ زمخشری نے یہ بیان کی ہے، کہ یہ ذلت اور لغزش کے بعد اربابِ دانش رحم ومغفرت کا ذکر نہیں کرتے ہیں۔ کیوں کہ یہ اس کو گناہ پر جری بنانے کو مستلزم ہو گا۔

حالاں کہ قرآن مجید کی دوسری آیتوں میں رحم ومغفرت کا ذکر خطا کاروں کی خطاکاری کے بعد مذکور ہے۔ مولانا نے فرمایا:

"بدوی کے انکار کی وجہ یہ نہ تھی، بلکہ وہ "فاعلمو" کا بلیغ تیور ہے، جو اس جگہ رحم ومغفرت کے ذکر کے منافی ہے"۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی اس بلاغت پر بے اختیار زبان سے نکل آیا

تو ئی چناں کہ تو ئی ہر کسے کجا داند

احادیث کے متعلق مولانا کا نظریہ

احادیث کے متعلق مولانا کا نظریہ بہت بلند تھا۔ مولانا فرماتے تھے، کہ ہر حدیث قرآن مجید کی کسی نہ کسی آیت کی تفسیر ہے۔ نیز یہ کہ ہر حدیث مشکاۃ نبوت کی اس تنویر کی روشنی میں جو "بما أراک اللّٰہ"[74] کے ماتحت آپ کو حاصل تھی۔ اس امر پر زبردست دلیل ہے، کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تشریح وتبیین آیات قرآنی کی فرمائی ہے، سب کے لیے آپ نے قرآن کے الفاظ میں اشارات پائے ہیں۔ جس طرح مجتہدین آیات منصوصہ میں مدار حکم کے اشارات پاتے ہیں پھر اس پر قیاسات کی بنیاد رکھتے ہیں اور فروعی احکامات کا استخراج کرتے ہیں۔ اس لیے مولانا کی رائے تھی کہ ہر حدیث کا تعلق قرآن

---

[74] سورۃ النساء:۱۲

سے بتانا چاہیے، اور ہر نوع کے مسائل کے متعلق سب سے پہلے قرآن سے جو کچھ ثابت ہے، اس کو زیر بحث لانا چاہیے، اس کے بعد احادیث سے جو کچھ سمجھا ہے اس کو بتانا چاہیے۔ اس کے بعد طلبہ کو اس کی طرف رہنمائی کرنی چاہیے، کہ مسئلہ کے اس خاص نوع میں مجتہدین کی کیا خدمات ہیں، اور کیوں کر ہیں، اور ان کا مدار کیا ہے؟

مولانا کا فقہ میں درجہ

مولانا جس طرح اختلاف احادیث کے باب میں جمع اور تطبیق سے کام لیتے تھے، اور اختلاف احوال اور مقتضائے ماحول پر اس کو محمول فرماتے تھے، یا اختلاف مدارج یعنی اباحت، رخصت، عزیمت کو سبب قرار دیتے تھے۔ اسی طرح فقہاء کے مختلف اقوال میں بھی جمع اور تطبیق سے کام لیتے تھے، اور امام صاحب اور صاحبین کے اختلاف کو نیز دوسرے ائمہ، امام شافعیؒ وغیرہم کے اختلاف کو خصوصاً معاملات میں مقتضائے ماحول اور اسی طرح کے دوسرے اسباب پر محمول فرماتے تھے، اور کہتے تھے مختلف جہات کی بنا پر جو مختلف احکام ہیں، ان میں واقعیت کے اعتبار سے دراصل کوئی اختلاف ہی نہیں ہے۔ اسی نظریہ پر مولانا یہ ہدایت فرماتے رہتے تھے کہ مفتی کو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب کے باب استصلاح کو ضرور مطالعہ کرنا چاہیے، تاکہ حوادث آتیہ اور جاریہ کے متعلق وہ بصیرت کے ساتھ فتویٰ دے سکیں۔

یہی وہ خصوصیات تھیں جن کی بنا پر مولانا ان مسائل میں جو ارتقائی اسباب کی بنا پر آئے دن نئی نئی صورتوں میں رونما ہوا کرتے ہیں، بلا تکلف صائب رائے دیتے تھے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کو پہلے سے سوچے بیٹھے

ہیں، اور اس کے شواہد اور نظیر پر غور و فکر کے تمام مراحل کو طے فرما چکے ہیں۔

جمعیۃ علمائے ہند اور اس طرح کی دوسری کمیٹیوں کی مجلس منتظمہ اور مجلس عاملہ پر ایک مرتبہ گفتگو آئی، اور اس سلسلہ میں یہ مسئلہ بھی سامنے آیا کہ موجودہ طریقہ پر انتظامی امور میں کثرت رائے سے جو فیصلہ کیا جاتا ہے، یا صدر کی رائے کو ترجیحی حیثیت دی جاتی ہے، اس کی کوئی نظیر عہد رسالت یا خلافتِ راشدہ میں ہے تو مولانا نے فوراً جواب دیا کہ ہاں اس کی نظیر وہ کمیٹی ہے،[۷۵] جس کو حضرت عمرؓ نے انتخاب خلیفہ سویم کے لیے مقرر کیا تھا۔ اور فرمایا تھا کہ اگر چھ آدمیوں کی کمیٹی میں سے تین تین دونوں طرف ہو جائیں تو عبدالرحمن جس طرف ہوں ان کو خلیفہ مقرر کرو، ورنہ اکثریت کی رائے پر عمل کرو۔

باتیں لکھنے کی بہت ہیں، لیکن اس رسالہ کی تنگ دامانی اس کی متحمل نہیں ہے۔ میرے خیال میں مولانا کی اصلی خصوصیت "تفقہ فی الدین" کی خداداد دولت تھی، جس میں وہ فقیہ اور یگانہ تھے۔ مولانا جس وقت الہ آباد سے گیا کو مراجعت فرما رہے تھے اور عمائدین کی جماعت مولانا کو رخصت کرنے کے لیے اسٹیشن پر تھی، تو ہر شخص کی زبان پر یہی تھا کہ الہ آباد سے "فقہ" رخصت ہو رہی ہے۔

مراجعت گیا

مولانا الہ آباد چھوڑ کر گیا (صوبہ بہار) کیوں تشریف لائے، اس کے اسباب سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ دراصل اس کا باعث ایک تو مولانا کا تعلیمی نظریہ تھا، دوسرے مدارس عربیہ کی زبوں حالی اور علمی کیفیت کی روزبروز

---

[۷۵] کنز العمال ج ا ص ۱۵۷

انحطاط پذیری تھی، جو مولانا کو بے چین اور مضطرب رکھتی تھی۔ مولانا چاہتے تھے کہ :

(۱)موجودہ نصاب بدل دیا جائے۔

(۲) صوبہ بہار کے تمام مدارس میں ایک نصاب جاری کیا جائے۔

(۳)مدارس عربیہ کے امتحان کے لیے لائق علماء کی ایک مجلس ممتحنہ ہو، جو امتحان کے سوالات مرتب کرے اور ان کے نتائج کو شائع کرے۔

(۴)تمام مدارس میں جو بڑا مدرسہ ہو، اس کو جامعہ ملیہ قرار دیا جائے۔

(۵) ہر قابل اعتناء مدرسہ کے ذمہ ایک مخصوص فن دے دیا جائے، جس کی تکمیلی تعلیم وہاں ہو، اور ابتدا ہی سے غیر محسوس طریقہ پر اس کا وہاں کے ہر درجہ میں لحاظ رکھا جائے مثلاً کسی مدرسہ کا خصوصی فن حدیث ہو، کسی کا فقہ ہو، کسی کا قرآن ہو وغیرہ۔

ان جملہ وجوہ کے ساتھ بہاری طلبہ کے اصرار کو بڑا دخل تھا، جو ہمیشہ مولانا کو مراجعت گیا کے لیے اُبھارتے رہتے تھے، اور کہتے رہتے تھے کہ جب تک آپ معیاری حیثیت کی تعلیم گاہ کی بنیاد رکھ کر جس میں کسی کا دخل نہ ہو، نمونہ قائم نہ کردیں گے، اور براہِ راست جدوجہد کو کام میں نہیں لائیں گے۔ مدارسِ عربیہ کے بوسیدہ نظام میں انقلاب نہیں پیدا ہوگا۔

بالآخر مولانا نے اس دعوت رنج و محن کو قبول کرلیا، اور گیا کی مراجعت کے لیے تیار ہوگئے، اور سب سے پہلا وفد دو شخصوں کا جس میں ایک راقم الحروف اور دوسرے مولوی احمد اللہ صاحب آبگلوی (جو ان دنوں دائرۃ المعارف حیدرآباد میں برسرِ خدمت ہیں) گیا روانہ کیا، تاکہ کسی مناسب مکان کا

مدرسہ کے قیام کے لیے پہلے سے انتخاب کرلیا جائے۔

ہم لوگوں نے ایک مکان کو مناسب سمجھ کر منتخب کرلیا اور مولانا کو اطلاع دے دی۔ تقریباً پندرہ بیس دن کے بعد مولانا پندرہ بیس بہاری طلبہ کی ایک جماعت کے ساتھ گیا تشریف لے آئے اور "ظفر منزل" کے سامنے ایک دومنزلہ مکان کرایہ پر لے لیا گیا۔ وہی مدرسہ بھی تھا اور وہی دارالطلبہ بھی۔

ابتدائی مشکلات

مولانا کا حال یہ تھا کہ وہ پس ماندہ کرنا نہیں جانتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں جو کچھ پڑتا تھا وہ خرچ ہو جاتا تھا۔ الٰہ آباد سے روانہ ہوئے تو جو کچھ ان کے پاس تھا ساتھ آنے والے طلبہ کے ٹکٹ اور ضروری مصارف پر خرچ کردیا۔

تعاون باہمی

یہاں پہنچ کر قیام کے بعد سب سے پہلا اہم مسئلہ طعام کا تھا۔ جس کا حل یہ کیا گیا کہ جس کے پاس جو کچھ تھا، وہ سب ایک جگہ جمع کردیا گیا، اور اسی سے قوت لایموت کا یہ انتظام کیا گیا کہ اکثر کھچڑی اور کبھی صرف خشکہ پکا لیا جاتا تھا، اس کو سُرخ مرچ کے بھرتہ کے ساتھ جو آگ پر بھون لی جاتی تھی، اور اس میں نمک ملا دیا جاتا تھا، مولانا ایک دسترخوان پر بلا تکلف طلبہ کے ساتھ بیٹھ کر کھا لیتے تھے اور مولانا کی پیشانی پر کبھی شکن بھی نہیں پڑتی تھی۔ مجھ کو یاد ہے کہ ایک عید ایسی بھی گزری تھی، کہ مولانا مدرسہ کی ضرورت سے کہیں باہر تشریف لے گئے تھے، اس روز کھانے کا کوئی سامان نہ تھا، صرف چند سیر گیہوں تھے۔ ان ہی کو بھون کر صوم عید کی حرمت سے گلوخلاصی کے بعد صبر و شکر کے ساتھ دوگانۂ عید ادا کی گئی تھی۔

عزیمت واستقلال

ان غیر معمولی حالات میں مولانا کو میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ وہ اس رنج ومحن کے کٹھن ایّام میں کبھی بھی مایوس ہوئے ہوں، یا یہ کہ ان کو کبھی خیال ہوا ہو، کہ بیٹھے بٹھائے کیوں الٰہ آباد کی طمانیت کی خوش عیش اور خوشگوار زندگی کو چھوڑ کر اس دردِ سر کو خریدا۔ مولانا ہمیشہ پر اُمید رہتے تھے، اور طلبہ کو پر اُمید رکھتے تھے، مشکلات سے نہ گھبراتے تھے، نہ کام کے ہجوم سے پریشان ہوتے تھے۔ ان ایام میں وہ تنہا سب کام انجام دیتے تھے، خود ہی مدرسہ کے مہتمم بھی تھے، مدرس بھی تھے، سفیر بھی تھے اور طلبہ کے اتالیق بھی تھے اور ان کے غم گسار اور مربی بھی تھے۔

تواضع اور خاکساری

پھر ان سب باتوں کے باوجود عملاً وہ مل جل کر رہنے میں، اتنے خاکسار اور متواضع تھے، کہ وہ ان امور میں بھی شریک ہو جاتے تھے، جو تقسیم کار کے اصول پر ہم لوگ اپنے ذمہ لیتے تھے۔ اور یہ مولانا کی طبیعت ثانیہ تھی، وہ اس میں نہ اپنے لیے عار سمجھتے تھے اور نہ ان کی جھجھک ہوتی تھی، پھر یہ انداز مرتے دم تک رہا۔ اور مولانا کی زندگی کے ہر دور میں یہ خصوصیت نمایاں رہی۔

مدرسہ انوار العلوم کی عمارت:

مدرسہ انوارالعلوم گیا مولانا کی انتھک کوششوں اور اخلاص کے باعث جب پروان چڑھا، عمائدین شہر کی اچھی خاصی توجہ بھی اس کو حاصل ہو گئی، اور مسماۃ مریم نے (خدا ان کو جنت نصیب کرے) مدرسہ کے لیے کچھ زمین، کچھ مکان، کچھ جائداد وقف کیا، اور مولانا کرایہ کے مکان سے جو ظفر منزل کے

سامنے تھا اُٹھ کر اس موقوفہ مکان میں چلے آئے، اور طلبہ کے قیام وطعام کا بھی بہتر اور قابل اطمینان سامان ہو گیا۔ تو مولانا کا خیال ہوا کہ مدرسہ کے لیے ایسی عمارت کی بنیاد رکھی جائے، جو درس گاہ اور طلبہ کے قیام گاہ دونوں کا کام دے۔ لیکن اس وقت باوجود ہر طرح کی سہولت کے اتنی مالی وسعت نہ تھی کہ اتنی بڑی عمارت جو اس وقت موجود ہے، اس کے ہر طرح کے مصارف کا بار اُٹھا لیا جاتا۔ اس لیے مولانا رات کو یہ کرتے کہ اتنی اینٹیں جو کل دن کے کام کے لیے کافی ہو جائیں، اینٹ کے بھٹہ سے جو عمارت کے قریب ہی احاطۂ باغ میں تیار کیا گیا تھا، طلبہ کو ساتھ لے کر ڈھوتے تھے، اور بنیاد کے پاس لا کر جمع کر دیتے تھے، اس طرح روز روز کا کام بھی سہولت اور کفایت سے ہوتا تھا۔ اور طلبہ میں عمل کی گرم جوشی رہتی تھی، اور نہ کسی کا بوجھ ہوتا تھا اور نہ کسی میں تنگ دلی پیدا ہوتی تھی۔ ہر شخص مولانا کے ساتھ خوشی خوشی اس کام کو انجام دیتا تھا، اور اپنے لیے سعادت سمجھتا تھا، اور یہ سب مولانا کے اخلاص اور عملی زندگی کی برکت تھی۔

چمپارن کا ایک واقعہ:

اسی طرح مجھ کو یاد ہے کہ زلزلہ کے موقع پر جب مولانا چمپارن کے دیہاتی علاقہ میں تشریف لے گئے، اور غریب کسانوں کی حالت زار دیکھ کر یہ محسوس کیا کہ یہ خانماں برباد تنگدستی کے ہاتھوں اس قابل نہیں ہیں کہ مزدور کی مزدوری ادا کر کے اپنے اور اپنے بال بچوں کی حفاظت کے لیے کوئی جھونپڑا ہی بنا سکیں تو مولانا نے تعاون باہمی کے اصول پر بعض جگہ اس طرح کام شروع کرا دیا کہ گاؤں کی آبادی کو متعدد جماعتوں پر تقسیم کر دیا اور ہر جماعت کا فریضہ قرار دیا کہ وہ باہم مل کر اپنی جماعت کے ہر فرد کا نوبت بہ نوبت چھپر، ٹھاٹھ، ٹٹی

وغیرہ بنائیں، اور عملاً اس میں سرگرمی بھی پیدا کیا، کہ خود بھی ان کے ساتھ بیٹھ کر دن بھر مزدور کی طرح ٹھاٹھ بناتے تھے اور ہاتھ میں رسّی اور چاقو لیے ہوئے ٹھاٹھ کی بندھن باندھا کرتے تھے۔

خودداری اور غیوری

جماعتی معاملات میں اس خاکساری اور تواضع کے ساتھ ذاتی معاملہ میں مولانا انتہا درجہ کے خوددار اور غیور تھے۔ شاید یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مولانا کی زندگی نہایت عسرت کی زندگی تھی، اس میں شبہہ نہیں کہ ابتدا میں مولانا کا گھر دال روٹی میں خوش حال گھرانوں میں تھا، معقول کاشت کاری تھی۔ ہر طرح کی وسعت اور فارغ البالی تھی، دو چار ملازم اور کام کرنے والے گھر پر ہمیشہ مصروف خدمت رہتے تھے، مگر یہ سب کچھ اس زمانہ میں تھا، جب مولانا مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں مدرس تھے۔ چنانچہ جب کبھی ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ کسی وجہ سے ہفتہ دو ہفتہ کے لیے مدرسہ بند ہو جاتا تھا۔ تو مولانا ایسے پندرہ بیس طلبہ کو جن کے اسباق کا ناغہ آپ کے نزدیک نامناسب معلوم ہوتا تھا، اپنے ساتھ اپنے مکان پنہسہ لے جاتے تھے، اور سب کے ناشتے اور کھانے کے خود ہی کفیل ہوتے تھے، اور ان کو وہیں پڑھاتے تھے۔

اس کے بعد جب وہ دور آیا کہ مولانا جماعتی اور دینی کاموں میں ایسے منہمک ہوئے کہ اس کی طرف سے بالکل بے توجہی ہوگئی، تو آہستہ آہستہ کاشت کاری خراب ہوگئی، اور محض خراب نہیں، بلکہ بربادی کی حد تک پہنچ گئی، یہاں تک کہ اس کی پیداوار سے زمین دار کی مال گزاری بھی ادا نہ ہو سکی، اور کئی زمین غالباً نیلام بھی ہوگئی۔

مولانا کی زندگی موجودہ حالت میں بالکل وجہ کفاف پر تھی۔ مگر اس حالت میں بھی وہ دوسروں کے لیے فیاض، اور اپنے احباب کے لیے مہمان نواز تھے، مجھ کو ذاتی طور پر اس کا علم ہے، مولانا اس سلسلہ میں مقروض بھی ہو جاتے تھے، اور شاید ان کے خاص لوگوں میں سے بھی بہت کم لوگ ہیں، جن کو مولانا کی اس غمگین زندگی کی اطلاع ہو۔

اس پر بھی مولانا کی خودداری کا یہ حال تھا کہ کسی کا احسان مند ہونا پسند نہیں فرماتے تھے۔ نواب خاں بہادر عبد الوہاب خاں صاحب مونگیر نے مجھ سے ذکر کیا کہ میں نے تنہائی میں مولانا سے ایک دفعہ کہا کہ مجھ کو اس کا موقع دیجیے کہ میں آپ کی خدمت کرکے اپنے لیے سعادت حاصل کروں، تو مولانا نے فرمایا کہ اس سے مجھ کو معاف رکھیے، اس سے ہمارے اور اللہ کے درمیان میں توکل کا جو معاملہ ہے اس میں خلل واقع ہو جائے گا۔ نواب صاحب ممدوح نے مجھ سے کہا، اس کے بعد میری ہمت نہیں ہوئی کہ میں ایک لفظ زبان پر لاؤں۔

مروّت وتلطف:

پھر میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی تھی، جب میں یہ دیکھتا تھا کہ عین اس حالت میں کہ مولانا خود مقروض ہوتے تھے۔ ان کے خاص احباب جب ان سے قرض مانگتے تھے، تو خودداری اور مروّت کا یہ عالم تھا کہ انکار نہیں فرماتے تھے، بلکہ قرض لے کر ان کو قرض دیتے تھے۔ اور ایک لفظ ایسا زبان پر نہیں لاتے تھے، جس سے اس کا وہم بھی ہو کہ ان کو کسی طرح پریشانی لاحق ہے۔ مولانا کی طبیعت بہت حساس واقع ہوئی تھی۔ اس لیے ان کا پورا پورا خیال رکھتے تھے۔ اس کو میری حالت کا احساس نہ ہو، ورنہ اس کو ندامت ہوگی کہ

پریشانی کی حالت میں مولانا کو کیوں پریشان کیا۔ اس معاملہ میں مولانا صحیح طور پر اس کے مصداق تھے کہ "یؤثرون علیٰ اَنفسھم ولو کان بھم خصاصۃ"

(وہ دوسروں کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ اپنے اوپر فاقہ ہو۔)

پھر مروّت کے ساتھ تلطف کا یہ عالم تھا کہ احباب تو احباب وہ بدخواہ بھی جن کو مولانا اچھی طرح جانتے اور پہچانتے تھے، جب مولانا کے حضور میں آتے تھے تو مولانا اس طرح پیش آتے تھے کہ گویا ان سے کوئی شکوہ ہی نہیں ہے اور نہ کوئی تکلیف ہی ان سے پہنچی ہے۔

اگر یہ احساس مجھ کو مانع نہ ہوتا کہ مولانا کی روح کو اذیت ہوگی کہ کیوں میں نے ان لوگوں کے ستر حال کا لحاظ نہیں کیا، تو میں ان کی نشان دہی کرتا اور اس سلسلہ میں مروّت وتلطف کے چند واقعات لکھتا۔

ہوسکتا ہے کہ جن کو آج ہم نہیں لکھنا پسند کرتے ہیں، کل یہی واقعات عمولانا کے سوانح نگار کی زبان قلم پر آجائیں۔

غیرتِ دینی:

مولانا ذاتی معاملات میں جس طرح انتہا درجہ کے بامروّت تھے، اور تسامح اور درگزر کے خوگر تھے، دینی معاملات میں وہ انتہا درجہ کے غیور اور عفو ودرگزر، تسامح اور تلطف کو بالکل جائز نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس کو مداہنت فی الدین سمجھتے تھے۔ پھر اس میں نہ شخص کی پرواکرتے تھے اور نہ جماعت کی، نہ اپنوں کی پرواکرتے تھے، نہ غیروں کی۔

چنانچہ ۲۰۔۱۹۱۹ء میں جو ہندو مسلم اتحاد کا دور تھا، جب عملاً یہ اتحادی

نظریہ شرعی نقطۂ نگاہ سے اعتدال سے گزر کر افراط وتفریط کی حد تک پہنچ گیا۔ یہاں تک کہ ایک طرف انفرادی طور پر بعض مسلمان لیڈروں نے جوش اتحاد کے مظاہرہ میں پیشانیوں پر قشقہ لگالیا، اور کاندھوں پر ارتھی اُٹھالی، اور دوسری طرف جماعتی حیثیت سے مسلم لیگ نے اپنے آل انڈیا اجلاس امرتسر ۱۹۱۹ء میں قربانی کے ترک پر تجویز پاس کردی جو آج تک مسلم لیگ کے دفتری ریکارڈ میں موجود ہے[۷۶]، اور اس کی تنسیخ عمل میں نہیں آئی ہے، تو مولانا کے تحمل سے یہ باہر ہوگیا، اور سب سے پہلے اس کے غلط اثرات کا احساس کیا، اور بلاخوف لومۃ لائم یہ اعلان کیا کہ:

> "غیرمسلموں سے مصالحت ومواد عت کا منشا کیا ہے۔ احکام مذہب، شعارِ ملت، خصائص قومی کی حفاظت اور اپنے مخصوص اخلاقِ حسنہ کے ذریعہ سے ان قوموں میں تبلیغ ودعوت۔ اس لیے اگر ضرورت ہو تو دنیا کی بہتر سے بہتر اور قیمتی سے قیمتی چیز غیرمسلموں کی مصالحت پر قربان کردی جاسکتی ہے۔ ان کے دلوں میں گھر کرنے کے لیے اپنے گھر کی ساری دولت لٹادی جاسکتی ہے۔ مگر احکامِ اسلام، شعار ملت، حقوق وخصائص قومی

[۷۶] آل انڈیا مسلم لیگ کی تجویز کے الفاظ یہ ہیں: " آل انڈیا مسلم لیگ کی یہ رائے ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ اہل ہنود نے جس نیک رویہ کا اظہار کیا ہے اس کے اعتراف اور ہندوؤں اور ہندوستان کے مسلمانوں کے درمیان رشتۂ اتحاد کو زیادہ مضبوط کرنے کی غرض سے بقرعید کے موقع پر جہاں تک ممکن ہوسکے گا گائے کی قربانی کے بجائے دوسرے جانوروں کی قربانی کی جائے۔ (روداد آل انڈیا مسلم لیگ اجلاس امرتسر)

میں سے چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی نہیں چھوڑی جاسکتی ہے۔ کیوں کہ یہ دنائت فی الدین ہے۔ اور نہ غیر مسلموں کے مخصوص مراسم کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ یہ شرک فی الاسلام اور فنائے قومیت اور تفویت مقاصد اسلام ہے"۔

علمائے بہار کے متفقہ فتویٰ کی ترتیب:

اور اسی کے ساتھ مولانا نے صدر کی بے اعتدالیوں کے متعلق ایک فتویٰ مرتب فرمایا، اور اس کو جمعیۃ علماء بہار کے اجلاس در بھنگہ ۱۳۳۹ھ (۱۹۱۱ء) میں پیش کیا، جو متفقہ طور پر منظور کیا گیا، اور تمام علماء کرام نے اس فتویٰ پر اپنے دستخط ثبت فرمائے۔ مولانا نے اس وقت اس کو رسالہ کی شکل میں "علماء بہار کا متفقہ فتویٰ" کے نام سے دو ہزار کی تعداد میں شائع کیا۔ اس تاریخی فتوے میں اور بے اعتدالیوں کے ساتھ قشقہ وترک ذبح گاؤ پر بھی استفتا کیا گیا تھا۔ بعض اقتباس بلفظہ حسب ذیل ہیں:

> کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیانِ شرع متین امور مفصلہ ذیل کے متعلق کہ شرعاً یہ امور کسی مسلمان کے لیے جائز ہیں یا نہیں؟
>
> قشقہ لگانا وجلوس رام لیلہ وغیرہ وہندو کے دیگر مراسم مذہبی میں شریک ہونا، کنٹھا لگانا جو بھگت ہونے یعنی التزام ترک گوشت خوری کی علامت ہے۔
>
> ہندوؤں کے جذبہ گاؤپرستی کے لحاظ وخیال کی بنا پر ذبح گاؤ سے پرہیز کرنا۔ دوسروں کو بھی اس سے بچنے کی تاکید کرنا، یا

ہندوؤں کے جبر ودباؤ سے ذبح کاروباری سے احتراز کرنا؟

الجواب:

(۱) ان سب اُمور کو جائز اور بہتر سمجھ کر کرنے والا خارج از اسلام ہے، مرتد ہے، اور اگر بلاجواز اعتقاد ان امور کا کوئی مسلمان مرتکب ہو تو سخت گناہ ہے کیوں کہ یہ سب مراسم مشرکین ہیں۔ ان امور سے بچنا اور پرہیز کرنا مسلمانوں پر واجب ہے۔ (اس کے بعد حدیث وفقہ کے حوالے نقل کیے گئے ہیں)۔

(۲) ان جمیع وجوہ کی بنا پر ذبح گاؤ سے پرہیز کرنا ناجائز ہے۔ ہندو کے خیال سے کہ ان کا دل دکھتا ہے، ذبح گاؤ کو ترک کردینا قطعاً حرام ہے۔ کیوں کہ اس میں تائید علی الشرک ہوتی ہے، اور مشرکین کی ہواپرستی کی باتوں کو تسلیم کرنا بالکل ناجائز ہے، گو رکھشا اور گوا کے بچانے کا مسئلہ ہندوؤں کی ہواپرستی ہے۔ یعنی گاؤ کے اندر وہ ایک خاص عظمت سمجھ کر قابل پرستش سمجھتے ہیں، پس جب تک ہندوؤں کے اندر جذبۂ گاؤپرستی موجود ہے، اس وقت تک ذبح گاؤ سرزمین ہند میں ایک شعار توحید اور شعار اسلام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "لئن اتبعت اھواءھم من بعد ما جاء ک من العلم اِنّک اِذا لمن الظالمین" (یعنی اگر کافروں کی خواہش کے مطابق کام کروگے باوجود اس بات کے کہ تمہیں علم قرآن ہوچکا ہے تو بیشک تم اس وقت ظالموں میں سے ہوگے) ونیز مجدد الف ثانی

مکتوب ہشتاد و یکم (جلد اوّل ص:۱۰۶ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ)
میں تحریر فرماتے ہیں: "غربتِ اسلام نزدیک بیک قرن برنہجے
قرار یافتہ است کہ اہل کفر بمجرد اجرائے احکامِ کفر بر بلاد اسلام
راضی نمی شوند، می خواہند کہ احکام اسلامیہ بالکلیہ زائل گردد،
واثرے مسلمانان و مسلمانی پیدا نہ شود، وکار سرحد رسانیدہ اند کہ
اگر مسلمانے اسلام اظہار نماید بقتل می رسد، ذبح گاؤ در
ہندوستان از اعاظم شعار اسلام ست، کفار بجزیہ دادن شاید
شوند، اما بذبیح بقر ہرگز راضی نخواہند شد"۔ (تقریباً ایک قرن
سے اسلام کی ایسی حالت ہوگئی ہے کہ کفار اسلامی ممالک پر
بمجرد اپنے کفریہ احکام جاری کرنے کے راضی نہیں ہیں۔ بلکہ
احکام اسلام کے ناپید ہونے کے خواہاں ہیں اور چاہتے ہیں
مسلمان اور مسلمانی کا کوئی اثر نہ ظاہر ہو۔ یہاں تک نوبت پہنچ
گئی کہ اگر کوئی مسلمان اپنے اسلامی شعار کا اظہار کرے، تو کفار
اس کو قتل کر ڈالیں گے، ہندوستان میں اسلام کی بڑی نشانیوں
میں سے ایک بڑی نشانی ذبح گاؤ ہے، کیوں کہ کفار جزیہ دینا شاید
منظور کرلیں، مگر گائے کے ذبح کیے جانے پر ہرگز ہرگز
رضامند نہ ہوں گے۔)

بکسر کا واقعہ اور گاندھی جی کا دورہ:

اس سلسلہ میں مولانا کی زندگی کا ایک تاریخی واقعہ بکسر کا ہے۔
اخباروں میں بھی یہ اعلان ہوا کہ ترکِ ذبح گاؤ کے متعلق چاہے وہ قربانی کی شکل

میں ذبح ہو، یا عام طور پر غذا میں کھانے کے لیے ذبح ہو۔ گاندھی جی مولانا محمد
علی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے لیڈروں کی معیت میں ملک کا دورہ کریں گے، اور
اس کی تبلیغ کریں گے، اور طے کردیں گے، کہ ہندوؤں کی خاطر مسلمان ذبح گاؤ
ترک کردیں، تو مولانا مضطرب ہوگئے، اور نہ معلوم ان کے فکر و تدبر کے عمیق
سمندر میں چند منٹ کے اندر کیا تلاطم ہوا کہ چہرہ تمتما اُٹھا، پیشانی پر بل پڑ گیا،
اور حسبِ عادت ہونٹوں کو دانتوں کے نیچے دبالیا، اور بول اُٹھے کہ یہ نہایت ہی
خطرناک فتنہ ہے۔ جس کو پوری قوت سے اسی قدم پر دبا دینا چاہیے۔ اتنا کہہ کر
پھر خاموش ہوگئے، اور پانچ منٹ کے بعد فرمایا کہ بہار کی سرحد پر بکسر میں
داخل ہونے سے پہلے میں گاندھی جی سے مل کر گاؤ کے مسئلہ پر گفتگو کروں گا۔
گاندھی جی کی سمجھ میں بات آگئی، تو خیر، ورنہ میں ان کے جلسہ کے مقابلہ میں
ہر جگہ جلسہ کروں گا، اور مسلمانوں کو اس فتنہ میں مبتلا ہونے نہیں دوں
گا۔ یہاں تک کہ بہار کے دورہ کے لئے جب گاندھی جی بکسر پہنچے تو مولانا یکہ
و تنہا ایک دن پہلے سے وہاں موجود تھے، مولانا محمد علی اور دوسرے مسلمان
لیڈر سے گفتگو ہوئی، مسئلہ کی اہمیت کسی اور صاحب کی سمجھ میں تو نہ آئی مگر
مولانا محمد علی سمجھ گئے، لیکن انہوں نے فرمایا میں آپ کی ترجمانی گاندھی جی سے
کروں گا تو ضرور، لیکن ان کی سمجھ میں آپ کی یہ منطق اور آپ کا یہ اصول نہیں
آئے گا کہ مباحات کے ترک پر جب اصرار کیا جاتا ہے اور اس پر مجبور کیا جاتا
ہے تو وہ مستلزم وجوب عموم کو ہو جاتا ہے، اور گاندھی جی اس سے مطمئن نہ
ہوں گے، گرچہ مسئلہ کے اعتبار سے حق یہی ہے جو آپ فرماتے ہیں لہٰذا کوئی
ایسی چیز فرمائیے جو میں گاندھی جی کے سامنے رکھوں اور ان کی سمجھ میں بھی

آجائے۔ مولانا نے فرمایا کہ ہاں اس مسئلہ کو ان کے سامنے یوں رکھئے کہ ہر اس مسلمان پر جو چالیس روپیہ یا چالیس روپیہ کی مالیت کی چیز کا مالک ہو اور وہ اس کے حوائج اصلیہ سے زائد ہو اس پر اسلام میں قربانی واجب ہے، اب ہر وہ کسان جو پانچ کٹھہ کھیت بھی رکھتا ہو اس پر قربانی واجب ہے اور ہر وہ عورت جو چالیس روپیہ کا زیور رکھتی ہے اس پر بھی قربانی واجب ہے، اب ایک گھر میں فرض کیا کہ ایک مرد ہے جو پانچ کٹھہ کھیت کا مالک ہے اور گھر میں چھ عورتیں ہیں (جن کے پاس عموماً اتنی ہی مالیت کا زیور ہوتا ہے) سب پر قربانی واجب ہے، اور آئین اسلامی کی رو سے اس کا فریضہ ہے کہ قربانی کرے، اب اگر سات راس خصی خریدتا ہے تو فی آدمی دس روپیہ کے حساب سے ستر روپئے اس کو چاہئیں، اور یہ اس کے امکان سے باہر ہے، اور اگر ایک گائے خریدتا ہے تو زیادہ سے زیادہ پندرہ روپیہ میں اس کو مل جاتی ہے اور سب کے سب قربانی کے فریضہ سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ بھڑک اٹھے کہ مولانا بس بس، یہ حساب کتاب والی بات گاندھی جی کی سمجھ میں آجائے گی، اور میں آپ کی پوری ترجمانی کروں گا۔ چنانچہ حضرت مولانا گاندھی جی سے ملے اور مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا کی ترجمانی اور تعارف کرایا، کہ یہ صوبہ بہار اور اُڑیسہ کے نائب امیر شریعت ہیں، بالآخر یہ بات طے پاگئی کہ بہار کے دورہ میں "ترکِ ذبح گاؤ پر کہیں تقریر نہیں ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں سے رواداری کی درخواست کی جائے گی۔ اور بس"۔

مولانا وہاں سے کامیاب واپس آئے۔ مگر اس فیصلہ کے باوجود بھی وہ

گاندھی جی کے جلسوں کی نگرانی کرتے رہے، اور اس سے باخبر رہے کہ کہاں کیا جاتا ہے۔

ایک اور واقعہ:

اسی سلسلہ کا مولانا کی حرارت ایمانی اور غیرت دینی کا ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے، کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کے سلسلہ میں قربانی گاؤ کے متعلق ایک آل انڈیا لیڈر سے خطاب کرتے ہوئے بھری مجلس میں مولانا نے برملا یہ تاریخی الفاظ فرمائے تھے:

> "سال بھر میں صرف ایک دفعہ گائے کی قربانی سے ڈاکٹر صاحب کا خون کھول جاتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کو یاد رکھنا چاہیے کہ ایک مسلمان جب بازاروں میں دریا کے کنارے اور آبادی میں گزرتا ہے۔ تو ہر قدم پر اس کا خون کھولتا ہے، جب کہ وہ دیکھتا ہے کہ اس کے محبوب خدا کی تحقیر کی جارہی ہے، جس کی وہ عبادت کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے، کہ کہیں پتھروں اور مورتیوں کو پوجا جارہا ہے۔ کہیں سمندر کے موجوں کی پوجا ہورہی ہے۔ کہیں درختوں کو پوج کر اس کے خدا کے حقوق کو پامال کیا جارہا ہے۔ لیکن مسلمان ان سب کو اس لیے برداشت کرتا ہے، کہ اب تک وہ اس سلوک کا عادی ہے، جو حکمراں ہونے کی حیثیت سے اُسے غیر مذاہب کے ساتھ کرنا چاہیے۔ اگر ہندو مطالبہ کرتے ہیں کہ مسلمان گائے کی قربانی ترک

کرکے ان کے جذبات کا احترام کریں، تو انھیں غیر اللہ کی پرستش چھوڑ کر مسلمانوں کے جذبات کا احترام کرنا پڑے گا"۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ کو خود مجھ سے بیان فرمایا۔

مولانا کی زندگی کے یہ چند شذرات ہیں، جن کو میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں، ورنہ مولانا کے سیاسی کارنامے اور دینی اور جماعتی خدمات جو امارت شرعیہ اور جمعیۃ علماء کے سلسلہ میں انجام دیئے ہیں، اور جن کا میں نے یہاں کوئی ذکر نہیں کیا ہے سیاسی اور انقلابی تاریخ کا اتنا بڑا وسیع باب ہے، جو اپنے میں دفتر کے دفتر رکھتا ہے۔ اس کا نہ یہ مختصر مضمون متحمل ہو سکتا ہے، اور نہ اس مجموعہ میں اس کے لیے گنجائش نکل سکتی ہے۔ خدا حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کو "فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر" کے درجہ عالیہ میں جگہ دے اور ہم لوگوں کو حضرت استاذ کے مشن کو زندہ رکھنے اور چلانے کی توفیق دے۔ آمین۔”

” حیات سجاد، ص۲۷۔

علالت کے نو دن

حضرت مولانا عبدالصمد رحمانیؒ

حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت ۹/ شوال یوم یکشنبہ ۱۳۵۹ھ سے ناساز ہوئی۔ صبح کو حسبِ معمول دفتر امارت شرعیہ میں تشریف لائے۔ روزانہ کے خطوط سنے اور ہدایات دیئے۔ پھر تھوڑی دیر ٹھہر کر یہ ارشاد فرماکر مکان تشریف لے گئے کہ طبیعت اچھی نہیں ہے، سردی معلوم ہوتی ہے، اور خفیف سی حرارت بھی ہے۔

مکان پہنچ کر کچھ دیر دھوپ میں لیٹے رہے، پسینہ آیا، اس سے کچھ طبیعت ہلکی معلوم ہوئی تو صحن سے اٹھ کر کوٹھری میں چلے گئے۔ اس دن نہ غذا کی گئی، نہ کسی طبیب کی طرف رجوع کیا گیا۔

دوسرے دن ۱۰/ شوال یوم دوشنبہ کو ہم لوگوں کے اصرار پر جناب حکیم سیّد شاہ محمد شعیب صاحب پھلواری شریف کو نبض دکھلائی گئی، اور دوا استعمال کی گئی۔ دفتر امارت شرعیہ میں تشریف لانا موقوف ہو گیا۔ آج کی ڈاک کے ضروری خطوط لے کر میں مکان ہی پر حاضر ہوا، ان کو سنا کر اور ضروری ہدایات لے کر دفتر چلا آیا۔

تیسرے دن ۱۱/ شوال کو حکیم صاحب ممدوح ایک عزیز کی علالت کے سلسلہ میں موضع "حسینا" تشریف لے گئے تو چوتھے دن ۱۲/ شوال کو حکیم مولوی حافظ محمد شرف الدین صاحب پھلواری شریف کی طرف رجوع کیا گیا۔

پانچویں دن تک طبیعت کے انداز اور بخار کے اتار چڑھاؤ میں کوئی غیر معمولی کیفیت نہیں پیدا ہوئی، مگر ضعف ونقاہت بہت زیادہ ہوگئی۔ اور ضرورت اس کی محسوس کی گئی کہ پوری نگرانی کے ساتھ تیمارداری کی جائے۔ خصوصاًرات کی نگرانی پورے انضباط کے ساتھ کی جائے۔ چنانچہ رات کے بارہ گھنٹے اس طرح تقسیم کر دیئے گئے کہ ابتدائی شب کے تین گھنٹے اور انتہائی شب کے تین گھنٹے کی ذمہ داری میرے حصّے میں رہی، اور وسط شب کے چھ گھنٹوں میں تین گھنٹے مختار سیّد محمد منظور صاحب (شرطی دفتر امارت شرعیہ) اور تین گھنٹے عبدالعزیز صاحب (شرطی دفتر بیت المال) کی ذمہ داری میں دی گئی۔

چھٹے دن بخار میں گیارہ بجے دن سے غیر معمولی اشتداد ہوگیا اور تکلیف زیادہ بڑھ گئی، سب سے زیادہ جو چیز پریشان کن ہوتی تھی، وہ ریاح کا صعود تھا۔ اس سے کرب واضطراب اور بے چینی اس قدر بڑھ جاتی تھی کہ تقریباً دن کے تین بجے تک کسی ایک کروٹ پر نہ قرار رہتا تھا، اور نہ کسی طرح کا سکون حاصل ہوتا تھا، چار بجے سے بخار کم ہوگیا، اور کرب واضطراب جاتا رہا، رات بخیریت گذری، اور کوئی غیر معمولی بات پیش نہیں آئی۔

طبیعت جب کچھ بھی سکون میں رہتی تھی تو عام باتوں کے ساتھ اس حال میں بھی علمی باتیں فرمانے لگتے تھے۔ ایک دفعہ مجھ کو یاد ہے کہ فرمانے لگے کہ اس کی وجہ سمجھتے ہو کہ بیمارپرسی کے لیے حدیث شریف میں "عیادت" کا لفظ کیوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اس کی تعبیر میں لقاء مریض، زیارتِ مریض، یااس طرح کے اور دوسرے الفاظ کیوں نہیں ارشاد فرمائے۔ پھر فرمایا: کہ نکتہ یہ ہے کہ اس تعبیر سے ذہن میں یہ بات ڈالنی ہے کہ مریض اس کا محتاج

ہے کہ بار بار اس کی خبر گیری کے لیے اس کے پاس پہنچا جائے۔ کیوں کہ عیادت کا مادّہ "عود" ہے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ اس وقت جب یہ فرمارہے تھے، تکلیف سے مضطرب تھے، ایک دو جملے فرماتے پھر خاموش ہوجاتے تھے۔ پھر ایک دو جملے فرماتے اور خاموش ہوجاتے تھے۔ اس وقت میرے ساتھ عزیز محترم مولوی عبداللہ صاحب سلمہ بازیدپوری بھی تھے۔ جو عیادت کے خیال سے دفتر سے میرے ساتھ ہولیے تھے اور غالباً ان ہی کی عیادت لفظ "عیادت" کی تشریح کی تقریب بن گئی تھی۔

عزیز ممدوح سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ خصوصی محبت رکھتے تھے۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ ان کے والد حضرت استاذ مولانا حکیم محمد صدیق صاحب مدظلہ سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو اتنا گہرا، مخلصانہ رابطہ تھا کہ ایّامِ علالت میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی علالت کی اطلاع کے لیے اور دعا کرنے کے لیے صرف مولانا مدظلہ کا نام لیا تھا، اور خط لکھنے کی ہدایت فرمائی تھی۔

ساتویں دن جناب مولانا حکیم محمد کفیل صاحب داناپور کی طرف رجوع کیا گیا، اور حکیم حافظ شرف الدین صاحب اور مولانا محمد کفیل صاحب کے مشورے سے علاج بدل دیا گیا، اور یہ سمجھا گیا کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو خراب قسم کا ملیریا ہے۔ آج اور دنوں کے اعتبار سے طبیعت پر مرض کا زیادہ اثر تھا۔ کرب واضطراب کے ساتھ قلب زیادہ متالم تھا۔ اور نبض کے نظام میں نمایاں ضعف محسوس ہوتا تھا۔ بخار آج بھی کل کی طرح سے بڑھا۔ لیکن رات کے آخری حصّہ میں بالکل اتر گیا۔

آٹھویں دن صبح سے لے کر حسبِ معمول دس گیارہ بجے تک بخار معمولی درجہ میں رہا۔ اس کے بعد اس کا اشتداد ہوا، اور پھر کرب واضطراب میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ لیکن رات کے ڈھائی تین بجے بخار کم ہو گیا اور ۹۶ر ڈگری تک اتر آیا، اس وقت سے صبح تک بخار بالکل نہیں رہا۔ معمولی گفتگو باطمینان فرماتے رہے۔ خشکی کی حالت میں کبھی انار کے دانے، کبھی سنترا کا نچوڑ، (شیرہ) دیتا رہا، اور مولاناؒ اس کا بلا تکلف استعمال فرماتے رہے۔

صبح کی جب اذان ہوئی تو میں ایک بنچ پر جو مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے کمرہ کے باہر پڑی ہوئی تھی، نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اور مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے خود سے اُٹھ کر چارپائی ہی پر حسبِ معمول بیٹھ کر نماز ادا کی اور لیٹ رہے۔ اور آہستہ آہستہ تسبیح پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔

آج علالت کا نواں دن ہے۔ نماز سے فارغ ہو کر مولانا کے پاس آکر بیٹھ گیا، ہاتھ پر ہاتھ رکھا، نبض کا نظام بالکل صحیح تھا، چہرہ پر سکون وطمانیت کے آثار تھے۔ اوّلاً مزاج پرسی کی۔ جواب میں نہ تو کسی غیر معمولی بات کا اظہار فرمایا گیا، نہ کوئی بے ربط بات فرمائی گئی۔

علالت کے پورے ایّام میں اس وقت بھی جب کہ کرب واضطراب سے آپ بے چین رہتے تھے، اور اس وقت بھی جب کہ بخار کو انتہائی اشتداد ہوتا تھا، کبھی بھی مولاناؒ کا دماغ بے قابو نہیں ہوا، اور نہ کوئی بے ربط بات فرمائی۔ بجز اس کے کہ ایک دن آپ نے اضطراب کی حالت میں کروٹ بدلتے ہوئے یہ فرمایا کہ "آہ دین کی یہ توہین" اور ایک دن انہی حالات میں گھبراہٹ کے لہجہ میں یہ فرمایا کہ "کیا مصر پر بھی قبضہ ہو گیا" یا ہو جائے گا؟۔ اس کے سوا

کسی وقت، کسی دن کوئی بے ربط بات زبان پر نہیں آئی۔ بس یہ چند جملے ہیں جو نہیں معلوم کہ عمیق فکر کے پیشِ نظر بے اختیار زبان پر آگئے۔ یا بالارادہ گہری عمیق فکر کے نتیجہ میں فرمایا گیا۔

آٹھویں کی شام کو حکیم سیّد شاہ محمد شعیب صاحب حسینا سے تشریف لے آئے تھے۔ نویں دن کی صبح کو میں حکیم صاحب کو مولاناؒ کے دیکھنے کو لے آیا، حکیم صاحب تشریف لائے تو مولانا سے مزاج پوچھا۔ مولانا نے اپنا حال بیان فرمایا۔ حکیم صاحب نے ڈھارس بندھائی کہ بخار نہیں ہے، دل ودماغ سب کا فعل درست ہے۔ اس پر مولانا نے فرمایا کہ پکا گیارہ بجے سے اشتداد ہوتا ہے۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ آج بخار نہیں آئے گا۔ اس پر مولانا نے فرمایا، تو یہ آپ کی کرامت ہو گی۔

اس کے بعد حکیم صاحب نے نسخہ دیکھا، جو دوا استعمال ہو رہی تھی، اسی کو باقی رکھا، تقویت قلب کے لیے خمیرہ مروارید عنایت کیا، جو استعمال کرایا گیا۔

گیارہ بجے سے بخار میں اشتداد ہونا شروع ہوا، مگر زیادہ سے زیادہ ایک سو تک پہنچا لیکن ریاحی بواسیر کے اثر سے قلب کی طرف ریاح کا صعود اتنا ہوا کہ متالم قلب متحمل نہ ہو سکا اور کرب واضطراب یک بیک بہت زیادہ ہو گیا۔ اور بارہ بجنے کے بعد حواس قابو میں نہ رہا۔ حالت نے نازک صورت اختیار کر لی، نبض ڈوبنے لگی، اور سانس اکھڑ اکھڑ کر چلنے لگی۔

تقریباً ایک بجے قاضی سیّد احمد حسین صاحب بانکی پور سے ڈاکٹر محمد عثمان صاحب کو لے کر آئے۔ ان کے ساتھ ان کے چھوٹے بھائی مولوی

عبدالجلیل صاحب بھی تھے، ان کو مولانا سے خاص ارادت تھی، مولانا کی حالت دیکھ کر پریشان ہوگئے۔ ڈاکٹر صاحب نے پوری کوشش کی کہ انجکشن کے ذریعہ حالت پر قابو پایا جائے۔ مگر وقت پورا ہوچکا تھا، کامیابی نہیں ہوسکی۔

نبض کے ساتھ ہی ساتھ تمام شریانی رگیں بھی ڈوب چکی تھیں۔ یہاں تک کہ اب سانس بے قابو ہوگئی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد سکرات کی کیفیت طاری ہوگئی۔

حضور امیر شریعت مدظلہ کو اطلاع ہوئی۔ آپ تشریف لائے تو نائب امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ نے چند منٹ کے بعد ہی، متاعِ جان، جان آفریں کو سپرد کردی، اور تقریباً پونے پانچ بجے ۱۷/ شوال یوم دوشنبہ ۱۳۵۹ھ (مطابق ۱۸/ نومبر ۱۹۴۰ء) کو اس دارِ فانی سے رخصت ہوگئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون رات کے دس بجے جنازہ کی نماز ہوئی، اور تقریباً ساڑھے دس بجے علم و عرفان کے خزانہ کو خانقاہ مجیبیہ کے قبرستان میں آغوش لحد کے سپرد کردیا گیا۔[78]

[78] حیات سجاد، ص ۱۲۲

امارت شرعیہ کے پلیٹ فارم سے
حضرت مولانا ابوالمحاسن سجادؒ کی خدمات

حضرت مولانا سیّد محمد عثمان غنیؒ اول ناظم امارت شرعیہ[79]

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب کو مسلم ہندوستان ایک عالم دین، سیاست داں اور مفکر کی حیثیت سے جانتا ہے، بلاشبہ حضرت مولانا ان اوصاف سے متصف تھے۔ لیکن ان کے ساتھ ان کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ

[79] حضرت مولانا سید عثمان غنی صاحب امارت شرعیہ کے پہلے ناظم تھے، اساس دیورہ ضلع گیا کے خانوادۂ سادات سے ان کا تعلق تھا۔ ۱۳۱۳ھ مطابق جنوری ۱۸۹۶ء کو پیدائش ہوئی، وطن میں ابتدائی تعلیم کی تحصیل کے بعد دارالعلوم دیوبند میں تکمیل کی، وہاں حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا عبید اللہ سندھیؒ و مولانا مدنیؒ کے ساتھ تحریکات میں سرگرم عمل رہے، فراغت کے بعد وطن آئے تو حضرت مولانا سجاد کی نگاہ جوہر شناس نے اپنے کاموں کے لئے ان کا بھی انتخاب کیا، اس وقت ان کی عمر بہت کم تھی، نو ارکان امارت کی منتخب پہلی کمیٹی میں وہ بھی شامل تھے، اس کے بعد سے تادم آخریں وہ ملک وملت کی خدمت اسی امارت شرعیہ سے وابستہ رہ کر انجام دیتے رہے، فتویٰ نویسی، جریدۂ امارت کی ترتیب، مختلف مقالات کی تدوین اور امارت کے کاموں میں وہ اخیر تک سرگرم رہے، اپنے ہم وطن مشہور بزرگ حضرت شاہ فدا حسین عثمانی دیوروی سے بیعت تھے، ۲۶ ذی الحجہ ۱۳۹۷ھ مطابق ۱۹۷۷ء کو پٹنہ ہی میں انتقال ہوا اور خانقاہ مجیبیہ کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ مزید حالات کے لئے دیکھئے فتاویٰ امارت شرعیہ اور ''ٹوٹے ہوئے تارے'' از شاہ محمد عثمانی۔ اس مضمون میں بھی بہت سے سوانحی اشارات موجود ہیں۔

وہ کلمۃ اللہ کا اعلاء، شریعتِ اسلامیہ کی رفعت، اصولِ اسلام کا اجراء، اور حکومتِ اسلامیہ کے قیام کی سعی کا جذبۂ کامل رکھتے تھے۔ اور اس کے لیے جد وجہد میں ہمیشہ مصروف رہتے تھے، اور اس حیثیت سے ان کا درجہ اپنے تمام معاصرین سے بہت بلند ہے۔ قوانینِ اسلام کا اعلاء اور حکومتِ شرعیہ کا قیام ہی ان کی تمام قومی وسیاسی امور میں شرکت کی بنیاد ہے۔

امارت شرعیہ کے قیام پر غور وفکر، اس کے لیے سعی وجہد، اس کی بنیاد اور اس کے تمام کاموں کی اصل روح حکومتِ شرعیہ کے لیے راہ کی صفائی اور ہمواری ہے۔

۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم کے وقت جب کہ ہندوستان کا بڑا طبقہ برطانیہ کی امداد واعانت میں مصروف تھا، حضرت مولانا ہندوستان کی برتری کے لیے ایک ایسی روشنی کی تلاش میں تھے جو شریعتِ اسلامیہ سے حاصل کی گئی ہو۔ چنانچہ کتاب وسنت سے یہ روشنی مل گئی۔

حضرت مولانا سے جن علماء کے تعلقات تھے، ان سے گفتگو کر کے ان کو ہم خیال بنالیا۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد اسی زمانہ میں رانچی میں نظر بند تھے، ان سے برادرم شاہ محمد قاسم صاحب عثمانی نے حضرت مولانا سجاد اور ان کی "شرعی اسکیم" کا تذکرہ کیا تو انھوں نے ملنے کی خواہش کی۔ چنانچہ حضرت مولاناؒ اخی محترم قاضی سیّد احمد حسین صاحب اور برادرم شاہ محمد قاسم صاحب کی معیت میں رانچی تشریف لے گئے اور حضرت مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات کی۔ یہ ملاقات بالکل تخلیہ میں ہوئی، جس میں حضرت مولانا نے امارت شرعیہ کے متعلق فقہی حوالے دکھائے، اس ملاقات وگفتگو کے بعد حضرت مولانا

ابوالکلام نے اس "شرعی اسکیم" سے اتفاق کا اظہار فرمایا۔ حضرت مولانا عبد الباری لکھنوی فرنگی محلی سے بھی اسی سلسلہ میں تعلقات پیدا ہوئے۔

جنگِ عظیم کے نتیجہ میں جب زوال خلافت کی نوبت آئی اور برطانیہ نے اپنے اعلانوں کی خلاف ورزی کی اور مسلمانوں کے مطالبات واحتجاجات بے اثر رہے، تو مسٹر مشیر حسین قدوائی مرحوم نے انگلستان سے مولانا عبد الباری مرحوم کو لکھا کہ اگر ہندوستان میں خلافت کمیٹی کے نام سے کوئی انجمن قائم کی جائے اور اس کے ذریعہ وسیع پیمانہ پر برطانیہ کے رویہ پر احتجاج کیا جائے، تو برطانیہ کے متأثر ہونے کی اُمید ہے۔ مولانا عبد الباری صاحب نے حضرت مولانا سے مشورہ طلب کیا اور خلافت کے نام سے لکھنؤ میں پہلا جلسہ ہوا، خلافت کمیٹی کی پہلی بنیاد بمبئ میں رکھی گئی۔ واپس آکر مولانا نے "گیا" میں خلافت کمیٹی کی بنیاد رکھی، پھر پھلواری شریف اور صوبہ بہار کے دوسرے مقامات میں خلافت کمیٹیاں قائم کیں۔

تمام ہندوستان میں ایک انقلاب ہو رہا تھا اور اسی انقلاب میں حضرت مولانا بھی نمایاں حصّہ لے رہے تھے۔

جمعیت علماء ہند نے ترک موالات کا جو فتویٰ شائع کیا، اس کے مصنف حضرت مولانا ہی تھے۔ اور اس فتوے کا ہندوستان میں جیسا کچھ اثر ہوا اس سے اس زمانہ کو دیکھنے والے اچھی طرح واقف ہیں۔

اس تمام سعی وجہد کے ساتھ حضرت مولانا امارت شرعیہ کے قیام کی سعی فرماتے رہے۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ جب مالٹا کی اسارت سے ہندوستان واپس آئے تو حضرت مولانا دیوبند جاکر ملے، اور شیخ الہند

سے امارت شرعیہ کے متعلق گفتگو فرمائی۔ حضرت شیخ الہند نے اس کو پسند فرمایا۔ لیکن اس تمام سعی وکوشش اور تمام علماء ہند کی رضا وہم خیالی کے باوجود بعض ایسے اسباب پیش آئے کہ امیر الہند کا انتخاب نہ ہو سکا۔ تب حضرت مولانا نے صوبہ بہار میں ہی پہلے امارت شرعیہ کے قیام کی سعی کی، اور جمعیۃ علماء صوبہ بہار کے غیر معمولی اجلاس پٹنہ میں جو ۱۹/ ۲۰/ شوال ۱۳۳۹ھ کو حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی صدارت میں منعقد ہوا، صوبہ بہار کے علماء اور دوسرے اصحاب حل وعقد نے باتفاق رائے حضرت مولانا شاہ محمد بدرالدین صاحب رحمۃ اللہ سجادہ نشیں خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کو امیر شریعت اور حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو نائب امیر شریعت منتخب کیا اور نو اصحاب کی مجلس شوریٰ بنائی، جس میں اس وقت حسب ذیل حضرات منتخب کیے گئے:

حضرت مولانا شاہ محمد محی الدین صاحب (موجودہ امیر)، حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب دربھنگہ، حضرت مولانا عبدالاحد صاحب، حضرت مولانا فرخند علی صاحب مرحوم، حضرت مولانا کفایت حسین صاحب مرحوم، حضرت مولانا زین العابدین صاحب ڈھاکہ اور راقم الحروف محمد عثمان غنی۔

جمعیۃ علماء بہار کا جلسہ ختم ہونے کے بعد میں اپنے مکان "دیورہ" چلا آیا۔ چند روز کے بعد حضرت مولانا نے مجھ کو "گیا" بلایا، اور وہاں سے میں حضرت مولانا کے ساتھ پھلواری شریف آیا۔ اور ۹/ ذی قعدہ ۱۳۳۹ھ کو دفتر امارت شرعیہ قائم کرکے ارکانِ مجلس شوریٰ کو دعوتی خط لکھا گیا۔

حضرت مولانا کی تحریک پر مجلس شوریٰ نے راقم الحروف کو ناظم امارت شرعیہ مقرر کیا اور صوبہ میں بیعت امارت کے لیے ایک وفد کی تجویز مرتب کی۔ جمعیت علماء بہار نے کچھ ماہ قبل اپنی ایک تجویز کے ذریعہ بیت المال اور دارالقضاء قائم کیا تھا۔ قیام امارت کے بعد مجلس شوریٰ نے بیت المال اور دارالقضاء کو امیر شریعت کی نگرانی میں لے لیا۔

ناظم بیت المال حضرت مولانا شاہ محمد نورالحسن صاحب مقرر کیے گئے، اور دارالقضا کے لیے قاضی، دفتر امارت شرعیہ اور بیت المال کے قیام کے بعد محررین، مبلغین، عمال اور محتسب مقرر کیے گئے۔

وفد امارت نے صوبہ میں دورہ کرکے امارت شرعیہ کی ضرورت واہمیت کی اشاعت کی تبلیغ واصلاح کے فرائض انجام دیئے۔ اور مسلمانوں سے امیر شریعت کی سمع وطاعت کی بیعت لی۔

وفد امارت کے دوروں میں خود حضرت نائب امیر شریعت شریک رہتے، اور وفد کا دورہ سال کے اکثر حصّوں میں برابر ہوتا تھا۔

مسلمانوں کو وفد کے دورہ سے جس میں خود حضرت مولانا شریک رہتے تھے، دینی ودنیوی فائدے حاصل ہوتے تھے، مذہبی باتیں معلوم ہوتی تھیں۔ دینی معلومات میں اضافہ ہوتا تھا، مراسم قبیحہ اور عقائدِ فاسدہ کا ازالہ فرماتے تھے، لوگوں کے باہمی جھگڑوں کو طے کرکے ان کو باہم ملادیتے تھے، اس سے لوگ باہمی بغض وخصومت سے بچتے اور اخراجات کی زیرباری سے محفوظ ہوجاتے تھے۔

تحریک خلافت کے زوال کے بعد ملک میں جو فتنہ وفساد پھیلا اور

شدھی سنگھٹن کی تحریک شروع ہوئی اور ملک کے مختلف حصّوں میں ارتداد کی وبا پھیل گئی، اس کے روکنے میں حضرت مولانا نے امارت شرعیہ کے کارکنوں سے کام لینے کے علاوہ خود بھی حصّہ لیا، ملکانہ میں خود دورہ کرکے تبلیغی کام انجام دیئے، امارت کے متعدد مبلغین کو وہاں متعین کرکے ان سے دفع ارتداد اور تبلیغ واصلاح کا کام انجام دلایا۔

صوبہ بہار کے گدیوں اور بھانٹوں میں جب ارتداد کی وبا پھیلی تو ضلع چمپارن میں گدیوں کی اصلاح کے لیے اور ضلع سارن میں بھانٹوں کی اصلاح کے لیے خود بھی دورہ کیا۔ چونکہ گورکھپور کی طرف سے ان اضلاع میں ارتداد کے جراثیم آتے تھے اس سرچشمہ کو بند کرنے کے لیے حضرت مولانا نے گورکھپور کے علاقہ کا دورہ فرمایا اور اصلاحی وتبلیغی جلسے کرکے اور متأثر شدہ افراد کی نفسیات کالحاظ رکھ کر اصلاحی رسائل شائع فرمائے۔

اس طرح ارتداد کی یہ وبا حضرت مولانا کی سعی جمیل سے اس صوبہ سے ختم ہوگئی اور ان لوگوں کی آئندہ حفاظت اور تعلیم کے لیے متعدد علاقوں میں مسجد تعمیر کرادی اور اس طرح ہزاروں مسلمان کفر کی آغوش میں جانے اور جہنم کے ایندھن بننے سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگئے۔

فتنۂ راج پال کے انسداد کے لیے صوبہ کے مختلف مقامات میں جلسے کرائے۔ راج پال ایک آریہ تھا جس نے "رنگیلا رسول" نامی ایک ناپاک کتاب لکھی تھی اور حکومت پنجاب نے جب اس پر مقدمہ چلایا تو ہائی کورٹ سے وہ رہا ہوگیا۔ اس واقعہ سے تمام مسلمانِ ہند میں ایک ہیجان پیدا ہوا، اور خطرہ ہوا کہ مفسد اور شریر افراد اسی طرح اپنے خبث نفس کا اظہار کرتے رہیں گے۔ اس بنا

پر تمام ہندوستان میں احتجاجی جلسے ہوئے اور حکومتِ ہند سے قانون میں ترمیم کا مطالبہ کیا گیا۔ ایک مسلمان نے راج پال کو قتل کردیا اور حکومت ہند نے قانون میں ایسی ترمیم کردی کہ پھر اس طرح کی کوئی کتاب شائع نہ کی جائے۔

صوبہ میں جتنے فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ان میں جہاں کہیں مسلمانوں کی مظلومیت ثابت ہوئی، حضرت مولانا نے امارت شرعیہ کی جانب سے مظلومین کی مناسب اعانت کی۔ بتیا کے فساد کے موقع پر وہاں مہینوں قیام کرکے مسلمانوں کے مقدموں کی پیروی کرائی، اور حضرت مولانا کے اثر اور امارت شرعیہ کے تعلق سے بڑے قانون دانوں نے کام کیا۔ بتیا کے مسلمانوں کو ہزاروں روپیہ تاوان دلائے۔

اضلاع دربھنگہ ومظفرپور کے بعض دیہاتوں میں بقرعید کے موقع پر فسادات ہوئے جن میں مسلمانوں کو قتل کیا گیا اور لوٹا گیا۔ وہاں بھی حضرت مولانا خود تشریف لے گئے اور امارت شرعیہ کے کارکنوں کے ذریعہ مقدمہ میں اعانت کی۔ صوبہ کے دوسرے مقامات کے فسادات میں بھی مسلمانوں کی اعانت کی گئی۔

کانگریسی حکومت کے زمانہ میں جو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے، اس کی خود تحقیقات کی یا امارت شرعیہ کے کارکنوں کے ذریعہ تحقیقات کرائی اور مظلوم مسلمانوں کی مالی یا قانونی امداد کرائی۔

نیاگاؤں ضلع مظفرپور کے فساد میں مظلوم مسلمانوں کے لیے پٹنہ کے ایک مشہور بیرسٹر کو حکومت کی طرف سے مقرر کرایا، جنھوں نے سشن اور ہائی کورٹ میں بھی کام کیا۔

گیا کے فساد کی تحقیقات کے لیے راقم الحروف کو بھیجا، اور پھر ایک دو روز کے لیے خود تشریف لے جاکر مفید مشورے دیئے، اور سعی و کوشش کر کے مسلمانوں کو تاوان دلایا۔

متعدد دیہاتوں میں بقر عید کے موقع پر مسلمانوں کو قربانی سے دفعہ ۱۴۴ کے ذریعہ روکا گیا، جس جگہ کے مسلمانوں نے بروقت اطلاع دی ان کو یہ مشورہ دیا کہ قربانی کرو اور لکھ کر درخواست دے دو کہ ہم نے قربانی کی۔ چنانچہ جس جگہ مسلمانوں نے ایسا کیا وہاں چند سال کے بعد وہ اطمینان سے قربانی کرنے لگے ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ حضرت مولانا کا مقصد وحید اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے شریعت اسلامیہ کی حکومت کا قیام تھا اور امارت شرعیہ اس کا ایک زینہ ہے۔ جس کے ذریعہ مسلمانوں کی تنظیم اور ان میں وحدت ملی اور عادت سمع وطاعت پیدا کی جاسکے۔ غلاموں اور محکوموں کے لیے اعلاء کلمۃ اللہ دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ ہم برابر دیکھتے ہیں کہ کرفیو آڈر کے وقت عشا اور فجر کی نماز ہم جماعت سے نہیں پڑھ سکتے۔ ہم ہر جگہ اپنے گھروں میں قربانی گاؤ نہیں کرسکتے۔ نکاح وطلاق کے معاملات میں بھی ہم قانون شریعت پر عمل کرنے سے معذور رہتے ہیں۔ ہماری مسجدیں ویران ہو رہی ہیں۔ ہمارے اوقاف برباد ہو رہے ہیں، لیکن ہم اپنے قانونِ شریعت کے مطابق ان کی اصلاح کرنے سے معذور ہیں۔ عام لوگوں کو تو کوئی احساس ہی نہیں۔ جب وہ خود مذہب کا استخفاف کرتے ہوئے نہیں شرماتے اور علانیہ نماز جیسے فریضہ کو ترک کرتے ہیں تو ان سے اس کی کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ دوسروں کے استخفاف دین پر کسی جذبۂ ایمانی کا اظہار کریں گے۔

جن مذہبی افراد کو احساس ہے وہ اپنے خیال کے مطابق اس صورت حال کو بدلنے کی مختلف راہیں تلاش کرتے ہیں اور کسی ایک راہ پر ہو لیتے ہیں، خواہ اس راہ سے وہ حجاز کے بجائے واردھا یا بمبئی تک پہنچ کر رہ جائیں، یا پھر روس جا پہنچیں۔ لیکن حضرت مولانا نے ایک سیدھی اور صاف راہ اختیار کی، جو شریعتِ اسلامیہ کی طرف لے جانے والی ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں جو کچھ کیا وہ صرف اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے کیا، اسلام اور اس کے قوانین کی برتری کے لیے کیا۔

حضرت مولانا کو جن لوگوں نے سیاسی مجالس میں دیکھا ہے، خواہ وہ مجلس خالص مسلمانوں کی ہو یا مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کی مشترک ہو، جب موقع ہوا تو انھوں نے کسی نہ کسی اسلامی مقصد کو پیش کر دیا۔ اس مقصد کو پیش کرتے ہوئے کبھی وہ لومۃ لائم کی پروا نہیں کرتے تھے، وہ فرقہ پرور اور تاریک خیال ملّا کہے جانے سے نہیں ڈرتے تھے۔

اسمبلی اور کونسل میں جب بھی کوئی ایسا مسودّہ قانون آیا جس کا کوئی اثر کسی اسلامی معاملہ پر پڑتا ہو تو سب سے پہلے اس کی مخالفت فرماتے تھے۔ راقم الحروف کو خاص تاکید تھی، کہ جب کوئی مسودۂ قانون یا کسی عدالت کا فیصلہ ایسا ہو جس کی زد کسی اسلامی قانون پر پڑتی ہو تو فوراً اس کی مخالفت میں مضامین لکھو اور جمعیت علماء ہند کو خط کے ذریعہ اطلاع دو۔

جب قانون نکاح نابالغان مرکزی اسمبلی سے پاس ہوا، تو اس کی مخالفت شدت کے ساتھ فرمائی۔ جمعیت علماء ہند نے اس قانون کی مخالفت میں اپنا ایک خاص جلسہ کیا اور تمام ہندوستان میں اس قانون کی مخالفت میں جلسے

کرائے۔ اس مخالفت کا سبب بھی یہی تھا کہ اسلام نے نکاح کے لیے عمر مقرر نہیں کی ہے۔ ہر عمر کے نکاح کو جائز قرار دیا ہے۔ اور یہ قانون اس کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ اور یہ اسلامی معاملات میں مداخلت ہے۔

قانونِ نکاح نابالغان پاس ہو جانے کے بعد جمعیت علماء ہند نے آئندہ کے خطرات کے انسداد کے لیے "مجلس تحفظ ناموس شریعت" قائم کی۔ اس کی نظامت جب حضرت مولانا کے سپرد ہوئی تو انھوں نے منجملہ دوسرے کاموں کے دہلی سے مساجد اور اوقاف کی واگذاری کی تحریک بھی شروع کی۔ یہ وہ مساجد واوقاف تھے جو حکومت ہند یا صوبوں کی حکومتوں کے قبضہ میں ہیں۔ مساجد واوقاف کے متعلق مرکزی اسمبلی میں سوال کرایا تو جواب سے معلوم ہوا کہ حکومت ہند کے قبضہ میں تقریباً پانچ سو مساجد ہیں۔ اوقاف کے متعلق کوئی جواب نہیں ملا یا شاید سوال ہی نہیں ہوا، اس وقت یاد نہیں۔ یہ تحریک بھی اسی دینی جرأت پر مبنی تھی جو حضرت مولانا کا خاص حصّہ تھا۔ اور پھر یہ کہ مسلمانوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ ان کی مذہبی چیزیں حکومت ہند کے قبضہ میں ہیں، اور ان میں اس کی واپسی کا جذبہ پیدا ہو اور تحریک کی کامیابی کی صورت میں مسلمانوں کو اپنے ایک فرض سے سبک دوشی بھی حاصل ہو جائے۔

مسلمانوں کو معلوم ہے کہ جمعیت علماء ہند نے ترک موالات کے سلسلہ میں مجالس مقننہ کا بھی مقاطعہ کیا تھا، لیکن انتخاب کے موقع پر مسلمانوں کی نشستوں سے مسلمان کھڑے ہوتے تھے اور منتخب ہو کر مجالس مقننہ میں جاتے تھے اور بعض لوگ وہاں پہنچ کر صرف اپنے مفاد کے پیش نظر کام کرتے تھے، دینی اور جماعتی مفاد کو فراموش کر جاتے تھے، صوبہ کی کونسل اور مرکزی

اسمبلی میں ایسے بہت سے واقعات پیش آئے۔

راقم الحروف نے حضرت مولانا سے عرض کیا کہ مجالس مقننہ کے ارکان جس طرح منتخب ہو کر جاتے ہیں وہ دین وملت اور ملک وقوم کے لیے سخت نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں، اس لیے مسلمان ارکان پر آئندہ کوئی پابندی عائد کرنی چاہیے۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ جب تک جمعیت علماء ہند مقاطعہ کی تجویز کو واپس نہ لے لے، اس وقت تک ہم لوگ کس طرح کسی کی تائید یا حمایت کر سکتے ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ مجالس مقننہ کے ارکان کی جو روش ہے اس کو دیکھتے ہوئے مقاطعہ کو قائم رکھنا جائز قرار نہیں دیا جاسکتا "إذا ابتلی ببلیتین فاختر أهونهما" پر عمل کرنا چاہیے۔ مثال میں ہم نے قاضی احمد حسین صاحب کے وقف بل کی ناکامیابی کو بیان کیا کہ صرف مسلمان ارکان کی حکومت پرستی نے اس مفید بل کو ناکامیاب کیا۔ نیز مرکزی اسمبلی کے بعض ارکان جیسی حرکتیں کر رہے تھے، اس کو عرض کیا۔

حضرت مولانا نے فرمایا کہ تم جریدۂ امارت میں لکھو، اگر جمعیت علماء ہند اپنی عائد کردہ پابندی ہٹالے تو پھر آئندہ حصّہ لیا جائے۔ چنانچہ راقم الحروف نے جریدۂ امارت میں مضامین لکھنا شروع کر دیئے۔ اس کے بعد نقیب میں بھی کچھ مضامین لکھے۔

حضرت مولانا کی عادت تھی کہ جس معاملہ میں ان کا قلب مطمئن ہو جاتا تھا پھر اس کو جلد سے جلد انجام دینے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ اس معاملہ میں بھی جب ان کا قلب مطمئن ہو گیا کہ مجالس مقننہ کے انتخاب میں

ہمارے حصّہ لینے سے کسی حد تک دینی فائدہ کی توقع ہے۔ اور امارت شرعیہ کے مقاصد کے لیے ہماری شرکت مفید ہو سکتی ہے تو انھوں نے جمعیت علماء ہند کی مجلس عاملہ میں (غالباً منعقدہ مراد آباد ۱۹۳۴ء میں) مجالس مقننہ میں حصّہ لینے کی تجویز پیش کر دی، جو منظور ہو گئی۔

اس کے بعد ربیع الاوّل ۱۳۵۳ھ میں امارت شرعیہ کی مجلس شوریٰ میں بھی حضرت مولانا نے اسی مقصد کی تجویز پیش کی۔ تمہید کے بعد اصلی تجویز کے الفاظ یہ ہیں:

"امارت شرعیہ اس امر کا اعلان کرتی ہے کہ اگر صوبہ بہار واڑیسہ میں کوئی مجلس اس اصول کے ماتحت قائم ہوئی اور اس کے دستور اساسی و قواعد امارت شرعیہ کے نزدیک قابل اعتماد ہوئے اور اس نے خصوصیت کے ساتھ اپنے دستور اساسی میں اس امر کو داخل کیا کہ ۔۔۔۔۔۔ مجلس (پارٹی) تمام ایسے امور میں جن کا تعلق مسلمانوں کے مذہب سے ہو، یا ان کے مذہبی معاملات پر اس کا اثر پڑتا ہو، امارت شرعیہ کی ہدایت ورہنمائی کی پابند ہوگی تو امارت شرعیہ کی پوری ہمدردی و تائید اس مجلس کے ساتھ ہوگی۔ لیکن اگر بدقسمتی سے اس نازک دور میں بھی مسلمانوں کی کوئی مجلس اس قسم کی قائم نہ ہوئی یا اس کے دستور و قواعد پر امارت شرعیہ کا اعتماد نہ ہوا تو امارت شرعیہ ان ہی مقاصد واغراض کے ماتحت اپنے صوبہ کے مسلم اُمیدواروں کے لیے ایک عہد نامہ مرتب کر کے شائع کر دے گی، تاکہ جو اُمیدوار اس پر دستخط کر کے امارت شرعیہ کے دفتر میں بھیجیں ان پر غور کر کے امارت شرعیہ کی مختصر مجلس

(سب کمیٹی) جن اُمیدواروں کے انتخاب کو ترجیح دیگی۔ امارت شرعیہ کی پوری ہم دردی و تائید اس کے ساتھ ہوگی"۔

اس تجویز کی بنا پر امارت بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی اور امارت شرعیہ نے پہلی بار انتخاب میں حصّہ لیا۔

دستور ہند ۱۹۳۵ء کا جب نفاذ ہوا، اور ہندوستان میں انتخابی پارٹیاں بننے لگیں تو صوبہ بہار میں تین پارٹیوں کی تشکیل ہوئی (۱) بہار مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی (۲) مسلم یونائٹڈ پارٹی (۳) مسلم احرار پارٹی۔

مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی نے امارت شرعیہ کی تجویز کے مطابق مذہبی معاملات میں امارت شرعیہ کی ہدایتوں پر عمل کرنے کو منظور کر لیا اس لیے حضرت مولانا، راقم الحروف اور امارت شرعیہ کے دوسرے کارکن اور حامی اس میں شریک ہو گئے۔

دوسری دونوں پارٹیوں کے ذمہ دار ارکان سے بھی مفاہمت کی گفتگو ہوئی، لیکن وہ آمادۂ مفاہمت نہیں ہوئے، اور بالآخر تینوں پارٹیوں (بلکہ کانگریس پارٹی سے بھی بعض حلقوں میں) شدید مقابلہ ہوا۔ اور امارت شرعیہ کے اثر، اس کے ہمدردوں کی سعی اور حضرت مولانا کی مخلصانہ جدوجہد اور انتھک محنت نے مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کو کامیاب بنایا۔ اور دوسری دونوں پارٹیوں کے لیڈروں کو سیاسی میدان چھوڑ دینا پڑا۔

انتخاب کے نتیجہ میں غیر مسلم ارکان میں سب سے زیادہ کانگریس کے ارکان کامیاب ہوئے اور مسلم ارکان میں سب سے زیادہ مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کے ارکان کو کامیابی ہوئی۔ اس طرح بہار اسمبلی میں کانگریس کے بعد

مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی ہی سب سے بڑی پارٹی تھی۔

کانگریس کی غیر متوقع کامیابی نے بعض بڑے کانگریسیوں کا دماغی توازن بگاڑ دیا۔ اور انھوں نے اپنے بیانات میں کہنا شروع کر دیا کہ ہم وزارت بنانے میں کسی دوسری پارٹی سے اشتراک نہیں کر سکتے۔ حالاں کہ وہی لوگ انتخاب کے قبل اپنی اور بعض دوسری پارٹیوں کے اشتراک سے وزارت بنانے کا اظہار کرتے تھے۔ اور پھر کانگریسی حکومت کی مخالفت کا جو جذبہ عام مسلمانوں میں پیدا ہوا اس سے متأثر ہو کر حضرت مولانا سے کہا گیا کہ مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کو حکومت میں شریک کرنے کے لیے کانگریس تیار ہے اور غالباً ایک وزیر اور دو پارلیمنٹری سکریٹریوں کی پیش کش کی گئی، لیکن حضرت مولانا نے بعض مصالح کی بنا پر اس کو قبول نہیں فرمایا۔

میں نے عرض کیا ہے کہ حضرت مولانا ہر معاملہ میں دین کے فائدے اور مسلمانوں کی بھلائی کو پیش نظر رکھتے تھے۔ چنانچہ انتخاب کے بعد بعض شرائط کی بنا پر کانگریس نے وزارت بنانے سے انکار کر دیا۔ اور مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کے لیڈر کو وزارت بنانے کی دعوت دی گئی تو اس یقین کے باوجود کہ اس عارضی وزارت کا دور بہت مختصر ہو گا۔ حضرت مولانا وزارت کی حمایت میں تھے۔

چنانچہ جب مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کی وزارت قائم ہوئی تو حضرت مولانا نے اس سے مفید کام لینے کی سعی فرمائی۔

صوبہ بہار کے سرکاری محکموں میں اردو کا نفاذ حضرت مولانا ہی کی سعی جمیل کا نتیجہ ہے۔ حضرت کی سعی تھی کہ اسی طرح قانون وقف کا بھی نفاذ کر دیا

جائے لیکن دفتری کاموں کا تیزی سے طے ہو جانا ناممکن سا ہے۔ مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کی وزارت کا دور جلد ہی ختم ہو گیا اس لیے قانون وقف نہ بن سکا۔ کانگریس کی حکومت کے قیام کے بعد اس سے بھی حضرت مولانا نے مفید کام لینے اور مسلمانوں کو نقصان دہ امور سے بچانے کی برابر سعی فرمائی۔ سیاسی معاملات میں مسلمانوں کی مخصوص پوزیشن قائم رکھنے کی سعی فرماتے رہے۔ زرعی انکم ٹیکس سے اوقاف اسلامیہ کا استثناء صرف حضرت مولانا کی مضبوط شخصیت اور مخلصانہ سعی کا نتیجہ ہے۔ حضرت مولانا نے مسلم اوقاف کا بل بہار اسمبلی میں مسٹر محمد یونس صاحب سے پیش کرایا، اس کے بعد ہی حکومت کی طرف سے ڈاکٹر سیّد محمود وزیر تعلیم نے مسلم وقف بل پیش کیا اور اس میں حضرت مولانا کے مشورہ کے مطابق عموماً ترمیمیں منظور ہوئیں اور بہار اسمبلی نے اس کو پاس کر دیا، لیکن بہار کونسل سے وہ پاس نہ ہونے پایا تھا کہ کانگریس حکومت مستعفی ہو گئی۔

نکاح، طلاق، تفریق زوجین اور فسخ نکاح وغیرہ کے معاملات میں عدالتوں سے غیر شرعی فیصلوں کا نفاذ ہوتا تھا، اور ان کے سبب سے مسلمان بڑی مصیبتوں اور عورتیں معصیتوں کے ساتھ مصیبتوں میں مبتلا رہتی تھیں۔ امارت شرعیہ کے دارالقضاء سے جو فیصلے ہوتے، وہ شریعت کے مطابق ہوتے اور اس سے مسلمانوں کی معصیتوں اور مصیبتوں کا ازالہ ہوتا، لیکن اس کا فائدہ محدود ہوتا تھا، اور مصیبت عام تھی، جس کے ازالہ کی سعی ہر مسلمان پر فرض تھی اور اس کی طرف حضرت مولانا بھی خود اپنے مضامین کے ذریعہ اسمبلی کے ارکان کو توجہ دلاتے تھے اور کبھی راقم الحروف کو لکھنے کا حکم فرماتے تھے۔ چنانچہ اس

طرح کے مضامین جریدۂ امارت اور نقیب میں برابر شائع ہوئے ہیں۔ لیکن جب کسی نے مفید مقصد مسودۂ قانون پیش نہیں کیا تو حضرت مولانا نے خود انفساخ نکاح مسلم کا مسودۂ قانون مرتب کر کے نقیب میں شائع کرایا۔ اور جمعیت علماء ہند کو توجہ دلائی۔ چنانچہ پھر جمعیت علماء ہند نے ایک مسودۂ قانون انفساخ نکاح مسلم مرتب کیا اور ارکان اسمبلی کو پیش کرنے کی ہدایت کی۔ لیکن یہ مسودۂ قانون جب قانون بن کر منظور ہوا تو اس میں ایسی ترمیم کر دی گئی تھی جس سے یہ قانون مسلمانوں کے لیے شرعاً غیر مفید ہو گیا۔

حضرت مولانا کے حسب ہدایت میں نے اس کے خلاف مضامین لکھے، خود حضرت مولانا نے جمعیۃ علماء ہند کو اس میں ترمیم کرانے کی طرف توجہ دلائی اور جمعیۃ علماء ہند نے اس قانون کی مذمت اور اس میں ترمیم کی تجویز پیش کی۔ اور بالآخر ایک ممبر نے پھر اس میں ترمیم کی تجویز مرکزی اسمبلی میں پیش کر دی، میں نے عرض کیا ہے کہ حضرت مولانا کا مقصد مجالس مقننہ کے انتخاب میں حصّہ لینے سے غیر شرعی قوانین کی تنسیخ اور شرعی معاملات کی تنفیذ کی سعی تھی، اور اس سے انھوں نے کسی وقت بھی غفلت نہیں کی۔ یہ تمام لوگوں کو معلوم ہے کہ حضرت مولانا، کانگریس کے حامی وہمدرد تھے، لیکن اس کا کوئی عمل، کوئی تجویز جو ان کو مسلمان کے لیے مضر معلوم ہوتی تھی اس کی سخت مخالفت فرماتے تھے۔ چناچہ واردھا تعلیمی اسکیم کی جس قدر مخالفت مولانا نے فرمائی اور ان کی نگرانی میں امارت شرعیہ نے انجام دی وہ کسی نے نہیں کی۔ اس کی تفصیل امارت کی مطبوعہ رپورٹ سے معلوم ہو سکتی ہے، جو راقم الحروف کی مرتبہ ہے۔

کانگریس حکومت نے جو محکمہ دیہات سدھار قائم کیا تو اس میں اہنسا کی تعلیم داخل کی، حضرت مولانا نے اس کی شدید مخالفت کی اور حضرت مولانا کی مخالفت کی بنا پر دیہات سدھار سے اہنسا کی تعلیم کو خارج کیا گیا۔

حضرت مولانا ہی کی سعی سے ڈاکٹر سیّد محمود وزیر تعلیم نے ابتدائی تعلیم میں مسلمانوں کے لیے مذہبی تعلیم کے حق کو تسلیم کیا۔

حضرت مولانا کی آخری زندگی کے دو واقعات ایسے ہیں جو چند مخصوص افراد کے علاوہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہیں۔

ایک یہ کہ حضرت مولانا نے مسلمانوں کے معاملات میں کانگریسی حکومت کی غیر منصفانہ روش اور کانگریسی ورکنگ کمیٹی کی غفلتوں اور غلطیوں کے متعلق ایک تحریر مرتب فرمائی تھی جس کو مکتوب کی شکل میں گاندھی جی، بابو راجندر پرشاد، پنڈت جواہر لال نہرو اور حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کو بھیج دیا تھا۔

دوسرا مکتوب جنگ کے متعلق ہز اکسلنسی وائسرائے ہند کے نام بھیجا تھا، جس میں موجودہ جنگ کے متعلق شرعی نقطۂ نظر کی وضاحت فرمائی تھی۔

پہلی چیز بالکل پرائیوٹ تھی اس لیے وہ شائع نہیں کی گئی اور دوسری چیز ایسی ہے جو موجودہ آرڈیننسوں کی بنا پر شائع ہی نہیں ہو سکتی۔

ان دونوں تحریروں کا مقصد مسلمانوں کی بھلائی اور اعلاء کلمۃ اللہ تھا۔ حضرت مولانا کی زندگی کا مقصد وحید اسلامی نظریہ کے مطابق مسلمانوں کی تنظیم، ان کی وحدت ملّی کا قیام اور ان کی فوضویت کا ازالہ تھا اور یہ سب کچھ اخلاص کے ساتھ اعلاء کلمۃ اللہ اور اسلام کی رفعت وبرتری کے لیے تھا۔ حضرت

مولانا جس مجلس میں بھی شریک ہوتے صرف اسی ایک مقصد کے ساتھ شریک ہوتے، جب کسی مجلس سے یہ توقع منقطع ہو جاتی، وہ اس سے علاحدہ ہو جاتے۔

حضرت مولانا کے اسلامی نظریہ سے ناواقف افراد کو ان کی مذہبی شدت اور اسلامی مقاصد کے حصول کی سعی سے یہ شبہہ ہوتا ہے کہ وہ مولویوں کا غلبہ واقتدار چاہتے ہیں۔ ان کے رفقاء واقف ہیں کہ یہ ان کا نظریہ نہیں تھا۔ وہ مولویوں کے اقتدار کے خواہش مند نہیں تھے بلکہ وہ دین ومذہب کے اقتدار کے خواہش مند تھے اور صرف مذہب کے اقتدار کے لیے (جس کے اقتدار ہی پر اعلاء کلمۃ اللہ کا انحصار ہے) وہ سب کچھ کرتے تھے۔ امارت شرعیہ کا قیام اور اس کی بست سالہ خدمت مخلصاًللّٰہ محض اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے کی۔

ان کی ہدایت ونگرانی میں امارت شرعیہ نے جو خدمتیں انجام دی ہیں وہ کبھی فراموش نہیں کی جاسکتیں۔ حضرت مولانا اور امارت شرعیہ کے کارکنوں کی تبلیغ واصلاح سے کم سے کم تین ہزار اشخاص کفر کے حلقہ سے نکل کر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ کم سے کم پچیس ہزار افراد ارتداد کی لعنت سے محفوظ ہوگئے۔ ہزاروں مسلمانوں نے مراسم شرک سے نجات پائی، ہزاروں مسلمان عقائد فاسدہ سے تائب ہوئے۔ ہزاروں مسلمانوں کے جھگڑوں کو مٹا کر ان کو متحد کر دیا۔ مدارس ومکاتب قائم کرکے علم کی روشنی پھیلائی اور تعلیم دے کر نجات کا راستہ بتایا۔ سیلاب، زلزلہ اور دوسری مصیبتوں کے وقت مسلمانوں کی امداد واعانت فرمائی۔

حضرت مولانا نے جو کچھ بھی کیا۔ مسلمانوں کے فائدے، دین کی برتری اور کلمۃ اللہ کی برتری کے لیے کیا۔

ان کی زندگی کا ہر کام اللہ کے لیے تھا، اور وہ ''اِنَّ صَلاَتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ'' کے مصداق تھے۔ حضرت مولانا اپنی مخصوص صلاحیتوں کے لحاظ سے اپنے تمام معاصرین میں خاص امتیاز رکھتے تھے، حضرت مولانا کی مذہبیت اور اخلاص کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنے تمام فضل وکمال اور علو منصب کے ساتھ بے انتہا منکسر اور متواضع تھے۔

افسوس کہ اس مخلص محترم اور مفکر جلیل نے ۱۷ر شوال ۱۳۵۹ھ کو اس دنیائے دنی سے اعلیٰ علیین کی طرف رحلت فرمائی، اِنّاللّٰہ واِنّا اِلیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا پر اپنی رحمت نازل کرے، ان کی مغفرت فرمائے اور قبر کو نور سے معمور کرے۔

حضرت مولانا ہم سے جدا ہوگئے، لیکن ان کے اخلاص اور بلند ہمتی کی یادگاریں آج بھی زندہ ہیں، ان کے قیام وبقا کی کوشش حضرت مولانا کے ہر رفیق، ہر ہمدرد کا فریضہ ہونا چاہیے۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق

ثبت ہست بر جریدۂ عالم دوام ما[80]

---

[80] حیات سجاد، ص ۱۳۳، البتہ عنوان میں جزوی تبدیلی کی گئی ہے۔

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ
ایک حیرت انگیز شخصیت، ایک جوہر نایاب[81]

مولانا امین احسن اصلاحیؒ [82]

مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کی ذات اس حقیقت کا نہایت واضح ثبوت تھی کہ کسی شخصیت کے اندر اصلی چیز اس کی معنویت اور ذہنی و اخلاقی طاقت ہے، مولاناؒ سے ملنے جلنے کے مواقع مجھے ان کی شاندار زندگی کے صرف آخری چند

---

[81] عنوان تبدیل کیا گیا ہے (اختر)

[82] سرائے میر، اعظم گڑھ، محاسن سجاد میں یہی لکھا ہے، کیوں کہ اس وقت مولانا مدرسہ الاصلاح سرائے میر میں تھے۔ مولانا امین احسن اصلاحی ممتاز علماء میں شمار ہوتے ہیں، ان کا اہم کارنامہ قرآن پاک کی تفسیر ہے جو تدبر قرآن کے نام سے مشہور ہے، ۱۹۰۴ء میں اعظم گڑھ کے ایک گاؤں موضع بمہور میں پیدا ہوئے اور پوری تعلیم مدرسہ الاصلاح سرائے میر ہی میں مکمل کی، مولانا حمید الدین فراہی کے آخری دور کے ممتاز شاگردوں میں تھے اور تفسیر قرآن میں ان کے جانشین تھے، فراغت کے بعد مختلف اخبارات میں کام کیا پھر مدرسہ الاصلاح سے وابستہ ہوگئے، اور تدبر قرآن جیسی اہم کتاب تصنیف کی، اس کی تکمیل کے بعد مدرسہ ہی میں تدبر حدیث پر کام کرنے کے لئے بھی ایک شعبہ قائم کیا لیکن کماحقہ اس کی تکمیل نہ ہوسکی، جماعت اسلامی کے اول روز سے اہم رکن اور علاقائی صدر رہے، تقریباً ایک درجن کتابیں اور سیکڑوں مقالات یادگار ہیں، مترجم کی حیثیت سے اخیر تک کام کرتے رہے، پھر پاکستان منتقل ہوگئے جہاں علمی خدمات انجام دے کر، ۹۳ سال کی عمر میں ۱۹۹۷ء میں شہر لاہور میں وفات پائی۔

سالوں میں ملے، میں ہمیشہ سنا کرتا تھا کہ مولانا جمعیۃ العلماء کے دماغ ہیں، قانونی وسیاسی مشکلات کے سمجھنے اور حل کرنے کی غیر معمولی قابلیت رکھتے ہیں، اسکیمیں بنانے، ان کے چلانے، ان کے مختلف الخیال و مختلف المشرب جماعتوں کو منظم کرنے کا ان میں خداداد سلیقہ ہے، پورے صوبہ بہار کے اندر ایک عظیم الاثر مذہبی تنظیم کے بانی اور قائد و امام ہیں اور حیران ہوتا تھا کہ ایک شخص جو تاثیر و نفوذ کے تمام ظاہری اسلحہ سے بظاہر محروم ہے، آخر یہ خوارق اس کے ہاتھ سے کیسے ظہور میں آتے ہیں؟ اور رہ رہ کے دل میں خواہش ہوتی تھی کہ کاش قریب سے ان کو دیکھنے اور ان کی عجیب و غریب شخصیت کے مطالعہ کا موقعہ ملے۔

یہ خواہش عرصہ تک دل میں پرورش پاتی رہی مگر اس کے پورے ہونے کا کوئی موقعہ پیدا نہیں ہوا، بالآخر چند سال ہوتے ہیں (سنہ ٹھیک یاد نہیں) مظفر پور کے ایک عربی مدرسہ کے جلسۂ تقسیم اسناد و دستار بندی میں شرکت کا اتفاق ہوا، خوش قسمتی سے مولاناؒ صدر تھے، اور میں مقرر، دستار بندی کی تقریب سے علماء کی دستار ہی کو میں نے عنوان تقریر قرار دیا اور اس کی گذشتہ عظمت کو یاد دلاتے ہوئے ان خطرات کی طرف تفصیل سے توجہ دلائی جن سے مستقبل میں اس دستار کو دوچار ہونا ہے، مجھے بھی اچھی طرح یاد ہے کہ اس تقریر میں میں نے قدیم طرز تعلیم، قدیم نصاب اور علماء کی روش پر نہایت تند لہجہ میں تنقید کی اور ان تمام تبدیلیوں کے لئے بے جھجک دعوت دی، جو عربی تعلیم اور خود علماء کی بقا کے لئے ناگریز ہیں، مجھے بالکل توقع نہیں تھی کہ مولاناؒ ان خیالات کو فیاضی اور ہمدردی سے سنیں گے، لیکن جلسہ ختم ہونے پر میری قیام گاہ پر

مجھے ملاقات کی عزت بخشی اور میں نے نہایت تعجب کے ساتھ یہ معلوم کیا کہ مولاناؒ نہ صرف میرے خیالات سے خوش ہیں، بلکہ بڑی حد تک متفق۔

جن لوگوں کو مولاناؒ سے ملاقات کی عزت حاصل ہے، وہ جانتے ہیں کہ ان کی گفتگو کا انداز کچھ دلکش اور جاذب نہیں تھا، شکل وصورت اور وضع وہیئت بھی نہایت مسکین تھی، اس وجہ سے گفتگو کے پہلے مرحلہ میں ان سے کچھ متاثر نہیں ہوا، لیکن جب ان کے چہرے کو غور سے دیکھا تو مجھے ان کی آنکھوں میں ایسی گہری معنویت، ان کی پیشانی پر ایسی پر معنی متانت اور ہونٹوں پر ایسی مربیانہ مسکراہٹ نظر آئی کہ میرا دل بے اختیار ان کی طرف کھینچنے لگا، وہ میری تقریر پر اظہار خیال کرتے کرتے عربی مدارس کی اصلاح سے متعلق خود اپنے خیالات ظاہر فرمانے لگے، اور تھوڑی دیر کے بعد جب انہوں نے گفتگو ختم فرمائی تو مجھے دفعۃً ایسا محسوس ہوا کہ خود میرے منتشر خیالات اب ایک مرتب و مہذب اسکیم کے قالب میں ڈھل گئے ہیں۔

یہ ملاقات بہت ہی مختصر رہی لیکن اس نے مولاناؒ کی خوبیوں کا ایک پائدار نقش میرے دل پر قائم کر دیا، مجھ پر سب سے پہلے ان کی شخصیت کا یہ راز بے نقاب ہوا کہ ہر چند ان کی زبان تعبیر بیانی سے قاصر ہے، مگر ان کا دماغ نہایت صاف ہے، وہ جس چیز پر سوچتے ہیں اس کی ابتدا، اس کا وسط، اس کی انتہا، سب ٹٹول لیتے ہیں اور اس کے چاروں گوشوں سے اس پر گھیرے ڈالتے ہیں، وہ مسئلہ کو گنجلک نہیں چھوڑتے ہیں اور اندھیرے میں تیر تکے چلانے کے عادی نہیں ہیں۔ اس حقیقت کے انکشاف نے میرے دل میں ان کی عظمت پیدا کر دی اور میں نے محسوس کیا کہ ذہنی اعتبار سے یہ بڑے آدمی ہیں۔

دوسری خوبی جو اس صحبت میں سامنے آئی وہ ان کی رواداری اور فیاضی تھی، میں ان کو ایک مخصوص جماعت کا آدمی سمجھتا تھا اور کبھی توقع نہیں کر سکتا تھا کہ جماعت کے جراثیم ان کے دل کے ساتھ چپکے نہیں ہوں گے، لیکن اس ملاقات میں میں نے محسوس کیا کہ ان کے دماغ کی طرح ان کا دل بھی بہت کشادہ ہے، وہ کسی خاص ادارہ کے اندر نہیں ہیں، وہ سب کے ساتھ اور سب سے الگ ہیں، وہ کیتھولک چرچ کی طرح دینداری اپنی ہی چہار دیواری کے اندر محدود نہیں سمجھتے، اس سے باہر بھی دنیا کا وجود مانتے ہیں اور اس کے ساتھ معاملہ کرنے کے لئے پوری طرح فیاض ہیں، ان کی اس خوبی نے میرے دل کو جیت لیا اور میں نے یقین کر لیا کی اسی چیز کے اندان کی تنظیمی قابلیت کا راز مضمر ہے۔

پہلی ملاقات میں ان کی یہ دو خوبیاں میرے سامنے آئیں اور میں نے عجلت میں یہ رائے قائم کر لی کہ مولانا کے سلاح خانے میں بس یہی دو ہتھیار ہیں جن سے ان کی تمام فتوحات ظہور میں آئی ہیں۔

اس ملاقات نے میرے دل میں مولاناؒ سے مخلصانہ عقیدت پیدا کر دی اور مولاناؒ کے دل میں میرے لئے مربیانہ شفقت۔ اس کے بعد سے وہ کبھی کبھی سیاسی و مذہبی جلسوں میں یاد فرمانے لگے اور گو میں نے اس طرح کی مجامع کے لئے اپنے تئیں کبھی اہل خیال نہیں کیا، مگر ان کے حکم کی تعمیل میں کبھی کبھی شریک ہونا پڑا۔ ان جلسوں کی شرکت کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ ان کی نسبت میری پچھلی رائے عاجلانہ تھی، وہ اس سے بہت زیادہ ہیں جتنا میں نے ان کو سمجھا ہے، اسکیموں کا بنانا، گتھیوں کا سلجھانا، عقدوں کا حل کرنا، پیچوں کو سمجھنا، بندراہوں کو کھولنا، یہ باتیں کتنی ہی وقیع اور اہم سہی، اور ان سے مولاناؒ کے ذہن

کی صفائی اور عقل کی تیزی اور چترائی کی کتنی شہادتیں فراہم ہوتی ہوں، مگر یہ سب مولاناؒ کی شخصیت کی ظاہری شئون ہیں، ان کی اصلی بڑائی ان کے اس کردار کے اندر چھپی ہوئی ہے، جس میں وہ پوری طرح پختہ ہو چکے ہیں، جس طرح ان کی ہر خاموشی با معنی اور ہر گویائی گرہ کشا ہوتی ہے اسی طرح ان کی ہر ادا ان کی سیرت کی پختگی اور ان کے کرادر کی مضبوطی کا پتہ دیتی ہے۔

جمعیۃ علمائے ہند کے جو جلسے گذشتہ چند سالوں کے اندر ہوئے ہیں، ان میں سے بعض میں مولاناؒ ہی کی دعوت پر میں شریک ہوا، ان جلسوں کی مخالفت میں جو ہنگامے اٹھے ان کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، بعض مرتبہ تو مخالفین کی خوش تمیزیاں ایسی ہولناک اختیار کر لیتی تھیں کہ آدمی کے ہاتھ سے دامن صبر چھوٹ جائے یا دامن امید، اور ظاہر ہے کہ ان تمام یورشوں کا اصلی نشانہ کم از کم صوبہ بہار میں مولاناؒ ہی کی ذات تھی، مگر میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ مولاناؒ ان ہنگاموں سے ایک لمحہ کے لئے بھی بے حوصلہ یا بے صبر ہوئے ہوں۔ ان کا دماغ ہمیشہ پُر سکون اور دل ہر حالت میں مطمئن رہتا تھا۔ ہم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اگر وہ پسند کرتے تو اپنے مخالفوں کے اوچھے ہتھیاروں کا مقابلہ اوچھے ہتھیاروں سے کر کے ان کو زک دے سکتے تھے، مگر اپنے طرز عمل کی کامیابی کا یقین کسی حالت میں ان کا ساتھ نہیں چھوڑتا تھا، اور ان کی اولوالعزمی ہمیشہ اوچھے ہتھیاروں کے استعمال سے ابا کرتی تھی۔ مولاناؒ کی یہ عزیمت اگر بے مثال نہیں تو کم از کم اپنی نوعیت میں غیر معمولی ضروری تھی۔

اس عزیمت کے ساتھ وہ انتھک کام کرنے والے تھے، میں نے ان کو کبھی خالی الذہن یا غیر مشغول نہیں پایا، وہ سوچتے یا کام کرتے، ستاتے کبھی

نہیں تھے، وہ ایک ایسی دریا کے مانند تھے جس میں تموج وطغیانی کی سرجوشی تو نہ ہو لیکن روانی کا پورا جوش وخروش موجود ہو جو بغیر دم لئے ہر آن وہر لمحہ چٹانوں سے ٹکراتا، پتھروں سے لڑتا، جھاڑیوں سے الجھتا، رواں دواں۔ ان کے پبلک اشغال نہ فیشن کے طور پر تھے نہ حصول سروری وسعادت کی طمع میں، وہ جس مسئلہ کو اٹھاتے وہ زندگی اور موت کا سوال بن کر ان سے چمٹ جاتا، اس لئے وہ کسی کام کو بے دلی (Disheartedly) کے ساتھ کر کے اپنے نفس کو مطمئن نہیں کر سکتے تھے، بلکہ مجبور تھے کہ اس کے لئے اپنے فکر وعمل کی تمام قوتیں میدان میں ڈال دیں، سوتے جاگتے بس وہی مسئلہ ان کے سامنے ہوتا اور ان کی ساری راحت وطمانیت اس کے انہاک کے اندر سمٹ آتی، وہ اپنے پبلک اشغال سے تھک کر نہ تو کوئی امن کا گوشہ تلاش کرتے، نہ دوسری غیر پبلک دلچسپیوں کو ان کے ساتھ شریک کر کے ان کی حرمت کو بٹہ لگاتے، اس اعتبار سے ان کا مزاج ایک سیاسی لیڈر سے بالکل مختلف تھا، ان کی دُھن میں عاشق کی دُھن کی شان تھی۔ اور چونکہ وہ ایک زبردست عالم تھے اس لئے یقیناً یہ چیزیں انہوں نے پیغمبران عظام کے اسوۂ حسنہ سے اخذ کی تھیں، میں نے یہ چیز وقت کے بڑے سے بڑے لیڈروں میں بھی نہیں پائی۔

مولاناؒ کے اخلاق میں ایک عجیب چیز ان کی محبت بھی تھی، جو تصنع اور بناوٹ کے ہر شائبہ سے بالکل پاک تھی، اس محبت کا اظہار نہ تو وہ لفظوں سے کرتے نہ سیاسی لیڈروں اور مذہبی پیشواؤں کی مصنوعی اداؤں سے، وہ سرتاپا عمل تھے، اس لئے ان کی محبت عملی تھی، میں جب کبھی ان سے ملا مجھے محسوس ہوا کہ ان کی محبت کے فیضان میں نہا گیا ہوں، حالانکہ وہ زبان سے تو کچھ کہتے نہیں تھے

اور اگر کچھ کہتے تھے، تو میں نہ تو اس کے سننے کی کوشش کرتا نہ سمجھنے کی، وہ اپنے ساتھیوں پر پورا اعتماد کرتے تھے اور قابل طبیعتوں کے جوہر نمایاں کرنے کے لئے استاد کی طرح شفیق اور باپ کی طرح فیاض تھے۔

مولاناؒ نے اسلامی قانون کا نہایت چھا مطالعہ کیا تھا۔ تمام حاضر الوقت مسائل میں وہ حیرت انگیز سرعت کے ساتھ شرعی نقطۂ نظر متعین کر لیتے تھے، ان کی نظر نہایت گہری تھی، بسا اوقات پہلے (مرحلہ) میں ان کی رائے کمزور معلوم ہوتی مگر ان کی تنقیحات کے بعد جب مسئلہ پوری روشنی میں آجاتا تو ہر شخص ان کی اصابت رائے کی داد دیتا۔ پھر وہ صرف جزئیات کے مفتی نہیں تھے، بلکہ اسلامی نظام کو اس کے تمام اشکال وصور میں جانتے اور سمجھتے تھے، اور اس کے اصولی و فروعی مسائل کی پوری معرفت رکھتے تھے۔ ان معاملات میں بصیرت رکھنے والے ہندوستان میں بہت کم ہیں، مولاناؒ ان میں سے ایک تھے۔

مولاناؒ جس انقلاب کے داعی تھے اس کا پروگرام بالکل شرعی اور مذہبی تھا۔ ان کو پورا اعتماد تھا کہ اگر مسلمانوں کی تنظیم جمعیۃ علماء کی قیادت میں ہو جائے تو مسلمان ہندوستان کے اندر ایک ایسا نظام نافذ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جو ہندوستانی قومیت میں شامل ہونے کے باوجود ان کی حفاظت کر سکے گا۔ وہ اس کو مسلمانوں کے لئے آئیڈیل نہیں سمجھتے تھے، مگر اس سے زیادہ کے لئے حالات سازگار نہیں پاتے تھے۔ وہ سیاسی نظریات میں عملی و مادی پہلو (Material Form) پر نظر رکھنے کے زیادہ عادی تھے اور نری تصوریت کے قسم کی کوئی چیز ان کو بہت کم اپیل کرتی تھی۔

میں یہ سطریں لکھتے وقت جب خیال کرتا ہوں کہ وہ اب دنیا میں نہیں رہے تو غم سے دل پارہ پارہ ہونے لگتا ہے، ان کی اصابت رائے اور قوت عمل پر مشکل سے مشکل وقتوں میں بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔

اللہ تعالی مولاناؒ کو اعلی علیین میں جگہ دے اور ہماری قوم کے اندر ان کا صحیح جانشین پیدا کرے۔[٨٣]

[٨٣] محاسن سجاد، ص۴۹۔

ایک دور اندیش مفکر
کچھ یادیں، کچھ باتیں

حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ سابق مفتی دارالعلوم دیوبند [۸۴]

نائب امیر شریعت حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب کا نام نامی اس وقت سے سنتا آرہا تھا جس وقت سے مدرسہ وارث العلوم چھپرہ میں داخل

---

[۸۴] حضرت مفتی ظفیر الدین صاحب مفتاحی کا شمار اس دور کے ممتاز ترین علماء اور مشہور مصنفین میں ہے ، ولادت اپنے آبائی وطن پورہ نوڈیہا دربھنگہ میں ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۹۲۶ء میں ہوئی، والد کا نام منشی شمس الدین تھا، تعلیم کا آغاز مدرسہ وارث العلوم چھپرہ اور تکمیل مدرسہ مفتاح العلوم مئو میں محدث کبیر مولانا حبیب الرحمن اعظمی سے ہوئی، فراغت کے بعد کئی مقامات پر تدریسی خدمات انجام دی، پھر موضع سانحہ ضلع مونگیر (حال ضلع بیگوسرائے) میں مدرسہ معینیہ قائم کیا اور آٹھ سال اسی میں خدمت انجام دی ،اس کے بعد دارلعلوم دیوبند تشریف لے گئے اور تاحیات دارالعلوم کے لئے وقف رہے، اس کے فتاویٰ کی ترتیب، مخطوطات کی مفصل فہرست سازی، اور ماہنامہ دارلعلوم کا اداریہ لکھتے رہے، پھر دارالافتاء کے مفتی بنائے گئے، فقہی وسعت نظر کی بناپر مسلم پرسنل لا نے ان سے قانون کی تدوین وترتیب کا بھی کام لیا جس میں کئی ممتاز فقہاء شامل تھے، اخیر میں ضعیفی کی وجہ سے اپنے وطن آگئے تھے اور وہیں تین سال رہ کر ۳۱مارچ ۲۰۱۱ کو وفات پائی ، تقریبا پچاسوں کتابیں اور ہزاروں صفحات پر پھیلے مضامین ان کی قلمی یادگار ہیں۔ حالات کے لئے دیکھئے خود مفتی صاحب کی خودنوشت " زندگی کا علمی سفر " اور حیات ظفیر (مجموعہ مقالات) مرتبہ مفتی سعود عالم قاسمی شعبۂ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

ہو کر عربی کتابیں میں نے پڑھنا شروع کی۔ اس مدرسہ کے صدر المدرسین حضرت الاستاذ مولانا عبد الرحمن صاحب امیر شریعت خامس اور حضرت الاستاذ سید محمد قادری صاحب برابر آپ کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں جب میں قدوری، کافیہ وغیرہ پڑھ رہا تھا(یہ درجہ فوقانیہ تھا، جس میں یہ کتابیں داخل تھیں) تو بتایا گیا کہ فوقانیہ کا سالانہ امتحان پٹنہ میں ہوگا، سنٹر مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ ہوگا۔

باہر جاکر امتحان دینا یہ میرے لئے نئی بات تھی، خوشی بھی تھی اور خوف بھی تھا۔ خوشی اس بات کی کہ پٹنہ شہر دیکھوں گا اور خوف اس کا دیکھئے امتحان میں نتیجہ کیا رہتا ہے۔ اللہ اللہ کر کے وہ دن آیا کہ اپریل ۱۹۳۸ء میں برائے امتحان پٹنہ جانا ہوا، پٹنہ میں دس دنوں رہنا ہوا، امتحان میں شریک رہا اور گھوم پھر کر پٹنہ شہر بھی دیکھا۔ یہ طے کر لیا تھا کہ بعد امتحان دفتر امارت شرعیہ اور حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ کو دیکھنا ہے۔

چنانچہ بعد امتحان تانگہ کے ذریعہ پھلواری شریف جانا ہوا، وہاں سے امارت شرعیہ کے دفتر کا نام پوچھتے ہوئے خانقاہ مجیبیہ پہونچا۔ جہاں امارت کا دفتر تھا۔ اس وقت صرف ایک ڈیڑھ کمرے امارت شرعیہ کے حصہ میں تھے۔ وہاں حضرت مولانا محمد عثمان غنی صاحب سے ملا۔ معلوم ہوا کہ مولانا محمد سجاد صاحب یہاں نہیں ہیں، باہر گئے ہوئے ہیں۔ وہاں ایک آدھ گھنٹے ٹھہرا اور مولانا عثمان غنی صاحب کو سلام کر کے چلا آیا۔ خوشی ہوئی کہ امارت شرعیہ دیکھا جس کا تذکرہ اپنے اساتذہ کرام سے سنتا آرہا تھا افسوس اس کا رہا کہ حضرت مولانا محمد سجاد صاحب سے ملاقات نہیں ہو سکی۔

اسی سال مئی میں جمعیۃ علمائے بہار کی صوبائی کانفرنس چھپرہ میں ہونے والی تھی، اس کانفرنس کے کارکنان مدرسہ وارث العلوم کے اساتذہ اور کچھ شہر کے معزز حضرات تھے ورنہ پوراشہر مسلم لیگ سے منسلک تھا۔

امتحان سے واپس ہوئے تو ہم تمام طلبہ اساتذہ کی زیر نگرانی صوبائی کانفرنس کے انتظام میں مصروف ہو گئے، اوقات تعلیم میں اسباق ہوتے، بقیہ اوقات میں جمعیۃ علماء کے کام۔ اجلاس کے دن قریب آئے، تو حضرت مولانا محمد سجاد صاحب خود تشریف لے آئے اور مدرسہ میں قیام فرمایا۔ مولانا کی آمد ہم طلبہ کے لئے بڑی نعمت تھی، اب مولانا کو قریب سے دیکھا اوران کی خدمت حصہ میں آئی۔ بہت سے خواص آپ سے ملنے آئے تھے، ہندوستان کی آزادی پر روشنی ڈالتے تھے، ہم طلبہ ان کی باتوں کو پورے غور سے سنتے تھے، ہندوستان کے غیر مسلموں کے لئے بھی سوال ہوا کرتے تھے۔ حضرت امیر شریعت بتاتے تھے کی اس ملک پر ہم مسلمانوں کی حکمرانی تھی، انگریزوں نے اس ملک کو ہم سے چھینا ہے اور حکومت کے قدم جمانے کے لئے بہت سارے علماء کرام اور دوسرے ممتاز مسلمانوں کا بے دردی سے قتل عام کیا ہے، اس لئے ہم مسلمانوں کا فرض ہے کہ انگریزوں کو یہاں سے نکالیں اور ملک کو آزاد کرائیں، غیر مسلم بھائیوں کو بھی ہم نے اس جنگ آزادی میں شریک کیا۔ خلافت کی تحریک جس وقت یہاں عروج پر تھی، انگریزوں نے جانے کے لئے بوریا بستر باندھ لیا تھا، وائسرائے ہند غیر مسلم لیڈروں کو بلا کر سمجھایا کہ ہم گئے اور مسلمان پھر حکمران بن گئے، تم غلام کے غلام ہی رہو گے۔ اس لئے تم مسلمانوں اور ہندو میں تفریق پیدا کرو اور حکمراں بننے کی تیاری میں لگ جاؤ، چنانچہ شدھی سنگھٹن

کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا اور انگریزوں کے بندھے ہوئے بستر کھل گئے، اس طرح انگریزوں کو کچھ دن حکومت کا موقع مل گیا۔

مولانا مرحوم نے ایک مجلس میں یہ بھی بتایا کہ آزادی جب قریب آئے گی تو ہندو مسلم زبردست فساد ہوگا، تاکہ مسلمان ہندؤں سے مرعوب اور خوف زدہ ہو جائیں، اگر اس وقت مسلمان منظم نہیں ہوئے تو پٹ جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ میں مسلمان زمین داروں سے کہتا ہوں کہ تم بکھرے ہوئے مسلمانوں کو یکجا کرلو اور چھوٹی چھوٹی مسلم آبادی کو اپنے یہاں بلالو، اس طرح تمہاری بھی حفاظت ہو جائے گی اور ان غریب مسلمانوں کی بھی۔ مگر میری یہ باتیں کسی کی سمجھ میں ابھی نہیں آرہی ہیں، مگر وقت آنے پر دیکھو گے کہ یہ پچھتائیں گے اور ان کا بہت بڑا جانی ومالی نقصان ہوگا۔

چنانچہ ہم نے اپنی آنکھوں دیکھا کہ ۱۹۴۶ میں ہندو مسلم سخت فساد برپا ہوا، چھپرہ شہر سے شروع ہوا اور پٹنہ ضلع کے دیہاتوں میں پھیل گیا۔ اخبار نقیب کی رپورٹ کے مطابق فساد میں چالیس ہزار مسلمان شہید ہوئے اور سینکڑوں مسلمان بستیاں ویران ہو گئیں اور ان کا نام ونشان مٹ گیا۔

اسی صوبائی کانفرنس کے موقع سے شرکت کانگریس کی جب تجویز آئی تو ایک طرف زیادہ علماء اس کے قائل تھے کہ بغیر کسی شرط کے کانگریس میں مسلمانوں کو شریک ہونا چاہیئے، تو دوسری طرف چند علماء اس کے قائل تھے کہ ایسا قطعا درست نہ ہوگا۔ جب حضرت مولانا سجاد صاحب سے کہا گیا کہ آپ فیصلہ فرمائیں تو مولانا نے فرمایا کہ تجویز میں "میں" کو "کے" میں بدل دیا جائے۔ یعنی کانگریس کے ساتھ ہو کر آزادی کی لڑائی انگریزوں سے لڑی جائے،

آپ نے فرمایا کہ یقین جانیئے کہ جب آزادی کا وقت آئے گا، برادرن وطن آپ
کو دھکا دے کر آگے بڑھ جائیں گے اور آپ غیر منظم ہوں گے تو مسلمانوں کا
قتل عام ہو گا، اس وقت کیا تجویز منظور ہوئی میں نہیں جانتا، مگر ملک جب آزادی
کے قریب پہونچا تو ہم نے اپنی آنکھوں سے وہ سارا منظر اپنی دیکھا، جس کی
مولانا محمد سجاد صاحبؒ پیشین گوئی فرماگئے تھے۔

اس سے ہم نے سمجھا کہ حضرت مولاناؒ بڑے دور اندیش اور معاملہ فہم
تھے اور تیس سال بعد جو کچھ ہونے والا تھا اس کو پہلے سمجھتے تھے۔

مولانا اپنی مجلس میں فرماتے تھے کہ انگریزوں کو جو کچھ کرنا ہوتا ہے
تیس سال پہلے سے اس کا پلان تیار کرتے ہیں اس لئے ہم لوگوں کو تیس سال
آگے کے مسائل کو سامنے رکھ کر اقدام کرنا چاہیئے۔

اس وقت مولاناؒ کی بہت ساری باتیں ذہن اور دماغ میں گونج رہی ہیں
مگر اس وقت ان سب کا بیان مناسب نہیں ہو گا اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں۔
افسوس یہ ہے کہ مولانا کا آزادی سے بہت پہلے انتقال ہو گیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ حضرت مولانا مرحوم کی نظر ان تمام چیزوں
پر تھی جو آئندہ آزاد ہندوستان میں ہونے والا تھا اور جن کو آپ ہم آزادی کے
بعد کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اگر مولانا آزادی کے وقت زندہ ہوتے تو
ان حالات کے لئے ضرور کوئی تدبیر سوچتے اور مسلمانوں کا جو قتل عام ہوا نہ ہو
نے پاتا۔

مولانا محمد سجادؒ نے ۱۹۳۵ء میں جب نیا ایکٹ آیا اور وزارت کے لئے
الیکشن ہوا تو آپ کانگریس پر تکیہ کر کے نہیں بیٹھے بلکہ اعلان فرمایا کہ الیکشن میں

امارت شرعیہ صرف ان مسلم امیدواروں کے ساتھ تعاون کرے گی جو امارت
شرعیہ کے عہد نامہ پر دستخط کریں گے اور وعدہ کریں گے کہ اسلام سے متعلق
جو بل پیش ہو گا اس میں وہ امارت کے نقطۂ نظر کی تائید کریں گے اور مولانا اس
تجویز پر مضبوطی سے جم گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سارے مسلم امیدوار آپ کی
خدمت میں آئے اور عہد نامے پر دستخط کرنے پر مجبور ہوئے۔ پھر اسی کے
ساتھ آپ نے ایک پارٹی بنالی، مسلم انڈی پینڈنٹ پارٹی، پھر الیکشن میں
امیدواروں کے کھڑے کرنے کا اعلان کیا۔

حضرت مولانا اپنے نظریہ کو بروئے کار لانے کے لئے الیکشن میں حصہ
دار بننا ضروری سمجھتے تھے، چنانچہ اس پارٹی کا مقابلہ بہار یونائیٹڈ پارٹی، بہار
احرار پارٹی، کانگریس پارٹی اور آزاد امیدواروں سے ہوا۔ انتخاب کا جب نتیجہ
آیا تو دنیا یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی کہ یونائیٹڈ پارٹی کے ۳۳ امیدواروں میں سے
صرف چھ کامیاب ہوئے اور احرار پارٹی کے دس امیدواروں میں تین کامیاب
ہوئے، حتی کہ پارٹی لیڈر مولوی شفیع داؤدی ناکام رہے اور انڈی پینڈنٹ پارٹی
نے اسی فی صد کامیابی حاصل کی اور کانگریس کے بعد دوسرے نمبر پر رہی، یعنی
غیر مسلموں میں زیادہ کامیابی کانگریس کو ہوئی اور مسلمانوں میں زیادہ کامیابی
انڈی پینڈنٹ پارٹی نے حاصل کی۔ اس وقت جداگانہ ووٹ ڈالے جاتے تھے،
مسلمان، مسلمانون کو ووٹ دیتے تھے اور غیر مسلم ووٹ غیر مسلم کو پڑتا تھا۔
اس وقت ہر بالغ ووٹ نہیں ڈالتا تھا۔ بلکہ کچھ دوسرا معیار بنا رکھا تھا، ووٹ ڈالنے
والے بہت کم ہوتے تھے۔ انتخاب کے بعد وزارت کانگریس کی بنتی مگر کانگریس
نے کسی بات پر وزارت بنانے سے انکار کر دیا، اس وقت گورنر نے مسلم انڈی

پینڈنٹ پارٹی کو وزارت بنانے کی دعوت دی ، جو بہار کی کانگریس کے بعد دوسری بڑی پارٹی تھی۔

حضرت مولانا محمد سجاد صاحب نے رائے دی کہ وزارت بنالی جائے، گو یہ طے تھا کہ یہ وزارت مختصر دنوں کے لئے ہوگی مگر اس عرصہ میں کچھ کام تو ہو ہی جائے گا، بعض لوگوں کی رائے خلاف میں تھی، مگر ترجیح مولانا کی رائے کو ہوئی، اور وازارت بنی، بیرسٹر محمد یونس کی قیادت میں کام شروع ہوا، سرکاری دفاتر میں اردو زبان کا رواج اسی وزارت کی دین اور دوسرے کام بھی ہوئے۔ صرف ساڑھے تین ماہ یہ وزارت رہی، پھر کانگریس وزارت میں آگئی۔

میں عرض کر چکا ہوں ۱۹۳۸ میں جمعیۃ العلماء بہار کی صوبائی کانفرنس کے سلسلہ میں مولانا محمد سجاد صاحب مدرسہ وارث العلوم چھپرہ میں تشریف فرما تھے ۔ اس زمانہ میں مسلم لیگ کا دور شباب پر تھا اور وہ جمعیۃ کی صوبائی کانفرنس کے سخت مخالف تھے۔ ہم طلبہ سمجھتے تھے کہ یہ کانفرنس کامیاب شاید نہ ہو سکے گی، ہم لوگ شہر میں اشتہار تقسیم کر کے واپس ہوتے تھے تو حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ بلا کر پوچھتے تھے عوام اور مسلم رضاکاروں کا تمہارے ساتھ کیا برتاؤ رہا۔ ہم بتاتے تھے کہ گالیاں دی گئیں، کہیں علماء کرام کے خلاف زبان درازیاں ہوئیں۔ مولانا ان تمام تفصیلات کو غور سے سنتے تھے اور پھر تشفی کے جملے فرماتے تھے اور حوصلہ افزائی فرماتے تھے اور فرماتے تھے کہ ہمت نہ ہارو کانفرنس کامیاب ہو کر رہے گی، چنانچہ اس سخت مخالفانہ ماحول میں مولانا کی تدبیروں سے کانفرنس کامیاب رہی، بڑا خوبصورت پنڈال تیار کرایا گیا۔ جمعیۃ کا

جھنڈا کالا سفید اسی وقت تیار کرایا اور اس کو بڑے اچھے انداز میں نمایاں کر کے لہرایا، مخالفین پنڈال اور جھنڈے دیکھنے آتے تھے۔

جس بلڈنگ میں علماء کرام کا قیام تھا وہاں سے لے کر پنڈال تک سڑک کے دونوں طرف لیگی کالے جھنڈے لے کر کھڑے رہتے تھے اور مخالف نعرہ لگاتے تھے، یہی حال اس وقت ہوتا تھا جب ہم اسٹیشن سے مہمانوں کو لے کر قیام گاہ پہنچاتے تھے، بڑا سخت وقت تھا، مگر حضرت پر کبھی کوئی اثر نہیں دیکھا۔ ہمارے اساتذہ بھی میدان میں جمے ہوئے تھے۔

یہ بالکل درست ہے کہ مولانا بہت دور اندیش جری اور بہادر تھے جس کا مخالفین کو بھی اعتراف تھا اور اپنوں کو بھی۔ جس طرح وہ ملک کی آزادی چاہتے تھے تحریک آزادی کے ساتھ ساتھ وہ مسلمانوں کو اسلامی احکام کا پیرو اور مطیع دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ تحریک آزادی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں مذہبی اور شرعی زندگی کو لوٹانا چاہتے تھے اور صورتاً و سیرتاً سچا مسلمان دیکھنا پسند کرتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ وہ ابتدائے عمر سے امارت شرعیہ کی اسکیم پورے ملک میں نافذ دیکھنا چاہتے تھے۔ مسلمانوں کی شرعی تنظیم کا قیام ان کا سب سے اہم مشن تھا۔ جب امیر فی الہند کے انتخاب کی صورت نہیں نکل سکی تو آپ نے بہار و اڑیسہ میں امارت شرعیہ قائم کی اور اس کے لئے جد وجہد جاری رکھی اور اپنے ارد گرد رہنے والوں میں جذبہ و ولولہ پیدا کیا۔ بہار کی دو مشہور خانقاہیں تھیں دونوں کے ذمہ داروں سے ملے اور دونوں نے ساتھ دیا۔

آپ "تاریخ امارت" شرعیہ بغور پڑھ جائیں پھر اندازہ ہوگا کہ مولانا نے کتنی محنت کی تھی، جب چوتھے امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی منتخب ہو

ئے تو انہوں نے امارت شرعیہ کو حضرت مرحوم کے فکر و نظر کے مطابق بنانے کی بھرپور سعی اور جد وجہد کی جو حضرت مولانا محمد سجادؒ چاہتے تھے۔ امارت شرعیہ کو اس نقشے کے مطابق بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ دارالقضاء جس کی ملک وملت کو سب سے زیادہ ضرورت تھی، اس شعبہ کی ترقی پر کافی زور دیا۔ اس کے لئے باضابطہ مونگیر جامعہ رحمانی میں بار بار کیمپ لگایا اور علماء کو دعوتیں دیں۔ حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی نائب امیر شریعت جو آپ کے استاد تھے ان کو فقہی کتابیں مرتب کرنے اور نوجوانوں کو اس کے مطابق ٹرینڈ کرنے کی زحمت ی۔ الحمد اللہ اس میں مولانا منت اللہ رحمانی صاحب کامیاب رہے اور کچھ ذہین علماء کو قضاء کے کاموں کے لئے تیار کر دیا، اور ہر ضلع میں قاضی مقرر کرنے کی پیہم سعی فرمائی اور دارالقضاء قائم کیا اس کے دفاتر قائم کئے غریب و مجبور عورتیں جو مصائب سے دو چار تھیں انہوں نے یہاں سے فسخ نکاح کرا کر خوشگوار زندگی حاصل کی۔ امارت شرعیہ کے لئے پہلے مکان خریدا، ہر شعبہ کا دفتر الگ الگ قائم کیا اور اس کے مالی شعبہ کو مضبوط کرنے کی کوشش کی۔ جب اس سے اطمینان ہوا تو امارت کے دفاتر جو اندر قصبہ میں تھے جہاں تک ہر شخص کا پہونچنا آسان نہیں تھا اس کی جگہ بدلنے کا خیال پیدا ہوا۔ شیخ عبداللہ پٹنہ آئے تو مولانا رحمانی نے ان کو زحمت دی کہ وہ دفاتر امارت شرعیہ کا معائنہ فرمائیں، شیخ عبداللہ آئے، جہاں انہوں نے نظام اوقات کی تعریف کی وہیں یہ بھی فرمایا کہ اسلام نے صفائی ستھرائی کی بہت تاکید کی ہے۔

حضرت امیر شریعتؒ نے ان کو رخصت کر کے فرمایا کہ مفتی صاحب اب جیسے بھی ہو دفتر کو روڈ کنارے لانا ہوگا تاکہ قصبہ کی گندگی کا شکوہ سننا نہ پڑے۔

میں نے عرض کیا حضرت آپ ارادہ فرمائیں، ایسا بھی جلد ہی ہو جائے گا، یہ بڑی بات نہیں ہے، چنانچہ حضرت امیر شریعت اس کے لئے مستعد ہو گئے اور دو تین سال کے اندر دفاتر کے لئے داناپور روڈ کے کنارے زمین حاصل کی، اسے ہموار کیا اور پھر اس میں امارت شرعیہ کی نئی بلڈنگ بنوائی، پھر سجاد اسپتال کھولا، اور اسی کے ساتھ مسلمان نوجوانوں کے لئے ٹیکنیکل کی بلڈنگ کی بنیاد رکھوائی اور اپنی زندگی میں یہ تینوں کام انجام دیا۔ ایک دفعہ فرمایا بھی کہ یہ کام لوگ جوانی میں کرتے ہیں اور اس کے فوائد کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، میں بڑھاپے میں کر رہا ہوں، جو زندہ رہیں گے اس کے فوائد کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔ پھر امارت شرعیہ کو پورے ملک میں متعارف کرایا اور مختلف صوبوں میں امارت قائم ہوئی۔

واقعہ ہے کہ حضرت مولانا محمد سجاد صاحب کا اخلاص، ان کا ایثار کام کر رہا ہے اور امارت شرعیہ مختلف انداز میں اپنے فرائض انجام دینے میں مصروف ہے، وہ جہاں صوبہ بہار، اڑیسہ کے مسلمانوں کی خدمت کر رہی ہے وہیں پو رے ملک کو فائدہ پہنچا رہی ہے اور ان شاء اللہ پہنچاتی رہے گی، چند مخلص بھی جب تک رہیں گے امارت شرعیہ ترقی کرتی رہے گی اور حضرت مولانا محمد سجاد کا نام زندہ رہے گا۔[۸۵]

[۸۵] حضرت مولانا سجاد (مجموعہ مقالات سیمینار پٹنہ)۔

حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد دید و شنید

حضرت مولانا عبد اللہ عباس ندوی رح[86]

---

۸۶ مولانا عبد اللہ بن عباس بن انس مجیبی جعفری پھلواروی ندوی، ہندوستان کے مقتدر و ممتاز علماء میں ان کا مقام اور عظمت مسلم ہے، بالخصوص عربی زبان و ادب اور علم بلاغت پر مجتہدانہ نظر تھی، اسی بنا پر قرآن پاک کے رموز و حقائق اور اسرار بلاغت کی تشریح و توضیح میں ملکۂ تامہ حاصل تھا، دوسرے علوم و فنون میں بھی کمال حاصل تھا، اردو، عربی اور انگریزی تینوں زبانوں میں ان کی تصانیف ہیں، فارسی اور فرانسیسی زبان سے بھی پوری طرح واقف تھے، روحانی مقام بھی بہت بلند تھا، پھلواری شریف کے معروف خانوادۂ علم و عمل سے ان کا تعلق تھا، سہار ضلع آرہ میں جو ان کی نانہال تھی پیدائش ہوئی، تعلیم کی تکمیل مدرسہ قدیمیہ فرنگی محل کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں کی اور چند سال رحیم آباد مضافات لکھنؤ میں خدمت انجام دے کر پھر ندوہ میں مدرس ہوگئے اور ترقی کرتے ہوئے ادیب اول کے عہدہ پر فائز ہوئے، اسی دوران ایک دعوتی وفد کے ساتھ حجاز گئے، اس کے بعد مستقل حجاز منتقل ہوگئے، وہاں رابطہ عالم اسلامی سے وابستہ رہے پھر جامعۃ ام القریٰ میں تدریسی خدمت انجام دی، اسی دوران انگلینڈ جاکر پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی۔ درجنوں کتابیں اور کئی سو مقالات ان کے قلم سے نکلے، عالم اسلام و یورپ کے اہم ممالک کے سفر بھی کئے۔ ۱۹۸۰ء میں ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم بنے، مکہ میں مستقل قیام تھا، اور وہیں یکم جنوری ۲۰۰۶ء مطابق ۱ ذی الحجہ ۱۴۲۶ھ کو انتقال فرمایا اور جنۃ المعلی میں دفن ہوئے۔ حضرت مولانا کی علمی خدمات اور کمالات سے واقفیت کے لئے ان کی خود نوشت ''سفر نامۂ حیات''، سہ ماہی المجیب پھلواری شریف اور تعمیر حیات ندوۃ العلماء لکھنؤ کے خصوصی شمارے اور عربی میں ڈاکٹر قمر شعبان ندوی کی "عبقریۃ عبد اللہ عباس الندوی" دیکھیں۔

حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجادؒ کو میں نے دیکھا ہے، میرے لئے یہ بات قابل فخر اور قابل ذکر ہے، مگر اس وقت دیکھا جب کہ میری عمر ۱۲، ۱۳ سال کی تھی، گفتگو اور سمجھنے کی عمر نہیں تھی، لیکن آپ کے متعلق پڑھا اور سنا بہت ہے، ثقہ ترین بزرگوں سے سنا اور اہل ایمان و اخلاص کو آپ کے ذکر میں رطب اللسان پایا۔

آپ کے محاسن جمیلہ کے پانچ ابواب ہیں، اور ہر باب تشریح و تطبیق کے لئے متعدد فصول کا طالب ہے، اخلاص و للّٰہیت، علمی رسوخ، سیاسی بصیرت، اصابت رائے اور مجاہدانہ کردار، اس کے علاوہ جو ہے انہیں جلی عنوانات کی شرح ہے، حاشیے ہیں اور تطبیقات ہیں۔

میری معلومات کے مآخذ و مصادر میں سب سے پہلی وہ باتیں ہیں جو میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد عباسؒ سے گھریلو مجلسوں میں سنیں، دوسری شخصیت جن کی خدمت میں حاضر باشی کا بارہا موقع ملا وہ حضرت مولانا عبد الصمد رحمانی تھے جو ناظم امارت شرعیہ تھے اور بعد میں نائب امیر شریعت مقرر ہوئے، تیسری شخصیت قاضی احمد حسین صاحب کی تھی جو اپنے گھر کے رئیس، امارت شرعیہ کی خدمت کرنے والے بے لوث بزرگ تھے، جن کی بصیرت دینی اور حسن اخلاق نے ان کو صاحب محاسن سے قریب کردیا تھا، ان بزرگوں کے علاوہ اسلامی تاریخ کے دیدہ ور مورخ اور عربی ادب میں بین الاقوامی شہرت رکھنے والے مولانا مسعود عالم ندوی تھے، جن کی کتاب محاسن سجاد میرے محدود علم کے مطابق حضرت مولانا محمد سجاد کی شخصیت اور کارناموں پر مشتمل مضامین کا پہلا

مجموعہ تھا،اس میں ایک مضمون ایسے صاحب کا بھی داخل ہوگیا تھا جنہوں نے آفتاب کی کرنوں کو دیکھنے کے لئے سیاہ شیشے کی عینک لگا لی تھی،اس مقالہ سوداء کی بنا پر یہ کتاب "المحاسن والاضداد" بن گئی۔

اخلاص وللّٰہیت کا لفظ مبہم سمجھا جائے گا اگر اس کی شہادت حالات وواقعات سے نہ ہو۔

مولانا اپنے گھر کے کھاتے پیتے لوگوں میں تھے،ایک معقول جائیداد کے مالک تھے،مگر دینی وعلمی جدوجہد میں اس درجہ سرگرم تھے کہ جائیداد ضائع ہوگئی۔[87]

انہوں نے بیسوں اشخاص کو اسمبلی کا ممبر بنایا،چیف منسٹر اور منسٹر کے عہدے تقسیم کئے،ان کی ذات لاکھوں مسلمانوں کے لئے عقیدت کا مرکز تھی، اگر چاہتے تو ایک عالی شان بنگلہ میں رہ سکتے تھے،یا اپنا اچھا سامکان بنواسکتے تھے،اس وقت کے تمدن میں جو آسائش کے سامان میسر تھے،وہ ایک اشارہ پر حاصل کرسکتے تھے،مگر پھلواری کے ایک خستہ حال مکان میں کرایہ دار کی حیثیت سے رہے،موٹا جھوٹا کھاتے تھے،کھدر کا معمولی لباس پہنتے تھے،صاحبزادہ کو بجائے آئی سی ایس بنانے مدرسہ میں تعلیم دلائی،اور جب مرے تو ان کی ملکیت چند آنوں تک محدود تھی۔

علمائے ادب لکھتے ہیں کہ زہد کی دوقسمیں ہیں،ایک زہد القادر،اور ایک ہے زہد المحروم،زہد القادر یہ ہے کہ رفاہیت کے حصول کی قدرت رکھتے ہوئے اس کو قبول نہ کرنا،اور زہد المحروم یہ ہے لاچاری وناداری کی بنا پر خستہ

[87] حیات سجاد،ص۲۲

حال رہنا،اجر اس کا بھی ہے لیکن زہد القادر کی بات ہی اور ہے۔مولانا سجاد کا زہد زہد قادر تھا،تصور کیجئے،وزارت گر رہنما،ایسا قائد جو کسی کو وزیر اعلی کا عہدہ دلارہا ہے مگر اپنے ضرورت مند اور باصلاحیت نوجوان داماد کو پانچ روپئے کی ملازمت دلانے کی کوشش نہ کرے،اگر یہ اخلاص وللّٰہیت نہیں ہے تو سیاہ عینک سے آفتاب کی کرنوں کو دیکھنے والوں کو چاہئے کہ اس لفظ کو لغت سے نکال دیں۔

مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کی سوانح حیات کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے ان کے اخلاص وللّٰہیت کے لئے کسی سوگند وگواہ کی ضرورت نہیں ہے،ان کی پوری زندگی اخلاص وللّٰہیت کا آئینہ تھی،دنیا جانتی ہے کہ وہ امارت شرعیہ کے بانی تھے،فکر بھی انہیں کی دی ہوئی تھی،لیکن جب منصب امارت پر سرفرازی کا وقت آیا تو پیچھے ہٹ گئے،آگے اپنے وقت کے تسلیم شدہ مشائخ کرام کو بڑھادیا،اور زندگی بھر نائب امیر شریعت کی حیثیت سے سرگرم عمل رہے۔چونکہ ان کے پیش نظر اپنی ذات،اپنا نمود نہیں تھا،بلکہ ملت کی سرفرازی،وحدت کلمہ اور وحدت تنظیم تھی،دنیا میں سارے جھگڑوں کی بنیاد کرسی وتنظیم ہے،کوئی شخص اپنے اقتدار میں شریک نہیں چاہتا،مگر حضرت مولانا محمد سجاد نے عملی ثبوت دیا کہ عہدہ ومنصب کے لئے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے اور امت کی بہبودی کے لئے کام کررہے تھے،یہ مرتبہ خاصان خدا کا ہے۔[88]

[88] حضرت مولانا سجاد (مجموعہ مقالات سیمینار پٹنہ)۔

مولانا محمد سجاد کے محاسن

قومی، جماعتی، مذہبی، دینی گلزار کے بہار

جناب بیرسٹر محمد یونسؒ سابق وزیر اعظم بہار[89]

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے قومی کاموں کے سلسلہ میں میری پہلی ملاقات ۱۹۲۳ء میں "حزب اللہ" کے قیام کے سلسلہ میں ہوئی۔ مولانا کا یہ خیال تھا کہ ایسی حالت میں کہ ملک میں فتنہ انگیز نفوس کے ہاتھوں، فسادات رونما ہوتے رہتے ہیں جس سے مذہبی احکام وشعار کی بے حرمتی اور توہین ہوتی ہے۔ ملک میں بدامنی بھی پھیلتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر ایک طرف مسلمان پریشان ہوتے ہیں۔ تو دوسری طرف حکومت وقت، نیز امن پسند غیر مسلم بھی اس کے اثرات سے قدرتاً محفوظ نہیں رہتے ہیں۔ اور نہ رہ سکتے ہیں۔

اس لیے مقتضائے وقت اور ضرورت کی آواز سے کانوں میں انگلیاں

[89] بیرسٹر محمد یونس صاحب کی شخصیت اس حیثیت سے بہت مشہور ہے کہ وہ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد علیہ الرحمۃ کی تشکیل کردہ انڈی پنڈنٹ پارٹی کے وزیر اعلیٰ صوبہ بہار رہے، ان کے سیاسی کارنامے مشہور ومعروف ہیں، وہ پٹنہ کے مشہور وکلاء میں تھے، زیادہ حالات معلوم نہ ہوسکے، شاید مسلم لیگ سے ان کے مراسم اچھے نہ تھے اسی لئے اراکین لیگ ان کے وزیر اعلیٰ بننے پر حضرت مولانا سے بھی سخت برہم ہوگئے۔

ڈالنا اور اس کی طرف توجہ نہ کرنا خطرناک نتائج کا موجب ہوگا۔ ضرورت کے ماتحت ملک کے حالات کی بناپر وقت کا یہ ضروری اور ناگزیر مسئلہ ہے کہ ایک جماعت رضاکاروں کی "حزب اللہ" کے نام سے ہر گاؤں اور تمام شہر وقصبات میں موجود رہے۔ جو ہر قسم کے فتنہ وفساد کا انسداد کرے۔ اور اس کے لیے وہ اپنی طرف سے ہر طرح کی خدمات کو انجام دے۔ اور ملک کے امن کو ہر ایثار وفدویت سے کام لے کر بحال وبرقرار رکھے۔

ہم جانتے ہیں، آج جب کہ پانی سر سے اونچا ہو رہا ہے، اس دور بیں فقیر صفت بزرگ کے اس نظریہ کو آج چوٹی کے لوگ عملاً برتنے پر مجبور ہیں۔ اور مختلف نام سے اس کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔

مولانا مرحوم نے اس سلسلہ میں "اُصول ودستور" بھی حزب اللہ کے وضع کیے تھے، اور ان کا خیال تھا، کہ پوری تنظیم کے ساتھ بہار کے ہر ہر گوشہ میں حزب اللہ کا قیام ہو جائے۔ جہاں تک مجھ کو یاد ہے کہ اس کا قیام بھی ہوا۔ اور اس سے اچھے نتائج بھی مرتب ہوئے۔ مگر مسلمانوں کے ہر کام کی طرح یہ بھی ادھورا رہا۔ جس کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ مولانا مرحوم کی ذات ایک انار وصد بیمار کی مصداق تھی۔ وہ جس وقت تک ایک چیز کی تخلیق کرکے، اس کی ابتدائی مبادیات کو درست کرکے عملی ڈھانچہ میں لاکر کھڑا کرتے۔ زمانہ دوسری ضروری چیز ان کے سامنے اس طرح لاکر کھڑا کر دیتا۔ کہ وہ اس کی طرف توجہ کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ اور اس کی فکر میں لگ جاتے۔ اور کوئی دوسرا ایسا صحیح کارکن نہیں ہوتا۔ جو صحیح طور پر مولانا مرحوم کے پہلے کام کو پھیلاتا۔ "حزب اللہ" کا بھی حشر یہی ہوا۔ ضرورت آج بھی اس کی داعی ہے۔ کہ

مولانا مرحوم کے وضع کردہ "دستور واصول" کے ماتحت اس کی تمام تنظیم کی جائے۔

مولانا مرحوم کی یہ عجیب خصوصیت تھی کہ وہ وقت کے تقاضا کو خوب سمجھتے تھے۔ اور بروقت اس کا حل بھی نکال لیتے تھے۔ مولانا مرحوم کے ساتھ قومی، سیاسی، دستوری اور آئینی ہر طرح کے کام کرنے کا مجھ کو شرف حاصل رہا۔ اور مولانا کے ذہن رسا کے متعلق مجھ کو عملاً ہر قسم کے معاملہ میں اس کا اندازہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ کہ وہ کس طرح معاملہ کی روح اور اس کی سیاست کو سمجھ جاتے تھے۔ اور اگر سیاسی اور آئینی معاملہ کے متعلق یہ کہوں کہ مولانا مرحوم کی شخصیت باوجود اس کے کہ موجودہ سیاسی لٹریچر کی زبان سے وہ ناآشنا تھے۔ اور آئین ہند کے دفاتر واسفار کے مطالعہ سے وہ بالکل دور تھے وہ اس قدر قریب سے اس کو دیکھتے تھے، کہ اس کے جوار کا رہنے والا ششدر ہو جاتا تھا۔ تو میری یہ شہادت، قیاس و تخمین نہیں ہوگی۔ بلکہ عملی تجربہ ہوگا، جس کی بنیاد واقعات پر ہوگی۔ اور ایسے واقعات پر ہوگی، جس کے دامن میں میری سعی بھی تھی اور اس کے انصرام میں میری ناچیز جدوجہد کو دخل بھی تھا۔

پھر سب سے بڑی بات یہ کہ مولانا مرحوم صرف خیالی دنیا کے بادشاہ اور ایسے اسکیم گر نہیں تھے۔ جو بہتر سے بہتر منطقی اسکیم تو تیار کر سکتا ہے۔ اور بہتر سے بہتر خاکہ اور دستور تو وضع کر سکتا ہے۔ مگر اس کے لیے راہ نہیں پیدا کر سکتا ہے۔ اور اس کو عملاً برت کر اس کو عملی تمثال میں کھڑا نہیں کر سکتا ہے۔ بلکہ جامعیت کے لحاظ سے وہ ایسے موڑ پر تھے، جو علم و عمل کے کارواں کا نقطۂ اتصال تھا۔ مولانا مرحوم جس چیز کو ڈوب کر فکر کی نگاہ سے ایک مرتبہ دیکھ

لیتے تھے۔ تو ساتھ ہی ساتھ وہ اس کے عملی مشکلات پر بھی عبور پا لیتے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ پہلے ہی سے اس کو سوچے ہوئے تیار بیٹھے تھے۔ اور اس کے سارے پیچ و خم، ان کی نگاہوں کے سامنے ہیں۔

قومی اور مذہبی مقدمات کے سلسلہ میں "امارت شرعیہ" کے بیسوں ایسے مقدمات فوجداری اور عدالتی ہیں جس میں مولانا مرحوم کے حکم سے مجھ کو اپنی خدمات پیش کرنے کا موقع ملتا رہا ہے۔ مجھ کو اس کا تجربہ رہا ہے کہ مولانا مرحوم جس طرح دین کے معاملہ میں، دین کے مسائل میں، دینی مشکلات کے حل میں، خصوصی امتیاز کا خصوصی درجہ رکھتے تھے۔ وہ دنیا کے معاملات کے سمجھنے، اور ان کی پیچیدگی کے حل میں، اور ان کے لیے راہ نکالنے میں بھی خصوصی درک اور عبور رکھتے تھے۔

ان خصوصیات کے ساتھ مولانا مرحوم کی بے نفسی اور تحمل، جماعتی اور قومی، دینی اور مذہبی مفاد کے لیے ہرجا اور بیجا اعتراض کو سننا، اور درگزر کرنا، ایسی خصوصیت تھی کہ اس کی مثال مشکل سے ملے گی، ایسے واقعات ہماری آنکھوں نے دیکھے ہیں۔ اور ایسے دل آزار، اور بے محل الزامات میرے کانوں نے سنے ہیں، جس کا محض جماعتی مفاد کے لیے تحمل کر لینا نہیں بلکہ اس سے درگزر کر لینا اور محض درگزر کر لینا نہیں بلکہ اس طرح سننا کہ گویا سنا ہی نہیں۔ اور دل پر اس کا کوئی اثر ہی نہیں۔ حیرت ہوتی تھی جب وہی شخص دوسرے قومی کام کو لے کر مولانا مرحوم کے پاس آتا تھا تو مولانا مرحوم اس سے اس طرح پورے تپاک اور اخلاص دلی کے ساتھ ملتے تھے۔ اور اس کی باتوں کو سنتے تھے۔ اور اس کے کام کو پوری دردمندی کے ساتھ انجام دیتے تھے کہ گویا آج

کے پہلے دنوں میں اس سے کوئی ناگوار بات ظہور میں آئی ہی نہیں ہے۔ نہ اس کا اس سے کوئی ذکر کرتے تھے۔ نہ اس کے کام میں اس کا کوئی اثر پڑتا تھا، مولانا مرحوم کے ہر کام کا اصول یہ تھا کہ اس کے پہلے جو کچھ کیا تھا وہ بھی اللہ کے لیے تھا۔ اور آج بھی جو کچھ کر رہے ہیں وہ بھی اللہ کے لیے ہے۔ درمیانی وسائط کی ذاتیات ان کی نگاہ میں کبھی نہیں رہتی تھی۔

ان کے سامنے اشخاص نہیں رہتے تھے بلکہ ان کے اعمال رہتے تھے۔ کسی کی خصوصی ذات کو اُن کی فکر و توجہ کی دنیا میں گزر نہیں تھی۔ اور کسی درجہ میں بھی وہ قابل اعتنا نہ تھی۔ لیکن اعمال اور انقلاب کی ہر کڑی پر ان کی کڑی نگاہ رہتی تھی۔ اور کبھی ایسے اعمال کو درگزر کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ جو مذہبی احکام، یا مذہبی شعائر سے ٹکراتے ہوں اور اس کے منافی ہوں۔ ہم پوری بصیرت کے ساتھ یہ جانتے ہیں کہ مولانا مرحوم نے سیاست میں حصّہ لیا، تو وہ بھی مذہب کے لیے۔ الیکشن میں حصّہ لیا، تو وہ بھی مذہب کے لیے۔ کانسل اور اسمبلی کے مباحثات میں حصّہ لیا تو وہ بھی مذہب کے لیے۔ اور یہ سب ایسی باتیں ہیں جو انڈیپنڈنٹ پارٹی کے منشور اور اس کے خطبۂ استقبالیہ وغیرہ کے واقف کار پر روزِ روشن سے بھی زیادہ واضح ہیں۔ ان کی ہر حرکت وعمل، ان کی ہر فکر و تامل کا مرکزی نقطہ مذہب رہتا تھا۔ وہ جب کسی مجلس کے دستور واصول یا تجویز وبیان یا درمیانی وسائط اور پروگرام پر گفتگو کرتے، یا رائے زنی فرماتے۔ تو ان کے سامنے اسلامی اُصول رہتے تھے، اسلامی احکام رہتے تھے، اسلامی قوانین رہتے تھے، اسلامی مفاد رہتے تھے، مسلمانوں کی فلاح وبہتری رہتی تھی۔ چاہے وہ مجلس کانگریس ہو، یا مسلم لیگ ہو، یا کوئی اور جماعت

ہو، ان کے سامنے پارٹی بازی کی گندگی کبھی نہیں رہتی تھی۔ وہ پارٹی بازی کے ماتحت کسی مسئلہ کو نہ سوچتے تھے، نہ سوچنا چاہتے تھے، نہ پارٹی بازی کی اس ذہنیت کو وہ درست سمجھتے تھے، بلکہ وہ پارٹی ہی کو اسلامی اُصول واحکام کے ماتحت سوچتے تھے۔ جو اسلامی مفاد کے مطابق، اسلامی مفاد کے ہم آہنگ ہوتی تھی، اس کی ہم آہنگی میں ان کو کبھی باک نہیں ہوتا تھا۔ اور جو مجلسیں اپنی پارٹی اصول پر مجبور ہو کر ہر طرح کی غلط اور صحیح چیزوں کو اختیار کرتی تھیں۔ تو مولانا مرحوم اپنے نقطۂ نظر کی بنا پر صاف لفظوں میں غلط کو غلط کہہ دیتے تھے، اور صحیح کو صحیح فرما دیتے۔

مولانا مرحوم کی عملی زندگی کا یہ وہ معیار ہے۔ جس پر ان کی زندگی کے تمام کارنامے مبنی ہیں۔ اور جو اُصولاً اپنے اندر یکسانیت رکھتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کی نگاہ مولانا مرحوم کی عملی زندگی کے اس بنیادی اُصول پر نہیں ہے اُن کو تخالف اور تضاد نظر آئے گا۔

مولانا مرحوم کی زندگی اتنی خوبیوں کی مالک تھی کہ اُن کا ایک مختصر مضمون میں لانا ناممکن ہے۔ نہ میرے ایسے پریشان عمل انسان کے لیے ان کا جمع کرنا ممکن ہے۔ مولانا مرحوم "بہار" کے قومی، جماعتی، مذہبی، دینی گلزار کے بَہار تھے۔ آہ کہ آج ایک مولانا مرحوم کے فقدان کے باعث سب پر اوس برس رہی ہے، اور خزاں کی مردنی چھائی ہوئی ہے۔ اللہ مولانا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے مشن کے لیے غیب سے تائید فرمائے۔ آمین[۹۰]!

---

[۹۰] حیات سجاد، ص ۸۶

مولانا سجادؒ کی مذہبی اور سیاسی زندگی

ایک بے مثال شخصیت

مولانا شاہ سیّد حسن آرزو صاحب[91]

اسلامی تاریخ کا ابتدائی مدوّن ابن خلدون (خدا اسے معاف کرے) علمائے اسلام کی نسبت رائے قائم کرنے میں جلدی کر گیا، ورنہ اگر آج کے دور قحط الرجال میں اور بالخصوص ایک غلام ملک میں شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ، امیر الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد، مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ، شیخ الحدیث مولانا حسین احمد صاحب مدنی، نائب امیر شریعت ابوالمحاسن مولانا سجادؒ جیسی شخصیتیں پیدا ہوسکتی ہیں، تو کون کہہ سکتا ہے کہ تیسری اور چوتھی صدیوں میں ایسے باعمل سیاست داں علماء کی کمی رہی ہوگی، جن کا "یابون عن السیاسة" کہہ کر ابن خلدون نے ماتم کیا ہے۔ خدا کروڑوں رحمتیں نازل کرے مولانا سجادؒ کی روح پر۔

جن کی زندگی کے درمیانی دور کا مجھے ذاتی علم اور پچیس سالہ مشاہدہ

[91] پٹنہ میں خدا بخش لائبریری سے متصل گورنمنٹ اردو لائبریری میں اسسٹنٹ لائبریرین تھے، جیسا کہ حیات سجاد میں لکھا ہے، حضرت صاحب سوانح کے ساتھ ان کے کاموں میں شریک رہے، جس کے اشارات اس مضمون میں ملیں گے۔ مزید حالات کا علم نہیں۔

ہوتا رہا۔ مولانا سے میری ملاقات اس وقت کی ہے جب کہ خلافتِ اسلامیہ کے پرخچے اُڑا دینے کا پروگرام مرتب ہو چکا تھا، اور لوزان کانفرنس کے فیصلہ کا خطرہ مسلمانانِ ہند کے سامنے جلد ہی آنے والا تھا، اندرونِ ہند میں رولٹ ایکٹ جیسا سیاہ قانون فوراً ہی جاری ہونے والا تھا، مسلمانان ہند الگ پریشان اور مضطرب اور مذہبی سیاست کے ہیجان میں مبتلا تھے اور ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت کانگریس تقریباً نصف صدی کی بے عمل زندگیوں سے گھبرا کر کروٹ بدلنا چاہتی تھی۔

انہیں مقاصد کے پیشِ نظر حکیم الامت مولانا عبد الباری فرنگی محلی مسلمانانِ ہند کے مخصوص اور بااثر صاحبِ فہم افراد کا ایک مذہبی اجتماع مسلم کانفرنس کے نام پر لکھنؤ میں کرنا چاہتے تھے، جس کی صدارت آنریبل بھور گری کو کرنی تھی۔ خوش قسمتی سے مجھے لکھنؤ کے اس سفر میں مولانا سجاد مرحوم کی معیت کا شرف حاصل ہوا۔ میں نے پہلے ہی ملاقات میں اس دبلے پتلے نحیف وکمزور "عالمِ دین" سے مل کر یہ محسوس کیا کہ اس کے سینے کے اندر گوشت کا لوتھڑا نہیں، دہکتی آگ کا شعلہ ہے۔ اس کی نظر کی گہرائی، اس کے دماغ کی بلندی اور فہم وفراست، ارتقائے ملک کے لیے صاف اور سیدھا نظام عمل اپنے اندر مخفی رکھے ہوئے ہے۔ لکھنؤ کی وہ صحبت یقینی ایک تاریخی صحبت تھی۔

مخصوص مسلمانوں کا ایک بڑا مجمع تھا، اور کم از کم میری زندگی کا ایک تاریخی دن تھا۔ مجلس مضامین کی مخصوص صحبت میں پتہ چلا کہ مولانا سجاد کی ذہنی کاوشیں کیا ہیں اور سیاسی معلومات میں وہ کس درجہ ماہر ہیں۔ لکھنؤ کی اسی صحبت میں سارے ہندوستان میں خلافت کمیٹیوں کے قیام کا مسئلہ طے کیا گیا۔

اور لوگ مذہبی جوش وخروش کے ساتھ اپنے اپنے گھروں کو لوٹے، اپنے وطن لوٹنے کے بعد میرا دعویٰ[92] تھا کہ سب سے پھلواری خلافت کمیٹی قائم ہوئی اور مولانا فرماتے تھے کہ گیا خلافت کمیٹی قائم ہوئی، اس پر میرا اور مولانا کا برابر جھگڑا رہا، ان خلافت کمیٹیوں نے مسلمانوں میں صحیح احساس اور ان کی باہمی تنظیم میں کم از کم جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ مسلمانان بہار ہی سے نہیں، مسلمانان عالم سے مخفی نہیں، لیکن مولانا سجاد اسی پر بس نہیں کرسکتے تھے وہ جو چیز ڈھونڈھتے تھے وہ خلافت کمیٹیوں میں بھی نہیں ملتی تھی۔ وہ جس منزل کے متجسس تھے، وہاں تک پہنچنے میں سبھی کے پاؤں تھکتے تھے، لیکن "سجاد" اپنے مقصد میں تھکنا نہیں جانتے تھے وہ اپنی آخری ساعت تک سعی پیہم سے باز نہ آئے۔ سختیاں جھیلیں، مصیبتیں برداشت کیں، جھڑکیاں سہیں، غیروں سے نہیں اپنوں سے گالیاں کھائیں۔ دشنام سنے، مگر ارادہ اور مضبوط ارادہ کا یہ ہمالیہ ایک قدم بھی اپنے مقصد ومرکز سے ہٹنے کو تیار نہیں ہوا۔ ہندوستان کی آزادی جان سے زیادہ عزیز اور اس کے لیے سب کچھ نچھاور کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ کانگریس سے ملے اور ہر اس جماعت سے موالات کرنے کو بڑھے جس نے ہندوستان کی آزادی کو مطمح نظر تسلیم کیا، لیکن اسی کے ساتھ وہ مسلمانان ہند کی ایک مخصوص زندگی کے طالب تھے، وہ مسلمانوں کو صورتاً اور سیرتاً صاف اور سچا مسلمان دیکھنا چاہتے تھے۔

---

[92] واقعہ کی صحیح تصویر یہ ہے کہ سب سے پہلے خلافت کمیٹی بمبئ قائم ہوئی جس میں حضرت مولانا عبدالباری صاحب (فرنگی محل لکھنؤ) اور حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب کا ہاتھ تھا، مولانا محمد سجاد صاحب جب ممبئ سے واپس ہوئے تو گیا میں خلافت کمیٹی قائم کی اس کے بعد مولانا علیہ الرحمۃ پھلواری شریف تشریف لائے اور یہاں خلافت کمیٹی قائم کی گئی (عبدالصمد رحمانی)

سیاسی ہنگاموں کے ساتھ ساتھ وہ مذہبی اور شرعی زندگیوں کو ایک بار پھر لوٹالانا چاہتے تھے۔ وہ کسی ایسے مسئلہ میں کسی کی رعایت نہیں کرسکتے تھے، جس کے اندر ذراسا بھی مسلم مفاد کو ٹھیس لگ جانے کا شبہہ بھی پیدا ہو۔ اگر وہ ایک طرف خود اپنی ایسی جماعت سے جنگ کرنے پر تیار رہتے تھے جس کے وجود سے ہندوستان کی آزادی کو خطرہ پیدا ہوسکتا تھا، تو ٹھیک اسی ساعت وہ کانگریس جیسی سیاسی اور ٹھوس آزادی کی طالب جماعت سے جنگ چھیڑ دیتے جہاں انھیں یہ محسوس ہوتا کہ اس کے عمل وحرکت سے مسلمان یا مذہبی مفاد کو نقصان پہنچنے کا خطرہ رونما ہورہاہے یا ہونے والا ہے۔

مجھے مولانا سے مدتوں بعض امور، بعض مسائل میں سخت ترین اختلاف رہا، اور باوجود متعدد گفتگوؤں کے مولانا کی منطق میری سمجھ میں نہ آئی، لیکن ان کی نیک نیتی اور اپنے سے بہت زیادہ قابل اعتماد سیاست دانی پر بھروسہ کرتے ہوئے مولانا کے اس اجتہاد پر وقت کا انتظار کرتا رہا۔ مجھے اپنی شکست اور نافہمی کا اقرار ہے کہ مولانا جیتے اور میں ہارا۔ میں اوپر عرض کرچکا ہوں کہ مولانا آزادی کے ساتھ ساتھ مسلمانانِ ہند کو مذہبی مسلمان دیکھنا چاہتے تھے، اور بیسیوں قضیوں میں غیر مسلم فیصلوں کو ناجائز بتاتے تھے، اور شرعی اسلامی زندگی کے لیے وہ لازمی اور واجبی جانتے تھے، کہ مسلمانانِ ہند کی زندگی شرعی طریقہ پر منظم زندگی ہو۔ اسی لیے انھوں نے علمائے ہند کے سامنے امیر الہند کی ایک شرعی تجویز رکھی جو بالاتفاق علماء کی جماعت میں قبول کی گئی مگر حالات کی ناسازگاری سے اس پر عمل نہ ہوسکا، لیکن مولانا سجاد کی نظر میں یہ حقیقت تھی کہ اگر مرکز یا دوسرے صوبوں پر انھیں اختیار نہیں تو کم از کم اپنے ہی صوبہ میں

بیج تو ڈال ہی دیں اور سارے ہندوستان کی نہ سہی بہار کے مسلمانوں کی شرعی زندگی کا سنگ بنیاد تو پڑ ہی جائے۔

آپ جانتے ہیں کہ ۱۳۳۹ھ میں مولانا سجاد کی سعی پیہم اور جان توڑ کوششوں نے امیر الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے زیر سیادت بہار میں امیر شریعت کا انتخاب کرا ہی چھوڑا۔ مجلس استقبالیہ کے صدر مولانا شاہ حبیب الحق صاحب سجادہ نشیں خانقاہ عمادیہ منگل تالاب پٹنہ سیٹی تھے۔ بہار کے اس اسلامی تاریخی اجتماع نے حضرت مولانا شاہ محمد بدرالدین صاحب کو متفقہ طور پر اپنا امیر تسلیم کیا اور مولانا سجاد نائب امیر۔ مجھے مولانا سجاد کی معیت میں اس خدمت کو انجام دینے کا بھی شرف حاصل ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ مولانا مرحوم کو اس وقت کن کن دشواریوں کا سامنا پڑا تھا۔ مگر ہمت و عمل کی اس مشین نے ساری دشواریوں سے مقابلہ کرتے ہوئے آگے چلو! آگے بڑھو! کا نعرہ لگایا، اور ہماری ہمتوں کو بلند اور کامیابی کو سامنے لا کھڑا کر دیا۔ میں اور میرے دوسرے رفیق کار منھ تکتے ہی رہے اور مولانا کے سر کامیابی کا سہرا بندھ ہی گیا۔

خلافت کمیٹیوں کا اصلی کام بہادران ترک اور سمرنا کے مظلوم مسلمانوں کی مالی امداد ہی تھی۔ مولانا نے صوبہ اور مرکزی خلافت کمیٹی کی خدمت اس وقت تک جاری رکھی، جب تک انھیں دوسرے ذمہ دار کارکنوں کی طرح پوری مایوسی نہ ہو گئی، افسوس ہے کہ مرحوم سیٹھ چھوٹانی کے ساتھ ساتھ خود مرکزی خلافت کمیٹی کا جو حشر ہوا، اس نے کم از کم دوسری خلافت کمیٹی کی کمر توڑ دی۔ اور صدیوں بعد ہندوستان میں جو مسلم تنظیم ہو سکی تھی بد قسمتی سے اس کا شیرازہ ہی پھر ایسا بکھرا کہ آج تک سنبھل نہ سکا۔ اب مولانا مرحوم صرف ملکی

آزادی اور مسلمانانِ ہند کی شرعی زندگی کی جانب متوجہ ہو گئے، اور امارتِ بہار کا جو بنیادی خیال تھا، اُسے عملی جامہ دینے کی تیاری شروع کر دی۔ مولانا کو امارت کے اصول کو پھیلانے، مسلمانانِ بہار کو پوری طاقت کے ساتھ متوجہ کرنے میں طرح طرح کی مخالفت اور دشواریوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔

مولانا کا صاف اور حقیقی نظریہ یہ تھا کہ مذہب اور سیاست مسلمانوں کے دونوں معاملات میں علمائے اسلام کو عموماً اور امارتِ بہار کو خصوصاً نہ صرف مداخلت کرنے کا حق ہے، بلکہ اس کی نگرانی کا فرض انھیں پر عائد ہوتا ہے۔

مولانا کے اس نظریہ نے خصوصی حلقہ میں ہلچل ڈال دی، اور انھوں نے اپنے ذاتی مفاد کو انتہائی خطرہ میں دیکھتے ہوئے نہ صرف مولانا بلکہ نفسِ امارت کی ہی مخالفت شروع کر دی، اور کچھ اس غیر معمولی قوت سے مخالفت شروع کی کہ بظاہر مولانا کو ان کا مقابلہ دشوار نظر آنے لگا۔ بد قسمتی سے مخالفین کے اس گروہ میں دانستہ یا نادانستہ کچھ علماء بھی داخل ہو گئے، لیکن مولانا نے اس کی ذرّہ برابر پروا کیے بغیر جس ہمت مردانہ سے مخالفوں کا مقابلہ کیا، وہ در حقیقت امارتِ بہار کی ایک سنہری تاریخ ہے۔

مخالفوں نے امیر بے طاقت کا مسئلہ اپنی دانست میں بہت ہی زور وشور سے اُٹھایا تھا، اور وہ سمجھتے تھے کہ اس پردہ میں مولانا اور مولانا کی ساری اسکیم ہی کو مار لیں گے، اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا انتشار اور ان کی پریشان حالی، مخالفوں کی کامیابی کا سبب ہو سکتی تھی۔ حالاں کہ یہ کوئی بھی بڑا اور اہم مسئلہ نہ تھا مگر مخالف ہماری پراگندگی اور انتشار کے پیش نظر اسی رائی کو پہاڑ بنا رہے تھے۔ یقینی اس دور میں امیر بے طاقت ہی کی ضرورت تھی۔ ظاہر ہے کہ بہار کی امارت نہ تو

جہاد کی مدعی تھی، نہ سلطنت وخلافت کی۔ وہ مسلمانوں میں مذہبی تنظیم پیدا
کر کے صرف سمع وطاعت کی عادت ڈال دینا چاہتی تھی، اور یہ بالکل حقیقت ہے
کہ اگر قوم وجماعت منظم طور پر صرف سمع وطاعت کی عادی ہو جائے، تو نہ اسے
تلوار کی ضرورت ہو، نہ تیر کی کہ اسی کا دوسرا نام قوت وطاقت ہے، جس کا
تاریخی مظاہرہ بدر وحنین اور ابتدائے اسلام کے ہر ابتدائی دفاعی جنگوں میں
ہوتا رہا تھا۔ ہاں خصومات باہمی میں دارالقضا کے فیصلوں کی پابندی جزولازم چیز
تھی، ممکن ہے یہی مخالفوں کی خود ساختہ منطق چند منٹ مقابلہ میں آسکتی تھی۔
لیکن اس کا صاف اور سیدھا جواب یہی ہو سکتا تھا کہ اگر تم امیر کو اپنا امیر تسلیم
کرتے ہو اور اسی سمع وطاعت کے اصول پر اپنا دعویٰ دارالقضا میں رجوع کرتے
ہو تو انفصال قضیہ کے بعد نفاذ فیصلہ میں کوئی بھی دشواری کا امکانی پہلو نظر نہیں
آسکتا۔ اطاعت امیر کی صحیح تعریف تو یہی ہو سکتی تھی کہ اس کے شرعی حکم پر
کوئی روگردانی نہ کی جائے۔

جیسا میں اوپر عرض کر چکا ہوں، مولانا مسلمانوں کے مذہب وسیاست
کی باگ علماء اور بالخصوص امارت کے مضبوط ہاتھوں میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اس
کی پہل اسمبلی اور کانسل کی گزشتہ انتخابات میں انھوں نے کر بھی دی۔ گو
امارت کھلے کھلے نہ تو سامنے آئی اور نہ انتخاب کو اپنے ہاتھ میں لیا، مگر یہ کام جس
جماعت کے حوالہ کیا گیا، وہ درحقیقت امارتِ بہار کی ایک اہم بااعتماد اور ذمہ دار
جماعت تھی، مولانا سجاد اس کے اصلی روح، سردار اور مشیر اعلیٰ تھے۔ مجھے
خوب یاد ہے کہ اس ہمت مردانہ کے جرم میں مولانا مخالفوں اور دشمنوں کے
ہجوم میں گھرے ہوئے تھے اور یقینی وہ وقت بہت ہی نازک تھا کہ غیروں کے

بجائے اس اصولی جنگ میں انھیں اپنوں سے مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا، لیکن مفاد
اسلامی کا یہ شیدائی اپنوں سے بھی بے نیاز وبے پرواہ ہو کر اصولی جنگ چھیڑ چکا تھا،
اور کامیابی اس کا قدم لینے کے لیے بے چین ومضطرب وقت کا انتظار کر رہی
تھی۔ قدرت نے بھی اس کی آبرو رکھی، اور دنیا نے دیکھ لیا کہ بہار اسمبلی میں
کانگریس کی مجموعی اکثریت کے بعد امارت اور مولانا سجاد کی ہی پارٹی غالب
تھی۔

مولانا سجاد وقت کو ضائع کرنا بدترین گناہ جانتے تھے، ان کا کوئی منٹ
بھی کام سے خالی نہیں جاتا۔ کچھ نہیں تو دوسروں کے ساتھ بیٹھے ہوئے اخبار کے
بنڈل ہی باندھ رہے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں، وہ راتوں کی نیند میں بھی صبح کے
کاموں کا پروگرام ہی مرتب کرتے ہوں گے۔ مولانا کے سیاسی تبحر کا آپ کو
اسی سے اندازہ ہو جائے گا کہ جب مولانا شفیع داؤدی اور ہمارے مولانا سجاد کے
درمیان خاص حالات کی بنا پر اختلاف ہوا اور اختلاف نے جنگ کی صورت پیدا
کر دی، تو پٹنہ کے کچھ مخلص نے باہمی مصالحت کی ایک اچھی صورت نکالنی
چاہی، اور دونوں کو ایک جگہ دعوت دی گئی، اور بات یہ طے پائی، کہ دونوں باہمی
اصولی گفتگو کر کے ایک متفقہ راہ مسلمانوں کے لیے نکال لیں۔ مجمع بہت ہی اچھا
خاصہ، سمجھدار اور تعلیم یافتوں کا تھا جس کے روح رواں ڈاکٹر سیّد عبدالحفیظ
فردوسی تھے۔ ان کے درمیان ابتدائی گفتگو شروع ہوئی۔ جس کا سلسلہ اتنا دراز
ہوا کہ ساری رات ختم ہو گئی، اور صبح کی نماز کے بعد مجمع منتشر ہو سکا۔ پھر بھی
بات ناتمام رہی۔ مولانا شفیع داؤدی کا پروگرام لاہور جانے کا تھا۔ اسی سلسلہ میں
ممالک عالم کے سیاسی اور نظامی دستورات پر گفتگو نکل پڑی۔ مولانا شفیع داؤدی

بول رہے تھے کہ مولانا نے ٹوکا اور اس کے بعد جو انھوں نے بیان کرنا شروع کیا کہ انگلینڈ کا دستور حکومت یہ ہے، فرانس کا یہ ہے، جرمنی کا یہ ہے، اٹلی کا یہ ہے، روس کا یہ ہے، امریکہ کا یہ ہے، آئرلینڈ کا یہ ہے، ٹرکی و ایران کا یہ ہے، تو سارا مجمع حیرت واستعجاب سے مولانا کو تک رہا تھا، اور وہ نہایت ہی جوش کے ساتھ کانسٹی ٹیوشن بیان کرتے چلے جارہے تھے۔ بالآخر مولانا شفیع داؤدی کو یہ تسلیم ہی کرنا پڑا کہ مولانا نہ صرف مذہبی عالم متبحر ہیں۔ بلکہ دنیا کی سیاست اور اس کے دستور ونظام حکومت کے بھی عالم متبحر ہیں۔ مولانا ہر اختلاف میں اصولی اختلاف کرنے کے عادی تھے، اور اختلاف کو اختلاف ہی کی حد تک قائم رکھنا جانتے تھے۔ نہرو رپورٹ جب سامنے آئی تو مولانا نے اس سے اصولی اختلاف شروع کیا۔ اور آخری وقت تک پوری قوت کے ساتھ اختلاف کرتے رہے۔ اسی طرح نئی اصلاحات ملکی سے انھوں نے پوری طاقت کے ساتھ اختلاف کیا۔ وہ جدید نظام حکومت میں بالخصوص مسلم مفاد کا سخت ترین گھاٹا اور نقصان سمجھتے تھے، اور بارہا فرماتے رہے کہ اس سے تو بعض حیثیت سے نہرو رپورٹ ہی بہتر چیز تھی۔ واردھا اسکیم میں چوں کہ مذہبی تعلیم سے بے اعتنائی کا کافی پہلو نظر آتا تھا۔ مولانا نے شروع ہی میں اس کی مخالفت کی۔

اسی طرح سارادا ایکٹ جب سامنے آئی تو چوں کہ اس کا تعلق ٹھیک ہندوؤں کی طرح مسلمانوں سے بھی تھا، اسی لیے اس کی پوری کوشش شروع کردی کہ مسلمان بہرحال اس قانون سے الگ کردیئے جائیں۔ کیوں کہ یہ قانون شرعی قانون سے آگے چل کر یقینی متصادم ہوگا۔ میں اوپر بھی عرض کرچکا ہوں کہ مولانا آزادئ ہند کی حیثیت سے کانگریس کے گرم جوشی سے مدد

ومعاون اور شریک کار تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مفاد اسلامی کے خطرہ کے موقع پر وہ کانگریس کے سخت ترین دشمن ومخالف بھی تھے۔ ہمارے صوبہ کی گزشتہ قومی حکومت سے اس لیے جنگ کرگئے کہ وہ جبریہ تعلیم کے اسکیم میں خصوصیت کے ساتھ مذہبی تعلیم کو کوئی جگہ دینا نہیں چاہتی تھی، لیکن اس شدید مخالفت کے باوجود ذمہ داران کانگریس مولانا کو ایک بے غرض محب قوم ووطن سمجھتے ہوئے انتہائی عزت واحترام سے پیش آتے رہے۔

مولانا صبر وتحمل کے بھی ایک پہاڑ تھے۔ میں نے تقریباً پچیس سال کی مدت میں بجز ایک موقع کے کبھی کسی سخت گو کا جواب سختی کے ساتھ دیتے نہ سنا۔ شریر اخبار نویس یا دوسرے خود غرضوں نے مولانا کو گندی اور غلیظ گالیاں دیں۔ حالات وواقعات سے ناآشنا لوگوں نے مولانا پر اعتراض کے تیر برسائے۔ بدمعاشوں نے اتہامات تراشے، ہجوئیں لکھیں۔ لیکن مولانا خموش، سب دیکھتے اور سنتے رہے۔ مولانا کے عقیدت مندوں میں کچھ صاحب قلم بھی تھے۔ مگر مولانا نے انھیں سختی کے ساتھ روک رکھا تھا۔

بالعموم سیاسیین اور مخلص خادمان وطن کی خانگی زندگیاں تنگی وعسرت کی زندگی ہوا کرتی ہے۔ مولانا کو ابتدا ہی سے اس سے واسطہ پڑا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس سلسلہ میں مولانا کی زندگی بے حد صبر آزما تھی۔ اس کے باوجود مجھے ذاتی علم ہے کہ وہ دوسروں کی بھوک کو برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ اپنے لیے وہ انتہائی غیور تھے لیکن دوسروں کے لیے وہ قرض لینا بھی معیوب نہیں جانتے تھے۔

لکھنے اور بیان کرنے کی لاکھوں باتیں ہیں مگر کہاں تک لکھوں۔ مولانا کا بڑا لڑکا خدا اُسے جنت نصیب کرے۔ دیوبند کا تعلیم یافتہ اور فارغ التحصیل تھا۔ ۱۹۳۰ء کے سیاسی ہنگامے، سول نافرمانی کے سلسلہ میں اُسے بھی ۶/ماہ کی جیل ہوگئی۔ مدت تمام کرنے کے بعد جب مکان آیا تو اس پر کچھ دنوں بعد ہی نمونیا کا حملہ پڑا، اور سخت حملہ۔ مولانا تبلیغی ضرورتوں کے سلسلہ میں چمپارن کا دورہ فرما رہے تھے، یہاں سے تار پر تار گیا لیکن مولانا اس وقت مکان پہنچے، گویا لڑکا مَر چکا تھا۔ مولانا کے آنے کے دو تین بعد لڑکے کا انتقال ہوگیا۔ مولانا کے پاس کچھ زمین ایسی بھی تھی جس کا لگان دوسرے زمین دار کو دینا پڑتا تھا۔ اتفاقاً زمین داروں نے ڈگری کرا کر بعض زمین نیلام کرانی چاہی۔ لوگوں نے مولانا کو اطلاع دی۔ مولانا نے ہنس کر فرمایا، جانے بھی دو۔ اس کا بھی تعلق لگا ہی رہتا ہے، وہ بھی ختم ہو جائے تو اللہ کے بندوں کی خدمتوں میں پوری یکسوئی حاصل ہو۔ سچ ہے،

ع جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

اللہ اکبر مولانا اپنے ایمان وصداقت کی راہ میں جتنا جھنجھوڑے گئے اور آزمائش میں ڈالے گئے اور بار بار ڈالے گئے، اتنے ہی کھرے ثابت ہوئے جس کی مثال اس دور میں کم کیا مل ہی نہیں سکتی ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ اِذَا اَصَابَتْهُمْ مُصِيْبَةٌ، قَالُوْا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ، اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ، وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ۔[۹۳]

---

[۹۳] حیات سجاد، ص ۹۱

تنظیم شرعی کا مفکر اول

قاضی سید احمد حسین صاحب[۹۴]

---

[۹۴] نرہٹ گیا (حال ضلع نوادہ)، سابق ایم ایل سی۔ محاسن سجاد میں صرف اسی قدر لکھا ہے لیکن قاضی صاحب کی شخصیت بہت مشہور ہے اور ان کے کارنامے معروف ہیں، گرچہ نسل نو ان سے بہت کم واقف ہے، وہ جنگ آزادی کے ممتاز مجاہدوں میں تھے، کونی بر اور نرہٹ ضلع نوادہ (سابق ضلع گیا) ان کا وطن اور سملہ ضلع اورنگ آباد (سابق ضلع گیا) ان کی نانہال ہے، ۱۸۸۸ء میں اپنے وطن کے ایک خوش حال سادات کے گھرانے میں پیدا ہوئے، خاندان میں مسلم عہد حکومت میں عہدۂ قضا مدت تک رہا تھا اسی لئے خاندان کے لوگ نام کے ساتھ قاضی لکھتے تھے، زمینداری کے سبب معاش سے پوری طرح یکسو تھے لیکن والد کے انتقال اور دیگر ضروریات کی بنا پر روایتی تعلیم ادھوری رہ گئی، لیکن خود سے علوم اسلامیہ کا گہرا مطالعہ کیا، اور آغاز ہی سے مختلف تحریکوں اور سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے، مولانا ابوالکلام کی الہلال تحریک کا ان پر بہت گہرا اثر تھا، نیز مولانا شوکت علی کے ساتھ بمبئی میں خلافت کمیٹی کے دفتر میں بھی رہے، بنگال کی بعض تحریکات میں بھی پیش پیش رہے، ان کی سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کا آغاز ۱۹۰۶ء سے ہوا اور ۲۹/ جولائی ۱۹۶۱ء کو گیا میں انتقال ہوا، اس طویل عرصہ میں وہ ہر سطح پر ملک وملت اور دین کی خدمت کرتے رہے، امارت شرعیہ، خلافت کمیٹی، جمعیۃ علماء، کانگریس سب ان کی خدمت سے مستفید ہوئے، امارت شرعیہ میں رہ کر کچھ دن اس کی خدمت بھی کی، بالخصوص شعبۂ تبلیغ کو منظم کیا، اخیر میں تبلیغی جماعت سے وابستہ ہوگئے تھے، اور گیا میں اسی کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا، آزادی کے بعد دو مرتبہ راجیہ سبھا کے ممبر بھی رہے، حضرت مولانا سجاد صاحب کے دست راست اور امارت شرعیہ کے قیام میں ثانی اثنین تھے، سماجی وملی کاموں کے ساتھ زہد وعبادت کا ذوق بھی بہت اعلی تھا اور تقویٰ وطہارت میں ممتاز تھے۔ حالات

مولاناؒ سے میرا تعارف مدرسہ انوار العلوم گیا کے جلسوں کے سلسلہ میں ہوا تھا،

ابتدا ہی سے مولانا کی اسپرٹ مجاہدانہ تھی، امارت شرعیہ کے قیام کا خیال تو مولانا مرحوم کو بہت پہلے سے تھا، لیکن حالات کی ناسازگاری نہ حرف مطلب کو زبان تک لانے کی اجازت دیتی تھی، نہ ماحول عمل کا متحمل تھا، پھر بھی مجاہدانہ جذبہ مولانا کو بے قرار رکھتا تھا، چنانچہ جہاد کی بیعت بعض خاص لوگوں سے مولانا نے قیام امارت سے پہلے لی تھی۔

وہ اس سلسلہ میں خفیہ انقلاب پسند جماعتوں کی بھی تائید کو جائز رکھتے تھے، جنگ عظیم کے زمانہ میں بنگال کی خفیہ سوسائیٹوں کے غبطہ میں مجھ کو خفیہ سوسائیٹی بنانے اور آتشیں اسلحہ کی فراہمی کا خیال پیدا ہوا۔ مولانا میرے اس خیال سے نہ صرف واقف تھے بلکہ معین ومشیر بھی تھے، چنانچہ مولانا کے ایک دوست نے جب ان کو بتلایا کہ وہ ریوالور بہم پہنچاسکتے ہیں تو مولانا نے مجھ کو ان سے ملادیا، ان صاحب نے مجھ سے ڈیڑھ سو روپیہ لیا، ریوالور کیا دیتے روپیہ بھی ہضم کر گئے، بہر حال اس سے مولانا کے ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ خفیہ سوسائٹی کے سلسلہ میں میرے خیالات ابھی عزیمت کی حد سے نکل کر عمل کی سرحد تک بھی نہ پہنچے تھے کہ تحریک خلافت شروع ہوگئی اور مولانا سجاد صاحب نے صوبہ بہار میں پہلی خلافت کمیٹی گیا میں قائم کی اور میں اس کا سکریٹری تھا، اور پہلی خلافت کانفرنس کے سلسلہ میں مجھ کو مولانا کے

کے لئے دیکھئے مولانا طیب عثمانی ندوی کی کتاب "شخصیات"، نیز "ٹوٹے ہوئے تارے" از شاہ محمد عثمانی۔

ساتھ خلافت کانفرنس میں شرکت کا موقع ملا، اور وہاں میں نے پہلی دفعہ گاندھی جی کو دیکھا اور ان کی سیدھی سادھی تقریر سنی، وہ تقریر تھی یا سحر کہ جس نے ہمارے خیال میں انقلاب پیدا کر دیا، میں نے محسوس کیا کہ انقلاب کے لئے یہ خفیہ سوسائٹی کی تحریک بجائے مفید ہونے کے مضر ہے۔

یہی زمانہ تھا کہ مولانا جمعیۃ العلماء کی تنظیم کر رہے تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد اپنی جماعت "حزب اللہ" بنانے کی کوشش کر رہے تھے، ابھی یہ جماعت بننے نہ پائی تھی کہ مولانا ابوالکلام رانچی میں نظر بند ہوگئے۔ مولانا آزاد سے ہمیں بھی عقیدت تھی، رانچی میں ان کے یہاں بھی آتا جاتا تھا، ایک دفعہ مولانا ابولمحاسن محمد سجاد صاحب سے مولانا ابوالکلام صاحب کے حزب اللہ کا تذکرہ آیا، تو مولانا سجاد صاحب نے فرمایا کہ شریعت میں تنظیم اسلامی کا اصول "امارت" ہے، اس بنیاد پر نظم کرنا بہتر ہے۔ اس گفتگو کا تذکرہ رانچی میں مولانا آزاد سے آیا، تذکرہ کرتے وقت ایسا محسوس ہوا کہ مولانا نفس مسئلہ تک پہنچ گئے، مشتاقانہ مولانا سجاد صاحب سے ملنے کی خواہش کی، رانچی جا کر مولانا سجاد صاحب مولانا آزاد صاحب سے ملے، اور ہندوستان میں امارت کے قیام سے مولانا آزاد نے اتفاق کر لیا اور مولانا سجاد صاحب نے کوشش شروع کی۔ مولانا کا خیال تھا کہ پہلے امیر الہند کا انتخاب کر لیا جائے، پھر صوبہ وار امارت شرعیہ کا قیام ہو، مولانا مرحوم نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کو اس امر پر راضی کر لیا تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد امیر الہند ہوں، میں اس وقت جیل میں تھا مگر جہاں تک یاد آتا ہے، جمعیۃ العلماء ہند دہلی کے دوسرے اجلاس میں مولانا سجاد صاحبؒ نے اس تجویز کو پیش کیا، مگر شیخ الہندؒ کی علالت کی وجہ سے

جب کہ وہ خطرناک حالت سے گذر رہے تھے، دوسرے اجلاس کے لئے اس کو ملتوی کر دیا گیا، صوبہ وار امارت پر بھی نجی صحبتوں میں بحث و گفتگو ہوئی، اس میں مضائقہ نہیں سمجھا گیا۔

مولانا مرحوم دہلی سے جب واپس ہوئے تو سب سے پہلے یہ کام کیا کہ صوبہ بہار میں امارت شرعیہ کے قیام کے لئے جدوجہد میں مصروف ہو گئے اور ۱۳۳۹ھ میں ایک عظیم الشان نمائندہ اجلاس زیر صدارت مولانا ابو الکلام صاحب آزاد جمعیۃ علماء بہار کا منعقد کیا اور صوبہ بہار کے ارباب حل و عقد کے اجتماع میں امارت شرعیہ کی بنیاد رکھی اور مولانا سید شاہ محمد بدر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو باتفاق رائے امیر منتخب کیا گیا۔

ہندوستان کی تنظیم کے ساتھ مولانا بیرون ہند کے مسلمانوں کی فلاح سے بھی کافی دلچسپی رکھتے تھے، خصوصاً سرحد کے آزاد علاقہ سے، میرے علم میں مولانا نے ایک دفعہ ایک شخص کو ایک معقول رقم صوبۂ سرحد کے مجاہدین تک پہنچانے کو دی تھی، میرا یقین ہے کہ صوبہ سرحد کے مجاہدین کے ساتھ مولانا کی دلچسپی مرتے دن تک قائم رہی۔

مولانا کی وفات سے تقریباً ایک سال پہلے میں نے ایک دفعہ بر سبیل تذکرہ مولانا سے کہا، اس صوبہ میں امارت شرعیہ قائم کر کے آپ نے اپنا وقت زندوں کے بجائے مردوں میں ضائع کیا، کاش کہ آپ صوبہ سرحد جا کر ایک چھوٹی سی نمونہ کی اسلامی حکومت قائم کئے ہوتے تا کہ دنیا دیکھتی کہ اسلامی حکومت انسانیت کے لئے کیسی رحمت ہے، تو مولانا نے فرمایا کہ صوبہ سرحد سے

کچھ لوگ میرے لینے کو آئے اور میں بھی جانے کو تیار ہو گیا تھا، لیکن امیر شریعت اول حضرت مولانا شاہ بدر الدین صاحب نے جانے نہ دیا۔

ان واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا مسلمانوں کی فلاح کی تمام صورتوں کو سوچتے رہتے تھے اور ہندوستان ہو یا بیرون ہند جہاں کہیں ممکن ہوتا بقدر استطاعت مسلمانوں کی فلاح کی کوشش سے باز نہ رہتے۔

مرض الموت کی حالت میں بھی جو کچھ فرماتے اس سے بھی یہی جذبہ ظاہر ہوتا تھا، بہار کے مسلمانوں کے مصائب و آفات کے لئے ان کا وجود ایک سد سکندری تھا، افسوس کہ وہ اب باقی نہیں ہے۔[۹۵]

---

[۹۵] حیات سجاد ص ۷۴ تا ۷۷۔

آنسو کے چند قطرے!

اسلامی قانون اور اسلامی نظام معیشت کے سر گرم داعی

ڈاکٹر سید محمود سابق وزیر تعلیم بہار[۹۶]

میں مہینوں سے بیمار پڑا ہوں، مولانا سجاد مرحوم کے انتقال نے اس بیماری کی حالت میں میرے دل و دماغ پر جو اثر کیا اس کا اظہار مشکل ہے، میری آنکھوں کے سامنے ایک اندھیرا چھا گیا ہے، دل و دماغ قابو میں نہیں، اس کا

[۹۶] ام-اے، پی-ایچ-ڈی، بالقابہ سابق وزیر تعلیم بہار۔ یہ معلومات محاسن سجاد کی ہیں، ڈاکٹر سید محمود کی شخصیت ہندوستان میں غیر متعارف نہیں، سید پور مضافات غازی پور میں ان کی پیدائش ہوئی، تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہوئی لیکن سیاسی سرگرمیوں میں دلچسپی کی وجہ سے وہاں سے اخراج ہو گیا تو لندن چلے گئے جہاں کیمبرج یونیورسٹی سے گریجویشن اور ایم اے کے بعد بیرسٹر کی ڈگری حاصل کی، پھر جرمنی چلے گئے اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، وہیں گاندھی جی اور جواہر لال نہرو سے تعلقات پیدا ہوئے، واپسی کے بعد پہلے پٹنہ میں وکالت کی، اسی دوران کانگریس کے سرگرم رکن بن کر کام کرتے رہے، پھر بہار کے وزیر تعلیم بنے، آزادی کے بعد لوک سبھا کے اولین ممبروں میں شامل ہوئے اور ٹرانسپورٹ اور پھر وزارت خارجہ میں نائب وزیر کے عہدہ پر فائز ہوئے، ان کا شمار ملک کے ممتاز مسلم سیاسی رہنماؤں اور قائدین میں ہوتا ہے، بیرون ملک بھی ہندوستان کی نمائندگی کی۔ اور ملی مسائل کے دفاع میں سرگرم رہے، ۲۸ ر ستمبر ۱۹۷۱ء کو ان کی وفات ہوئی، حالات کے لئے سید صباح الدین عبد الرحمن کی کتاب "سید محمود" دیکھنی چاہئے۔

خواب و خیال بھی نہ تھا کہ مولاناؒ اس قدر جلد اور قبل از وقت داغ مفارقت دے جائیں گے۔

آپ نے محاسن سجاد کے لئے مجھ سے کچھ لکھنے کی فرمائش کی ہے، لیکن میں کیا لکھوں ؟ اپنی دماغی و دلی بے چینی کا اظہار کروں اور کیوں کر کروں ؟ مولاناؒ کے محاسن کوئی دو چار ہوں تو گنائے جائیں، وقت اور صحت ساتھ دے تو شاید کبھی اپنے تاثرات قلمبند کر سکوں، اس وقت تو رہ رہ کر یہی خیال آتا ہے کہ بہار ایک بہت بڑے مخلص اور بہت بڑے کام کرنے والے سے خالی ہو گیا۔ ہمارا صوبہ اس حادثہ پر جس قدر ماتم اور واویلا کرے وہ تھوڑا ہے۔

گذشتہ بیس برس سے جو انتھک اور پُر خلوص خدمت مسلمانوں کی اور ملک کی انہوں نے کی، اس کا احساس تو مسلمانوں کو نہیں، لیکن اس کا اجر خدا دے گا، ایسا جانباز مجاہد جس نے فاقے کر کے قوم و ملک کی خدمت انجام دی، جو جان کو جان اور مال کو مال نہ سمجھا، جس نے اپنا گھر بار سب کچھ قوم کی راہ میں لٹا دیا، جو اس سال، ہونہار بیٹے کی خطرناک علالت اور پھر موت بھی جسے فرض سے غافل نہ کر سکی، جس نے اللہ کے راستہ میں اپنوں کی گالیاں اور غیروں کے طعنے ہنسی خوشی برداشت کئے، ایسے جانباز مجاہد اور ہمہ تن سوز خادم ملت کی یاد جس قدر تازہ رکھی جا سکے غنیمت ہے اور اس کی یاد میں نذر عقیدت کے جس قدر پھول چڑھائے جا سکیں، حق تو یہ ہے کہ ان کی خدمات کا حق ادا کرنا بہت مشکل ہے۔

میں عرصہ سے جانتا تھا کہ ان کی زندگی حد درجہ عُسرت سے گذرتی ہے لیکن انتہائی گہرے تعلقات کے باوجود کے کبھی لب کشائی کی جرأت نہ

ہوئی، ان کی خود داری کچھ پوچھنے کا موقع نہ دیتی تھی، ابھی چند مہینے ہوئے مجھے ایک دوست کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ وہ نہایت عُسرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں، بلکہ گھر میں فاقے تک کی نوبت آجاتی ہے، اس پر میرا دل تڑپ کر رہ گیا، ضبط نہ ہوا تو دریافت کیا، وہ مسکرا کر خاموش رہے، جانباز مجاہد ایسے ہوتے ہیں، مگر افسوس! ہماری قوم کو کیا قدر اور کیا پروا؟ اب جب نظر دوڑاتا ہوں تو صوبہ بہار کو ہر طرف خالی پاتا ہوں۔

ایسا بے لوث خادم قوم آسانی سے نہیں پیدا ہوا کرتا، مسلمانوں کو خود اپنی حالت کی خبر نہیں، جیسے افراد کی بد قسمتی ہوا کرتی ہے ویسے ہی قوموں کی بھی بد قسمتی ہوتی ہے اور اس سے زیادہ کسی قوم کی کیا بد قسمتی ہوسکتی ہے کہ اس میں سے ایسے مخلص جانباز مجاہد روز اٹھتے چلے جائیں۔

مولاناؒ عام علماء کی طرح محض ایک صاحب درس عالم نہیں تھے، تدبر اور ملکی مسئلوں کے فہم و گرفت میں وہ کسی بڑے سے بڑے سیاسی مدبر سے کم نہیں تھے، اور تو اور خالص قانونی اور دستوری موشگافیوں میں بھی ان کا دماغ اس طرح کام کرتا تھا، جیسے کسی عام فقہی مسئلہ کے سلجھانے میں۔

مجھے وقف بل کے سلسلہ میں ذاتی طور پر اس کا تجربہ ہے کہ بعض دفعات میں جہاں الجھاؤ پیدا ہوا ہے اور سلیکٹ کمیٹی کے سرکاری اور غیر سرکاری ممبر ہار مان چکے ہیں، مولانا کے قانونی دماغ نے مسئلہ کو سمجھنے اور سمجھانے میں کوئی دقت محسوس نہیں کی، اور جہاں کسی تجویز یا ترمیم کی پیچیدگیاں پیش کی گئیں، ان کے ناخن تدبیر نے الجھی ہوئی گتھیاں فوراً سلجھا دیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کا دماغ اس کے لئے دیر سے تیار ہے۔

ان کے سامنے ایک مرکب مجموع ہوتا تھا

وہ کسی مسئلہ پر انفرادی حیثیت سے غور نہیں کرتے بلکہ ان کے سامنے ایک مرکب مجموع (Composite Whole) ہوتا تھا، وہ ہندوستان کی جنگ آزادی کے پُرجوش سپاہی اور جرنیل تھے، لیکن ساتھ ساتھ اسلامی حقوق نہیں بلکہ پورے اسلامی نظام معیشت اور اسلامی قانون کے نفاذ کے بھی وہ سر گرم داعی تھے، اور ان کی دونوں حیثیتیں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئیں، انہوں نے دستوری اسمبلی کی تجویز کی حمایت کی، ساتھ ساتھ ایک اہم ترمیم بھی منظور کرا کر رہے، جبری تعلیم کی تائید کی لیکن مذہبی تعلیم کی عدم شمولیت پر سخت نکتہ چینی کرنے میں بھی انہیں کوئی باک نہ ہوا۔

مسلمانوں کے لئے وہ الگ نظام کے حامی تھے، ہندوستان کا مستقبل ان کی آنکھوں کے سامنے روشن تھا، وہ اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارنے کے عادی نہیں تھے، دل کے ساتھ ان کا دماغ بھی روشن تھا، البانیہ، پولینڈ، یوگوسلاویہ کی مثالیں ان کے سامنے تھیں، وہ ڈرتے تھے کہ آگے چل کر یہ ملک بھی کہیں مسلمانوں کے لئے ایک بڑا راجپوتانہ نہ بن جائے، اس لئے وہ ہندوستان کی سب سے بڑی قومی سیاسی جماعت کا ساتھ دے کر اس سے اپنی انفرادیت منوانا چاہتے تھے، یہی ان کا مقصد تھا اور اسی کے لئے وہ پچیس سال سے کچھ اوپر شب وروز سرگرم کار رہے، امارت شرعیہ، جمعیۃ علماء اور دوسری تحریکیں سب اسی مقصد کے حصول کا ذریعہ تھیں۔ میں نے ابھی کہا کہ وہ کسی مسئلہ پر انفرادی حیثیت سے غور نہیں کرتے تھے۔ ان کے سامنے ایک مرکب مجموع (Composite

(Whole ہوتا تھا، ان کی مختلف سرگرمیوں کا جائزہ لیتے وقت یہ اصول پیش نظر رہنا چاہیئے۔

کہاں تک لکھوں؟ سچی بات یہ ہے کہ ابھی دل ودماغ میں سکت ہی نہیں، اللہ سے دعا کیجیے کہ فرصت و صحت نصیب ہو، تو دل کے پھپھولے توڑ سکوں، اور نہ جاننے والوں کو بتلاؤں کہ مولاناؒ کی بے وقت موت سے مسلمانوں کا کتنا بڑا نقصان ہوا ہے۔[97]

[97] محاسن سجاد، ص ۴۵

مولانا الہ آباد میں

مولانا حکیم یوسف حسن خان صاحب سوریؒ[98]

[98] محاسن سجاد میں "جناب مولوی حکیم حافظ قاری یوسف حسن خان صاحب بہار شریف" لکھا ہے۔ مولانا مسعود عالم ندوی کے رفقاء میں تھے، گرچہ سن وسال میں بہت بڑے تھے لیکن علمی رفاقت اور دوستانہ مراسم تھے، ان کا تعلق حضرت مولانا سجاد کے وطن سے قریب بڑاکر گاؤں سے تھا، والد محترم مفتی الٰہی بخش بڑاکری بہاری ممتاز علماء میں تھے، بزرگان صادقپور کی کتابوں کے ترجمہ کے علاوہ صغانی کی مشارق الانوار کی ترتیب وفہرست سازی ان کا اہم کارنامہ ہے، بہار شریف ہی میں وفات پائی، اہل حدیث عالم تھے، شاید یہ نسبت بھی مولانا مسعود عالم ندوی اور ان کے خاندان سے قربت میں موثر رہی ہو، مولانا کا تعلق سوری پٹھانوں کے خاندان سے تھا، یوسف صاحب کے پوتے طفیل خاں سوری کی اطلاع کے مطابق شیر شاہ سوری کا ایک خاندان بہار شریف میں تھا اس سے ان کی رشتہ داری ہے، حکیم یوسف صاحب ۱۸۹۳ میں پیدا ہوئے، حفظ قرآن اور ابتدائی کتابیں اپنے والد ہی سے پڑھیں، کچھ حالات اس مضمون میں بھی موجود ہیں، اساتذہ میں مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد، مولانا عبدالرحمن مکی استاذ قراءت و تجوید، اور خود والد ماجد ہیں، کچھ سال دہلی میں بھی پڑھا، شاید مدرسہ امینیہ میں مفتی کفایت اللہ صاحب سے استفادہ کیا ہو، وہیں دستار بندی ہوئی، منتہی کتابیں اپنے والد سے بھی پڑھیں، فراغت کے بعد ۱۹۱۸ میں بہار شریف میں مطب کھولا، جید حکیم تھے، لیکن اس کے ساتھ ملی و قومی کاموں میں بھی سرگرم عمل رہے، اور مختلف عہدوں پر فائز ہوئے، انجمن اطبائے بہار کے صدر تھے، حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ سے بیعت تھے، ۱۶ فروری ۱۹۸۱ میں ۸۸ سال کی عمر میں وفات پائی اور بہار شریف ہی میں مدفون ہوئے۔ یہ حالات تاریخ اطبائے بہار سے مستفاد ہیں، بحوالہ تذکرہ علمائے بہار، ص ۲۲۴ جلد اول۔

۱۵؍ جنوری ۱۹۱۱ء مطابق ۱۶؍ محرم الحرام ۱۳۲۹ھ کو والد ماجد مولوی الٰہی بخش خان[99] صاحبؒ نے حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد صاحبؒ کو جب کہ وہ مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں مدرس تھے، اس مضمون کا جوابی خط لکھا کہ ان دنوں محمد یوسف سلمہ کی تعلیم مستقل طور پر نہیں ہو رہی ہے، اور ان کو آپ سے پڑھنے کا بے حد شوق ہے اس لئے میری خواہش ہے کہ آپ کے پاس بھیج دوں، سفر میں رہنے سے ان کو تجربات حاصل ہوں گے، معلومات میں بھی اضافہ ہو گا۔ اس کے جواب میں ۲۲؍ جنوری ۱۹۱۱ء مطابق ۲۳؍ محرم الحرام کو مولانا نے اپنے دست مبارک سے والد ماجد علیہ الرحمۃ کو جو جواب لکھا تھا وہ حسب ذیل ہے:

جناب مولانا المعظم والافخم مد عنایتکم۔ بعد سلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔

اعزاز نامہ صادر ہوا، مسطور فیہ سے واقف ہوا، اس وقت ان کے مناسب حال مفصلہ ذیل کتابیں ہو رہی ہیں: شرح وقایہ ہر دو جلد، جلالین شریف، مشکوۃ شریف، مقامات حریری، قطبی، اور یہ سب بالکل ابتدا ہی میں ہو رہی ہیں، اگر آپ مناسب سمجھیں تو روانہ فرمادیں، کھانے کا انتظام ہو جائے گا، مگر میرے خیال میں تو آپ کے سامنے ان کی تعلیم باحسن وجوہ ہوتی، مگر خیر میں آپ کے ارشاد

[99] مولانا الٰہی بخش خان صاحب بڑاکری بہاری اپنے وقت کے ایک ممتاز اہل حدیث عالم تھے، بیسیوں کتابیں ان کی یادگار ہیں اور چھپ کر مقبول ہو چکی ہیں۔ بڑاکر بہار شریف سے دکھن اور مولانا مرحوم کے وطن پنہسہ سے تین چار میل کے فاصلے پر ہے (م)

کو ہرگز اٹھا نہیں سکتا۔ فقط والسلام، جناب شاہ مظہر حسین صاحب کی خدمت میں میرا سلام عرض فرما دیجیے گا۔

ناچیز

ابو المحاسن محمد سجاد عفی عنہ

میں اس وقت ۱۵ سال کا تھا، جناب حافظ عبد اللہ صاحب پیش امام جامع مسجد بہار شریف کی توجہ سے حفظ سے فارغ ہو چکا تھا۔ خان بہادر جناب مولانا محمد مبارک کریم صاحب مدظلہ العالی (ریٹائرڈ سپرینڈنٹ اسلامک اسٹڈیز صوبہ بہار اڑیسہ) سے مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں مرقاۃ، شرح تہذیب اور جناب مولانا اصغر حسین صاحب مدظلہ العالی (حال وائس پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ) سے شرح وقایہ و ابو داؤد پڑھ رہا تھا، مجھ کو سفر کا بے حد شوق تھا، جب والد ماجد علیہ الرحمۃ سے دلی خواہش کا اظہار کیا تو اس وقت سردی بہت زیادہ پڑ رہی تھی، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے خط آنے پر بھی مجھے روک رکھا۔ مولانا کی شہرت سن کر ان کی خدمت میں حاضری کا شوق بہت بڑھ گیا تھا۔ جب برابر باوجود سردی کے میرا اصرار ہوا تو والد ماجد نے اپنے خط میں یہ جملہ تحریر فرمایا کہ "در موسم سفر از بہار پُر بہار خواہد شد"۔ بالآخر سہ شنبہ ۷؍ فروری ۱۳۲۹ھ کو مولاناؒ کی خدمت میں الہ آباد پہنچا۔ مولاناؒ میرے رہنے اور کھانے کا انتظام اپنے ساتھ رکھ کر مندرجہ بالا کتابیں پڑھاتے تھے، ان دنوں ۲۰ سے ۲۵ بہاری طلبہ مولاناؒ سے تعلیم حاصل کر رہے تھے، مجھے اس پر ناز ہے کہ میں نے یہ سب کتابیں مولاناؒ ہی سے پڑھیں، سارے طلبہ مولاناؒ کے عاشق زار تھے۔ مولاناؒ طلبہ کو بلاناغہ پنجشنبہ کے روز تقریر و مناظرہ کی تعلیم دیا کرتے تھے، چونکہ میں مدرسہ کا باضابطہ طالب علم نہ تھا اور فقط مولاناؒ کی خدمت کو ذریعۂ سعادت سمجھتا تھا، اس

لئے فن تجوید کے لئے میر انظم احیاء العلوم میں استاذ القراء جناب حافظ قاری عبد الرحمن مہاجر مکیؒ سے فرمادیا تھا اور جو کچھ قرأت و تجوید حاصل کی وہ صرف قاری صاحب کا فیض ہے۔

شروع رجب ۱۳۲۹ھ میں مولاناؒ کو چند ناگزیر واقعات کی بنا پر الہ آباد چھوڑنا پڑا۔ مولانا علیہ الرحمۃ جس وقت الہ آباد چھوڑ رہے تھے، شہر کے سارے عمائدین ورؤساء اسٹیشن پر آکر رو رہے تھے اور فرماتے تھے کہ الہ آباد سے آج فقہ رخصت ہو رہی ہے۔ الہ آباد میں میرے قیام کے زمانہ میں ساری دنیا کی صنعتوں کی نمائش ہو رہی تھی، مولاناؒ اپنی شفقت کے باعث مجھے لے گئے اور ساری چیزوں کو دکھا دکھا کر مجھے سمجھایا۔ اسی زمانہ کا ایک لطیفہ ہے کہ ایک بہت بڑا آریہ مناظر مولاناؒ سے ملنے آیا اور کہنے لگا کہ مولانا اس میں تو کوئی مضائقہ نہیں کہ مسلمان گائے کی قربانی ترک کر دیں اور ہنود مسلمانوں کو بکرا دے کر قربانی کا انتظام کر دیں، مولاناؒ نے فوراً برجستہ فرمایا کہ میاں ہم لوگوں کو جانور کے بالوں کی تعداد کے مطابق ثواب ملتا ہے اتنا بال اور جانوروں میں کہاں؟ وہ لاجواب ہو گیا اور کچھ دیر خاموش ہو کر رخصت کی اجازت چاہی اور چلا گیا۔

دوران قیام میں ایک شیعہ رئیس زادہ مولاناؒ سے ریاضی پڑھنے آتا تھا ،وہ سارے ہندوستان کی خاک چھان چکا تھا، لیکن کہیں اس کی تشفی نہیں ہوئی ،آخر میں وہ مولاناؒ کے طرز تعلیم پر فریفتہ ہو گیا اور باوجود رئیس زادہ ہونے کے برابر مولاناؒ ہی کی خدمت میں قیام گاہ پر تعلیم حاصل کرتا تھا اور اس کے والدین مولاناؒ کو پچیس روپیہ دیا کرتے تھے۔ مولانا علیہ الرحمۃ اس سے روپیہ لے کر طلبہ کی ذات میں خرچ کر دیا کرتے اور اپنے لئے ایک پیسہ بھی نہیں رکھتے۔

جس وقت مولاناؒ مدرسہ سبحانیہ سے جدا ہونے لگے ۱۵ سے ۲۰ طلبہ ساتھ ہو گئے۔ مولاناؒ نے سب کو اپنی جیب خاص سے سفر خرچ عنایت فرمایا اور گیا آکر مدرسہ انوار العلوم کی بنا ڈالی۔ میں وہاں سے مدرسہ احیاء العلوم جا کر صرف قاری صاحب سے قرأت پڑھتا رہا، اور ۱۴ر اگست ۱۹۱۱ء مطابق ۱۸ شعبان ۱۳۲۹ھ کو وطن واپس چلا آیا۔ پھر مولانا مرحوم کا گیا مدرسہ انوار العلوم سے طلبی کا خط مورخہ ۱۳ر شوال ۱۳۲۹ھ کو گھر پر ملا، لیکن افسوس میں نہ پہنچ سکا۔ مکتوب گرامی حسب ذیل ہے:

عزیزی مولوی حافظ یوسف سلمہ، دعائے خیر۔

میں بخیر ہوں اور صحت آں عزیز کی مطلوب، مدرسہ کی حالت جو کچھ ہے وہ یہاں آنے سے معلوم ہو گی۔ مجملاً یوں سمجھ لو کہ بالفعل ابھی تک سبق شروع نہیں ہوا ہے کیونکہ آں عزیز کا انتظار ہے۔ لہذا آں عزیز کو تحریر کرتا ہوں کہ بہ مجرد خط کو دیکھتے ہوئے چلے آؤ کیونکہ جناب حافظ صاحب (مولانا حافظ عبد الکافی صاحبؒ الہ آبادی) وغیرہ تشریف لانے والے ہیں، جس میں جلسۂ افتتاحی بھی ہونے کا خیال ہے۔ خلاصہ یہ کہ جہاں تک ممکن ہو بہت جلد چلے آؤ۔ زیادہ والدعا۔[100]

ابوالمحاسن محمد سجاد عفی عنہ

از مدرسہ انوار العلوم متصل ظفر منزل

مورخہ ۱۳ر شوال المکرم ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۱ء

---

[100] محاسن سجاد میں اسی طرح ہے۔

مولاناؒ کی شفقت و عنایت کا حال یہ تھا کہ بہار شریف جب تشریف لاتے مجھے قدمبوسی کا شرف مرحمت فرماتے، مجھ ناچیز سے کبھی کبھی کچھ دینی خدمت بھی لے لیتے تھے جس کی شہادت یہ دو خطوط [۱۰۱] دے رہے ہیں۔ سنہ رواں کے ماہ رجب میں مولاناؒ نے پٹنہ میں مجھے شرف زیارت بخشا اور مدرسہ اسلامیہ بہار شریف کے متعلق پر درد لہجہ میں فرمایا کہ لوگ ایسے قدیم دینی فیض رساں درسگاہ کو برباد کرنا چاہتے ہیں، میرا ارادہ ہے کہ دو تین ماہ خاص بہار شریف جا کر اقامت اختیار کروں اور اس کا باضابطہ مالی انتظام درست کردوں۔ مگر افسوس کہ یہ حسرت مولاناؒ کی پوری نہ ہونے پائی اور بے وقت انتقال نے مدرسہ مذکورہ کی اصلاح کی صورت پیدا نہ ہونے دی [۱۰۲]۔

[۱۰۱] چند برس ہوئے بہار شریف میں امارت شرعیہ کے ماتحت جمعیۃ العلماء قائم کی گئی تھی جس کے صدر والد ماجد مولانا عبد الشکور صاحب مدظلہ تھے اور نظامت حکیم صاحب کو تفویض کی گئی تھی ،کچھ دنوں سرگرمی سے کام ہوتا رہا۔ اس سلسلہ کے تمام خطوط حکیم صاحب نے عنایت فرمادیئے ہیں جو سیرت کی تدوین میں کام آئیں گے۔ (م)

[۱۰۲] اب آخری اطلاع یہ ہے کہ حریفوں کو صرف مولاناؒ کی وفات کا انتظار تھا اور ان کے انتقال کے کچھ ہی دنوں بعد یہ مدرسہ گویا ختم کردیا گیا۔ اب اس کی صورت ایک معمولی مکتب کی رہ گئی ہے۔ وائے برحال ما۔ (م) لیکن اب پھر اس کی تجدید کی کوشش ہورہی ہے، بی بی جین اسٹیٹ کو صغری وقف اسٹیٹ میں ضم کردیا گیا ہے اور گرچہ اب مدرسہ کی جگہ جو جامع مسجد بہار شریف روڈ بمقام پل پر ہے مارکیٹ تعمیر ہوچکی ہے لیکن صغریٰ وقف اسٹیٹ کے نئے متولی اس کی تجدید کی فکر میں ہیں۔ یہ مضمون محاسن سجاد سے ماخوذ ہے، ص، ۳۰

حضرت مولانا محمد سجادؒ کی

اولوالعزم شخصیت اور خدمات جلیلہ

جناب حافظ محمد ثانی صاحبؒ [۱۰۳]

ضلع چمپارن پر حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کے اہم احسانات اور بے بہا خدمات کے جذبۂ تشکر، اور مولانا رحمانی ناظم امارت شرعیہ کے اس ارشاد کے باعث کہ آپ کا مضمون حیات سجاد میں ہونا ضروری ہے۔ کیوں کہ آپ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے حواریوں میں سے ہیں، یہ چند شذرات سپرد قلم ہیں۔ یہ میری عزت افزائی ہے ،ورنہ یہ ناچیز اس اعلیٰ خطاب کا اپنے کو مستحق نہیں پاتا۔ حضرت مولانا علیہ الرحمہ کے ادنیٰ ترین خدام کی فہرست میں میرے نام کا درج پاجانا میرے لیے باعث سعادت وعزت ہے۔ داعی اکبر حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ نے مسلمانوں کو شرعی تنظیم کی دعوت دی۔ ۱۹۲۱ء میں جمعیت علماء صوبہ بہار کا اجلاس پٹنہ میں منعقد ہوا اور انتخاب امیر شریعت کا اہم فریضۂ شرعی ادا کیا گیا۔ حضرت مولانا موصوفؒ بحیثیت نائب امیر بتیا ضلع چمپارن میں تشریف لائے۔ ایک عظیم الشان جلسہ مسلمانانِ ضلع چمپارن کا ہوا۔ دیگر معزز علماء بھی شریک جلسہ تھے۔ حضرت نائب امیر شریعت کے دستِ مبارک پر مسلمانوں نے سمع

[۱۰۳] چمپارن میں مولانا کے اہم معاونین میں تھے اور بعد میں ان کی پارٹی ہی کی طرف سے ایم ایل اے ہوئے، چمپارن کے دورہ میں مولانا کے خصوصی معاون رہے، جیسا کہ مولانا مسعود عالم صاحب نے بھی ایک جگہ ذکر کیا ہے، غالبا بتیا کے کسی مدرسہ میں مدرس تھے۔

وطاعت کی بیعت کی اور شرعی تنظیم کی آواز پر لبیک کہا۔ یہ ضلع سابق ایام میں ظلمت وجہالت کا گہوارہ اور شعاع علم سے یکسر محروم تھا مگر ۱۸۵۷ء کے بعد خدائے پاک کی توفیق اور مہربانیوں سے علمائے حقانیین مثلاً حضرت مولانا جعفر علی صاحب وحضرت مولانا سرفراز علی صاحب خلفائے کرام غازی اعظم حضرت سید احمد صاحب بریلویؒ نے ہدایات وارشاد کے لیے اس ضلع کو منتخب فرمایا، اس کے بعد یوپی کے ایک باخدا بزرگ حضرت مولانا احسان اللہ صاحب نے اس ضلع میں سلسلۂ تبلیغ وہدایات جاری رکھا، ان ہی مقدس بزرگوں کے فیوض وبرکات سے مسلم آبادیوں میں مسجدیں تعمیر ہوئیں اور مدرسہ حفظ کلامِ پاک کی بنیاد ایک غیر معروف بستی سمرا میں ڈالی گئی جس میں آج بھی تقریباً ایک صد طلبہ قرآن پاک حفظ کر رہے ہیں۔ اور یہ مدرسہ باوجود غیر مستقل ذرائع آمدنی کے ان طلبا کے طعام وقیام ودیگر ضروری اخراجات کا کفیل ہے۔ اُس کے بعد اُن ہی بزرگوں کے معتقدین نے مختلف مقامات میں مدارسِ علوم دینیہ کی بنیاد ڈالی۔ ایک اور خصوصیت اس ضلع کی یہ تھی کہ اس ضلع کے مسلم باشندے زیادہ تر غریب اور کچھ متوسط الحال تھے۔ کسی مسلم زمین دار اور دولت مند سرمایہ دار کا وجود نہیں تھا۔ اور علوم فرنگ اور تہذیب جدید کے مسموم جراثیم سے بالکل محفوظ ومامون تھا۔ حضرت نائب امیر شریعتؒ کی دوربیں نگاہوں نے ایک نظر ڈالتے ہی یہ اندازہ لگالیا کہ اس صوبہ میں یہی ایک ضلع ہے جہاں کے لوگوں میں احکامِ شریعت بلا دلیل حجت قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔ سرمایہ داروں کی جنگِ سرمایہ داری، متفرقین اکابر کا مکر وحیلہ، شیدایانِ علوم فرنگ کا جہل مرکب، فریفتہ گان تہذیب جدید کی سازشیں، حق وصداقت کی دعوت

وتبلیغ میں سد راہ نہیں ہیں، ان ہی اسباب کی بنا پر امارت شرعیہ جیسے اہم ترین فریضہ کی دعوت وتبلیغ کے لیے حضرت مولاناؒ نے اس ضلع کی طرف خاص توجہ مبذول فرمائی، چناچہ یہ ضلع حضرت مولاناؒ کے تبلیغی دور کی عزت اور اعلیٰ دینی خدمات پر جس قدر بھی فخر کرے کم ہے۔ چمپارن کی مسلم آبادی کا کوئی گوشہ ایسا باقی نہیں ہے جو مولانا کے ارشادات وہدایات کے فیضان سے محروم ہو۔

مولاناؒ کا مخصوص دورہ تقریباً ہر سال آخر شعبان سے پورے رمضان المبارک میں ہوتا تھا، ۳۴ء کے زلزلۂ عظیم کے موقع پر آخر رمضان میں حضرت مولانا دیہات کے دورہ سے بتیا تشریف لا رہے تھے۔ ٹرین جیسے ہی بتیا اسٹیشن پر پہنچی کہ دفعتاً زلزلہ شروع ہوا اور مسافرین وحاضرین بدحواسی وپریشانی کے عالم میں شور وغوغا کرنے لگے۔ مولانا مرحوم اپنے عصائے مبارک کو پلیٹ فارم پر ٹیک کر نہایت استقلال کے ساتھ کھڑے ہوگئے۔ اللہ اللہ کہنے لگے اور حاضرین کو بھی تلقین کی۔ چناچہ سب لوگ کیا مسلم اور غیر مسلم اللہ اللہ بآوازِ بلند کہنے لگے۔ اس کے بعد سکون ہوا۔ بعض لوگوں سے مولاناؒ نے فرمایا کہ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں ایک دفعہ زلزلہ آیا تھا۔ انھوں نے اپنے عصائے مبارک زمین پر دبایا۔ خدا نے رحم کیا۔ میں بھی اُن کے غلاموں میں ہوں اس لیے میں نے ان کی سنت پر عمل کیا۔ مولانا کے دورہ میں احقر اور شیخ عدالت حسین صاحب ہمیشہ ساتھ رہتے تھے۔ ہم لوگوں پر مولانا کی ایک خاص شفقت کی نظر رہتی تھی۔ مولانا کی صحبت اور وعظ وپند میں وہ کشش تھی کہ ہم لوگ اپنی تمام اہم ضروریات کو بالائے طاق رکھ کر ان کی خدمت میں حاضر رہا کرتے تھے اور نکات قرآنی سے قوت روحانی حاصل کیا کرتے تھے۔ مولانا تبحر علمی،

سیاست فہمی، ایثار واخلاصِ عمل وجذبۂ عمل، عجز وانکساری، سادگی وجفاکشی، صبر واستقامت، توکل وقناعت ودیگر صفاتِ عالیہ سے ایسے متصف تھے کہ یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ خدائے قدوس نے اپنے خاص بندوں کو خاص صفات ودیعت فرماکر کسی خاص اہم فریضہ کی انجام دہی کے لیے بھیجا تھا۔ چنانچہ مولاناؒ کے چند مخصوص واقعات قلم بند کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

ریاضت ومجاہدہ

۱۔ حضرت مولاناؒ جیٹھ بیساکھ کی چلچلاتی دھوپ اور جلتی تپش میں بیل گاڑی پر بھی نہایت خوشی کے ساتھ صبح سے شام تک سفر کرتے اور چھتری تک نہیں لگاتے۔

2۔ ایک مرتبہ میں نے عرض کیا بہتر ہوتا کہ حضور کا دورہ اب سے بعد رمضان شریف یا قبل رمضان ہوتا کہ ہم لوگ روزہ میں تکالیف سفر سے نجات پاتے، مولانا نے تبسم آمیز لہجہ میں فرمایا کہ رمضان شریف میں عبادت کا زیادہ ثواب ہے۔ اصلاح قوم بہت بڑی عبادت ہے جس کو ہم لوگ اس متبرک مہینہ میں ادا کرتے ہیں۔

قرآن کریم کی نعمت خاصہ

۳۔ مولاناؒ قرآن پاک کی تلاوت فرمارہے تھے اور ان پر ایک کیفیت طاری تھی۔ میری طرف مخاطب ہوکر فرمایا کہ دنیادار دُنیاوی دولت پر غرور وفخر کیا کرتے ہیں۔ مگر اللہ پاک نے اپنی مہربانیوں سے کلام پاک کی جو دولت مجھے عطا فرمائی ہے اس کے مقابلہ میں دولت مندوں اور ان کی دولت کی میری نظروں میں کوئی حقیقت نہیں، مختصر یہ کہ حضرتؒ صحیح معنوں میں "علماء

أمتي كأنبياء بني إسرائيل" اور "العلماء ورثة الأنبياء" کے صحیح مصداق تھے۔

الوداعی آہٹ

مولانا وفات کے تین ہفتہ قبل یعنی رمضان شریف کے آخری ایّام میں دفعتہ بتیا تشریف لائے، دو روز قیام فرمایا، ایڈیٹر "الہلال"[۱۰۴] بھی ان کے ساتھ تھے۔ جمعہ کی نماز کے بعد ایک مختصر تقریر کی، روزہ کے فلسفہ کو بیان کیا اور یہ بھی فرمایا کہ اب میں بوڑھا ہوا، ممکن ہے وعظ ونصیحت کا موقع ملے نہ ملے، مجھے حیرت تھی کہ مولانا بلا کسی اہم ضرورت کے اس قدر جلدی ہی کیوں تشریف لائے مگر انتقال پُر ملال کی خبر سن کر یہ راز فاش ہوا کہ مولانا اپنے مخصوص مقام پر اپنے خاص خادموں سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہونے آئے تھے۔

اب میں چند خدمات خصوصی کا تذکرہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن کو مسلمانان چمپارن کبھی فراموش نہیں کرسکتے۔

فتنۂ ارتداد کا انسداد

۱۹۲۶ء میں جب کہ تمام ہندوستان میں فتنۂ ارتداد کا زور تھا، ضلع چمپارن میں مسلمان گدی قوم کے تقریباً ۴۰۰/اشخاص مکروفریب، ظلم وجور کے ساتھ مرتد بنائے گئے تھے۔ امارت شرعیہ کے مقامی کارکنوں نے دفتر امارت کو اطلاع دی۔ حضرت مولاناؒ خود تشریف لائے اور بعض مقامی کارکن یعنی شیخ عدالت حسین صاحب، حافظ احمد علی صاحب کے ہمراہ دریائے گنڈک پار کرکے چمپارن کے مغربی وجنوبی حصہ سے گزر کر خانقاہ اہرونی حضرت مولانا

---

[۱۰۴] غالباً زکریا فاطمی مراد ہیں۔

شاہ عبداللہ صاحب کے یہاں پہنچے، جو یوپی کے علاقہ میں چمپارن کی سرحد سے متصل واقع ہے۔ یوپی کے راجہ "تمکوہی" کا اس فتنہ کے بڑھانے میں زبردست ہاتھ تھا اور اُسی کا اثر یوپی اور چمپارن کے گدیوں پر پڑ رہا تھا۔ مولانا مرحوم نے حضرت شاہ صاحب موصوف کی کوششوں سے مسلمانوں کے ایک جلسۂ عام کا اعلان کر دیا جس میں گورکھپور سے مولوی سبحان اللہ صاحب اور مولانا آزاد سبحانی بھی تشریف فرماتھے، زبردست تبلیغی تقریریں ہوئیں۔ غریب گدیوں کی ہمت افزائی ہوئی۔ راجہ مذکور مرعوب ہوا اور فتنۂ ارتداد کا سدّباب ہوا اور تھوڑے دِنوں میں یوپی اور چمپارن کے مرتدین ایک ایک کر کے حلقۂ بگوش اسلام ہوگئے اور مولاناؒ نے ارشاد فرمایا کہ فوری مصیبت تو دور ہوئی مگر آئندہ کے لیے ایسا نظم ہونا چاہیے کہ یہ قوم اس فتنہ سے ہمیشہ کے لیے محفوظ رہے۔ چنانچہ حسبِ ہدایت مولانا مدرسہ اسلامیہ بتیا میں گدیوں کے بچّے تعلیم پانے لگے اور دیہاتوں میں متعدد مکاتب کا اجرا ہوا اور آج تک دو مکاتب خاص گدی قوم کے لیے امارت شرعیہ کے زیر نگرانی قائم ہیں، اور امارت شرعیہ اخراجات کی کفیل ہے۔ حضرت مولاناؒ ہی کی کوششوں سے جناب مولوی شاہ مصطفی احمد صاحب رئیس گیا نے موضع سریاڈیہہ گدیانی میں ایک پختہ مسجد بخرچ مبلغ ساڑھے سات سو روپیہ بنوادیا اور موضع بھٹواٹولہ گدیانی میں ایک مسجد خاص شخص نے بنوائی، اب اس قوم کے بعض لڑکے اتنے تعلیم یافتہ ہوگئے ہیں جو اپنی قوم میں تبلیغ وہدایت کا فریضہ انجام دے سکیں۔

ایک سو دلت گھرانے حلقہ بگوش اسلام

(۲)موضع چوتروا تھانہ بگہا ضلع چمپارن میں تقریباً چار سو گھرانے

جرائم پیشہ مگر ڈوم زیر نگرانی سلوشن آرمی ہیں۔ امارت شرعیہ کے مبلغین وکارکنوں کی کوششوں سے تقریباً ایک سو گھرانے بخوشی مسلمان ہوگئے۔ سلوشن آرمی کے انگریز منیجر نے غریب مسلمانوں پر قسم قسم کے مظالم ڈھانا شروع کیا مگر وہ لوگ صبر واستقامت کے ساتھ آج تک اسلام پر ثابت قدم ہیں ۲۶ء میں قاضی احمد حسین صاحب جو اس زمانہ میں کونسل کے ممبر تھے ان کی کوششوں سے ایک مسلمان معلم کو گورنمنٹ نے بحال کیا جو آج تک تعلیم دے رہے ہیں۔ کانگریسی حکومت کے زمانہ میں میں نے ان نومسلموں کے متعلق گورنمنٹ سے بارہا متعدد سوالات کیے جس کے بعد خود پرائم منسٹر صاحب ہم لوگوں کے ساتھ چوتروا تشریف لے گئے۔ تحقیقات کی اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ سولوشن آرمی کی نگرانی سے اُن لوگوں کو نکال کر اچھوت اور مسلمانوں کے مستند اداروں کی نگرانی میں دے دیا جائے، ابھی تک یہ معاملہ ناتمام ہی رہا کہ کانگریسی حکومت مستعفی ہوگئی۔

فرقہ وارانہ فسادات کے موقع پر مسلمانوں کی امداد

۲۱/اگست ۳۷ء کو بتیا میں ایک گہری سازش کے تحت جو مشہور فرقہ وارانہ فساد کرایا گیا تھا اور ہندوؤں نے غریب مسلمانوں پر جن جن مصائب کا پہاڑ ڈھایا تھا اس سے تمام ہندوستان واقف ہے، بارہ مسلمان جن میں زیادہ تر بوڑھے ضعیف تھے بے رحمی اور انتہائی ظلم کے ساتھ شہید کیے گئے اور سیکڑوں مجروح ہوئے۔ بے شمار مکانات نذر آتش کیے گئے اور لوٹے گئے۔ خدا کے پاک کلام اور مسجد کی بے حرمتی کی گئی۔ یہ ایک ایسا ہولناک اور روح فرسا واقعہ تھا کہ تمام شہر پر سناٹا چھایا ہوا تھا اور مسلمان بسبب غربت اور فلاکت کے بدحواس اور

پریشان تھے۔ حکام کے طرز تفتیش و برادرانِ وطن کی انتھک کوششوں سے صاف ظاہر تھا کہ اب مقدمات میں مسلمانوں ہی پر مزید مصیبت نازل ہو گی اور ہندو بال بال بے داغ بچ جائیں گے اور مظلوم قید و بند اور دارورسن کے شکار ہوں گے۔ دوسرے دن صبح کی ٹرین سے منشی سخاوت حسین صاحب عامل امارت شرعیہ کی معرفت ایک دستی خط مولوی شفیع داؤدی ناظم خلافت کمیٹی صوبہ بہار کو اور دوسرا خط حضرت نائب امیر شریعت صوبہ بہار مولانا سیّد ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ کی خدمت میں لکھا اور اُردو اخبارات اور خطوط کے ذریعہ صوبہ بہار کے مشہور و ممتاز قانون داں حضرات سے مظلومین کی امداد واعانت کی اپیل کی مگر افسوس کہ جواب میں ہر طرف سے خاموشی ہی خاموشی رہی۔ عزیز ملت نے ایسے فسادات میں مسلمانوں ہی پر الزام لگاتے ہوئے امداد سے بے تعلقی کا اظہار فرمایا ہے، وہ خط آج تک دفتر میں محفوظ ہے۔ ۴؍ اگست کو صبح کی ٹرین سے مولوی شفیع داؤدی صاحب تشریف لائے اور دردناک مناظر کا معائنہ فرما کر بہت متأثر ہوئے، چوں کہ شفیع صاحب ابھی تک کانگریس کے ہم نوا تھے، اس لیے انھوں نے بتیا کے کانگریسی ہندو اور مسلمان لیڈروں کو جمع کر کے فرمایا کہ بہت ممکن ہے کہ آپ لوگ بھی مقدمات کے سلسلہ میں گرفتار ہو جائیں، اس لیے ضروری ہے کہ اپنا اپنا بیان مجھے لکھا دیں تا کہ آپ لوگوں کی غیبت میں ہم اور بابو راجندر پرشاد بتیا آئیں اور آپ لوگوں کے بیان سے فائدہ اٹھائیں، میں اپنا بیان دینے کو مستعد تھا مگر چمپارن کے سب سے بڑے صلح کن اور ست واہنسا کے پجاری ہندو لیڈر نے فوری بیان دینے سے انکار کیا اور اپنے ہم مذہب ہندو فرقہ سے مشورہ کرنے کے بعد بیان دینے پر ٹلایا، شفیع صاحب ان

کی ذہنیت کو دیکھ کر بالکل مایوس ہو گئے اور فوراً واپسی کا اظہار کیا، ابھی وہ واپس نہ ہوئے تھے کہ ہم مسلمانوں کے دینی مقتدا اور سچے ہمدرد و بہی خواہ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب انار اللہ مرقدہٗ کی مقدس ہستی مظلوم و مصیبت زدہ مسلمانوں کے لیے سایۂ رحمت بن کر رونق افروز ہوئی۔ شفیع صاحب یہ کہہ کر واپس ہو گئے کہ اب مولانا تشریف لا چکے، میری ضرورت نہیں ہے، مگر شفیع صاب نے مظفر پور پہنچ کر بتیا کے عبرت ناک واقعہ کو بچشم پُرنم مسلمان وکلاء سے بیان کیا۔ بیان سن کر مولوی عبدالودود صاحب وکیل و مولوی سید مجتبیٰ صاحب وکیل اور مولوی زاہد حسن صاحب مختار بہ سواری موٹر برسات کے ایّام میں مظفر پور سے بتیا تک اسّی میل کی دشوار گزار مسافت طے کرتے ہوئے پہنچے۔ حضرت مولانا پہلے ہی سے مستقلاً بتیا میں قیام گزیں ہو چکے تھے۔ وہ لوگ ان سے ملے اور دو ایک روز رہ کر مقدمات کے متعلق ضروری اور مفید ہدایات دے کر مظفر پور تشریف لے گئے۔ مولانا نے مظلومین کی اعانت و حفاظت و ظالموں کی سرکوبی کے لیے بہترین نظم کیا، ایک ڈیفنس کمیٹی بنائی اور ایک باضابطہ دفتر کھول دیا، جس میں روزانہ صبح سے بارہ بجے شب تک محررین وٹائپسٹ اپنے فرائض متعلقہ کو انجام دینے لگے، مالیات کا بہترین نظم تھا جس سے مظلومین کی امداد اور دیگر ضروری اخراجات میں کوئی دشواری کبھی پیش نہیں آئی، اس زمانہ میں کونسل کا اجلاس رانچی میں ہو رہا تھا، شیخ عدالت حسین صاحب و مولوی مجتبیٰ صاحب وکیل کو ضروری ہدایات کے ماتحت وہاں مولانا نے بھیجا۔ تا کہ مسلمان ممبروں کے ذریعہ صوبائی گورنمنٹ کی توجہ مظلومین کی طرف منعطف کرائیں۔ مقدمات کی تحقیقات کی نگرانی کی گئی۔ مسلمانوں کو

تاوان دلانے کی زبردست سعی میں کامیابی ہوئی۔ مقدمات کے انچارج مولوی سیّد مجتبیٰ صاحب وکیل مظفرپوری بنائے گئے جنھوں نے نہایت ہی ایثار و قربانی کے ساتھ تحقیقاتی منزل سے لے کر سیشن کورٹ تک اپنا فریضہ نہایت خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ مولانا کا قیام چھ سات ماہ مسلسل بتیا میں رہا اور انھوں نے سب سے پہلے واقعات کے متعلق اپنی خداداد قابلیتوں سے ایک مبسوط و مدلل بیان اردو، انگریزی اخبارات میں شائع کرایا اور حکام بالا کو بھیجا۔ اس سے گورنمنٹ متوجہ ہوئی اور ہندوستان کے مسلمان متأثر ہوئے۔ گورنمنٹ کے آفیسران ہوم ممبر اور گورنر تک بتیا آئے اور ظالموں کے انتہائی ظلم وعدوان کا جانکاہ منظر اور مظلومین کی لاچاری اور بے کسی کا دردانگیز تماشا دیکھ کر واپس گئے۔ گورنمنٹ افسروں کے طرز تحقیقات میں تبدیلی ہوئی اور ہندوستان کے اہل درد اور مخیر مسلمانوں نے مظلومین کی امداد کے لیے مالی اعانت شروع کردی جن میں جناب سر فخرالدین مرحوم و حاجی عبدالرحمن صاحب وکیل مرحوم کے ساڑھے سات سو کی رقم سب سے پہلے پہنچی اور مظلومین وفاقہ کشوں کی فوری امداد میں خرچ ہوئی۔ جزاہم اللہ خیر الجزاء۔

ابتدائی ایّام میں طویل مقدمات کے کثیر اخراجات کا تصور غریب و مفلس مسلمانوں کے لیے باعثِ پریشانی و حیرانی تھا مگر بحمدللہ مولانا کے بیان کے بعد ان کی مقدس ذات کی برکت سے روپیوں کی بارش شروع ہوئی اور تقریباً بارہ ہزار روپے جمع ہوکر خرچ ہوئے۔ یہ مولانا کی بہت بڑی کرامت تھی، مقدمات کی تحقیقاتی منزل میں مسٹر حاجی محمد یونس صاحب، مسٹر سیّد اصغر یوسف صاحب، بیرسٹران پٹنہ و مولوی عبدالودود صاحب وکیل مظفرپور بھی دو

ایک روز کے لیے تشریف لائے تھے اور کام کیا تھا اور سیشن کورٹ میں مسٹر سیّد بشیر الدین صاحب بیرسٹر پٹنہ نے تقریباً ایک ماہ مسلسل قلیل معاوضہ پر اپنے اعلیٰ قانونی قابلیت کا ثبوت دیا، ان تمام جدوجہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ سیشن کورٹ سے پانچ مسلمانوں کو ایک سال سے پانچ سال تک سزائے قید ہوئی اور ہائی کورٹ سے یہ بصورت جرمانہ تبدیل ہوئی اور مسلمان قید خانہ سے باہر آئے۔ تقریباً پندرہ ہندوؤں کو چار سال سے دس سال تک کی سزا ہوئی۔ اڈیشنل پولیس کا خرچہ ہندو اور مسلمان دونوں فریق سے وصول ہوا۔ پچاس ہزار کی رقم ہندوؤں سے وصول کرکے بصورت معاوضہ نقصانات مسلمانوں کو دلایا گیا۔ ان ہولناک جرائم کی انگریزی عدالت سے یہ سزا ہوئی۔ فاعتبروا یا أولی الأبصار۔ آہ صد آہ! مسلمانوں کے سچّے رہبر، مخلص خادم، مصیبت زدوں کے ہم درد و رموزِ شریعت کے واقف، نکاتِ قرآنی کے ماہر، علم بردار حریت، مجاہد اعظم ہمیشہ کے لیے ہندوستان کے حقیقی مسلمانوں کو عموماً اور صوبہ بہار کے مسلمانوں کو خصوصاً داغ مفارقت دے کر عالم بقا کو تشریف فرما ہوئے، اِنّاللّٰہ واِنّا اِلیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے فضل و کرم سے اعلیٰ علیین اور فی مقعدصدقٍ عندملیک مقتدر کا مستحق بنائے۔ ان کی یادگار امارت شرعیہ کو تاقیامِ قیامت باقی رکھے اور اس کے فیوض و برکات سے مسلمانانِ بہار کو خصوصاً اور مسلمانانِ ہند کو عموماً فیض یاب کرے اور اُن کے خصوصی ہدایات وارشادات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله الذي هدٰنا لهذا وما كنّا لنهتدی لو لا أن هدانا الله لقد جاء ت رسل ربّنا بالحق ونودوا أن تلكم الجنۃ أورثتموها بما كنتم تعملون

جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ

چمپارن میں حضرت مولانا سجادؒ کا دورہ اور انقلاب آفریں خدمات

ایک مشاہد کے قلم سے

حاجی شیخ عدالت حسین رحمہ اللہ[105]

چمپارن[106] کو یہ خصوصی شرف حاصل ہے کہ قیام امارت شرعیہ کے بعد حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب نائب امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ نے باضابطہ پہلا دورہ چمپارن کا فرمایا، اور اس احقر کو اس کا شرف حاصل رہا، کہ یہاں کے مہمات اُمور میں اکثروبیشتر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں شریک کار رہا۔ اس لیے میں جو کچھ عرض کروں گا وہ خود بیتی ہوگی، روایتی اور سنی ہوئی بات نہیں ہوگی۔

دورہ کی مختصر حالت

---

[105] حضرت مولانا سجاد صاحب کے معاونین بالخصوص دورہ کے خاص معاونین میں تھے ، بگہی ضلع چمپارن وطن تھا، سابق الذکر مضمون میں ان کا ذکر کئی جگہ آیا ہے۔ آگے بھی کئی مضامین میں ان کا ذکر آئے گا۔

[106] چمپارن ایک خطہ کا نام ہے ۔اس کے دو حصے ہیں ، مغربی اور مشرقی ، مغربی حصہ کا صدر مقام بتیا ہے، اور مشرقی حصہ کا موتیہاری ہے۔

چمپارن میں سب سے پہلے بڑا جلسہ "بتیا" میں ہوا۔ جس میں مسلمانوں نے حضرت نائب امیر شریعت کے ہاتھ پر امارت کی بیعت عام کی۔ دوسرا جلسہ "لوریا" میں ہوا، جس میں پورے علاقہ کے مسلمان خلوص کے ساتھ جمع ہوئے تھے، اور امارت کی بیعت کی تھی۔

تیسرا جلسہ "یتلپور" کے دیورواعید گاہ میں ہوا۔ دیوراج کی بہت بڑی جماعت ہاتھی گھوڑے لے کر لوریا پہنچی تھی، کہ دیوراج میں پہلا جلسہ یتلپور میں ہو، اور وفد امارت یہاں سے سیدھا یتلپور پہنچے۔ مگر حضرت مولانا شاہ سیّد محی الدین صاحب مدظلہ (موجودہ امیر شریعت) نے جو اس وفد میں شریک تھے، فرمایا، کہ حضرت والد صاحب حضور امیر شریعت کا حکم ہے کہ میں یہاں سے پہلے شیخ عدالت حسین صاحب کے یہاں قیام کروں، پھر ان کی معیت میں دوسرے مقامات کا دورہ کروں، اس لیے تعمیل حکم کی بنا پر میں پہلے شیخ صاحب کے ہاں جاؤں گا۔

چنانچہ وفد باقاعدہ جلوس کے ساتھ لوریا سے روانہ ہوا، اور دس بجے "بگہی" پہنچا۔ اور تناول طعام کے بعد فوراً جلوس یتلپور روانہ ہوگیا اور ان لوگوں کے اصرار کے موافق جلسہ بعد نماز ظہر کے عید گاہ میں ہوا، جس میں پورے دیوراج کے مسلمان شریک تھے۔ جلسہ کے بعد امارت کی بیعت عام ہوئی۔ اور عشروزکاۃ، قومی محصول اور چرم قربانی وفطرہ وغیرہ کے ادا کرنے کا پختہ اقرار ہوا، اور تنظیم کا کام شروع ہوا۔

چوتھا جلسہ شیخ شراکت حسین صاحب کی دعوت پر موضع "سیرہوا" میں ہوا۔ حضرت نائب امیر شریعت اور حضرت مولانا سیّد شاہ محی الدین صاحب

نے تقریریں کیں اور امارت کی بیعت لی گئی۔

اسی طرح وفد جناب ولی محمد صاحب کی دعوت پر موضع "جھار مہوی" گیا۔ پھر موضع "مہوا" گیا۔ پھر بگہی۔ پھر موضع "بسوریا"۔ اسی طرح اور مقامات میں عام جلسے ہوئے۔ اور مسلمانوں نے امارت کی بیعت کی۔

اس سلسلہ میں دورہ کی تفصیلات کو نظر انداز کرتے ہوئے علاقہ "پٹاساٹھی" کا کچھ ذکر نہ کیا جانا ایک اہم فروگذاشت ہوگی۔ جس وقت حضرت نائب امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا سیّد شاہ محی الدین صاحب مدظلہ (موجودہ حضور امیر شریعت) ساٹھی اسٹیشن پر پہنچے۔ پورا اسٹیشن اس علاقہ کے مسلمانوں سے بھرا تھا اور ہجوم کا یہ عالم تھا کہ ہر طرف انسانوں کا جنگل معلوم ہوتا تھا۔ حافظ دین محمد صاحب چنپٹیا کی پندرہ سو روپیہ کی نئی شکرم گاڑی، جس میں پانچ سو روپیہ کا گھوڑا لگا ہوا تھا، اسٹیشن پر موجود تھی۔ جب دونوں بزرگ بیٹھے تو ارادت مندوں کے والہانہ جذبات کا یہ حال تھا، کہ باوجود سخت انکار اور ممانعت کے لوگوں نے گھوڑے کو الگ کر دیا۔ اور جوش ارادت میں موضع سمری شیخ عبدالحکیم صاحب کے مکان تک کھینچ کر لے گئے۔

یہاں سے شیخ گلاب صاحب مجاہد چمپارن کی دعوت پر چاندبروا تشریف لے گئے۔ شیخ صاحب نے اس طرح وفد کا استقبال کیا کہ تین میل آگے سے کیلے کے ستون نصب کرکے جھنڈیوں سے آراستہ کیا تھا۔ اور مسلمانوں کے عام اژدحام کے ساتھ ساتھ علاقے کے ہندو رؤساء بھی ہاتھی اور گھوڑے پر سوار شریک جلوس تھے۔ پولیس بھی نگرانی کے خیال سے مع فورس کے ساتھ تھی۔ دن کو شیخ صاحب کے ہاں کھانا کھایا گیا۔ رات کو موضع وھوبنی

میں حافظ محمد اسحٰق صاحب کے زیر اہتمام عظیم الشان جلسہ ہوا۔ حضرت نائب امیر شریعت اور دیگر علماء نے تقریریں کیں۔ جن میں حضرت مولانا ریاض احمد صاحب[۱۰۷] خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ شب کو حافظ محمد اسحٰق صاحب کے مکان پر بند کمرے میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے مخصوص حضرات کو خصوصی طور پر طلب فرمایا اور حالات حاضرہ کے متعلق خصوصی مشورے دیئے۔

آریہ سماجی فتنہ

بتیا کے گدیوں کی شدھی کا بروقت انسداد:

علاقہ چمپارن میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات میں گدیوں کی شدھی کا انسداد وہ درخشاں خدمت ہے، جو تاریخ کے اہم اور نمایاں واقعات میں لکھا جائے گا۔

چمپارن میں پچیس سال سے آریہ سماج مخفی طور پر کوشش کر رہے تھے کہ چمپارن کے بائیس ہزار گدیوں کی شدھی کر لی جائے۔ کیوں کہ گدیوں کی یہ قوم باوجود اپنے کو مسلمان کہنے کے سیرت وصورت، نشست وبرخاست، خورد ونوش، طرز بود وماند میں یکسر ہندوانہ طریقے پر تھی۔ ان کے مردوں کے نام مہادیو، شیورتی، رام بلاس، عورتوں کے لچھمنیاں، بھگمنیاں، سیتا، درپتی وغیرہ تھے، سر پر ٹیک رکھتے تھے، مونچھیں بڑی بڑی رکھتے تھے۔ داڑھیاں بالکل صاف رہتی تھیں۔ مسلمانوں کے ساتھ کھانے پینے میں ان کو احتراز تھا۔ نماز، روزہ سے ناآشنا۔ دیبی، درگا، بھوانی، بنسپتی کے معتقد اور ناگ پوجا وغیرہ

[۱۰۷] مولانا ممدوح چمپارن کے ممتاز عالم، زندہ دل بزرگ ہیں جو زندہ دل اور حساس قلب رکھتے ہیں، غالباً ان دنوں مدرسہ عزیزیہ بہار شریف میں مدرس ہیں۔ (عبدالصمد رحمانی)

کے عادی تھے۔ ان ہی حالات نے آریوں کو آمادہ کر لیا، اور وہ شدھی کے پَرچار
میں تن مَن دھن سے مصروف ہوگئے، اور ان کے پرچارک اور مبلغ کونے
کونے میں پہنچ کر مخفی طور پر کام کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ آپہنچا کہ
یہ طے ہوا کہ فلاں دن۔ "پنجروا استھان" پر جو بتیا سے تین کوس پر ہے، ان
سب کی شدھی کی جائے، اور اس کے لیے بنارس، گھور کھپور، اجودھیا وغیرہ سے
بڑے بڑے سوامی مدعو کیے گئے۔

امارت شرعیہ کے کارکن حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ جن کو مولانا
رحمۃ اللہ علیہ کی اس امر میں خصوصی ہدایات حاصل تھیں۔ چنانچہ عین موقع پر
صدر النقیب امارت شرعیہ حافظ محمد ثانی صاحب، اور مولانا ابو محمد صاحب مبلغ
امارت شرعیہ وغیرہ مسلمانانِ بتیا کے ایک پورے جتھ کے ساتھ پہنچے۔ حالات
اس درجہ خطرناک ہوگئے کہ پولیس مع فورس کے نگرانی کے لیے آگئی۔ بلوہ
خطرہ کی شکل میں آکھڑا ہوا۔ مگر مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ہدایات اور تربیت
بروقت کام آگئی۔ اور ظہر کی نماز کے بعد سے تقریریں شروع ہوگئیں۔ آریوں
نے بھی تقریریں شروع کیں، مگر اسلامی تقریروں کا اتنا اچھا اثر ہوا کہ تمام
گدی آریوں سے متنفر ہو کر اپنی چوٹی اور ٹیک کٹوانے لگے، اور بُرے افعال سے
تائب ہوئے۔ باہر کے آئے ہوئے گدی بھی جو شدھی کرانے کے لیے لائے
گئے تھے۔ صحیح معنوں میں شدھ (یعنی پاک ہو کر) وہ بھی تائب ہوگئے۔ آریہ
مبلغ ناکام ہو کر بھاگ نکلے۔

اس واقعہ کے بعد حضرت نائب امیر شریعت نے سربرآوردہ گدیوں کو
بتیا مدرسہ میں جمع کر کے اپنے ساتھ چائے ناشتہ میں شریک کیا، اور ان کی گنجان

آبادیوں میں مکتب کھولنے اور مسجد بنانے اور نماز وروزہ کی پابندی کے انتظامات
شروع کرادیئے۔

موضع سریا میں ایک پختہ مسجد، موضع بھٹولیا میں پختہ کھپرا پوش مسجد
اور موضع کرنمیاں میں خام دیوار کی مسجد اور بہت سی جگہوں میں خس پوش
مسجدیں تیار کرائی گئیں۔ اور موقع موقع سے مکتب کھولے گئے، اور گدیوں کے
بہت سے لڑکوں کو بتیا کے مدرسہ میں داخل کیا گیا، ان کے نام بدل دیئے گئے۔
آج بفضلہ تعالیٰ بہت سے گدی کے نوجوان تعلیم یافتہ مکتب اور اسکولوں میں
ملازمت پر ہیں۔

شدھی کی دوسری کڑی:

اسی سلسلہ کی دوسری کڑی راجہ "تمکوہی" علاقہ گورکھپور کی ریاست
کا ہے۔ جب حضرت نائب امیر شریعت کو یہ اطلاع ملی کہ اس علاقہ کے گدیوں
کی شدھی کی جارہی ہے، اور ان کے گھر کے صحن میں بانس کا جھنڈا گاڑ کر
گھر والوں کو گائے کے دہی، دودھ، گھی میں گوبر اور پیشاب ملا کر اُن کو پلایا جاتا
ہے، اور اس طرح ان کو شدھ کیا جاتا ہے۔ اور بانس کی جڑ میں ایک رسم "نک
دریا" کرائی جاتی ہے۔ اور اسی کے ساتھ مولانا شاہ عبد اللہ صاحب اہرونی کا خط
پہنچا، کہ فلاں تاریخ کو میری مسجد شہید کی جائے گی اور میرا مکان مسمار کیا جائے
گا۔ نیز میری جان کا بھی خطرہ ہے۔ تو حضرت مولانا بیتاب ہوگئے۔ اور فوراً یہ
انتظام کیا کہ نوجوان گدیوں کے تقریباً چالیس افراد کو جو رضاکار بنائے گئے تھے،
ان کے صدر عبد الحکیم گدی کے ساتھ مقدمۃ الجیش بنا کر اور ہدایات دے کر
آگے روانہ کیا۔ اس کے بعد حضرت مولانا اپنے ساتھ مجھ کو لے کر اور مولانا

عبدالرزاق صاحب مبلغ امارت شرعیہ اور حافظ محمد نعیم اور حافظ علی احمد عرف بیچو صاحب انصاری روانہ ہوئے۔ راستہ پر خطر تھا۔ دو جگہ "دریائے گنڈک" اور ایک جگہ "دریا بانسی" کو عبور کرنا تھا۔ یکہ کی سواری تھی۔ حافظ بیچو صاحب رہنمائی کر رہے تھے۔ غلطی سے بے گھاٹ راہ پر یکہ لگ گیا۔ حضرت نائب امیر شریعت کا یکہ پہلے دلدل میں جاپڑا، اور قریب ڈوبنے کے پہنچ گیا۔ اس کے بعد میرا یکہ جس پر مبلغ صاحب بھی تھے دلدل میں جاتا رہا۔ اور وہ بھی ڈوبنے کے قریب ہو گیا۔ مبلغ صاحب اور حافظ محمد نعیم صاحب گھبرا کر چیخ رہے تھے، کہ حضرت فوراً خشکی پر تشریف لے آیئے۔ مگر مولانا باطمینان بیٹھے ہوئے تھے اور "في الباساء` والضراء" والی آیت تلاوت فرمارہے تھے، کہ یکایک تائید غیبی ہوئی۔ اور تینوں یکے جو ہم لوگوں کی سواری میں تھے، مع سوار کے راستہ پر لگ گئے۔ اور سب لوگ بال بال بچ گئے۔

اس کے بعد جب "دریا بانسی" پہنچے، تو مغرب کا وقت ہو چلا تھا۔ کشتی سے دریا عبور کر کے مغرب کی نماز ادا کی گئی۔ اب یہاں سے شاہ عبداللہ صاحب کا مکان تقریباً چھ میل کے فصل پر تھا۔ عجب اضطراب انگیز مصیبت تھی۔ مگر حضرت نائب امیر شریعت باطمینان تمام ہم لوگوں کو تسلی دیتے ہوئے اور رہنمائی فرماتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ ہم لوگ دس بجے شب کو شاہ صاحب موصوف کے مکان پر پہنچ گئے۔

رضاکاروں کی جماعت پہلے پہنچ چکی تھی۔ اس سے حضرت مولانا کی تشریف آوری کی خبر دور دور پہنچ چکی تھی۔ ضلع سارن اور ضلع گورکھپور کے ذمہ دار حضرات اور علماء اور غریب عوام اس خبر کو سن کر کچھ آچکے تھے، اور

زیادہ تر آپ کی تشریف آوری کے بعد پہنچے۔ گدیوں کی جماعت سے (جن میں چالیس رضاکاروں کو بھیجا گیا تھا) اور تقریباً اس علاقہ میں ان کی آبادی چھیالیس ہزار ہے۔ بہت بڑی جماعت کثیر تعداد میں پہنچی۔ اور حملہ آور لوگوں کی (جو گھات میں وقت کا انتظار کر رہے تھے) ان حالات کو دیکھ کر حملہ کی ہمت نہ ہوئی۔ ریاست نے اپنی حدود ریاست میں جلسہ کی ممانعت کر دی تھی۔ جس سے مخمصہ کی شکل پیدا ہو گئی تھی۔ مگر قدرت نے یہ راہ پیدا کی کہ مسٹر ملیکشن صاحب مالک کوٹھی بتزہی نے حضرت نائب امیر شریعت کی تشریف آوری کی خبر سے متأثر ہو کر جلسہ کے لیے اپنی زمین دی۔ اور اسی کے ساتھ جلسے کے تمام سامان شامیانہ اور خیمہ وغیرہ کا خود مسٹر موصوف نے نظم کیا، اور بڑے پیمانہ پر جلسہ ہوا۔ شرکاء جلسہ میں مولوی سبحان اللہ صاحب رئیس اعظم گورکھپور اور مولانا آزاد سبحانی صاحب اور مولانا جمیل احمد صاحب علی گنج بھی تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے علماء کرام تھے، جن کے نام مجھ کو یاد نہیں ہیں، جلسہ کا افتتاح مولوی سبحان اللہ صاحب نے کیا، اور اپنی پر جوش تقریر سے حاضرین کے دلوں کو گرمادیا، اور حق وباطل کی آویزش اور صداقت وحقانیت کی برتری اور کامرانی پر ایسی مدلل تقریر کی کہ شدھی کے خطرات کے تمام تار پور بکھر گئے۔

اس کے بعد حضرت نائب امیر شریعت نے نہایت بلیغ اور پر معنیٰ خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا اور اسی کے ساتھ یہ اعلان فرمایا کہ چمپارن کے گدیوں اور جرائم پیشہ ڈوموں کے پیر یہاں موجود ہیں۔ آپ لوگ ان کی باتوں کو سنیں۔ جلسہ سے شور اُٹھا کہ ہم لوگ ان کی زیارت کرنا چاہتے ہیں۔

حضرت نائب صاحبؒ کے حکم سے میں جلسہ میں پیش ہوا۔ اور گدیوں

کی ابتدائی حالت کی تاریخ جو ہندی میں حضرت نائب امیر شریعتؒ کے ملاحظہ کے بعد طبع کرا کے اپنے ساتھ لیتا گیا تھا، پڑھ کر سنایا، جس سے گدیوں میں جوش وخروش پیدا ہو گیا، اور آریوں کی فریب کاریوں اور دسیسہ کاریوں سے ان کے دلوں میں اپنے ہندو ہونے کے متعلق جو تردد پیدا ہو گیا تھا وہ یک قلم کافور ہو گیا، اور ان کے دل اس یقین سے معمور ہو گئے کہ ہم لوگ مسلمان ہیں۔ خاتمہ پر میں نے گدیوں کے ذمہ دار پیر ہونے کی حیثیت سے اعلان کیا کہ اس کے بعد اگر کوئی زبردستی آپ کے گھروں میں "دھجا" گاڑنے آئے یا "پنچ گپ" کا انتظام کرے۔ یا "نک دریا" کی رسم کرانا چاہے اور آپ کو اس پر مجبور کرے، تو آپ پوری قوت سے اس کا مقابلہ کریں۔ اور جان دینے اور جان لینے کے بھی خطرہ کا کچھ خیال نہ کریں اور صاف کہہ دیں کہ میرے پیر کا یہی حکم ہے۔

اس کے بعد دو روز تک جلسہ ہوتا رہا۔ علماء کرام کی اصلاحی اور تبلیغی تقریریں ہوتی رہیں۔ ان ہی حالات میں معلوم ہوا کہ راجہ صاحب اوّل ہی روز موٹر سے بنارس روانہ ہو گئے، اور آریہ سماج کے سوامی شہر سنگھ جو بڑے جنگجو مشہور تھے، وہ بھی روانہ ہو گئے، اور کسی کو مقابلہ کی ہمت نہ رہی، یہ سب برکات حضرت نائب امیر شریعت کی رہنمائی اور حسن تدبر اور تدبیر کی تھیں۔ جو بروقت کام آئیں، اور اس طرح یہ مورچہ کامیابی کے ساتھ مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ اس کے بعد حضرت مولانا نے موضع ڈبنی اور صاحب گنج بازار اور چند مقاموں پر گدیوں کی تعلیم کے لیے مدرسے قائم کر دیئے۔

جرائم پیشہ ڈوموں کی اصلاح:

چمپارن میں جرائم پیشہ ڈوموں کو پورے ضلع سے جمع کر کے گورنمنٹ نے چوترواسلمنٹ تھانہ بگہا اور ہری نگر تھانہ رام نگر میں رکھا تھا، اور اصلاح کے لیے ان کو سلوشن آرمی کے حوالہ کیا گیا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد معلوم یہ ہوا کہ ان کو کرشچین بنایا جارہا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ آریہ سماجیوں نے بھی ریشہ دوانی شروع کر دی ہے۔ حضرت نائب امیر شریعت اس صورتِ حال سے بہت متأثر ہوئے، اور مجھ کو ہدایات دے کر ارشاد فرمایا کہ وہاں جاکر ان کی اصلاح کرو۔ اور اسلام کی تبلیغ کرو۔ حسبِ ارشاد میں اور مولانا حفیظ الحسن صاحب مبلغ امارت شرعیہ ہری نگر سٹلمنٹ گئے۔ اور حسب ہدایات حضرت مولانا تبلیغ شروع کر دی، جس کا نتیجہ بہت بہتر نکلا، اور ان کی کثیر تعداد اسلام میں حلقہ بگوش ہو گئی۔ اور پھگوا تہوار کے سلسلہ میں جو دو تین دن کے بعد ہونے والا تھا ان لوگوں نے حسب دستور قدیم سور (خنزیر) شراب، گانجا وغیرہ جمع کیا تھا۔ ان سب سامان کو برباد کر دیا۔ سور جنگل میں چھوڑ دیئے گئے۔ شراب اور گانجا کو نالیوں کے نذر کیا گیا۔

یہ خبر تمام بجلی کی طرح پہنچ گئی۔ اور متمول ہندو بڑے بڑے سوامی کے ساتھ زرپاشی کے لیے روپیہ لے کر پہنچ گئے اور لالچ دے کر شدھی کی ترغیب دینے لگے۔

لیکن اسلام کی سادگی اور معاشرتی مساوات ان کے دل میں گھر کر چکی تھی، انھوں نے مطالبہ کیا کہ آپ لوگ میرے ساتھ بیٹھ کر کھانے کے لیے تیار ہیں؟ ہم کو جنھوں نے کلمہ پڑھایا ہے۔ ایک ساتھ کھاتے ہیں۔ ایک بستر پر

سوتے ہیں۔ ایک مسجد میں ایک ساتھ کھڑے ہو کر نماز پڑھتے ہیں۔ کوئی فرق اور امتیاز میرے ساتھ نہیں برتتے ہیں۔

جب اس سے وہ مایوس ہوگئے تو تھانہ کی طرف رجوع کیا۔ وہاں سے سب انسپکٹر کو مع چند کانسٹبل کے لے کر وہاں پہنچے، جہاں ہم لوگ نئی مسجد بنا کر قیام کیے ہوئے تھے۔ الزام یہ رکھا گیا کہ آپ لوگوں نے خلافِ قانون سٹلمنٹ کو بہکا کر خراب کیا ہے۔ ہم لوگوں کی طرف سے جواب دیا گیا کہ ہم لوگوں کا کوئی آدمی سٹلمنٹ میں ابھی تک نہیں گیا ہے، جو میرے پاس آکر اسلام قبول کرتا ہے، ہم لوگ اس کو اسلام کی تلقین کرتے ہیں اور مسلمان بناتے ہیں۔ اس پر وہ خاموش ہوگئے۔

جب انسپکٹر صاحب جانے لگے، تو میں نے ان سے کہا کہ چند منٹ ٹھہر جائیے، سٹلمنٹ کے مرد وعورت کی ایک جماعت غسل کرنے کے لیے دریا گئی ہے۔ ابھی آکر آپ کے سامنے اسلام قبول کرے گی۔ آپ بھی اس کو دیکھ لیں، تاکہ رپورٹ میں سہولت ہو، اتنے میں تیس آدمی آگئے۔ جن کو مولانا محمد حفیظ الحسن صاحب مبلغ امارت شرعیہ نے کلمہ پڑھایا، اور ان لوگوں نے اپنی چوٹی اور مونچھ کے بال اپنے ہاتھ سے کاٹ کر وہاں رکھا، جہاں اور بھی یہ شعار کفر پہلے سے رکھے ہوئے تھے۔

اس کے بعد موضع کولہوا چوتروا (جو مسلمانوں کی بستی ہے اور سٹلمنٹ کے قریب واقع ہے) آگئے۔ اور وہاں کی مسجد میں قیام کیا۔ جرائم پیشہ ڈوم وہاں بھی پہنچتے رہے۔ اور مسلمان ہوتے رہے۔ چند دنوں میں سٹلمنٹ کا تقریباً نصف حصّہ مسلمان ہوگیا۔ اس جرم میں کہ ان لوگوں نے اسلام کیوں قبول کیا۔ آئینی

اور غیر آئینی طریقہ پر مصیبت میں مبتلا کیے گئے۔ مگر بحمد اللہ وہ لوگ اپنے اسلام میں پختہ ثابت ہوئے، اور ان کے استقلال ایمانی میں کوئی لغزش نہیں ہوئی، اور پورے صبر واستقامت کے ساتھ یہ لوگ آج تک اسلام پر ثابت قدم ہیں۔

ان حالات میں مایوس ہو کر شدھی کے پرچارک آریہ سماجی جو سیکڑوں کی تعداد میں چمپارن میں متعین کیے گئے تھے۔ مرکز کے عتاب میں آکر موقوف کیے گئے۔ اور سلوشن آرمی کے پادری کا درجہ توڑ دیا گیا اور وہاں سے تبدیل کر دیئے گئے۔

انسداد فسادات

حضرت نائب امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی یہ خصوصیت تھی کہ جس طرح وہ مخالفین اسلام کے تعمیری کاموں پر نگاہ رکھتے تھے، اور ان کی شدھی اور سنگھٹن کی ہر حرکت پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ ان کے تخریبی کاموں پر بھی نگاہ رکھتے تھے، اور اس کی مدافعت اور انسداد کرتے تھے۔

چنانچہ موضع بیلابلاس پور میں جب مفسد ہندوؤں نے عیدالاضحیٰ کے موقع پر فساد کیا، اور مسجد کو اور چند مسلمانوں کے مکان کو توڑا، اور مسلمانوں کو مجروح کیا۔ تو حضرت نائب امیر شریعت مجھ کو اور مولوی محمد ثانی صاحب کو لے کر یہاں تشریف لائے، اور مظلوم مسلمانوں کی ہر طرح کی ہمدردی کی اور ان کے مقدمہ کی کامل پیروی کی۔ اور اس کے لیے جملہ مبادیات کو بہم کیا، اور مسلمان کامیاب ہوئے اور ہندو سزایاب ہوئے۔

اسی طرح سوگولی، چٹپا، اختہ کے شدید بلوے اور ضلع چمپارن کے گوشہ گوشہ کے جزئی فسادات میں (جو ان دنوں بکثرت ہو رہے تھے) حضرت

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے مقدمات کی اس طرح نگرانی فرمائی کہ کارکنان امارت شرعیہ چمپارن ہر موڑ پر کامیاب رہے۔

ہندوانہ مراسم کی اصلاح:

اس علاقہ کی جہالت کی وجہ سے شادی میں ہندوانہ مراسم کا عام شیوع تھا۔ اسی بنا پر عقد ثانی کرنا سخت معیوب تھا، اور اس کا اظہار کرنے والا انتہادرجہ کا معتوب ہوتا تھا۔ چمپارن میں یہ مردہ سنت حضرت نائب امیر شریعت کی وجہ سے زندہ ہوئی۔ اور شیخ شمس الدین صاحب کا نکاح جو موضع سبیا کے سربر آوردہ لوگوں میں سے ہیں ان کی بیوہ بھاوج سے کیا گیا۔ اس کا اثر پورے علاقہ پر یہ ہوا کہ وہ تمام کراہیت جو قدیم سے اس سنت کی انجام دہی میں حائل تھی وہ مفقود ہوگئی۔ اور پورے علاقہ میں عقد ثانی کا اجرا ہوگیا۔ اور آج تک ہوتا ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک بری رسم یہ بھی تھی کہ چھوٹے بھائی کی بیوہ بی بی سے عقد کرنا نہایت ہی برا سمجھا جاتا تھا۔ آپ کی وجہ سے اس کی بھی اصلاح ہوئی، بعض کا نکاح چھوٹے بھائی کی بیوہ بی بی سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے کر دیا۔

اسی سلسلہ کی ایک کڑی شادی میں اسراف بیجا اور غیر ضروری تزک و احتشام اور لہو ولعب بھی تھا۔ جس کے لیے مسلمان سودی قرضہ لیتے تھے، اور اپنی جائداد مرہون اور فروخت کر دیتے تھے، اور اس طرح یہ شادی خانہ آبادی ساتھ ساتھ خانہ بربادی بھی ہو جاتی تھی۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی مساعی سے یہ اسراف بیجا بھی بند ہوگیا۔ اب عموماً لڑکا والے طعام ولیمہ کرتے ہیں۔ اور لڑکی والے حسب لیاقت جہیز دیتے ہیں۔

شیخ فیض القدیر صاحب رئیس بگہی کے لڑکے کی شادی شیخ محی الدین

صاحب سبیا کی لڑکی سے جس اسلامی سادگی کے ساتھ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی موجودگی میں ہوئی، وہ چمپارن کی تاریخ میں یادگار واقعہ رہے گا۔ حضرت نائب امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ لڑکے کو مع چند خاص اصحاب کے سادہ لباس میں لے کر سبیا پہونچے، عصر اور مغرب کے درمیان حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے عقد پڑھایا۔ اس کے بعد حاضرین نے چائے پی، اور اسی دن لڑکی بیل گاڑی کی سواری سے رخصت کر دی گئی۔ حالاں کہ طرفین کے لوگ اللہ کے فضل وکرم سے اپنے گاؤں کے رئیس ہونے کے علاوہ دونوں حضرات کے پاس متعدد ہاتھی، گھوڑے، ٹمٹم، موجود تھے۔

حافظ ہیبت صاحب کا واقعہ:

علاقہ رام نگر جنگل کی ترائی میں دورہ فرماتے ہوئے حضرت مولاناؒ موضع سبیا کے سامنے پہنچے۔ تو وہاں آپ کے انتظار میں حافظ ہیبت صاحب مرحوم اور ان کے خاندان کے تمام افراد سڑک پر موجود تھے۔ انتظار کی وجہ یہ بیان کی کہ شیخ شمس الدین صاحب کی بی بی دردِزہ میں مبتلا تھیں۔ سول سرجن دو دفعہ آچکے ہیں اور اب ان کا فیصلہ یہ ہے کہ بچہ پیٹ میں مرچکا ہے۔ فوراً اسپتال لے جاؤ، ورنہ زچہ کی جان پر بن جائے گی۔ ضرورت ہے کہ بچے کو پیٹ چاک کرکے فوراً نکالا جائے۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ سواری سے اُترے اور زچہ کے کمرے کے دروازہ پر کھڑے ہو کر فرمایا، کہ ایک عورت زچہ کے پیٹ کو دبائے، اور اپنی ہتھیلی پر انگلی رکھ کر کچھ لکھا اور تالی لگادی، اور غریب خانہ پر بگہی تشریف لے آئے۔ ایک گھنٹہ کے بعد حافظ صاحب مرحوم شاداں وفرحاں دوڑتے ہوئے آئے، اور کہا کہ حضرت آپ کی توجہ سے زندہ لڑکا پیدا ہوگیا۔

زچہ ہوش میں آگئی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ایک دوسری مشکل چیز پیش کی، کہ میری لڑکی پر کچھ دنوں سے جن مسلط ہو گیا ہے۔ بڑے بڑے عامل آئے اور ناکام گئے بعض عامل قبل اس کے کہ پہنچیں راستہ ہی سے افتاں خیزاں اس لیے بھاگ گئے کہ جن نے پہنچنے سے پہلے ہی دوچار مرتبہ ان کو راستہ میں پٹکا۔ حضرت مولاناؒ نے ایک تعویذ لکھ کر دیا، اور کچھ روغن دم کر کے حوالہ کیا۔ اس دن سے جن کی پھر آج تک تسلیط نہیں ہوئی ہے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے واقعات کے یہ چند شذرات ہیں جو ارتجالاً قلمبند کر کے بھیج رہا ہوں، کیوں کہ

نمی گردید کوتہ دامن معنی رہا کردم
حکایت بود بے پایاں بخاموشی ادا کردم[108]

[108] حیات سجاد، ص ۱۲۰

امیر ملت ورہبر امت

حضرت مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجادؒ[109]

مولانا عظمت اللہ ملیح آبادیؒ[110]

مولانا ابو المحاسن سید محمد سجادؒ صوبہ بہار، پنہسا[111] ضلع پٹنہ کے رہنے والے تھے، بہار کے مشہور فلسفی مولانا عبد الوہاب اور مولانا عبد الکافی الہ آبادی سے درسی تعلیم حاصل کر کے دار العلوم دیوبند میں حضرت شیخ الہندؒ کے درس میں شریک ہوئے[112]۔

[109] یہ مضمون ایک سہ ورقی کتابچہ کی شکل میں ہمیں اخیر میں جامعہ رحمانی مونگیر کے کتب خانہ سے حاصل ہوا، جس کے سرورق پر "حیات سجاد— مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ ناظم اعلیٰ جمعیۃ علمائے ہند، نائب امیر شریعت کے مختصر حالات از مولانا عظمت اللہ صاحب (ملیح آبادی) حسب ارشاد حضرت مولانا عبد الحکیم صاحب صدیقی ناظم جمعیۃ علمائے ہند دہلی، انصاری برقی پریس دہلی میں چھپا" لکھا ہے، عنوان کو معنون کے مطابق کر دیا گیا ہے، یہ مولانا سجاد کی شخصیت پر میسر تحریرات میں سب سے اولین تحریر ہے۔

[110] افسوس کہ مولانا عظمت اللہ ملیح آبادی کے حالات ہمیں نہ مل سکے، شاید دیوبند کے فضلاء میں تھے، اور جمعیۃ علمائے ہند سے تعلق تھا۔

[111] اصل کتابچہ میں پھینسا لکھا ہے، بعد مکانی کی بنا پر ایسی غلطی بعید از قیاس نہیں۔

[112] مولانا عبد الحکیم صاحب ملیح آبادی نے اپنے مضمون میں اس کی تردید کی ہے۔

مولانا اپنے شوق مطالعہ، تبحر علمی، خداداد حافظہ، اصابت رائے اور بلندی فکر میں امتیازی درجہ رکھتے تھے، حسن اخلاق، تقوی و قناعت، خلوص وللّٰہیت، ایثار و جفاکشی کے اوصاف جو ایک امیر ملت اور رہبر امت کے لئے ضروری ہیں مولانا میں پورے طور پر موجود تھے۔

مولانا نے اپنے اساتذہ کرام کی علمی اور روحانی مجلسوں سے جو فیض حاصل کیا، اس کی اشاعت کے لئے بہار کے مشہور تاریخی شہر گیا میں مدرسہ انوار العلوم قائم کیا۔ جہاں آپ عرصہ تک مذہبی اور سیاسی علوم کا درس دیتے رہے۔ ساتھ ہی ساتھ امام شاہ ولی اللہ دہلوی کے کامیاب انقلابی پروگرام کو ایک خاموش اور پُرجوش مبلغ ہونے کی حیثیت سے چلاتے رہے۔ اسی زمانہ میں صوبہ بہار عیسائی مشنریوں کا مرکز بنا ہوا تھا ان کی دیکھا دیکھی قادیانیوں نے بھی اپنے پیر جمانے شروع کر دیئے تھے۔ حضرت مولانا محمد علی مونگیری جو اپنے زمانہ کے عالم باعمل بزرگ تھے، وہ عیسائیوں کے خلاف تبلیغ کر رہے تھے۔ مولاناؒ نے اس کام میں ان کا ہاتھ بٹایا، ان متفقہ کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ صوبہ بہار میں عیسائیوں اور قادیانیوں کا زور ٹوٹ گیا اور جو توقعات وہاں کے مسلمانوں سے ان کو تھیں ختم ہو گئیں۔

۱۹۱۴ء میں جب جنگ عظیم شروع ہوئی تو ہندوستان بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔ تُرک جرمن کے ساتھ شریک ہو گئے، ہندوانہ قوانین کا نفاذ ہوا ملک میں ایک ہل چل مچی ہوئی تھی مگر مولانا کا حلقہ عمل درس کی چہار دیواری سے آگے نہ تھا۔ ۱۹۱۵ء میں مولانا کے تمام رفقاء کار نظر بند کر دئے گئے۔

حضرت مولانا محمود الحسنؒ مکہ معظمہ چلے گئے۔ برطانیہ نے شریف حسین کے ذریعہ ان حضرات کو گرفتار کرا کے مالٹا میں قید کر دیا۔

استاد کی اسیری اور رفقائے کار کی کی نظر بندی نے مولانا کو مدرسہ کی زندگی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ملک میں یا خیر خواہی اور وفاداری تھی، یا خاموشی یا گوشہ نشینی تھی۔ مولانا نے ہندوستان کے مختلف مقامات کا دورہ کیا۔ علماء، صوفیا اور تعلیم یافتہ لوگوں کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلائیں، لوگ آپ کے مخلصانہ جذبہ اور فداکارانہ عمل کو دیکھ کر تحریک حریت میں شریک ہوئے۔ مدرسہ کے عالم، خانقاہ کے صوفی، کالج اور عدالتوں کے تعلیم یافتہ اور قانون داں مولانا کے ساتھ ہوئے۔ تحریک حریت و آزادی پوری قوت کے ساتھ ملک میں پھیلی جس میں مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی تمام قومیں اپنی اپنی جگہ شریک ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔

اس وقت تک ہندوستان میں علماء کا کوئی با قاعدہ نظام نہ تھا، نہ علماء میں جماعتی زندگی کا احساس تھا۔ پوری فضائے ہند تنظیم علماء کی تحریک سے خاموش تھی۔ مولانا کو علماء کی جماعتی زندگی کا خیال آیا اور ۱۹۱۷ء میں مدرسہ انوار العلوم کے سالانہ اجلاس کے موقعہ پر جمعیۃ العلماء بہار کی طرح ڈالی، اس کی دیکھا دیکھی دوسرے صوبوں میں بھی جمعیت علماء قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ محکمۂ قضاء کے نہ ہونے سے مذہبی زندگی میں جو دشواریاں پیش آرہی تھیں مولانا اس سے غافل نہیں تھے۔

۱۴ء سے پہلے گورنمنٹ نے جو برائے نام محکمہ قضا قائم کر رکھا تھا اس کو بھی منسوخ کر دیا گیا۔ جس سے مسلمان ایک ایسے محکمہ سے محروم ہو گئے جو ان کے خانگی اور مذہبی قانون کو نافذ کرتا تھا۔

۱۶ء میں کانگریس اور لیگ کا جو معاہدہ ہوا، اس میں بھی محکمہ قضا اور اسلامی پرسنل لا کے تحفظ کو نظر انداز کر دیا گیا۔

۱۹۱۷ء میں ملک معظم کا اعلان حکومت خود اختیاری کے متعلق شائع ہوا، جس میں ہندوستان کو ذمہ دار حکومت دینے کا وعدہ کیا تھا۔ جب مسٹر مانٹیگو وزیر ہند اس اعلان کے لئے ہندوستان آئے تو ہندوستان کی تمام جماعتوں نے اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق عرضداشتیں پیش کیں۔ مگر مولانا نے ان کے پاس محکمہ قضاء کے متعلق ایک عرضداشت بھیجی کہ گورنمنٹ مسلمانوں کے خالص مذہبی معاملات اور مقدمات کے فیصلے کے لئے جن میں مسلمان حاکم شرط ہے محکمہ قضا قائم کیا جائے اور اس کو ان مقدمات کے متعلق ڈسٹرکٹ جج کے برابر اختیارات دیئے جائیں۔ مولانا کی اس عرضداشت پر کوئی توجہ نہ کی گئی۔ مگر مولانا اپنے اس مطالبہ سے کسی وقت بھی غافل نہ ہوئے۔ ۱۹۱۹ء میں مولانا نے صوبہ بہار میں امارت شرعیہ قائم کی جس کے تحت محکمہ قضا قائم ہوا اور قاضی کے ذریعہ طلاق، فسخ نکاح وغیرہ کے متعلقات مقدمات کے فیصلے ہونے لگے، محکمہ تعلیم، شعبہ تبلیغ، بیت المال بھی قائم کیا گیا، یوں سمجھئے کہ مولانا نے مسلمانوں کے مذہبی اور خانگی معاملات کے فیصلہ کرنے کے لئے اسلامی نظام قائم کر دیا۔ مولانا چاہتے تھے کہ ہندوستان کے تمام صوبوں میں امارت شرعیہ قائم ہو۔ مسلمانوں کے تمام معاملات اسی سے طے ہوں۔ مگر مولانا اس

کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ۱۹۲۱ء میں جمعیۃ علمائے ہند کے اجلاس میں جو لاہور میں مولانا ابو الکلام آزاد کی صدارت میں ہوا تھا۔ یہ طے ہوا تھا کہ تمام ہندوستان میں امارت شرعیہ قائم کی جائے۔ مولانا نے اس کا نظام نامہ مرتب کیا مگر حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے اب تک امارت کی اسکیم ہندوستان میں کامیاب نہ ہو سکی۔ ۱۹۴۰ء میں جمعیۃ علمائے ہند کے اجلاس جونپور میں امارت کی تحریک پھر شروع ہوئی۔ مولانا کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح امارت شرعیہ کا نظام ہندوستان میں پھیل جائے، "محکمہ قضا" گورنمنٹ خود قائم کرے، اور جب تک گورنمنٹ اس کی ضرورت کو تسلیم نہ کرے تو اس وقت تک مسلمان اپنے طور پر اس محکمہ کو قائم کریں۔

۱۹۱۸ء میں ٹرکی کی شکست اور اس کی سلطنت کی تقسیم نے مسلمانوں کو اتحادیوں کی طرف سے بددل کر دیا۔ ہندوستان میں ان کے خلاف احتجاجی جلسے شروع ہو گئے، مولانا نے اس نازک موقع پر جب کہ ملک میں ہنگامی قوانین جاری تھے۔ بلاخوف و خطر اعلان حق کیا، ممالک اسلامیہ کی حفاظت جزیرۃ العرب اور خلافت اسلامیہ کی اہمیت سے لوگوں کو واقف کرایا۔ ان کے تحفظ وبقا کے لئے لوگوں کو ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کی، ملک میں پوری قوت کے ساتھ خلافت کی تحریک پھیلی جس سے مسلمانوں میں آزادی اور خود مختاری کے حصول کا ایک بے پناہ جذبہ پیدا ہو گیا۔

۱۹۱۹ء میں ہندوستان کی فضا تحریک آزادی کی پکار سے گونج رہی تھی۔ عام سیاسی حالات جلد جلد بدل رہے تھے۔ قومی حقوق کے تحفظ اور ملک کی آزادی کا سوال اہمیت اختیار کر رہا تھا۔ انفرادی اور شخصی رائے کی کوئی حیثیت نہ

رہی تھی ان ہنگامہ خیز اور حریت پرور فضا میں علماء نے اپنی مرکزیت اور اجتماعی زندگی کی ضرورت کو محسوس کیا۔ مولانا جو اس تحریک کے بانی اول تھے ان نازک حالات میں جمعیۃ علماء ہند کے قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے، اس طرح ہندوستان کے تمام علماء نے ایک مرکز پر جمع ہوکر ملک وملت کی خدمت کا تجدید عہد کیا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی توجہ عام طور پر اب جمعیۃ علماء کی طرف ہو گئی۔ لوگ جمعیۃ علماء کے فیصلوں کے منتظر رہنے لگے۔ ۱۹۲۰ء میں جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس دہلی میں ہوا، جلسہ کے صدر حضرت شیخ الہندؒ تھے۔ اس جلسہ میں ہندوستان بھر سے بہت بڑی تعداد میں علماء شریک ہوئے تھے۔ پیدا شدہ حالات کے متعلق لوگ اسلامی احکام کے منتظر تھے، مولانا نے حالات حاضرہ کے پیش نظر ایک فتویٰ مرتب کیا جس پر پانچ سو کے قریب علماء کے دستخط تھے، جب یہ فتویٰ شائع ہوا تو حکومت نے اس کو ضبط کرلیا۔

۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء تک ہندوستان کی تمام قوموں نے مل کر جس اتحاد کا مظاہرہ کیا تھا، وہ ایک معلوم مگر غیر محسوس طاقت کے ذریعہ ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۳ء میں اختلاف وعدوات میں تبدیل ہوگیا۔ ملک کی عام فضا فرقہ وارانہ جھگڑوں کی وجہ سے مکدر ہوگئی، امن وامان تباہ ہوگیا، قتل وغارت، لوٹ مار کے واقعات عام طور پر ہورہے تھے۔ مولانا ملک کی اس تباہی وبربادی کو برداشت نہ کرسکے اور اس مقصد کے پیش نظر مسلم اور غیر مسلم لیڈروں کو ایک جگہ جمع کر کے ملک میں عام سکون اور اعتماد کی فضا پیدا کردی۔

۱۹۲۵ء میں مرادآباد میں جمعیۃ علماء ہند کا عام اجلاس ہوا۔ مولانا اس کے صدر تھے۔ آپ نے اپنے خطبہ کے ذریعہ تمام ہندوستانیوں کو اتفاق اور

اسلامی رواداری کا پیغام دیا۔ مسلمانوں کو آزادیٔ وطن، محکمۂ قضا کے قیام اور اسلامی پرسنل لا کے تحفظ کی دعوت دی۔ اسلامی تعلیم کی روشنی میں مسلمانوں کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلائیں۔ مولانا کے اس پیغام کا عام طور پر تمام قوموں پر اچھا اثر ہوا، مسلمان جو فرقہ وارانہ جھگڑوں کی وجہ سے ملکی تحریکات میں برداشتہ خاطر ہورہے تھے پوری دل چسپی لینے لگے۔ متعلقہ مطالبات پیش کرنے اور مسلم حقوق کے تحفظ کے لئے آل پارٹیز کانفرنس کا انعقاد، نہرو رپورٹ پر تنقید، سائمن کمیشن کا بائیکاٹ، یہ تمام سرگرم تحریکیں مولانا ہی کی قوت عمل کا نتیجہ ہیں، ۳۰ء اور ۳۳ء کی سول نافرمانی میں مسلمانوں کی شرکت، جمعیۃ علماء کا سول نافرمانی کے معاملہ میں کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل، دائرہ حربیہ کا قیام، ان تمام کاموں میں مولانا کی قوت فکر وعمل کا بہت بڑا حصہ ہے۔

۱۹۱۵ء سے اس وقت تک کی وہ کونسی تحریک ہے جو سرکاری اور غیر سرکاری اداروں، سیاسی اور مذہبی جماعتوں کی طرف سے ملک وملت کے مفاد کے خلاف پیش ہوئی اور مولانا نے اس کے خلاف احتجاج نہ کیا ہو، حجاز میں مؤتمر اسلامی، حجاج کے لئے نیا قانون، معلمین حج کا قانون، اسلام کے معاشرتی قوانین، اسلامی اوقاف کی حفاظت، اردو زبان کی حفاظت، واردھا اسکیم پر تنقید، غرض کہ وہ کون سا مسودہ، بل یا تجویز ہو جس پر مولانا نے مذہبی اور سیاسی تنقیدی نظر نہ ڈالی ہو، ملکی اور قومی مفاد کی وہ کونسی تحریک تھی جس میں مولانا نے شرکت نہ کی ہو، مولانا ہندستان کو مکمل طور پر آزاد دیکھنا چاہتے تھے، تحریک "آزادی کامل" کے محرک مولانا ہی تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ دوسری جماعتیں آزادی کامل کے مطالبہ پر غور کررہی تھیں۔ ۳۰ء و ۳۲ء تک مولانا نے جمعیۃ علماء کے

مرکزی دفتر دہلی میں دائرہ حربیہ قائم کر کے سول نافرمانی میں حصہ لیا اور اس وقت تک اس کو جاری رکھا جب تک تحریک بند نہ کر دی گئی۔۱۹۳۱ء میں گول میز کانفرنس کے موقع پر جمعیۃ علماء نے کانگریس کے مقابلہ میں متبادل فارمولہ تیار کیا جس میں پرسنل لا کا تحفظ، محکمۂ قضا کا قیام، کلچر، زبان، رسم الخط، تعلیم، صوبوں کی تقسیم، طریقۂ انتخاب، طرز حکومت، حق رائے دہی، ملازمتوں میں تناسب وغیرہ۔ اس فارمولا کے مطابق کانگریس نے گول میز کانفرنس میں معاملات طے کرنے کی کوشش کی، مگر بعض حالات کی بنا پر طے نہ ہو سکے، جس کی وجہ سے آزادی وطن اور تحفظ حقوق کا بہترین موقع جاتا رہا، اس عظیم الشان اور بنیادی فارمولا کی ترتیب میں مولانا کا بڑا حصہ ہے۔اسمبلی کونسلوں اور دوسرے پبلک اداروں میں مولانا اپنی مستقل پارٹی رکھنا چاہتے تھے۔ اس لئے خصوصیت کے ساتھ صوبہ بہار میں مولانا نے انتخابات میں حصہ لیا، امارت شرعیہ کے نام پر کامیاب الیکشن لڑائے،۱۹۳۶ء میں انڈیپنڈنٹ پارٹی کے نام پر الیکشن لڑا، بہار میں مخلوط وزارت قائم کی۔ اردو زبان بہار میں سرکاری زبان تسلیم کی گئی،واردھا تعلیمی اسکیم کی مخالفت کی اور صوبہ بہار میں عام تعلیم کے بجائے مذہبی تعلیم کو لازم قرار دینے کی کوشش کی۔

خلع ایکٹ کی ترتیب اور اس کو مستقل قانون بنوانے میں مولانا نے ہر ممکن سعی کی جو اب کاظمی ایکٹ کے نام سے مشہور ہے۔اس ایکٹ کی دفعہ نمبر۶ میں مسلم حاکم کی قید کو باقی نہ رکھا گیا۔ مولانا چاہتے تھے کہ دفعہ ۶ میں تبدیلی ہو جائے اور مسلم حاکم کی قید بڑھادی جائے، اس قانون ہی کو ختم کر دیا جائے۔ اس سلسلہ میں مولانا نے وائسرائے سے بھی خط وکتابت کی اور ایک فتوی مرتب کر

کے علماء سے رائے لی، آزاد کانفرنس کے سوال نامہ کی ترتیب کے بعد مولانا اس کے جوابات میں مصروف تھے۔ مولانا اپنی زندگی کے آخری ایام میں اس بات کے آرزومند تھے کہ محکمہ قضا کا قیام اور کاظمی ایکٹ کی دفعہ ۶ کی تبدیلی اور آزاد کانفرنس کے سوال نامہ کے مطابق مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ہو جائے۔

مولانا کی سرگرمیوں اور عملی زندگی کا یہ ایک مختصر خاکہ ہے۔ مولانا نے جمعیۃ علماء ہند کے توسیعی نظام کے سلسلہ میں ایک مستقل پروگرام بنایا تھا، وہ عام مسلمانوں کو جمعیۃ علماء سے وابستہ کرنا چاہتے تھے، اس مشغولیت میں مولانا کی بصارت اور عام صحت کمزور ہو گئی تھی، مگر ہمت اور اولوالعزمیوں میں رفعت اور بلندی ہوتی گئی۔ مولانا امارت کے پروگرام کے لئے صوبہ بہار کا دورہ کر رہے تھے کہ ملیریا میں مبتلا ہو گئے اور ایک ہفتہ بیمار رہ کر ۶۱ سال کی عمر میں عصر کے وقت پیر کے دن اس دار فانی سے رحلت کر گئے اور پھلواری شریف میں علم و عمل کا آفتاب اور اخلاق وروحانیت کا پیکر سپرد خاک ہو گیا۔ جمعیۃ علماء ہند امارت شرعیہ اور دوسری آزاد خیال جماعتیں مولانا کی سیاسی رائے اور مذہبی تفقہ سے اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئیں۔ مولانا کی زندگی سادہ تھی، گذارہ معمولی تھا، دیانت و امانت کا اعتراف اپنوں ہی کو نہیں بلکہ بیگانوں کو بھی ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا کی تاریخ وفات ۱۷ شوال دوشنبہ ۱۳۵۹ھ ہے۔

میرے مخدوم حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد"
"ایک مرد کامل اور عضو عامل"

مولانا شاہ محمد عثمانیؒ[113]

میں نہیں کہہ سکتا کہ میں نے مولانا کو کب سے جانا۔ مولانا کے تعلقات میرے خاندان والوں سے اپنوں کی طرح تھے۔ وہ مولانا سے محبت کرتے تھے اور مولانا ان سے، میرا مکتب بھی مولانا نے کیا تھا، اس محبت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب مولانا سجادؒ کو معلوم ہوا کہ راقم الحروف کے ایک

[113] شاہ محمد عثمانی کا تعلق سملہ (اورنگ آباد) کے قدیم عثمانی خانوادہ سے ہے، ۱۹۱۵ء میں ان کی پیدائش ہوئی، حضرت مولانا سجادؒ نے مکتب کرایا، پھر مدرسہ انوار العلوم میں تعلیم کے بعد کلکتہ میں مدرسہ عالیہ اور پریسڈنسی کالج میں تعلیم کی تکمیل کی، اور کچھ دنوں وہیں اخبار نویسی کی خدمت انجام دی، پھر وطن آگئے، اس کے بعد معاشی ضرورت کے پیش نظر تقریبا دو سال بھوپال میں گذارے، اس دوران ملک وملت کے ممتاز قائدین وعلماء سے ان کے مراسم بڑھتے گئے، دو سال کے بعد مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہارویؒ کی دعوت پر بہار آکر پٹنہ میں جمعیۃ علماء کی شاخ بہار کے ذمہ دار رہے، پھر امارت شرعیہ کے ترجمان نقیب کے مدیر رہے، ایک طویل مدت تک اس کی خدمت انجام دے کر مستعفی ہوگئے، پھر کچھ دنوں بعد حجاز چلے گئے اور تا وفات وہیں مقیم رہے، ۲۱/ اپریل ۲۰۱۱ء کو وفات پائی۔ حالات کے لئے خود ان کی کتاب "ٹوٹے ہوئے تارے" کا مقدمہ دیکھئے جو ان کے فرزند پروفیسر محسن عثمانی کے قلم سے ہے۔

بزرگ کو سانپ نے کاٹ لیا ہے اور کوئی علاج کامیاب نہیں ہے، تو اپنے بنگالی شاگردوں سے پوچھا کہ ان میں کوئی سانپ کا جھاڑ جانتا ہے۔ بنگالیوں نے کہا کہ وہ جانتے ہیں، اور اگر ناک سے خون نہیں گرا ہے تو امید ہے کہ وہ اچھے ہو جائیں گے۔ مولانا ان کو لے کر دیہات آئے جہاں راقم الحروف کے یہ بزرگ مقیم تھے۔ لیکن اس سے پہلے ان کو مردہ سمجھ کر دفن کیا جا چکا تھا، بنگالیوں نے پھر کہا کہ اگر ناک سے خون نہیں گرا ہے تو وہ اچھے ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ مولانا نے قبر کھلوا کر لاش نکلوائی۔ لیکن جب میت کو بیٹھانے کی کوشش کی گئی تو ناک سے خون آگیا، بنگالیوں نے کہا کہ اب ان کا انتقال ہو گیا۔

میں جب مدرسہ انوار العلوم میں داخل کیا گیا تو اس وقت تک مولانا نے انوار العلوم سے کچھ تعلق باقی رکھا تھا اور ہر ماہ کا کچھ حصہ وہ مدرسہ میں گذارتے تھے، وہاں مجھ کو مولانا کو دیکھنے کا موقعہ ملتا تھا۔ گیا کے دوران قیام میں مدرسہ کے سالانہ جلسے میں نے کبھی نہیں چھوڑے، جس میں مولانا کے علاوہ مولانا احمد سعید صاحب، مولانا عبد الحلیم صدیقی، مولانا ابو القاسم سیف بنارسی اور مولانا نثار احمد کانپوری کی تقریریں سنتا تھا۔ مولانا احمد سعید صاحب کی تقریروں سے مجھ کو کافی فائدہ بھی پہنچا اور میری معلومات میں کافی اضافہ ہوا۔ یہ میرے بچپن کا زمانہ تھا، علماء سے میری واقفیت اور تعلقات کا آغاز اسی عہد میں ہو گیا تھا۔ نقیب اخبار بھی میرے نام برابر آتا تھا، اس سے بھی مولانا کا کچھ حال معلوم ہوتا رہتا تھا۔ والد کی مجلس میں سیاسی تبصرے ہوتے تو جمعیۃ علماء اور بالخصوص مولانا کی پرزور حمایت کی جاتی، مولانا محمد علی جوہر سے جمعیت والوں کا اختلاف ہوا تو میرا خاندان جمعیۃ علماء کے ساتھ تھا، کیونکہ مولانا سجاد جمعیۃ علماء کے

ستونوں میں ایک ستون تھے۔ قاضی احمد حسین صاحب بیمار ہو کر گیا آئے اور چند ماہ شہر میں رہے تو میں روزانہ ان کے پاس جاتا تھا، دیکھتا تھا کہ مولانا قاضی صاحب سے مشورہ کے لئے ہر ہفتہ آتے تھے۔ مولانا سجاد سے میرے تعلقات اس طرح بڑھتے رہے۔

مولانا بہار شریف کے ایک گاؤں پنہسہ کے رہنے والے تھے، لیکن تعلیم بہار شریف اور الہ آباد میں پائی۔ الہ آباد سے پہلے دیوبند بھی گئے تھے ،لیکن بعض طلبہ کے ساتھ کچھ ناگوار واقعات کی وجہ سے قیام نہ کر سکے اور الہ آباد چلے آئے، ہر دور میں طلبہ کا ایک طبقہ شرارت پسند ہوتا ہے۔

الہ آباد کے مدرسہ سے فارغ ہونے کے بعد بہار شریف اور الہ آباد میں درس وتدریس کا سلسلہ رہا۔ اس کے بعد گیا آئے اور میری پھوپھی کنیز فاطمہ نے جو سرکار عالیہ کہلاتی تھیں اور نیک کاموں میں دل کھول کر مدد کرتی تھیں ایک بڑی رقم مولانا کو گیا میں مدرسہ کھولنے کو دی اور مولانا نے ان کے داماد کے نام پر کہ ان کو اولاد نرینہ نہ تھی انوار العلوم کے نام سے شہر میں ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی۔

مولانا نے ایک مدرسہ کھول دیا کیونکہ شہر میں اعلی دینی تعلیم کا کوئی مدرسہ نہ تھا، لیکن مولانا آزاد کے الہلال کی تحریریں پڑھ پڑھ کر مولانا میں بے چینی بڑھی ہوئی تھی، اور وہ اس فکر میں تھے کہ علماء دین کو منظم کیا جائے پھر ان کی مدد سے کسی عالم دین کے ماتحت مسلمانان ہند کو۔ مسلمانوں کا اتحاد شریعت کا حکم ہے، اور اتحاد کسی گروہ کی سب سے بڑی طاقت ہے۔

ترکی خلافت پر برطانیہ اور امریکہ اور روس ویونان واٹلی کے متحدہ یلغار سے مسلمانان ہند میں بے چینی تھی۔ مولانا آزاد اور مولانا محمد علی جوہر کی تحریروں نے اس بے چینی کو اور بڑھادیا تھا۔ مولانا سجادؒ نے ایک مجلس میں فرمایا کہ مشیر حسین قدوائی نے لندن سے خط لکھا تھا کہ مسلمانان ہند خلاف کمیٹی کے نام سے ایک کل ہند مجلس بنالیں اور پھر اس کی طرف سے حکومت برطانیہ کو مخاطب کریں تو شاید کوئی اثر ہو۔ اس بنا پر مولانا سجادؒ اور مولانا عبد الباری فرنگی محلی نے مل کر خلافت کمیٹی قائم کرنے کی کوشش کی، اور جب خلافت کمیٹی کا قیام عمل میں آگیا اور مولانا محمد علی جوہر نے اس کی قیادت اپنے ہاتھوں لے لی تو مولانا سجاد اس کے فعال رکن رہے، لیکن مولانا کو تو جمعیۃ علماء کے قیام کی فکر تھی۔

مولانا محمد علی مونگیریؒ وغیرہ نے کانپور کے اجلاس کے بعد ندوۃ العلماء کے نام سے انجمن قائم کی تھی۔ اس کی طرف سے دار لعلوم کے نام سے مدرسہ کا قیام بھی عمل میں آیا تھا جو علامہ شبلی کی نظامت میں تھا، بنگال میں مولانا منیر الزماں اسلام آبادی نے انجمن علماء کے نام سے ادارہ قائم کیا تھا جو صوبائی سطح پر تھا۔ اول الذکر ادارہ علمی قسم کا تھا اور ثانی الذکر تبلیغی مقصد سے قائم کیا گیا تھا۔ مولانا کا مقصد اولاً سیاسی تھا اور اس کے علاوہ اور بھی مسلمانوں کے جو مسائل ہوں ان کے لئے مولانا نے پورے ہندوستان میں قابل ذکر علماء سے اس سلسلہ میں ملاقات کی اور ان کو جمعیۃ علماء کے قیام پر آمادہ کرنا چاہا، ایک علمی انجمن اور دوسری تبلیغی انجمن پہلے وجود میں آچکی تھی۔ مولانا عبد الباری فرنگی محلی نے ان کی پرزور حمایت کی اور لوگوں کو اس کے لئے دعوت دی، لیکن بہت

سے علماء کو یہ قابل عمل معلوم نہیں ہوتا تھا، یہاں تک کہ مولانا سجادؒ نے بہار کے علماء کو جمع کر کے جمعیۃ علمائے بہار قائم کی۔ اس کے بعد مولانا ثناء اللہ امرتسری نے جو شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے بھی شاگرد تھے، لیکن جماعت اہل حدیث کے لیڈر تھے چند علماء کو اپنے یہاں اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے مدعو کیا، دعوت نامہ پر مولانا سجاد نے اپنا نام دینے کی اجازت دی تھی لیکن کسی مجبوری کی وجہ اس جلسہ میں شریک نہ ہو سکے، لیکن انہوں نے اپنے شاگرد اور معتمد مولانا عبد الحکیم ناظم مدرسہ انوار العلوم کو اپنی نمائندگی کے لئے اس جلسہ میں بھیج دیا تھا۔

چنانچہ جمعیۃ علماء ہند کا قیام یہاں عمل میں آیا، اور مفتی کفایت اللہؒ صدر اور مولانا احمد سعید صاحب ناظم مقرر ہوئے۔ اس وقت سے مرتے دم تک مولانا سجاد اس کے فعال رکن رہے اور اہم ستونوں میں ایک ستون رہے۔ آخر عمر میں جب مولانا احمد سعید صاحب نظامت سے علاحدہ ہوئے تو یہ اس کے ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے، اور تذکرہ کے نام سے جمعیۃ علماء کی تاریخ اور اس کی ضرورت پر ایک رسالہ لکھا جس میں علماء کی اس جدوجہد کو شاہ ولی اللہ کی جدوجہد کی کڑی قرار دیا۔

علماء کے علاوہ مولانا کے دو زبردست رفیق تھے، ایک شیخ عدالت حسین بگہی چمپارنی، جو ہندوستان میں قدیم ترین کسان لیڈر تھے اور جنہوں نے گاندھی جی کے مشورے سے اپنے علاقے میں انگریزوں کے اثرات مٹا دیئے، دوسرے قاضی احمد حسین، مولانا نے نقیب کے نام سے بہار کے مسلمانوں کو منظم کیا، گاؤں گاؤں میں اس کی تنظیم پھیل گئی، مبلغین گھومنے لگے، مدارس

قائم ہونے لگے، شمالی ہند میں ارتداد کا فتنہ اٹھا تو یہ فتنہ امارت ہی کے ذریعہ بہار میں ختم ہوا۔ بیت المال سے غربا اور مساکین کی مدد کی گئی، مسلمانوں کے باہمی مقدمات کے فیصلے امارت کے دارالقضا سے ہونے لگے۔ دار القضا پہلے جمعیۃ علماء کے ماتحت تھا، اس کے روح رواں مولانا شاہ محی الدینؒ اور مولانا قاضی نور الحسن صاحب تھے جو آخر عمر تک اس کے قاضی رہے، اور جن کی بدولت فریقین اس اعتماد سے آتے تھے کہ ان کے مقدمات کا فیصلہ عدل و قسط کے ساتھ کیا جائے گا۔ امارت کے قیام کے بعد جمعیۃ نے امارت کی طرف اس ادارہ کو منتقل کیا تھا، مسلمانوں کو زکاۃ و عشر نکالنا چاہیئے اس کی بیداری بھی بہار کے مسلمانوں میں امارت ہی کے ذریعہ پیدا ہوئی، عاملوں نے گھوم گھوم کر مسلمانوں کو مسائل بتائے۔ دارالاشاعت کی طرف سے مختلف قسم کے دینی رسائل اور کتابیں شائع ہوئیں۔ فسادات میں امارت نے مظلوم مسلمانوں کی حمایت اور مدد کی۔

جب ۳۵ء کا دستور نافذ ہوا اور کچھ عمومی بنیادوں پر انتخابات ہونے لگے یعنی حق رائے دہی بالغان کی بنیاد پر تو نہیں ہوا جس کا مطالبہ کانگریس کر رہی تھی اور جس کی مخالفت جناح صاحب کر رہے تھے، لیکن پھر بھی حق رائے دہی ملک کے کافی بڑے حصہ کو مل گیا تھا، تو مولانا سجادؒ نے مولانا عثمان غنیؒ اور بعض دوسرے رفقاء کار کے مشورے سے مسلم انڈی پینڈنٹ پارٹی بنائی۔ اس وقت بہار میں دو پارٹیاں اور سرگرم تھیں جو علماء دین کی قیادت کی منکر تھیں۔ ایک شفیع داؤدی صاحب کی جماعت، شفیع داؤدی صاحب بھی مولانا سجادؒ کی طرح صوبہ کے سب سے زیادہ فعال رکن تھے۔ دوسرے مسٹر عزیز مرحوم وزیر تعلیم بہار جو اپنا اچھا اثر رکھتے تھے۔ انتخاب مخلوط نہ تھا۔ مسلمان صرف مسلمان

امیدوار کو ووٹ دے سکتے تھے، انتخاب ہوا تو صرف مسٹر عزیز کامیاب ہوئے ان کی پارٹی کامیاب نہ ہو سکی، اور شفیع داؤدی صاحب تو خود ہی ہار گئے اب بہار میں اسمبلی میں صرف دو پارٹیاں تھیں، ایک کانگریس دوسرے انڈی پنڈنٹ پارٹی۔ آزادی کی جدوجہد میں کل ہند کانگریس کے لیڈر راجندر پرشاد اور انڈی پنڈنٹ پارٹی کے صدر مولانا ابو المحاسن محمد سجاد شریک تھے۔ دونوں کل ہند شخصیت کے مالک تھے، دونوں فعال اور مخلص تھے اس لئے امید تھی کہ دونوں پارٹیاں مل کر کام کریں گی، لیکن کانگریس نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ کسی دوسری پارٹی کے تعاون اور حمایت سے مستغنی اور بے نیاز ہے۔ مولانا کو اور ان کے بعض ساتھیوں کو کانگریس کا یہ غرور پسند نہیں آیا، جب کانگریس نے بہار وزارت قبول کرنے سے انکار کیا اور گورنر نے انڈی پینڈنٹ پارٹی کو وزارت قبول کرنے کی دعوت دی تو مولانا کے رفقاء نے سوچا کہ ان کی جماعت کو کانگریس سے آزاد ہو کر ملک اور مسلمانوں کے فائدے کے لئے کوئی قدم اٹھانا چاہیئے، چنانچہ انڈی پینڈنٹ پارٹی کا جلسہ ہوا۔ اس میں ایک جماعت اس کی خواہشمند تھی کہ وزارت قبول نہ کی جائے، کیونکہ اقلیت میں ہونے کی وجہ سے یہ وزارت قائم نہیں رہے گی۔ گورنر زیادہ سے زیادہ چھ ماہ میں مجلس قانون ساز کا جلسہ طلب کرنے پر دستور کی رو سے مجبور ہے اور جیسے ہی یہ جلسہ ہوگا کانگریس پارٹی عدم اعتماد کی تجویز پیش کرکے اس وزارت کو ختم کر دے گی۔ دوسرے گروہ کا خیال تھا کہ چھ ماہ کے لئے کیوں نہ ہو وزارت قبول کر لی جائے اور مجلس قانون ساز کے ذریعہ عوام کو جو فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے وہ پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ دوسری جماعت غالب آئی اور مسٹر یونس بیرسٹر کو جو اس وقت بہار کے سب

سے بڑے بیرسٹر تھے پارٹی کی طرف سے وزارت قائم کرنے کی اجازت دی گئی اور وزارت بن گئی، چھ ماہ کے عرصہ میں مولانا سجاد کے مشورہ سے کسانوں کے مطالبات کی حمایت میں حکومت کی طرف سے سرکلر جاری کیا گیا، اردو میں درخواستیں قبول کرنے کی ہدایت کی گئی اور بھی کئی مفید کام ہوئے، یہاں تک کہ کانگریس نے وزارت قبول کرنے کا فیصلہ کیا اور مسٹر یونس مستعفی ہو گئے اور اس کے بعد پارٹی کا کانگریس حکومت سے زرعی ٹیکس کے سلسلہ میں اختلاف ہوا، مولانا سجاد نے اوقاف کو زرعی ٹیکس سے مستثنی کرنے کا مطالبہ کیا، یہاں تک کہ وقف علی اولاد کو بھی۔ مولانا نے کہا کہ اگر ان کا مطالبہ نہیں مانا گیا تو وہ سول نافرمانی کریں گے، بالآخر مولانا آزاد پٹنہ تشریف لائے اور انہوں نے مولانا سجادؒ کے حق میں فیصلہ دیا اور اوقاف کو زرعی ٹیکس سے مستثنی کر دیا گیا۔

مولانا کا خیال تھا کہ آزادی کی تحریک میں سب مسلمان کانگریس کا ساتھ دیں، لیکن قانون ساز اسمبلی میں مسلمانوں کی علاحدہ جماعت بنے تاکہ مسلمانوں کے مسائل کی وکالت صحیح طور پر ہو سکے۔ مولانا قیادت مذہبی لوگوں کی رکھنا چاہتے تھے، اسی لئے انہوں نے بہار میں مسلم لیگ پارٹی نہیں بنائی، حالانکہ اس وقت مولانا حسین احمدؒ اور جمعیۃ کے دوسرے حضرات یوپی میں مسلم لیگ کے حامی تھے۔ مولانا حسین احمد اور اکابر جمعیۃ کے موقف کے علی الرغم مولانا سجاد بہار میں مسلم لیگ کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔

اس کے بعد مسلم لیگ کا زور ہوا اور یہ صورت ممکن نہیں رہی کہ حریت پسند مسلمان اور انگریزی سرکار کے حامی مسلمان ایک پلیٹ فارم پر رہیں۔ چنانچہ مولانا حسین احمدؒ نے مسلم لیگ سے استعفا دیا اور انگریزی سرکار

کے بعض حامی مسلمانوں نے جو مولانا سجادؒ کے اثر سے مرعوب ہو کر ان کے ساتھ ہو گئے تھے، انڈپنڈنٹ پارٹی سے مستعفی ہو گئے۔

ابھی یہ دور چل رہا تھا کہ کانگریسی وزیروں نے اس بنا پر وزارتوں سے استعفی دیا کہ وہ دوسری جنگ عظیم میں ہندستان کی شرکت کے خلاف تھے۔ جمعیۃ علماء ہند نے غیر مشروط طور پر کانگریس کی شرکت کا فیصلہ کیا۔ مولانا سجادؒ جمعیۃ علماء ہند کے ناظم بنے اور پھر تھوڑے عرصہ کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

مولانا تفسیر و حدیث، فقہ و علم کلام اور سیاسیات و اقتصادیات پر گہری نظر رکھتے تھے، ہندوستان کے قوانین کی ایک ایک دفعہ مولانا کو یاد تھی۔ مجھ سے پٹنہ کے بعض وکلانے کہا (جن میں مسٹر یونس بھی تھے) کہ مولانا انگریزی ایک حرف نہیں جانتے تھے، لیکن سیاست اور صوبائی اور مرکزی حکومت کے قوانین کو جس قدر سمجھتے تھے وہ ہم (وکلاء) نہیں سمجھتے تھے، مسٹر یونس نے تو مجھ سے یہ بھی کہا کہ ان کے پاس بعض موکلوں کے مقدمات ایسے تھے کہ بظاہر قانون ان کے خلاف تھا کوئی دفعہ پیروی کی حمایت میں نہیں مل رہی تھی۔ مولانا سے ذکر آیا تو دفعات کی ایسی تاویل پیش کی کہ ہائی کورٹ میں مقدمہ اس تاویل کو پیش کر کے جیت لیا گیا۔

مولانا نے مسٹر جناح کو جو خطوط لکھے اور جو امارت شرعیہ سے کتابی شکل میں " دو سیاسی دستاویز" اور "اسلامی حقوق اور مسلم لیگ " کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان سے مولانا کی سیاسی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح مولانا کی کتاب "حکومت الہی" بھی قابل ذکر ہے جس میں مولانا نے بتایا کہ مروجہ جمہوری طریقہ انتخاب سے جمہوریت کا حقیقی مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ مولانا

پہلے آدمی ہیں جنھوں نے جمہوری طریقہ انتخاب کی خامیوں کو اس قدر شرح وبسط کے ساتھ لکھا ہے۔ اس کے برسوں بعد یہی بات جے پرکاش نارائن نے لکھی، اور راور کیلا اور جمشید پور کے مہیب فسادات کے بعد ڈاکٹر محمود صاحب نے اس طرف اشارہ کیا اور لکھا کہ طریق انتخاب میں تبدیلی ہونی چاہیئے۔ مولانا اصل میں اسلامی نظریۂ سلطنت پر کوئی کتاب لکھ رہے تھے جس کا یہ صرف مقدمہ تھا لیکن وہ یہ کتاب نہیں لکھ سکے اور یہ مقدمہ ان کے انتقال کے بعد "حکومت الہی" کے نام سے شائع ہوا۔ پھر ندوۃ المصنفین کی طرف سے جس کو مفتی عتیق الرحمن صاحب اور مولانا حفظ الرحمن صاحب کی سرپرستی حاصل تھی، مولانا حامد الانصاری غازی کی ضخیم کتاب " اسلام کا نظریۂ سلطنت" شائع ہوئی، سیاسی اور میدانی کاموں نے اس کا موقع نہیں دیا کہ مولانا کی علمی صلاحتیں تصنیفات کی شکل میں ظاہر ہوں۔

مولانا کا انتقال ہوا تو دہلی کے تعزیتی جلسہ میں مفتی کفایت اللہ صاحب نے فرمایا کہ جمعیۃ علماء کی خدمات در اصل مولانا سجاد کی خدمات ہیں، مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا کہ علماء میں وہی ایک مرد کامل اور عضو عامل تھا وہ بھی نہ رہا۔ مولانا عبد الرؤف داناپوری نے کہا کہ ان کی ایک خوبی ایسی تھی جو کسی عالم میں نہیں تھی وہ یہ کہ ہندوستان کے کسی قانون ساز ادارہ میں کوئی ایسا مسودہ قانون پیش ہوتا، جو اسلامی نقطۂ نظر سے قابل اعتراض ہوتا تو اس کی وہ خبر رکھتے تھے اور فوراً اس کے خلاف آواز اٹھاتے تھے اور محرک مسودہ قانون کو مسلم ارکان اسمبلی کو اور علماء ہند کے نام خطوط لکھتے تھے۔

محمد احمد کاظمی مرحوم وکیل الہ آباد نے جب مرکزی پرسنل لاء میں شرعی بل پیش کیا تو اس کے اندر شرعاً جو خامی تھی اس کی طرف مولانا نے ہی توجہ دلائی اور جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس بلا کر دوسرے نقطہ نظر کے علماء کی تائید حاصل کی اور اس مسودہ کی ترمیم کی اصلاح کی گئی، لیکن مسٹر جناح نے مرکزی اسمبلی کے عین اجلاس میں قانون وراثت کے اندر یہ ترمیم پیش کر دی کہ مرنے والا اگر وصیت کر جائے تو اس کی جائداد شریعت کے مطابق تقسیم ہو گی ورنہ رواج کے مطابق یعنی شریعت کا قانون وراثت اصل نہیں، بلکہ میت کی خواہش اصل ہے یا رواج، اور ان کی ترمیم منظور ہو گئی، تو مولانا نے مسٹر جناح کو یہ خط لکھا جس میں اس کی وضاحت کی گئی کہ مسلمانوں کو بہر حال شریعت کا پابند ہونا چاہیئے۔ افسوس مولانا کے خط کا اثر نہ ہوا اور جناح صاحب نے حکم شریعت کو منظور نہیں کیا۔ جب مسٹر جناح کی لڑکی نے غیر مسلم سے شادی کر لی، اور ارتداد کا راستہ اختیار کیا، تو ان کی وصیت کے مطابق ان کی لڑکی کو ترکہ مل گیا جو شریعت اسلامی کے مطابق نہیں مل سکتا تھا، تب اندازہ ہوا کہ جناح صاحب نے کیوں ایسی ترمیم کرائی۔

مولانا پرانی وضع کے سادہ موٹے کپڑے میں رہتے تھے، عمامہ باندھتے تھے، بہار میں جب زلزلہ آیا تو جائے وقوع پر پہنچ کر اپنے ہاتھوں سے ملبہ اٹھاتے اور ٹوکرا سر پر لے جا کر پھینکتے تھے اور اس میں اس قدر منہمک تھے کہ ان کا اکلوتا لڑکا مرض الموت میں مبتلا ہوا، لیکن اس کے مرنے سے پہلے اس کے پاس نہیں پہنچ سکے، مولانا کی سادگی اور بے نفسی مثالی تھی، علماء کے طبقہ میں کم لوگ اس معاملہ میں ان کے درجہ کو پہنچ سکتے ہیں۔

مولانا علماء میں تفریق کے قائل نہیں تھے، ہر مکتب فکر کے عالم دین سے ملتے اس کی عزت کرتے اور اس کا تعاون حاصل کرتے اور اس کو اپنی کارگزاری سناتے اور اپنے کاموں سے روشناش کراتے، اس لئے ہر طبقہ علماء میں وہ پسند کئے جاتے تھے۔

مجھ سے مولانا عبد الخبیر امیر جماعت اہل حدیث بہار نے کہا کہ میں پٹنہ سے باہر کسی کے جنازے میں شرکت کے لئے جاتا ہوں تو اپنی ہی جماعت کے لوگوں کے جنازے میں، لیکن میں نے مولانا سجادؒ کے انتقال کی خبر سنی تو فوراً پھلواری شریف گیا تا کہ جنازے میں شرکت کروں، لیکن ان کا جنازہ اس قدر جلد دفن کیا گیا کہ اس کا شرف حاصل نہیں ہوا۔

اسی طرح بریلوی عالم مولانا ظفر الدین صاحب سابق پرنسپل مدرسہ شمس الہدی کہتے تھے کہ مولانا سجادؒ اس طرح ملتے تھے اور بغیر الجھے اور بغیر لڑائی کئے ہوئے محبت سے اس طرح مدعا سمجھاتے کہ اختلاف کی ہمت نہیں ہوتی تھی، یہی وجہ تھی کہ بہار میں ہر مسلک کا عالم ان کا مداح اور ان کا حامی تھا۔ اختلافات سے بلند ہونا فکر و نظر کی بلندی اور قلب کی وسعت کی علامت ہے۔

مولانا شہروں سے زیادہ دیہاتوں پر توجہ دیتے تھے کیونکہ ملک کی پچھتر فیصدی آبادی دیہاتوں میں رہتی ہے۔ دوسرے یہ کہ شہروں میں کثرت سے جلسے ہوتے رہتے ہیں، علماء اور زعماء کی تقریریں ہوتی رہتی ہیں۔ دیہاتوں کے دشوار گزار راستوں کو طے کرنے کی کم ہی لوگ ہمت کرتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ دیہاتوں میں جو اثر ہو جاتا ہے وہ دیرپا ہوتا ہے۔ مولانا کی طاقت کا راز بھی یہی تھا جس سے مولانا اپنے حریفوں کو شکست دے سکے۔ مولانا اپنی صحت کی پرواہ نہ

کر کے کثرت سے دیہاتوں کا دورہ کرتے تھے، کھانا بھی معمولی کھاتے تھے۔ چائے اور پان تمباکو کے عادی تھے۔ ویسے تو موت کا وقت مقرر ہے لیکن بظاہر انہی اسباب کی بنا پر ان کی عمر نے وفا نہ کی۔ مولانا کا انتقال ہوا تو مولانا کا سامان ایک بستر اور ایک جوڑا کپڑا تھا، ایک جوڑا پہنے ہوئے تھے، جس میں انتقال ہوا، یہی اس مرد مجاہد کی زندگی کا کل اثاثہ تھا، مولانا بڑے عالم دین تھے، مولانا بڑے سیاسی لیڈر تھے، مولانا جماعتوں کے بانی تھے لیکن مولانا کی زندگی سادہ تھی۔

مولانا حفظ الرحمن صاحب فرماتے تھے کہ افسوس آزادی سے بہت پہلے مولانا سجاد کا انتقال ہو گیا ورنہ وہ مسلمانوں کے مسئلہ کا کوئی نہ کوئی حل نکال لیتے اگر پورے ہندوستان کے مسلمانوں کا کوئی حل نہ نکالتے تو بہار کا مسئلہ ضرور حل کر لیتے، نہ صرف مولانا حفظ الرحمن بلکہ تمام علماء مولانا کی صلاحیتوں کے بے حد معترف تھے۔

میں کلکتہ میں تھا اور مولانا کلکتہ تشریف لاتے تو ضرور مجھ سے ملنے آتے جو اس بات کی دلیل تھی کہ وہ معمولی آدمی کو بھی کتنی اہمیت دیتے تھے۔ وہ مولانا عبد الرؤف داناپوریؒ صاحب اصح السیر کے یہاں قیام فرماتے تھے، انہی نے مجھ کو ہدایت کی تھی کہ میں داناپوری صاحب سے ملتا رہوں۔ جب اس ملاقات سے مولانا آزادؒ کی امامت کے مسئلے میں اور خاکسار تحریک کے سلسلہ میں فائدہ پہنچا اور داناپوریؒ نے مولانا آزادؒ کی حمایت میں اور خاکسار تحریک کی مخالفت میں فتوے دیئے تو مولانا سجادؒ نے کہا کہ میں نے تم سے کہا تھا کہ ملتے رہنے سے فائدہ ہوتا ہے اور آدمی جس سے ملتا ہے اس کو اپنے سے قریب کر سکتا ہے۔

مولانا آخری دفعہ کلکتہ تشریف لائے تو میں اپنی شادی کے سلسلہ میں بہار گیا ہوا تھا، مولانا حسب معمول ہمارے دفتر تشریف لائے۔ ان دنوں میں ”روزنامہ استقلال“ کا ایڈیٹر تھا۔ میں نے دفتر والوں کو یہ نہیں بتایا تھا کہ میں اپنی شادی کے لئے جا رہا ہوں، لیکن مولانا کو دفتر امارت شرعیہ میں اس بات کی خبر مل گئی تھی۔ ہمارے دفتر والوں نے مولانا سے کہا کہ عثمانی صاحب نہیں ہیں، مولانا فوراً جواب دیا کہ ”مجھ کو معلوم ہے آج ان کی بارات ہے، میں تو آپ حضرات سے ملنے آیا ہوں“۔ میری غیر موجودگی میں بھی مولانا نے ملنے کے لئے آنے کا معمول ختم نہیں کیا۔

اس کے بعد مولانا سے جون پور میں جمعیۃ کے اجلاس میں ملاقات ہوئی، پھر پٹنہ میں ملاقات ہوئی۔ اور یہ آخری ملاقات تھی۔ میں اپنے سسرال جا رہا تھا، مولانا نے کہا کہ اسلام پور کے سجادہ نشین شاہ ابو البرکات صاحب کو میرا سلام کہنا، چنانچہ میں نے سلام پہنچا دیا۔ مولانا کو معلوم تھا کہ وہ مسلم لیگ سے متاثر ہو گئے ہیں، لیکن مولانا کو اس سے غرض ہی کیا تھی، ان کے یہاں تو مسلمان ہونا اور مذہبی ہونا کافی تھا۔ وہ جانتے تھے کہ تعلقات رکھنے سے اصلاح ہو سکتی ہے۔ پھر یہ فکری اختلافات تو اضافی چیزیں ہیں، اصل چیز ہے انسان کا خدا سے تعلق اور اسی چیز کا نام دین ہے۔ ایک بار اپنے ایک دوست کے ساتھ مولانا سے ملا تھا وہ ایم اے میں فلسفہ کے طالب علم تھے۔ مولانا نے کہا کہ انگریزی پڑھیے تو سائنس لیجئے جس میں مسلمان پیچھے ہیں، ادب اور فلسفہ کے میدان میں مسلمان پیچھے نہیں ہیں۔ مولانا در اصل اسلام اور سائنس کے ربط کے حامی تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمان ایک طرف اسلام سے واقف ہوں اور

دوسری طرف جدید سائنس پر بھی ان کی نظر ہو۔ مولانا کے عہد میں کم علماء ہوں گے جن کے اندر یہ حقیقت پسندی ہوگی۔

مولانا صوفی بھی تھے اور نقشبندی سلسلہ کی اجازت رکھتے تھے صاحب دل تھے لیکن بیعت نہیں کرتے تھے، مسلمانون کے اجتماعی مسائل کے حل میں زیادہ مشغول رہتے تھے، مشیخت اور سجادگی کو انہوں نے پیشہ نہیں بنایا۔

پڑھانے کے زمانے میں مولانا طلبہ کو کہتے ''سمجھا کہ نہیں'' یہ لفظ ان کا تکیہ کلام بن گیا تھا، جب انہیں اس کا احساس ہو گیا تو اس لفظ کے استعمال سے بچنے کی کوشش کی نتیجہ یہ ہوا کہ ''سمجھا'' تو چھوٹ گیا، لیکن ''نہیں'' کا لفظ زبان پر رہ گیا، لوگ مزاحاً کہتے کہ مولانا سجادؒ اس لئے گرفتار نہیں ہوتے ہیں کہ وہ ہر بات میں ''نہیں'' کہہ دیتے، مثلاً ''انگریزوں کو قتل کرو، نہیں''۔

مولانا کہتے کہ اپنے کو گرفتاری کے لئے پیش کر دینا کوئی عمدہ بات نہیں ہے۔ حکومت کے خلاف کام کئے جاؤ، ڈرو نہیں، اگر گرفتار کر لیا جائے تو کوئی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے اور جیل خانے سے نہیں ڈرنا چاہیئے، ہندوستان کی آزادی اور انگریزوں کو نکالنے کے جذبہ سے مولانا بھی اپنے ہم عصروں کی طرح سرشار تھے۔

مولانا نے انتخابات کے موقع پر حکومت برطانیہ کے خلاف ہر جگہ سخت تقریریں کیں اور حکومت کو مذہب دشمن قرار دیا۔ جب ان کی پارٹی کامیاب ہوئی تو مسٹر عزیز نے مقدمہ دائر کر دیا کہ مذہبی جذبات کو بھڑکا کر کامیابی حاصل کی ہے، مسٹر عزیز کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا، لیکن وہ جانتے تھے کہ مولانا عدالت میں اس سے انکار نہیں کریں گے۔ اس لئے مسٹر یونس

وغیرہ نے بہت مشکل سے مولانا کو اس پر راضی کیا کہ وہ عدالت میں حاضر نہ ہوں، چنانچہ جب تک عدالت میں مقدمہ کی کاروائی جاری رہی، مولانا پٹنہ سے باہر رہے، یہاں تک کہ ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے مسٹر عزیز کا مقدمہ خارج ہو گیا، ورنہ مولانا اگر عدالت میں حاضر ہوتے تو سچ بولتے، اگرچہ مخالف کے پاس ثبوت نہ تھا۔

ملک کے بعض علماء صرف مولانا کی وجہ سے جمعیۃ العلماء کے حامی تھے، مثلاً مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا مسعود عالم ندوی اور مولانا سید احمد عروج قادری، مولانا کے انتقال کے بعد انہوں نے نیا پلیٹ فارم تلاش کیا اور مولانا مودودی صاحب کی قائم کی ہوئی جماعت اسلامی میں شریک ہو گئے۔ مولانا مسعود عالم صاحب کا انتقال ہو گیا اور مولانا امین احسن اصلاحی اور بعض دوسرے علماء جیسے مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا منظور نعمانی، اور مولانا جعفر میاں پھلواروی ندوی جماعت اسلامی سے علاحدہ ہو گئے۔ مولانا عروج احمد قادری جماعت اسلامی کے رکن اور ''زندگی'' کے ایڈیٹر ہیں۔

لکھنؤ میں مدح صحابہ کی تحریک پر پابندی لگی اور مسلمانوں نے سول نافرمانی شروع کی تو مولانا وہاں تشریف لے گئے اور مسلمانوں کی حمایت کی اور سول نافرمانی کی کامیابی تک رہنمائی کی۔

مولانا نے انڈ یپنڈنٹ پارٹی کے جلسہ میں جو خطبہ دیا وہ مولانا کے سیاسی شعور اور دین سے محبت کا بہترین مظہر ہے۔ مولانا میں خطابت نہیں تھی لیکن دلیل کی قوت اس قدر زبردست تھی کہ انکار مشکل ہوتا تھا، انسان اگر

باشعور ہو تو اس کے نزدیک اصل قوت دلیل کی ہوتی ہے، انسان اگر بے شعور ہو تو بے معنی خطابت اور شاعری بھی دلیل کے قائم مقام بن جاتی ہے۔

ایک دفعہ مولانا عبدالرؤف داناپوریؒ کے یہاں مولانا کی موجودگی میں ایک صاحب تشریف لائے جو کسی رسالہ کے ایڈیٹر تھے، انہوں نے مولانا سے پوچھا کہ آپ نے کانگریس میں شرکت مشروط کی ہے یا غیر مشروط، مولانا نے جواب دیا کہ مشروط، شرط یہ ہے کہ اسلام کے خلاف کوئی بات ہوگی تو نہیں مانیں گے اور اس کی مخالفت کریں گے، انہوں پوچھا کہ شرط تحریری ہے یا تقریری، مولانا نے کہا تحریری نہیں ہے، انہوں نے کہا کہ اسلام کا حکم ہے کہ ''معمولی کام جیسے نکاح ہو تو بھی لکھ لو'' مولانا نے جواباً کہا کہ آپ کے خیال میں جن لوگوں کا نکاح ہوتا ہے اور لکھا نہیں جاتا، ان کا نکاح منعقد نہیں ہوتا؟ جو لوگ بیٹھے ہوئے تھے وہ ہنس پڑے، اور یہ صاحب خاموش ہو گئے، اصل میں بہار میں نکاح کی رجسٹری نہیں ہوتی، خاندان کا کوئی بڑا آدمی یا کوئی عالم دین فریقین سے زبانی اقرار لے لیتا ہے اور بس۔

مولانا اس بات کو بہت اہمیت سے کہتے تھے کہ جزیرۃ العرب میں نصاریٰ کو رہنے نہ دیا جائے تاکہ وہ مرکز اسلام میں کوئی سازش نہ کر سکیں۔ انوار العلوم گیا کا سالانہ جلسہ ہوتا تو اس میں یہ کتبے لگواتے

''اخرجو الیہود و النصاریٰ من جزیرۃ العرب''(حدیث) لاتتخذو والیہود و النصاریٰ اولیاء بعضہم اولیاء بعض (قرآن کریم)، ولن ترضی عنک الیہود والنصاریٰ حتی تتبع ملتھُم (قرآن پاک)۔

کہتے کہ دوسری غیر مسلم قومیں اپنے اپنے ملک میں مسلمانوں سے دشمنی کرتی ہیں، لیکن نصاریٰ کی حکومتیں تمام عالم اسلامی میں مسلمانوں کے ساتھ دشمنی کرتی ہیں، ایک صاحب نے مولانا کے سامنے وہ آیت پڑھی جس میں نصاری کو یہود اور مشرکین سے بہتر بتایا گیا ہے، مولانا نے جواب دیا کہ سیاق وسباق سے پتہ چلتا ہے کہ تمام نصاریٰ کے لئے یہ حکم نہیں ہے، کیونکہ اس میں ہے کہ یہ قرآن کی آیتیں سنتے ہیں تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں ،اس برعکس آج کے نصاریٰ میں کسی کی آنکھ سے آنسو جاری نہیں ہوتے، بلکہ یورپ میں انہوں نے اسلام اور محمد ﷺ کے خلاف ان گنت کتابیں لکھی ہیں جن میں جھوٹے اتہامات لگائے گئے ہیں۔ مولانا نے کہا کہ جلالین میں تفسیر مظہری میں اور بعض دوسری تفسیروں میں یہ وضاحت ہے کہ نصاریٰ کی یہ تعریف جو قرآن میں ہے، نجاشی اور اس کے لوگوں کے لئے ہے، جو قرآن کی آیات سن کر متاثر ہوئے اور جنہوں نے اسلام کی تصدیق کی، وہاں پر یہود سے مراد یہود مدینہ اور مشرک سے مراد مشرکین مکہ ہیں کہ ان دونوں کے مقابلہ میں نجاشی نے اسلام کی حمایت کی، نصاریٰ کی مودت کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے ،جب کہ قرآن کہتا ہے کہ'' یہ تم سے راضی نہ ہوں گے جب تک ان کا دین اختیار نہ کر لو'' مولانا نے کہا کہ آج جو مسلمانوں میں بے دینی پھیل رہی ہے وہ انہیں نصاریٰ کی حکومتوں کی بدولت ہے۔

یہ تو معلوم ہی ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان میں سیکولر طرز کی تعلیم گاہیں قائم کیں جن میں مذہبی تعلیم نہیں ہوتی تھی، سرکاری ملازمتیں اسی طرز کے اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے فارغین کو ملتی تھیں، علمائے دین نے

ان سرکاری تعلیمی اداروں کے متوازی دینی تعلیم گاہیں قائم کیں، وسائل کی کمی کی وجہ سے انگریزی زبان اور سائنس و ٹکنالوجی کو ان تعلیم گاہوں میں نہیں رکھا، یہ تعلیم گاہیں عام مسلمانوں کے چندوں سے چلتی رہیں، جن مسلمانوں کو دینی تعلیم کا شوق ہوتا وہ ان آزاد دینی مدارس میں تعلیم پاتے جن سے نکل کر ان کے لئے اپنے معاشی مسائل کا حل کرنا مشکل ہو جاتا اور جن کو مذہبی تعلیم کا شوق نہ ہوتا وہ ان سیکولر اسکولوں میں داخل ہوتے جن سے نکل کر ملازمتوں کے ذریعہ وہ اپنے معاشی مسائل حل کر لیتے، سائنس اور ٹکنالوجی کا رواج ان اسکولوں میں بھی بہت کم تھا، بہت سے مسلمان اپنے بچوں کو ابتدائی دینی تعلیم بھی نہ دیتے اور ان کو اسکولوں میں داخل کر دیتے، میں نے ہائی اسکول کے ایسے مسلمان طلبہ کو دیکھا جو یہ بتا نہ سکے کہ قرآن کس کی کتاب ہے؟ اور یہ کہ حضرت عیسی علیہ السلام مسلمانوں کے پیغمبر ہیں یا نہیں؟ جب مولانا سجادؒ کو ایسے واقعات معلوم ہوئے تو انہوں نے سوچا کہ اسکولوں میں لازمی ابتدائی تعلیم کا نظم ہونا چاہیے۔ کانگریسی وزارتیں قائم ہوئیں تو گاندھی جی نے ڈاکٹر ذاکر صاحب کی صدارت میں ابتدائی تعلیم کی اسکیم تیار کرنے کی غرض سے ایک کمیٹی بنائی، اس نے جو رپورٹ دی اس کو واردھا اسکیم کہتے ہیں۔ اس موقع پر مولانا سجادؒ نے مسلمانوں کے لئے لازمی بنیادی تعلیم کی آواز بلند کی، خود ڈاکٹر ذاکر صاحب کو اس پر انشراح نہ ہوا، لوگ یہ کہتے تھے کہ مذہبی اختلافات کی موجودگی میں بنیادی مذہبی تعلیم کا نصاب تیار کرنا مشکل ہے۔ ذاکر صاحب سرے سے اس کے خلاف تھے کہ مذہبی تعلیم حکومت کے ہاتھوں میں ہو، بلکہ وہ تو سب ہی طرح کی تعلیم کو حکومت کے اثر سے آزاد رکھنے کے حامی تھے

۔ مولانا سجادؒ کہتے تھے کہ وہ ایسا نصاب تیار کرنے کی ذمہ داری لیتے ہیں جس سے مسلمانوں کے کسی فرقہ کو اختلاف نہیں ہوگا۔ باقی رہا مذہبی تعلیم کا حکومت کے ہاتھوں میں ہونا تو وہ بھی اس کو پسند نہیں کرتے ہیں، لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ مسلمانوں پر دنیاداری اس درجہ غالب ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ابتدائی تعلیم دیئے بغیر اسکولوں میں داخل کر دیتے ہیں، چنانچہ مولانا نے ہتھیار نہیں رکھا اور انہوں نے سب سے پہلے اپنی جماعت جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ سے یہ مطالبہ منظور کرایا۔ اس کے بعد یہ مطالبہ گاندھی جی کے سامنے رکھا گیا، گاندھی جی کو اس سے اختلاف نہ تھا کہ مسلمان چاہتے ہیں تو ان کے بچوں کی مذہبی تعلیم کا نظم حکومت کرے، لیکن شاید ان کے سامنے مشکل یہ تھی کہ اگر ایسا ہوا تو ہندوؤں کی طرف سے بھی ایسا مطالبہ ہوگا اور اگر ان کا مطالبہ بھی منظور کیا گیا تو ملک میں توہمات کا زور ہو جائے گا۔

ان دنوں مسلم لیگ کا زور بڑھ رہا تھا، اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے کچھ مطالبہ نہ کر کے ان علاقوں کے لئے علاحدہ حکومت کا مطالبہ کیا، جہاں مسلمان اکثریت میں تھے۔ اس مطالبہ میں مولانا سجادؒ کا مطالبہ کھو گیا، یہاں تک کہ مولانا کی زندگی نے وفا نہ کی۔ جمعیۃ کی نئی قیادت نے اس پر زور نہیں دیا لیکن بہار میں قاضی احمد حسین صاحب نے یہ آواز اٹھائی اور بالآخر مولانا آزاد کے یقین دلانے پر کہ اس کے موقع اور محل پر وہ خود اس کی تحریک کریں گے، قاضی صاحب خاموش ہو گئے، یہاں تک کہ ہندوستان آزاد ہوا، مولانا آزاد وزیر تعلیم ہوئے۔ آل انڈیا ایجوکیشنل ایڈوائزری بورڈ کا جلسہ ہوا، مولانا آزاد نے اس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ کم پڑھے لکھے استاد بچوں کو

ابتدائی مذہبی تعلیم دیتے ہیں اور مذہبی نفرت اور تعصب پیدا کرتے ہیں، اس لئے ابتدائی مذہبی تعلیم کا نظم حکومت کو اپنے ہاتھوں میں لینا چاہیئے، لیکن مولانا کی آواز تنہا رہی۔ رادھا کرشن، ذاکر صاحب، جواہر لال اور گاندھی جی کسی نے بھی اس کی حمایت نہیں کی، اس کے بعد نئے سوالات پیدا ہو گئے، مسلمانون کے جان و مال ہی کی حفاظت کا بڑا سوال تھا، اس لئے پھر یہ آواز نہیں اٹھی، البتہ مولانا حفظ الرحمن صاحب نے مولانا آزاد کے مشورے سے یہ تحریک چلائی کہ مسلمان اپنے طور پر ابتدائی مذہبی تعلیم کا کل ہند نظم کریں۔

یوپی میں امارت شرعیہ کے قیام کی کوششیں آزادی سے پہلے ہوئیں لیکن علماء دین کے اختلاف باہمی کا مرکز یوپی کی ریاست رہی اس لئے مذہبی تنظیم کی اسکیم کامیاب نہ ہو سکی، آزادی کے بعد جمعیۃ علماء اس قابل ہو گئی تھی کہ وہ امارت شرعیہ قائم کرے۔ مسلمان جمعیۃ کے گرد جمع ہو رہے تھے، لیکن سردار پٹیل اور آر ایس ایس والے یہ پروپیگنڈہ کر رہے تھے کہ مسلمان انقلاب کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بلکہ انہونی باتوں کو مہیب شکل میں پیش کرتے تھے اور ان کا ہوا کھڑا کرتے تھے۔ مولانا حفظ الرحمنؒ وغیرہ خائف ہوئے کہ امیر شریعت فی الہند کا انتخاب ہوا تو اس کا مطلب بھی یہی لیا جائے گا۔ اس لئے امارت کا قیام تو کیا عمل میں آتا جمعیۃ نے سیاست سے علاحدگی کا اعلان کیا اور جمعیۃ کے مقاصد سے محاکم شرعیہ کے قیام کی دفعہ نکال دی گئی۔

ایک دفعہ شہید سہروردیؒ نے مولانا سجادؒ سے کہا کہ آپ لوگ ہندوستان کے بارے میں اتنا سوچتے ہیں، کبھی کبھی مسلمانوں کے بارے میں بھی سوچئے۔ مولانا نے جواب دیا کہ آپ کو جب وکالت سے فرصت ملتی ہے

تب مسلمانوں کے بارے میں سوچتے ہیں اور ہمارا تو اوڑھنا بچھونا ہی یہی ہے، لیکن ہم خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہندوستان کے طول و عرض میں مسلمان جس طرح منتشر ہیں ہندو مسلم منافرت پیدا کر کے مسلمانوں کا بھلا نہیں کیا جا سکتا۔"[114]

[114] ٹوٹے ہوئے تارے از شاہ محمد عثمانی، ص ۱۰۲

حضرت مولانا محمد سجادؒ
حیات مبارکہ کے چند یادگار گوشے

مولانا زکریا فاطمی ندوی[115]

صوبۂ بہار کے مشہور و معروف ذی علم بزرگ جناب خان بہادر مولانا ابو نعیم محمد مبارک کریم صاحب سابق سپر نٹنڈنٹ آف اسلامک اسٹڈیز بہار و اڑیسہ نے مولانا مغفور کی سوانح سے متعلق گراں قدر معلومات تحریر فرما کر دی تھیں مگر وہ یادداشتوں کی شکل میں تھی۔ راقم نے کوشش کی ہے کہ اختصار کے ساتھ اور خان بہادر صاحب موصوف کے الفاظ کو جابجا باقی رکھتے ہوئے یہ مفید معلومات قارئین کرام تک پہنچادی جائیں۔

خاندان اور ابتدائی حالات:

حضرت مولانا کا اسم گرامی محمد سجاد اور کنیت ابو المحاسن تھی، والد کا اسم گرامی مولوی شیخ حسین بخش مرحوم اور عم محترم کا مولوی شیخ مخدوم بخش (مرحوم) تھا، ان کا خاندان علمی لحاظ سے ذی استعداد اور باذوق خاندان تھا۔

---

[115] یہ انڈیپنڈنٹ پارٹی کے ترجمان الہلال کے ایڈیٹر تھے گرچہ نام ان کا تھا لیکن کام سب مولانا مسعود عالم ندوی کے ذمہ تھا، ندوی فاضل تھے۔ مولانا نے سرکاری ملازم (خدابخش لائبریری کے مرتب فہرست مخطوطات و کیٹلاگر) ہونے کی وجہ سے نام درج کرنے سے گریز کیا تھا، مزید ان کے حالات کا علم نہیں ہو سکا۔

حضرت مولاناؒ کا آبائی وطن موضع پنہسہ (ضلع پٹنہ) ہے جو بہار شریف سے دکھن راجگیر[116] جانے والی سڑک پر ۶ یا ۷ میل کے اندر واقع ہے، اسی موضع میں حضرت مولاناؒ ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۲ء) میں پیدا ہوئے۔

---

[116] راجگیر مگدھ دیش میں ایک بڑا پرانا شہر تھا، اسی کا نام مہابھارت میں گری براج پور لکھا ہے، گری براج پور کے لفظی معنی پہاڑوں سے گھرے ہوئے شہر کے ہیں، اور بلحاظ اپنی جگہ کے یہ نام بہت ہی مناسب ہے، یہ پہاڑیاں شہر گیا سے ۳۶ میل تک ایک دوسرے کے آمنے سامنے دریائے پنچانا تک چلی جاتی ہیں، اور گریک گاؤں کے آگے تک گئی ہیں، راج گیر ہی مہاتم میں (جو والیو پران سے بنایا گیا ہے) پانچ پہاڑوں کے نام اس طرح لکھے ہیں، 1 بیوہار۔ ۲ اپیل۔ ۳ رتن کوٹ۔ ۴ گری برج۔ ۵ رتنا چل۔ اور پالی کی کتابوں میں انہیں کے نام گجی کوٹ اسیگلئی، بیوہارو، بیپلو، پانڈہیں، اور اب ان کے نام بیوہار گر بیپل گر، رتنا گری اودیا گر اور سونا گر ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام قریب وہی ہیں جو مہابھارت میں لکھے ہیں، مہابھارت میں گری براج پور کو ایک شہر لکھا ہے، اور راج گیر ہی کو مہاتم میں ایک پہاڑی لکھا ہے۔ گری برج پور کا اول ذکر ہم رامائن اور مہابھارت میں برہ ورتی کے خاندان کے متعلق پاتے ہیں، برہ ورتی جراسندھ کا باپ تھا، اور جراسندھ غالباً سال عیسوی سے پہلے ۱۶۰۰ سے ۱۵۰۰ برس کے درمیان تھا۔ مہابھارت میں ذکر ہے کہ جب یڈھشٹر نے اشومیدھ جگ کرنا چاہا تو سری کرشن جی نے کہا تھا کہ جراسندھ سے جیتنا مشکل ہے تم اس سے اکیلے لڑو، تب وہ پانڈوں کے ساتھ جراسندھ کے پاس گیا، مہابھارت (سبھا پرب ادھیائے ۱۲۱ اشلوک ۳۴ میں) لکھا ہے کہ یگ شالہ میں آکر راجگیر گیا۔ جراسندھ کا لڑکا سہدیو اور سہدیو کا لڑکا سوپانی۔ سوپانی کے بعد مگدھ کا آخری راجہ راجگیر کا برہ ورتی کے خاندان میں رپن جی ہوا۔ مسٹر دت نے اس کا زمانہ ۹۷ سال قبل مسیح بتایا ہے۔ اس کے بعد راجہ پر اڈیت جو سونک کے خاندان کا تھا مگدھ کا بادشاہ ہوا، ویشنو پران کے بموجب سونک خاندان کے پانچ بادشاہوں نے ایک سو اڑتیس سال تک مگدھ میں حکومت

کیا۔ سونک کے بعد بدیہہ خاندان کی حکومت آئی جس کا پہلا راجہ "شیسوناگ" تھا، اور جس نے راجگیر کی حکومت چھین لی، ویشنو بھاگوت متی اور برہمانڈ پرانوں کے مطابق مگدھ میں اس خاندان کی حکومت تین سو باسٹھ سال رہی، شیسوناگ سے خاندان کا چوتھا بادشاہ بھائیا ہوا، اس کے زمانہ میں کپل بستو میں ۵۵۸ برس ق۔ میں سالیہ سنگھ (جس کا نام بعد میں گوتم بدھ ہوگیا) پیدا ہوا تھا، اور اس کے پانچ سال بعد راجگیر کے محل میں بھائیا کے ایک لڑکا بمبسار پیدا ہوا جس نے نیا شہر راجگیر بسایا۔ مہابھارت کے اکیسویں ادھیائے میں سری کرشن جی گری براج پور میں گوتم منی کا مرکز ہونا بیان کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہاں ہی گوتم منی کے لڑکے پیدا ہوئے ہیں جن میں پہلے کا نام ککشی دان تھا۔ راج گرہی مہاتم میں اکثر راجگیر کو راج گرہ بن لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب نیا شہر راجگیر مگدھ کا دارالحکومت بنا تو پرانا شہر چھوٹ گیا اور چھوٹ جانے کی وجہ سے پھر جنگل ہوگیا۔ گری براج پور شہر وہاں تک پھیلا ہوا تھا جہاں کہ اب گریک گاؤں ہے۔ گریک کے سامنے جو پہاڑ نظر آتا ہے اس پر اینٹوں کا ڈھیر اب تک جراسندھ کی بیٹھک کے نام سے مشہور ہے، گری براج پور میں مکانات بہت قریب قریب ہونے کی وجہ سے اکثر آگ لگ جایا کرتی تھی جس سے رعایا کا بہت نقصان ہوتا تھا۔ جب رعایا نے بادشاہ سے اس کی کوئی تدبیر کرنے کے لئے درخواست کی تو اس نے اپنے مشیروں کی رائے سے یہ حکم دیا کہ اب سے جس کا گھر پہلے جلے اس کو نکال دیا جائے، بادشاہ کا محل سب سے پہلے جلا بادشاہ نے خود باہر نکل جانا پسند کیا اور سب سے پہلے اس کا محل بنا اس لئے شہر کا نام راجگیر ہوا۔ آج کل چھوٹا گاؤں راجگیر اس شہر کی جگہ پر بسا ہوا ہے اور پہاڑیوں کو راجگیر کی پہاڑیاں کہتے ہیں۔ بعد کو چندر گپت نے یہ شہر چھوڑ دیا اور اپنا دارالسلطنت پاٹلی پتر قرار دیا۔ بودھ لوگ اکثر زیارت کے لئے یہاں آتے رہتے ہیں، کیوں کہ گوتم بدھ نے راجگیر کی پہاڑیوں میں اکثر ریاضیت کی تھی۔ پال خاندان کے دور میں بہت سے سیاح یہاں آیا کرتے تھے، اور تانترک بدھ کی بہت سے بت اور مجسمے راجگیر میں انہی بادشاہوں کی بنوائے ہوئے ہیں جن میں کچھ اب تک ویبوہار پہاڑی پر موجود ہیں۔ راجگیر میں جینیوں کا آغاز بمبسار کے زمانہ سے ہوا، مہابیر سوامی بہت زمانہ

تک بپیل گری میں رہے، اور بمبسار کو (جس کو سرینک بمبسار بھی کہتے ہیں) تعلیم دی۔ یہ معلومات ماڈرن ریویو کلکتہ کے حوالہ سے ایک قدیم کتاب "جین دھرم کے مقدس مقامات" مطبوعہ خدابخش لائبریری پٹنہ سے ماخوذ ہیں، جس میں اس پورے مضمون کا خلاصہ درج ہے، لیکن اس شہر سے مسلمانوں کے تعلق کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا ہے، یہ مسلمانوں کی توجہ کا بھی اسی طرح مرکز رہا ہے، حضرت مخدوم الملک رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے جنگلوں میں سالہا سال چلہ کشی کی ہے، اسی ریاضت کے دوران یہ اہم واقعہ پیش آیا تھا کہ کسی جوگی نے ان پر پتھر گرانے کی کوشش کی تھی، وہ نماز میں تھے، تشہد کی انگلی اٹھائی تو وہ چٹان اپنی جگہ رک گیا اور آج بھی اسی طرح دیکھا جاسکتا ہے، حضرت مظفر بلخی خلیفہ حضرت مخدوم الملک اور حضرت شاہ شعیب جیسے بزرگوں نے بھی یہاں ریاضت کی ہے، گرم پانی کے چشمے، پہاڑیاں اور معتدل موسم اس قصبہ کا خاص امتیاز ہے، مغل عہد حکومت میں یہ سرکار بہار (بہار شریف) کا ایک پرگنہ تھا، ابوالفضل نے آئین اکبری میں سرکار بہار کے ایک پرگنہ کی حیثیت سے راجگرہ کا ذکر کیا ہے، یہ پہلے سے اسی نام سے پکارا جاتا تھا، اس کی اصلیت باختلاف روایات راج گھر، راج گڑھ اور راج گرہ بتائی جاتی ہے اور ان سب کا مشترک مفہوم دارالسلطنت سے ادا ہوجاتا ہے، انگریزوں کے دور میں یہ لفظ راجگیر ہوگیا۔ یہاں سلسلۂ شطاریہ کی ایک خانقاہ بھی قائم تھی، جس کے مشہور بزرگ حضرت امام الدین شطاری ہیں، مسلم عہد حکومت میں یہاں ممتاز خانوادے آباد تھے لیکن اب چند گھر رہ گئے ہیں، سیاح آتے رہتے ہیں اور حکومت بھی اس پر خصوصی توجہ دے رہی ہے، گرم پانی کے چشموں کی وجہ سے الگ الگ حوض بنے ہیں، جن میں مسلمانوں کا حوض مخدوم حوض کے نام سے مشہور ہے نیز قدیم آثار بھی بہت ہیں، اسی سے دس کلو میٹر کے فاصلہ پر نالندہ کے کھنڈرات ہیں، انہی کے درمیان شرفاء کی چند قدیم بستیاں ہیں جن میں دھنجوہی میں حضرت مخدوم الملک کے قیام کے نشانات موجود ہیں، اسی سے متصل حضرت مولانا سجاد کا وطن پنہسہ بھی ہے۔ اس علاقہ کے علماء کی نسبت (خواہ وہ قریب کے کسی گاؤں کے ہوں)

مولانا مرحوم کی ابتدائی تعلیم گھر ہی میں ہوئی اور اپنے والد ماجد نیز اپنے برادر کلاں مولوی احمد سجاد صاحب سے (جو اس وقت بھی ماشاء اللہ بقید حیات ہیں اور عابد مرتاض ہونے کی وجہ سے صوفی صاحب کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں)، قرآن مجید اور ابتدائی اردو فارسی کی تعلیم پاتے رہے۔

مدرسہ اسلامیہ بہار شریف:

ابتدائی تعلیم کے بعد اپنے برادر کلاں کے حسب مشورہ مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں داخل کئے گئے، وہاں آپ نے رشتہ کے بزرگ حضرت مولانا سید وحید الحق صاحب ساکن موضع استھانواں ضلع پٹنہ بانی مدرسہ مذکورہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، آپ کے برادر موصوف پہلے ہی سے مدرسہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، چنانچہ اس دوران میں آپ کی نگرانی بھی کرتے رہے، غالباً یہ واقعات ۱۳۱۰ھ (۹۳-۱۸۹۲ء) کے ہیں۔

جس زمانے میں مولاناؒ مدرسہ اسلامیہ بہار شریف کی ابتدائی جماعتوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اسی زمانہ میں مولانا محمد مبارک کریم صاحب بھی اوپر کے درجوں میں تحصیل علم میں مشغول تھے، تو جیسا کہ عام طور پر عربی مدارس کا قاعدہ ہے کہ اعلی درجوں کے طلبہ کو ابتدائی جماعتوں کے طلبہ کی تدریس کے فرائض سپرد کئے جاتے ہیں اسی طرح مولانا مبارک کریم صاحب کے ذمہ بھی مولانا مغفور کی ابتدائی تعلیم کے فرائض سپرد کئے گئے، اس سے

عام طور پر راجگیر ہی کی طرف کی جاتی ہے، مولانا لطف علی شاگرد مولانا سید نذیر حسین دہلوی جو قریہ دھنچوہی کے باشندے تھے، راجگیری کی نسبت سے مشہور ہیں۔

اوپر کی تعلیم مولانا نے کانپور اور متوسطات (شرح جامی وغیرہ) سے لے کر انتہا تک مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں حاصل کیا جیسا کہ آئندہ سطروں سے معلوم ہو گا۔

کانپور کا سفر:

ازاں بعد جب کہ مولانا سید وحید الحق صاحب کی خرابی صحت کے باعث مولانا مبارک کریم صاحب نے بغرض حصول تعلیم کانپور جانے کا عزم کیا تو مولانا مغفور بھی ان کے ہمراہ عازم کانپور ہوئے اور وہاں جاکر مولانا احمد حسن صاحب کانپوریؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے،[۱۷] کچھ عرصہ کی تحصیل علم کے بعد مولاناؒ کی علمی استعداد متوسطات تک پہنچ چکی تھی اور عام معمول کے مطابق مولانا اپنے سے نیچے درجوں کے طلبہ کی تعلیم میں حصّہ لیتے تھے۔ اسی اثنا میں مولانا مرحوم کانپور سے دیوبند آگئے، مگر وہاں اپنے علمی مذاق کی تسکین کا سامان نہ پاکر چند ماہ کے قیام کے بعد پھر کانپور واپس آئے اور پھر کچھ عرصہ کے لئے وہیں قیام رہا، مجموعی طور پر تین چار سال تک مولاناؒ نے کانپور میں تعلیم حاصل کی۔

مراجعت وطن اور ازدواج:

اس کے بعد آپ مکان واپس تشریف لے آئے، کچھ عرصہ کے بعد آپ کی شادی حضرت مولانا سید وحید الحق صاحب موصوف کی چھوٹی

[۱۷] کانپور میں حضرت مولانا نے مولانا خیر الدین صاحب کامل پوری ثم گیاوی سے بھی استفادہ کیا تھا جیسا کہ ان حالات میں درس حیات میں درج ہے۔

صاحبزادی سے ہوئی، شادی کے بعد کچھ عرصہ تک آپ گھر کے اور سسرال کے کاموں میں اس طرح الجھے رہے کہ تعلیم کی تکمیل کا موقع نہ مل سکا۔

الہ آباد میں:

مگر پھر اپنے شوق اور بہی خواہوں کے مشورے کے مطابق بغرض تکمیل حضرت مولانا عبدالکافی صاحب مرحوم بانی و مدرس مدرسہ سبحانیہ الہ آباد کی خدمت میں پہنچے، جو اپنے وقت کے بہت مشہور اور جید عالم تھے۔

مولاناؒ نے الہ آباد میں کئی سال صرف کئے اور اپنی ذہانت، مذاق صحیح ،رجحان طبع اور جید علمی استعداد کی بدولت حضرت مولانا عبدالکافی مرحوم کے دست وبازو کی حیثیت بھی رکھتے تھے، اور وہ اس طرح کہ مدرسہ مذکورہ کے دوسرے منتہی درجوں کے طلبہ کو بھی اپنی اعلیٰ قابلیت کی بنا پر تعلیم دیا کرتے تھے۔ تکمیل ہو چکی تو مولانا عبدالکافی مرحوم نے آپ کی دستار بندی کے جلسہ میں ہندوستان کے نامی گرامی علماء کو مدعو کیا اور تمام معزز مہمانوں کی موجودگی میں رسم دستار بندی ادا ہوئی[۱۱۸]۔ لوگوں کا بیان ہے کہ اتنا شاندار جلسہ الہ آباد میں اس سے قبل کبھی نہیں ہوا۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ الہ آباد اور

[۱۱۸] بہار شریف سے لے کر مدرسہ سبحانیہ تک آپ کے رفیق درس بہار شریف کے ممتاز عالم مولانا امیر حسن بن محمد معصوم بھی رہے، جن کے مشہور و ممتاز فرزند ہندوستان کے نامور محقق مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی تھے، اس کی تفصیل میں اپنے مضمون اساتذہ حضرت مولانا سجادؒ میں ذکر کر چکا ہوں، جو ان شاء اللہ سمینار کے مجموعۂ مقالات کے ساتھ شائع ہو گا۔

اس کے اطراف کی پبلک دور دور سے آکر شریک جلسہ ہوئی اور علماء میں بھی تقریباً تمام سربر آوردہ علماء ہند موجود تھے۔

درس و تدریس بہار و الہ آباد:

فراغت کے بعد کچھ عرصہ تک مدرسہ سبحانیہ کی طرف تشنہ کامان علوم اور معاونین کی توجہ زیادہ سے زیادہ ہوتی مگر پھر بعض بہی خواہوں مثلاً مولانا محمد مبارک کریم صاحب کے وغیرہ کے اصرار پر اپنے استاذ اور خسر حضرت مولانا سید وحید الحق صاحب مرحوم کے قائم کردہ مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں آکر تدریس کا سلسلہ جاری کیا، آپ کی شہرت سن کر طلبہ جوق در جوق آکر جمع ہوئے اور مدرسہ کی نیک نامی کو چار چاند لگ گئے۔

جب آپ الہ آباد سے بہار شریف جانے لگے تو آپ کے ساتھ متعدد ایسے طلبہ بھی ساتھ ہو گئے جو آپ کے طرز تعلیم اور استادانہ شفقت کے گرویدہ تھے یہ طلبہ عرصہ دراز تک مدرسہ اسلامیہ بہار میں آپ کے حلقۂ درس میں شامل رہے، آپ کے ان شاگردوں میں مولانا عبدالرحمن جونپوری بھی ہیں جو اس وقت مدرسہ امدادیہ دربھنگہ کے صدر مدرس ہیں، علاوہ ازیں مولانا محمد اصغر حسین بہاری (حال نائب پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ) مولانا حافظ عبدالرحمن صاحب (مدرس مدرسہ مذکورہ) اور مولوی شرافت کریم برادر مولانا مبارک کریم صاحب موصوف بھی مدرسہ اسلامیہ میں پہلے ہی سے زیر تعلیم تھے، آپ کی تشریف آوری کے بعد یہ لوگ بھی آپ کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ کئی سال مدرسہ اسلامیہ میں رہنے کے بعد آپ اپنے استاد حضرت

مولانا عبدالکافی صاحب مرحوم کی طلب واصرار پر پھر الہ آباد تشریف لے گئے اور مدرسہ سبحانیہ میں نائب مدرس اول مقرر ہوئے۔

گیامیں:

الہ آباد میں بھی کئی سال تک آپ کا قیام رہا، اس کے بعد حسب ارشاد حضرت مولانا عبدالکافی صاحب مرحوم آپ گیا تشریف لائے اور وہاں جاکر آپ نے مدرسہ انوار العلوم کو دوبارہ جاری کیا، جو قاضی فرزند احمد صاحب رئیس گیا کے صاحبزادہ قاضی انوار احمد مرحوم کے نام سے شمس العلماء مولانا عبدالوہاب فاضل بہاری کا قائم کیا ہوا تھا، مگر شمس العلماء مرحوم کے الگ ہو جانے کے باعث بند ہو گیا تھا۔

المختصر جس وقت آپ تشریف لائے گیامیں کوئی مدرسہ نہیں تھا، اور ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ کوئی عربی درس گاہ جاری کی جائے، چنانچہ آپ نے مدرسہ انوار العلوم کو جاری فرمایا، اس مدرسہ کا فیض دور دور تک پہنچایا اور نہ صرف اس صوبہ میں بلکہ دوسرے صوبوں کے تشنگان علوم بھی اس کے چشمۂ فیضان سے سیراب ہوتے رہے، مدرسہ کے جلسہ کا افتتاح اور سالانہ دستار بندی کے جلسوں میں نامی گرامی علماء کرام تشریف لایا کرتے تھے جس سے گیا کی پبلک بھی مستفید ہوا کرتی تھی۔

آپ کی سعی بلیغ سے مدرسہ کو نہ صرف معنوی ترقی بلکہ صوری ترقی بھی ہوئی۔ مدرسہ کی شاندار عمارت تعمیر ہوئی، دارالاقامہ بھی تعمیر ہو گیا اور بہتیرے غیر مقامی طلبہ کے نہ صرف قیام بلکہ طعام کا بندوبست بھی باضابطہ ہو گیا۔

اصلی مشن:

یہ سب کچھ تھا مگر مولانا مرحوم اپنے دل میں جس کی تڑپ محسوس کر رہے تھے وہ کوئی اور چیز تھی، چنانچہ جب آپ کو مدرسہ کی طرف سے اطمینان ہوا تو آپ نے مدرسہ کا انتظام اپنے لائق شاگرد مولانا عبد الحکیم صاحب کے سپرد فرمایا اور خود علمائے صوبہ کو منظم کرنے اور ان کی وساطت سے بے عمل مسلمانوں کو اس کا پابند کرنے کے لئے باضابطہ قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا اور غور فکر کے بعد قیام امارت کا خاکہ آپ کے ذہن میں آیا، اس اسکیم کو بروے کار لانے کے لئے آپ نے اپنی تمام کوششیں وقف کر دیں اور خدا کے فضل سے آپ کی کوششوں ہی کا نتیجہ امارت شرعیہ بہار کی شکل میں آج بھی موجود ہے۔

امارت شرعیہ کی اسکیم کیا ہے؟ اس پر مفصل مضمون کسی دوسری جگہ ملاحظہ فرمائیں، اجمالی طور پر یہاں یہ لکھنا مناسب ہو گا کہ اس اسکیم کی رو سے پورے صوبہ کو درجہ وار علاقوں میں تقسیم کیا گیا اور تبلیغ و اشاعت اسلام کے لئے ہر جگہ مبلغین اور نقباء کا سلسلہ قائم کیا گیا، فتاوی اور باہمی جھگڑوں کے فیصلے کے لئے قاضیوں کا تقرر عمل میں لایا گیا، اور اس تمام مشنری کو بروئے کار لانے کے لئے زکاۃ، صدقات اور عُشر وغیرہ کی تحصیل کے لئے محصلین اور عمال جابجا مقرر کئے گئے، علاوہ ازیں مذبذب اور متزلزل ایمان رکھنے والی جماعتوں میں عقائد اسلامیہ کے استحکام اور پابندی احکام کی تبلیغ کی گئی، مرتدین اور برگشتہ ایمان لوگوں کو دائرہ اسلام میں واپس لانے کی جدوجہد ہوئی اور غیر مسلمین میں اسلام کو کما حقہ روشناس کیا گیا، اور اس طرح کثیر تعداد مخلوق خدا آپ کی فیض رسانیوں سے مستفید ہوئی۔

ایثار:

مولانا مرحوم تقریباً ۲۲ - ۲۳ سال تک قومی سرگرمیوں میں بلا معاوضہ اور بدون توقع کسی صلہ کے سرگرم کار رہے، نہ دن کو دن سمجھا اور نہ رات کو رات۔ اپنے بال بچوں اور اعزہ و اقرباء تو کیا خود اپنے نفس کے آرام کا بھی مطلق خیال نہ کیا۔ اگر دل میں کوئی درد تھا تو قوم کا اور سر میں کوئی سودا تھا تو وہ اسلام کا۔

آپ کی ان جانکاہیوں اور مجاہدانہ سرگرمیوں کے سلسلہ میں اس حقیقت کا انکشاف بے محل نہ ہوگا کہ آپ نے اس راہ میں نہ صرف اپنے آپ کو وقف کر دیا بلکہ حق تو یہ ہے کہ اس سلسلے میں آنے سے پہلے بہت بڑی مقدار میں کاشت اور کچھ مالکانہ حصوں کے مالک بھی تھے، جو آپ کے کلیۃً قومی کاموں میں مصروف رہنے کے باعث خراب و خستہ ہو گئے اور صرف یہی نہیں کہ آپ نے ذاتی وقار، علمی تبحر، گھر کا اثاثہ بلکہ اپنے جوان بیٹے مولوی محمد حسن سجاد مرحوم کو بھی قربان کر دیا، انتہا تو یہ ہے کہ انتقال کے وقت آپ کے دوا علاج کے لئے کوئی کافی سامان نہ ہو سکا اور انتقال کے بعد پس ماندگان بیوی، بچوں کے لئے قوت لایموت کا کوئی اطمینان بخش ذریعہ بھی موجود نہیں۔ انا اللہ و انا الیہ راجعون۔

وفات:

مولاناؒ عمر کی تقریباً ۶۰ منزلیں طے کر کے سترہویں شوال المکرم ۱۳۵۹ھ بمطابق ۱۸ نومبر ۱۹۴۰ء روز دوشنبہ کو بوقت پونے پانچ بجے شام بمقام پھلواری شریف انتقال فرما گئے، اسی روز دن گذار کر تقریباً ۱۰ بجے شب کو خانقاہ

پھلواری شریف کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ سقی اللہ ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ ۔آمین۔

تالیف وتصنیف:

جہاں تک اندازہ ہے آپ نے زمانۂ تدریس میں شاگردوں کے لئے مختلف کتب کے حواشی تالیف کئے تھے، اس کے علاوہ آپ کے مؤقر مضامین اخبارات اور رسائل میں برابر شائع ہوتے رہے ہیں نیز بعض رسالے بھی مختلف سیاسی ومذہبی تحریکوں سے متعلق شائع ہو کر قبول عام حاصل کر چکے ہیں، ضرورت ہے کہ ان تمام افادات کو یکجا کر کے شائع[۱۱۹] کیا جائے تاکہ عوام اس سے مستفید ہو سکیں۔ خدا راست لائے۔ آمین[۱۲۰]

[۱۱۹] بحمد اللہ مولاناؒ کے مضامین کی ترتیب کا کام ان کے لائق وعزیز شاگرد مولانا سید منت اللہ رحمانی ایم۔ایل۔ اے۔ نے شروع کر دیا ہے (م) لیکن اب تک یہ کام پورے طور پر انجام نہیں پا سکا ہے، بعد میں چند رسائل اور مکاتیب کے مجموعے حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کے اہتمام میں امارت شرعیہ کی طرف سے شائع ہوئے، لیکن ابھی بہت سے کام باقی ہیں، جن کے لئے قدیم مجلات واخبارات کی مراجعت اور تلاش وتفتیش کی ضرورت ہے۔

[۱۲۰] محاسن سجاد، ص ۱۶

یاد سجاد

مولوی سید مجتبٰے، ایم-اے، بی-ایل [۲۱]

میں نے حضرت مولاناؒ کو پہلی مرتبہ ۱۹۲۰-۲۱ء کے عدم تعاون اور خلافت کے جلسوں میں بمقام بانکی پور دیکھا۔ مسٹر مظہر الحق مرحوم نے ایک کوٹھی فریزر روڈ پر ڈاک بنگلہ کے سامنے بنوانی شروع کی تھی، مگر ابھی عمارت کرسی تک بلند ہوئی تھی اور کچھ دیواریں کھڑی ہوچکی تھیں کہ کلکتہ کے خصوصی اجلاس نے کانگریس کو عدم تعاون کا جنگی حربہ بخشا اور صوبہ بہار میں مسٹر مظہر الحق صاحب مرحوم نے اس تحریک کی قیادت کی۔ وہ زمین جو حسن امام صاحب مرحوم کا رضوان "[۲۲] ہے، مسٹر مظہر الحق صاحب مرحوم کی قیادت میں مصاف حریت بنی ہوئی تھی۔ بانکی پور میں جتنے ابتدائی ہنگامہ خیز مجامع ہوئے وہ اسی موجودہ رضوان کی سر زمین پر۔ یہ تحریک عدم تعاون کے انہی جلسوں میں حضرت مولاناؒ پہلی بار سیاسی پلیٹ فام پر مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی مرحوم اور مولانا ابوالکلام کے دوش بدوش نظر آئے۔ حضرت مولانا سجادؒ کا نام اس سے قبل تحریک خلافت کے ہنگاموں میں مشہور عالم ہوچکا تھا۔ لیکن اس وقت تک مولاناؒ

[۲۱] اصل کتاب میں "مولوی سید مجتبیٰ صاحب ایم اے بی ایل آرگنائزر محکمہ دیہات سدھار بہار" لکھا ہے، ان کا وطن بھی چمپارن تھا، مشہور وکلاء میں تھے، حافظ ثانی صاحب کے مضمون میں ان کا ذکر آیا ہے۔

[۲۲] شاید اس نام سے پٹنہ میں گاندھی میدان کے قریب کوئی عمارت تھی۔

مدرس اور عالم تھے، مدرسہ انوار العلوم گیا سے آپ کا تعلق باقی تھا۔ اب ۱۹۲۰ء کی تحریک عدم تعاون نے مولانا کو خالص سیاسی رہبر بنادیا۔

مولاناؒ ان سیاسی مجالس میں تقریر کم کرتے، مگر تجویزوں کی درستگی اور مذہبی نقطۂ نگاہ کی وضاحت میں کافی حصہ لیتے اور یہی مولاناؒ کی سیاسی زندگی میں ہمیشہ فوقیت رکھتا تھا۔ یہ موقع ایسا نہیں کہ مولاناؒ نے صرف سیاسی تجویزوں کو مذہبی نقطۂ نگاہ بخشنے میں جو اہم سیاسی اور مذہبی خدمات پیش کی ہیں، ان کی تفصیل بیان کی جائے، اس خدمت کو ان کا سیرت نگار بہترین طور پر انجام دے سکتا ہے۔ راقم السطور محض اس مضمون میں مولاناؒ کی سیرت کے ان نمایاں واقعات کو بیان کرنا چاہتا ہے جو ذاتی مشاہدہ میں آئے، ورنہ بحر سیاست کا شناور اور مسلمانان بہار ہی نہیں، بلکہ مسلمانان ہند کا مذہبی رہبر، اپنے کمالات علمیہ وقوت عملیہ کے فیوض سے جو دولت لازوال اس پریشان حال جماعت مومنین کو دے گیا، اس کی قدر وقیمت کے لئے چشم بصیرت کی تلاش ابھی باقی ہے۔ مشیت ایزدی نے حضرت مولاناؒ کو حجاب قدس میں لے لیا، مگر ہمیں یقین ہے کہ مسلمین ہند کے لئے مولاناؒ کی مشعل ہدایت بھی عرصۂ دراز تک مستقبل کو روشن کرتی رہے گی اور جنگ حریت کا خاکہ اس سے آگے نہ بڑھ سکے گا جس کا نقشہ مولاناؒ کا سیاسی ومذہبی دماغ بناکر چھوڑ گیا ہے۔

حضرت مولاناؒ نے ۱۹۲۰ء سے تا دم مرگ سیاسی آزادی کے لئے غایت انہماک کے ساتھ خود کو وقف کردیا تھا۔ مولاناؒ نے سیاست اور مذہب کے اتحاد واتصال کا نمونہ امارت شرعیہ بہار کو قائم کیا۔ یہ مولاناؒ کی زندگی کا عظیم الشان باب ہے جو ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کا ایک اہم ترین مسئلہ ہے،

آئندہ مورخ کا قلم برسوں ان موشگافیوں میں مبتلا رہے گا کہ امارت شرعیہ کا محرک اصلی کون تھا اور ہندوستان میں امارت شرعیہ کا مستقل قیام کیوں وجود پذیر نہ ہو سکا اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن مرحوم کی عظیم شخصیت کے باوجود بھی امارت شرعیہ ہندیہ کا نظام نامہ مستقل لائحہ عمل اختیار نہ کر سکا و نیز یہ کہ امام الاحرار حضرت مولاناؒ کی تحریک قیام امارت شرعیہ صوبہ بہار میں کیونکر بار آور ہوئی اور خود امام الاحرار بنگال میں جو ان کا آج تک مستقر ہے، صوبہ متحدہ میں جہاں لکھنؤ کے فرنگی محل سے سراج منیر کی جھلک آرہی تھی اور دہلی میں جہاں ان کا وطن ہے اور پنجاب میں جہاں کے مسلمان آج بھی دعوی قیادت اسلام رکھتے ہیں امارت شرعیہ کا نظام قائم نہ ہو سکا، اور پھر یہ سبب بھی لائق تفتیش ہوگا کہ بہار ایسے صوبے میں جو اسلامستان ہند میں پست ترین صوبہ سمجھا جاتا ہے، کن کمزور ہاتھوں نے امارت شرعیہ کا نظام قائم کر دیا، جو آج بھی تمام خامیوں کے باوجود حیرت نگاہ بنا ہوا ہے اور جس نے مسلمانان ہند کے سامنے ہمیشہ مذہبی، سیاسی نقطۂ نگاہ و پیرایۂ عمل کو بار بار تجربہ کر کے لائق تقلید بنا دیا۔

جمعیت علمائے ہند کی تاریخ امارت شرعیہ سے اس طرح وابستہ ہے جیسے دو توام ہستیاں اور اس رشتۂ اتحاد خیال و عمل میں بھی صرف ایک واحد روح سرایت کر رہی تھی، جو آج ہم سے رشتۂ حیات توڑ چکی اور ہم ''وا امتاہ'' اور ''وا اسفاہ'' لکھ کر اپنا غم غلط کرنے پر مجبور ہیں۔ ان تمام شؤون ماضیہ میں بس ایک روح جلوہ فرما تھی اور وہ ''روح سجاد'' تھی۔

حضرت مولاناؒ سے راقم الحروف کے تعلقات خصوصی اسی عہد امارت شرعیہ سے شروع ہوتے ہیں۔

حضرت مولاناؒ نے ایک عجیب دماغ پایا تھا، وہ غایت مذہبی اور سیاسی انہماک کے ساتھ ساتھ پیرایۂ عمل میں بھی بہترین قانون دانوں کے لئے رہبر خیال تھے ۔ تحریک عدم تعاون اور خلافت کا دور شدھی اور سنگھٹن کے ہنگاموں میں غائب ہو گیا، اور قدرت نے انقلاب کے خوفناک عناصر کو منصۂ شہود پر باہم دست و گریباں کر دیا۔ حضرت مولاناؒ جہاں ہندو مسلم اتحاد کے شیدائی تھے، وہاں آپ کی زندگی کی یہ نمایاں خصوصیات تھیں کہ آپ نے کبھی اصول اسلام کے برتنے میں مداہنت سے کام نہیں لیا۔ شدھی اور سنگھٹن کے ہنگامۂ خونیں میں مولاناؒ کی ذات گرامی ہی از اول تا آخر سربکف رہی اور یہ ایک دوسرا عظیم الشان باب مولاناؒ کی زندگی کا ہے، جو مولاناؒ کے سیرت نگار کی بہترین کوشش اور توجہ کا مستحق ہے ۔ یہ وہ دور تھا جو ۲۴-۲۵ء سے صوبہ بہار میں شروع ہوا اور ۳۲-۳۱-۳۰ تک ہمہ گیر رہا۔ تحریک عدم تعاون اور خلافت کے مسلمان قائدین جو کانگریس سے اتحاد پیدا کر چکے تھے، اب سر چھپانے لگے۔ لیکن ایک مولاناؒ کی ذات گرامی تھی جس نے امارت شرعیہ کے مبلغین کو صف جنگ پر سامنے لا کھڑا کیا، اور خود اس کی قیادت کی، حضرت امیر شریعت اول و حضرت امیر شریعت ثانی نے حضرت مولانا سجادؒ کے دست و بازو ہی سے تمام فتنۂ ارتداد، شدھی سنگھٹن اور فسادات متعلق قربانی گاؤ، جلوس، باجہ، انہدام مسجد، اغوا اور ہزاروں دیگر فسادات کا مقابلہ کیا، جو ہندو مسلم سیاسی اتحاد کو ملیامیٹ کرنے کے لئے تمام صوبے میں پیدا کئے گئے۔

بتیا کا خوفناک بلوہ ایک ایسا واقعہ ہائلہ تھا، جس نے مولانا سجادؒ کی عظیم شخصیت کے جوہر دکھلائے، یہاں یہ اشارہ کرنا ضروری ہے کہ امارت شرعیہ نے

چمپارن ضلع اور بتیا تحصیل میں جاہل غریب مسلمانوں میں بہترین تنظیم کی ہے جو آج بھی لائق رشک ہے۔

بتیا شہر میں ایک محلہ میر شکار ٹولی کہلاتا ہے ، باختلاف روایت چالیس پچاس ہزار ہندوؤں کا مسلح جلوس اس محلہ کی تنگ سڑکوں سے گذرنے لگا ، جہاں ایک چھوٹی سی مسجد میں تیس چالیس مسلمان نماز عصر ادا کرنے کو جمع ہوئے تھے ، مسلمانوں نے عذر کیا کہ وہ راستہ نہ تھا ، آبادی محلہ کی خالص مسلمانوں کی تھی ، سرداران جلوس نے اس مزاحمت کا جواب مسلح حملوں سے دیا ، مسجد بری طرح بے حرمت کی گئی ، تمام محلہ جلا کر خاک سیاہ کر دیا گیا اور شہر میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان عام بلوہ ہو گیا ، ہتھیار عام طور پر استعمال ہوئے ، بندوقیں چل گئیں ، سینکڑوں مکانات اور دکان لٹ گئے ، مسلمان بہت زیادہ مقتول ہوئے ، ایک ہندو بھی مارا گیا اور وہ سب کچھ ہوا جو ایسے بلووں میں ہوا کرتا ہے۔

بتیا کے مسلمان عموماً جاہل ، غریب اور مزدور پیشہ ہیں ، ان کا پُرسان حال اور پیروی کار کوئی نہ تھا ، یہی بطل حریت اور رہبر عالم اسلام مسلمانان بتیا کے لئے ملجاومامن بن کر پہنچا۔ مدرسہ اسلامیہ بتیا میں امارت شرعیہ کے آزمودہ کار نقیب و رئیس حافظ محمد ثانی صاحب و شیخ عدالت حسین [۱۲۳] کی مدد سے مولاناؒ نے پیروی مقدمات کا دفتر کھول ڈالا۔ بہترین قانون دان حضرات باہر سے بلوائے گئے اور تقریباً ایک سال تک تمام مقدمات کی پیروی کی گئی ۔ دنیا جانتی

[۱۲۳] حافظ محمد ثانی صاحب ام ال اے اور شیخ عدالت حسین صاحب ، مولاناؒ کے خاص رفیقوں میں تھے ، اور آخر تک ساتھ رہے ، چمپارن کے ہر دکھ درد میں یہ حضرات سینہ سپر رہتے ہیں۔ (م)

ہے کہ بلوے کے ایسے خوفناک مقدمات کیا ہوتے ہیں ، قانون کی چیرہ دستیاں کس طرح لوگوں کو پریشان کرتی ہیں ، تمام شہر اور مضافات ایک عجیب مصیبت میں مبتلا تھے اور مولانا سجادؒ ان کے ہر مرض کی دوا۔ تین سو سے زیادہ مسلمان ماخوذ تھے جن پر تمام سنگین دفعات عائد کئے گئے تھے ، مگر بالآخر ایک ایک مسلمان رہا ہو کر رہا ، کچھ ہندو سزایاب ہوئے ، سرغنہ ہندوؤں کو سخت سزائیں ہوئیں ، مسلمانوں کو تقریباً پچاس ہزار تاوان حکومت نے دلوائے ۔ راقم الحروف تقریباً ایک سال تک مولاناؒ کے ہمراہ قانونی مشیر رہا ، اس مضمون کے مختصر حدود اجازت نہیں دیتے کہ اس سال کی بھر کی زندگی کو مفصل بیان کر سکوں ، مگر اتنا کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ اصحاب رسول ﷺ اور قرن اول کے مجاہدین اسلام کے متعلق جو کچھ کتابوں میں پڑھا یا سنا تھا وہ سب ایک مولانا کی ذات گرامی میں بچشم خود دیکھا

ز فرق بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

مولاناؒ نے حکومت بہار کے ایوان گورنری سے لے کر ایک ایک ادنی افسر متعلقہ پر مسلمانوں کی بے جرمی اور مظلومیت کا نقشہ بیٹھانے میں جو سعی کی ہے اس کا بیان کامل ابھی تشنہ ہے۔ مولاناؒ نے اس حادثۂ عظیم پر جو اول مراسلہ بہار کے گورنر کے پاس بھیجا اس کا مسودہ خود تیار کیا تھا ، اور اس خادم کو انگریزی ترجمہ کے لئے مرحمت فرمایا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس خادم کو مولانا کی تحقیق و تلاش اور فراست قانون کے حیرت انگیز قوائے عقلیہ و دماغیہ و علمیہ کا علم ہوا

،مراسلہ مذکورہ کی ایک نقل آج بھی محفوظ ہے اور اس کا مطالعہ مولاناؒ کے سیرت نگار کے لئے ایک مخزن واقعات ہو گا۔

تمام حکام پولیس مجسٹریٹ اور گورنر کے کونسل کے ممبران بتیا کو اپنا مستقر بنا کر مصروف تحقیقات تھے، مولاناؒ نے جو دفتر تحقیقات قائم کیا تھا اور وہاں جو کام مولاناؒ کی ہدایت سے کیا جاتا، حکومت اس کو جاننے کو بے قرار رہتی اور آپ یہ جان کر تعجب کریں گے کہ حکومت نے مولاناؒ کے طریقۂ تحقیقات کی بارہا تقلید کی ۔اس قسم کا ایک مشہور واقعہ تصویر کشی کا ہے ،مولاناؒ نے قانونی ضرورتوں کے لئے تمام مقامات متعلقہ کے فوٹو تیار کرائے ،ایک فوٹو گرافر باضابطہ مقرر کیا گیا اور کام جاری ہو گیا، پولیس کے افسران حیرت سے پوچھتے کہ اس میں کیا غرض پنہاں تھی، بالا آخر پولیس نے بھی فوٹو لینے شروع کئے۔ آپ بس اتنا ہی سن کر اکتفا کریں کہ دفعہ ۳۰۳تعزیرات ہند یعنی قتل عمد کا جو الزام مسلمانوں پر تھا،اس مقدمہ میں زیادہ کامیابی فوٹو کی وجہ کر ہوئی، جس کو دکھلا کر گواہوں سے اس طرح جرح کی گئی کہ ان کا کذب ظاہر ہو گیا اور مسلمان بے داغ بری ہو گئے۔

باوجود انتہائی اتحاد عمل کے مولاناؒ نے شدھی سنگھٹن اور ارتداد کے قضیوں میں ہر گز کانگریس یا مہاسبھائی ہندوؤں کی دوستی کو مداخل نہ بنایا اور سینہ سپر ہو کر محافظت اسلام کے لئے آخر وقت تک قربانیاں کرتے رہے۔

انہی واقعات میں سے گورکھپور اور چمپارن ضلعوں کے مسلمان گدّیوں کا ارتداد ہے ، گدی ان اضلاع میں مسلمانوں کی وہ جماعت ہے جو مویشیوں کے پالنے اور دودھ ،دہی ،گھی کی تجارت کا روزگار کرتے ہیں ،یہ

مسلمان گوجر، گوالے یا اہیر ہیں، یہ غایت درجہ جاہل اور توہم پرست ہیں۔ان مسلمان گدیوں کی تنظیم بھی مولاناؒ کی محیر العقول تنظیمی قوت کا نمونہ تھا۔

اس دور کی خدمات میں چوتروا ضلع چمپارن کے ڈوموں کی تبلیغ بھی ہے، قوانین موجودہ نے جرائم پیشہ اقوام کی اصلاح کے لئے ایک مخصوص و محدود آبادی ضلع چمپارن اور دیگر اضلاع میں قائم کرنے کی کوشش کی ہے ،جس میں چوتروا کی آبادی نہایت ممتاز ہے۔ جرائم پیشہ اقوام میں ،مگہیا ڈوموں کی کثیر تعداد یہاں آباد ہے جن کی اصلاح کا کام عرصہ سے مسیحی تبلیغی ادارے کیا کرتے تھے ۔ حضرت مولاناؒ کی تحریک پر مبلغین امارت کو ان بد نصیب جماعتوں کی اصلاح و تبلیغ کے لئے بھیجا گیا۔حکومت کے افسران اور مسیحی مبلغین سے جو" سالویشن آرمی" یا مکتی (نجات دہندہ) فوج کہلاتی ہے اختلافات پیدا ہوئے ،بالآخر مولاناؒ کی جدوجہد سے حکومت نے یہ حق تسلیم کر لیا کہ ان جرائم پیشہ ڈوموں کی اصلاح کا حق ہندو مسلمان سب کو ہے ۔ اس عرصہ میں مبلغین کی کوششوں سے تقریباً ایک سو خاندان مسلمان ہو چکے تھے۔ مسلمان مبلغین کو حکومت نے اجازت دی کہ وہ ان مسلمان ڈوموں کی مذہبی تربیت کریں ،اخبارات میں جو مراسلے مولاناؒ کے شائع ہوئے اس سے آریہ مبلغین نے بھی زور وشور سے ان جرائم پیشہ اقوام کی اصلاح میں پر جوش حصہ لینا شروع کیا۔اس سلسلہ کی ایک اصلاح مولاناؒ نے چمپارن ضلع کے ابتدائی اسکولوں اور پاٹ شالوں میں کی، جہاں مسلمان بچوں کو ہندی کی تعلیم دی جاتی تھی اور بجائے قرآن کے گیتا پڑھایا جاتا تھا، مولاناؒ نے دفتر تعلیمات سے کافی مراسلات کئے اور ابتدائی مکاتب کا معائنہ کر کے من وعن حالات حکام بالا کو

پہنچائے۔ متعصب افسران ماتحت کو بدلوایا اور مسلمان بچوں کی تعلیم مذہبی کا
انتظام کرایا اور بکثرت اردو دان مسلمان معلم مقرر کرائے۔

آج مسلمانوں کے سیاسی اختلافات نے کتنی تنگ نظری پھیلا دی ہے۔
مسلمانوں کی ایک جماعت نے مرنے والے کو بہت زیادہ مطعون کیا کہ وہ ہندو
پرست تھے، کانگریس کے نمک خوار تھے اور اصول اسلام کو ہندوؤں کی
خوشنودی پر فروخت کرتے تھے، عیاذاً باللہ ! فردائے قیامت میں خداوند
قدوس کے سامنے ہزاروں کلمہ گو اس امر کی یقینی شہادت دیں گے کہ یہ بندۂ
خدا ابوالمحاسن محمد سجاد بیس سال تک اس صوبہ میں کم از کم تنہا مجاہد اسلام و
حریت تھا جس نے سنت محمدی ﷺ کے اجرا اور اصحاب رسول کے نقش پر چلنے
میں اپنی جان گنوائی۔ دنیا کی کوئی حرص نہ تھی اور وہ سراپا تمسک بالاسلام پر قدم
زن تھا۔ ذہاب فی سبیل اللہ اس کی حیات دنیاوی کی تصویر تھی، مسلمانوں کی
سیاسی اور مذہبی تنظیم میں اس ذات گرانمایہ نے ایک ایک لمحۂ حیات صرف کیا
اور دنیا کی کوئی طاقت اس کو مرعوب نہ کر سکی، وہ تنگ نظر نہ تھا کہ ہمسایہ اقوام
سے اتحاد عمل کرنے میں جی چراتا، وہ طالب جاہ نہ تھا کہ حکومت پر جلوہ فرما
ہو کر مظاہرہ و مقابلہ کرتا، اس کی زندگی سراپا جہاد تھی، اور وہ خالص مجاہد اسلام
تھا۔

بتیا کے بلوے نے حضرت مولاناؒ کے قوائے عقلیہ و عملیہ کو حکومت اور
پبلک دونوں کے سامنے انتہائی کمال کے ساتھ دکھلایا اور امارت شرعیہ کو صوبہ
بہار میں غایت درجہ مستحکم کر دیا، مبلغین امارت کی وقعت ہر گوشہ میں پیدا ہو

گئی اور کم از کم اضلاع ترہت میں مسلمانوں کو اس ادارے پر کامل بھروسہ ہو
گیا۔

یہ زمانہ ایسا تھا کہ ہر ضلع اور ہر تحصیل میں ہندو مسلم فسادات رونما ہو
رہے تھے، عید قربان اور دُرگا پوجا، ہولی اور مہابیری جلوس کے موقعے بلووں
کے خطرے کے لئے نہایت پریشان کن ہوئے۔ بتیا کے بلوے کے بعد ہی مظفر
پور ضلع میں پاتے پور تھانہ کے موضع سمروارہ میں قربانی گاؤ کے لئے ہندوؤں
نے ایک غریب مسلمان کو شہید کر دیا اور بہتیرے غریب مسلمانوں کو جو اس
بستی میں آباد تھے لوٹ لیا۔ اس علاقہ کے قریب ہی دربھنگہ ضلع کے دیہات
مسمّٰی سرسونہ میں بقر عید ہی کے موقع پر دوسرا بلوہ ہوا جس میں ہندوؤں نے
مسلمانوں کے گھروں کو لوٹ لیا۔ یہ دو مقدمے بھی کامیابی کے ساتھ لڑے گئے
اور حضرت مولاناؒ کی جدوجہد برابر شامل حال رہی، اس مضمون کا محدود پیرایۂ
بیان اس کی اجازت نہیں دیتا کہ واقعوں کی تفصیل کی جائے، صرف اس کے
نتیجہ کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ حضرت مولاناؒ کا اصول عمل ہر واقعہ میں
بین طور پر ظاہر ہو جاتا۔ نظام امارت نے باوجود مالی بے مائیگی کے ہر موقعہ پر
مسلمانان بہار کی مذہبی آزادی برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ مسلمانوں کی مذہبی
آزادی پر جب بھی کبھی حملے ہوئے تو حضرت مولاناؒ نے بحیثیت نائب امیر
شریعت مسلمانوں کی مذہبی آزادی کی حفاظت کے لئے سینہ سپر ہو کر حکومت
اور برادران وطن کا مقابلہ کیا اور ایسی جدوجہد کی کہ ہر مرتبہ ظالموں کو سزایاب
کرایا اور حکومت سے انصاف کا مطالبہ کر کے خاطر خواہ طور پر قضیوں کو طے
کرایا۔ قربانی گاؤ، جلوس اور مساجد و مدارس، مکاتب و اوقاف ان تمام چیزوں کی

نگرانی پورے صوبہ میں ایک مولاناؒ کی ذات سے وابستہ تھی اور مبلغین امارت
اسی مرکز کے گرد گھومتے تھے۔

ان تمام واقعات ہائلہ نے حضرت مولاناؒ کو صوبہ بہا کے گوشہ گوشہ
سے وابستہ کر دیا۔ ہر علاقے کے مسلمان ادنی واعلی، جاہل اور تعلیم یافتہ آپ سے
واقف اور آپ کی عظیم شخصیت سے متاثر ہوگئے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب کہ حج کے
متعلق قوانین نافذ ہونے لگے اور وائسرائے کی حکومت نے حج بل کے
مسودات پیش کئے، حاجیوں کی واپسی، ٹکٹ، جہازوں کے تعین، حاجیوں کی
خوراک، معلمین کے لائسنس وغیرہ کے مسائل زیر بحث آ گئے اور در پردہ
سیاسی قضیے پیدا ہو گئے۔ یہ باب مولاناؒ کی زندگی کا ایسا اہم ہے کہ مولاناؒ کا سیرت
نگار ابھی برسوں غور کرے گا کہ واقعات کی گتھیوں کو کیوں کر سلجھائے۔ ایک
واقف کار نے بہت ہی خوب کہا کہ حضرت مولانا سجادؒ کی سیرت لکھنے کے لئے
ضرورت ہے کہ کچھ دن اور انتظار کیا جائے تا کہ کچھ شخصیتیں اور ابھی عالم فنا کو
منتقل ہو جائیں، ورنہ خوف ہے کہ سیرت نگار کا قلم شخصی جھگڑوں میں بھی پھنس
جائے گا۔ یہی وہ عہد ہے جب کہ مولاناؒ ہندوستان کی بعض عظیم مسلم شخصیتوں
سے مقابل ہوئے اور محافظت اسلام کے لئے آپ نے اعلائے کلمۂ حق میں بے
باکانہ جرأت سے کام لیا۔ مولاناؒ نے امیر شکیب ارسلان کی کتاب حاضر العالم
الاسلامی[۱۲۴] اور دیگر خالص عربی ذرائع کے حوالہ سے وائسرائے کی اسمبلی کے

[۱۲۴] حاضر العالم الاسلامی اصل میں امریکی مصنف (STODDARD) کی کتاب "دی نیو ورلڈ
آف اسلام" کا ترجمہ ہے۔ مترجم سید عجاج نویھض ایک روشناس عرب اہل قلم ہیں، مجاہد جلیل امیر
شکیب ارسلان مدظلہ نے اس پر جابجا حواشی (فٹ نوٹ) لکھے ہیں۔ لیکن امیر البیان کا قلم اور
دنیائے اسلام کی سیاست! لکھنے بیٹھے حواشی تو خود پر قابو نہ پا سکے اور یہ حواشی بھی بڑھ گئے اصل

تمام مسلمان ممبروں کو قانون حج کے اصل سیاسی مفہوم سے مطلع کیا اور
مسودات پیش شدہ کی مخالفت کا مطالبہ کیا۔ حج کمیٹی کی کاروائیوں پر اعتراضات
کئے اور تمام ہندوستان کا دورہ کر کے تمام مسلم اداروں کو آئندہ خطرہ سے مطلع
کیا اور حج پر سیاسی اغراض سے جو قانونی پابندیاں ہونے والی تھیں ان کو برملا
سمجھانا شروع کیا، اس دور میں مولاناؒ نے ان قائدین سے مخالفت مول لی جو اب
تک مسلمانوں کی اپنے اپنے حلقے میں بلاشرکت غیر نمایندگی کرتے تھے، ان ہی
لیڈروں میں شفیع داودی بھی ہیں، جن سے مولاناؒ کے سیاسی اختلافات آئندہ
الکشنوں میں عجیب تکلیف دہ صورت اختیار کر گئے۔ یہ داستان اس صوبہ میں اب
تک بھولی نہ گئی ہوگی، اس لئے دہرانے میں کوئی لطف نہیں۔

غرض صرف اس قدر بیان کرنا ہے کہ قانون حج کے واقعات نے
مولاناؒ کو سیاسی پلیٹ فارم پر بہت جلد بلا لیا اور ۱۹۳۰ء کی پہلی مسلم کانفرنس نے
مولاناؒ کے سیاسی تدبر کا ایک نمونہ پیش کیا۔ مولوی شفیع داودی کی کوششوں سے
بانکی پور پٹنہ کے محلہ مرادپور کی اشرف منزل میں مسلم کانفرنس کا پہلی بار انعقاد
ہوا اور مولانا محمد علی جوہر مرحوم جو فرانکو (جرمنی) میں بغرض علاج مقیم تھے
صدارت کے لئے براہ راست پٹنہ تشریف لائے۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ مولانا
محمد علی مرحوم کانگریس سے علاحدہ ہو چکے تھے اور ایک نئے سیاسی پلیٹ فارم
کے بنانے میں مشغول تھے، ڈاکٹر انصاری مرحوم نیشنلسٹ کانگریسی مسلمانوں

کتاب سے، پہلا ایڈیشن عرصہ ہوا دو جلدوں میں چھپا تھا، دوسرا ایڈیشن مزید اضافہ کے ساتھ چار
جلدوں میں ۱۹۳۲ میں شائع ہوا ہے جس میں اصل مصنف کا ایک ربع سے زیادہ نہیں۔ یہ ایک
حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی بین الملی سیاسیات پر دنیا کی کسی زبان میں ایسی کتاب اب تک شائع
نہیں ہوئی۔ (م)

کے سردار تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد اور حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کی ہمت افزا رفاقت ان کا حاصل تھی۔ عین کانفرنس کے موقع پر ڈاکٹر انصاری صاحب بھی پٹنہ بلائے گئے اور نیشنلسٹ مسلمانوں نے ان کی صدارت میں علاحدہ کانفرنس کرنا چاہا، ڈاکٹر انصاری صاحب سر علی امام کے مہمان تھے اور مولانا محمد علی مرحوم مسٹر عبدالعزیز کی کوٹھی "دلربا" میں رونق افروز، اس پرانے شہر عظیم آباد کی نئی آبادی میں سخت ہنگامے کا خطرہ تھا، سر علی امام کی کوششوں سے ڈاکٹر انصاری اور مولانا محمد علی مرحوم میں مفاہمت کی گفتگو ہوئی اور بالآخر یہ طے پایا کہ مسلم کانفرنس کے کھلے اجلاس میں ڈاکٹر انصاری مرحوم صاحب کو بھی اپنی جماعت کا نقطۂ خیال پیش کرنے کی اجازت دی جائے۔

یہ راز اب کہہ دینے کے قابل ہے کہ ان تمام کوششوں میں حضرت مولانا سجادؒ کا ہاتھ بھی پیش پیش تھا اور علمائے اسلام میں اس موقع پر بھی ہزاروں آنکھوں نے اگر کسی عالم کو ان سیاسی زعمائے ملت کے دوش بدوش ہی نہیں بلکہ اکثر مواقع پر بہترین مشیر اور رہبر دیکھا تو وہ مولانا سجادؒ ہی کی ذات تھی۔

دنیا یہ جانتی ہے کہ مسلم کانفرنس نے کچھ اصولی مطالبات حقوق کے متعلق بنائے لیکن یہ راز اب تک سربستہ ہے کہ حقوق مسلم کی تعریف کس نے بتائی، اس کی حد بندیاں کس نے کیں؟ اور کس طرح وہ مخصوص حقوق تجویز کی شکل میں فرداً فرداً شمار کر کے دنیا کے سامنے پیش کئے گئے؟۔ مسلم کانفرنس کی مجلس مضامین میں مولانا مرحوم نے وہ تجویز جو حقوق مسلمین کے حدود متعین کرتی ہے کافی بحث و تمحیص کے بعد مولانا محمد علی مرحوم کی استدعاء پر قلمبند کر کے دی اور مؤخر الذکر بزرگ نے اس کو انگریزی کا جامہ پہنایا۔

یہ محدود تجویز مسلم کانفرنس کی طرف سے سائمن کمیشن کے سامنے پیش کی گئی اور پھر کچھ دنوں بعد دوسری گول میز کانفرنس میں پیش کی گئی اور نئے قالب میں مسٹر محمد علی جناح کے "چودہ پوائنٹ" میں آگئی۔ اس میں مولاناؒ نے اقلیت کے مسائل خصوصاً مسلمانوں کے پرسنل لا کے متعلق قوانین سازی کے متعلق یہ اصول وضع کیا کہ جب تک مسلم نمائندگان کی اکثریت کسی بل پر متفق نہ ہو، وہ بل قانون نہ بن سکے۔ ہمارے مطالبات آج بھی اس حد سے آگے نہیں بڑھے۔

چند ہی سال بعد ۱۹۳۵ء میں مرکزی اسمبلی کا انتخاب درپیش ہوا اور مولاناؒ نے جمعیۃ علماء اور امارت شرعیہ کو میدان میں لا کھڑا کیا اور دنیا نے یہ تماشا دیکھا کہ مدرسوں اور خانقاہوں کے بوریہ نشین سیاست کی نئی گتھیاں سلجھانے لگے۔

مسلمان انگریزی داں طبقہ نے مولاناؒ کی اس جرأت کو ناقابل معافی سمجھ کر سخت مخالفت کی اور اس مخالفت کا ممتاز واقعہ مولوی شفیع داؤدی صاحب کا مقابلۂ انتخاب تھا، ایک محدود جماعت انگریزی دانوں کی مولانا سجادؒ کے ہمراہ بھی تھی، لیکن یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ اکثریت آخر تک مخالف رہی اور مولوی شفیع الکشن میں کامیاب ہوئے، مولانا سجادؒ نے الکشن کو خلاف قانون قرار دینے کے لئے مقدمہ دائر کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ الکشن ٹریبونل کی تحقیقات مولوی شفیع داؤدی کی موافقت میں ہونے کے باوجود وائسرائے نے انتخاب مسترد کر دیا، یہ داستان ابھی ہماری یاد سے محو نہیں ہوئی۔

"امارت الکشن بورڈ کا "مینی فسٹو (منشور) اور الکشن کے نتائج نے دو امر واضح کر دیا، اول تو یہ کہ ۱۹۱۴ کی جنگ عظیم کے وقت ایک سیاسی مدبر[۱۲۵] نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ " یہ جنگ اور خاص کر عالم اسلام کی کشمکش ایسا واقعہ ہے کہ خانقاہوں کے حجروں میں رہنے والے اپنا سجادہ و تسبیح چھوڑ کر میدان سیاست میں اتر آئیں گے اور دیوبند اور ندوۃ العلما کے بوریا نشیں مسلمانوں کی مذہبی جماعتوں کو میدان میں لا کھڑا کریں گے "۔ ۱۹۳۵ میں یہ جماعت علماء و مشائخ کی سیاست میں عملی لینے کے لئے پریشان نظر آنے لگی اور دوسری طرف انگریزی داں طبقہ کو اپنے سیاسی لائحہ عمل پر از سر نو غور کرنا پڑا۔ ابھی وقت نہیں آیا کہ کامل فیصلہ کیا جائے کہ کون صراط مستقیم پر تھا اور ہے ، مگر عالم تلاطم میں طوفان کا شور اور سمندر کا مدوجزر ہر آنکھ کے سامنے عریاں ہو گیا۔ وہ جو صاحب عزلت تھے میدان میں کود پڑے اور وہ جو طالب سکون تھے حجروں میں جا چھپے۔

۱۹۳۵ کے قانون قبول یا رد کرنے کے ہنگامے اور ۱۹۳۷ء کا صوبہ وار الکشن مولانا سجاد علیہ الرحمۃ کی رہبری کا یکساں ممنون ہے ، مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی اور مسلم یونائیٹڈ پارٹی اور احرار پارٹی کی انتخابی سر گرمیاں ، مولانا سجادؒ کی سیاست و تدبر کے لئے ایک نئی اور شاید آخری آماجگاہ بن گئیں۔ مولاناؒ کی مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی اکثریت کے ساتھ انتخاب میں کامیاب ہوئی اور مسٹر محمد یونس پارٹی لیڈر کی عارضی سہ و نیم ہائی وزارت بھی مولاناؒ ہی کی زندگی کا ایک

---

[۱۲۵] یہ پیشین گوئی غالباً مسٹر ماریسن (سابق پرنسپل ام، اے، او کالج علی گڑھ) کی ہے جس کو اسٹاڈرڈ نے بھی نقل کیا ہے۔ (م)

ممتاز باب ہے ، جس کی کم از کم ایک درخشاں یادگار اردو زبان کا عدالتوں اور دفتروں میں جاری کرنا ہے ، آپ اس وزارت کے متعلق جو کچھ بھی رائے رکھیں اس پر بحث کا یہ موقع نہیں ، اس کلیہ سے کم اختلاف ہو گا کہ مولاناؒ نے اپنا اصل سیاسی مقصد حاصل کر لیا، اور ایک انقلاب عظیم ہندوستان کی سیاست میں برپا کر دیا ۔ مسلمانوں کی مذہبی جماعت نے سیاست میں غور و فکر کرنا شروع کر دیا، انتخابات میں حصے لئے، کامیابیاں، نمایاں اور ممتاز کامیابیاں حاصل کیں اور ان تمام امور میں جن کو مذہبی مسائل سے تعلق ہے ، مذہبی جماعت سے استصواب رائے کرنے کے اصول کو منوالیا۔

مولاناؒ جادۂ حریت کے ایک مسافر تھے اور اپنا سفر ختم کر کے منزل مقصود تک پہنچ گئے ، اب راستے درست ہوں گے ، منزلیں مقرر ہوں گی ، آرائش و آسائش کے سامان بہم پہنچائے جائیں گے ، اور مال غنیمت کے حصے بخرے کرنے کے لئے جھگڑے ہوں گے ، مگر جادۂ عمل کی تاریکی غائب ہو چکی اور وادیٔ مقصود کی خاردار جھاڑیاں کٹ چکیں ، اب صرف شہسواروں کی یکہ تازی منظر نگاہ ہے ، وہ کونسا شہسوار ہے جس نے ٹھوکریں نہیں کھائیں؟ مگر صد ہزار آفریں ہے اس رہ نورد پر جو راہ کی تاریکی اور خطرناکی سے کبھی نہ گھبرایا، اور ہم سفروں کی قلت سے کبھی اس کا دل ملول نہ ہوا ، جس کو سامانوں کی کمی نے کبھی فکر مند نہ کیا اور جس نے مصیبتوں کے پہاڑ جھیلنے میں کوتاہی نہ کی ، خدا کی رحمت ہو اس فرش خاک پر جہاں وہ ابدی راحت میں منتظر قیامت ہے۔

علمائے اسلام کی جماعت آئندہ مولاناؒ کے افکار و ہدایات کی کیا تاویل کرے گی؟ یہ کہنا مشکل ہے ، مگر آج تو اس کو یہ اعتراض بخوشی قبول کر لینا چاہئے

کہ کم از کم صوبہ بہار میں اوریوپی اور دہلی و پنجاب تک مولانا سجادؒ نے علماء کے تفوق کے لئے آخر لمحہ تک جہاد کیا۔اسلام کے قرن اول سے لے کر آج تک مذہبی جماعت کے تفوق کا مسئلہ دیگر ادیان و ملل کی طرح باعث نزاع رہا اور تاریخ کے صفحات ایسی خونیں داستانوں سے بھرے ہیں، مگر ہندوستان کی سیاسی پامالی کے بعد اس اُبھار کی کوئی امید باقی نہ تھی۔مولاناؒ نے اپنے جد وجہد سے یہ ثابت کر دیا کہ کہ اس خاکستر میں ابھی کتنی آگ باقی ہے، جو اگر قابو میں نہ رکھی گئی تو ایک عالم کو خاک کر دے سکتی ہے۔

مولاناؒ کی زندگی کیا تھی؟ سراپا فقر! آپ کا عمل کیا تھا؟ جہاد فی سبیل اللہ، احیائے سنت اللہ و اعلائے کلمۃ اللہ، سامان زندگی اتنا مختصر کہ غربت بھی شرمائے، ارادے ایسے بلند کہ بلندی کو شرم آئے، گھر اور گھر کی تمام بضاعت اپنے مقصد پر قربان کر چکے تھے، پھلواری شریف کے قصبہ "ناجیہ" میں غلامی سے نجات پانے کے لئے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔جب سے امارت شرعیہ کا دفتر قائم ہوا پھلواری ہی جائے سکونت قرار پائی، تقریباً بیس سال سے پاؤں میں چکر تھا کبھی چین کے دو دن بھی یہاں نصیب نہ ہوئے، کچھ دنوں سے جمعیت علمائے ہند کے دفتر کو سنبھالنے کے لئے دہلی میں زیادہ رہنا ہوتا تھا۔

ذاتی حیثیت سے مولاناؒ سراپا توکل تھے، عُسرت کی زندگی بخندہ پیشانی بسر کرتے۔خاندان کی کاشت کا معتد بہ حصہ امانواں راج نے بقایا لگان میں نیلام کرالیا تھا، ایک وسیع مکان خاندان کی رہائش کا موضع پنہسہ تھانہ دیپ نگر، تحصیل بہار شریف(ضلع پٹنہ) [حال ضلع نالندہ] نالندہ روڈ اسٹیشن کے

قریب ریلوے لائن سے متصل تھا جس کے اکثر حصے غیر مرمت اور منہدم ہو گئے ہیں۔

مولاناؒ کس درجہ رضائے الٰہی پر شاکر تھے اس کا یک واقعہ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے۔مولاناؒ کا ایک جوان لڑکا دیوبند میں تعلیم پا رہا تھا جو خاص مولانا حسین احمد صاحب کے زیر درس تھا، وہی ایک چراغ خانہ تھا جو سنت ایزدی سے ۱۹۳۴ء میں غالباً گھر پر سخت بیمار پڑا، مولانا سجاد علیہ الرحمۃ مولانا احمد سعید صاحب کے ہمراہ اضلاع ترہت میں دورہ کر رہے تھے، تار پر تار گئے، اس لڑکے کی حالت خطرناک ہو گئی اور وہ انتقال کر گیا، مولاناؒ اس وقت تک سفر ملتوی کرنے پر مائل نہ ہوئے جب تک خطرناک حالت اور نا امیدی کی اطلاع نہ ملی، اس حال میں بھی مولاناؒ نے جس صبر کا ثبوت دیا اس کی مثالیں عنقا ہیں، جن لوگوں نے مولاناؒ کو اس وقت دیکھا ہے وہ اس کی شہادت دیں گے کہ مولاناؒ نے کس ضبط و صبر سے راضی برضا رہ کر اسلام کی بہترین تعلیم کا نمونہ دکھلایا۔

کتب بینی مولاناؒ کا محبوب مشغلۂ فرصت تھا، کثرت مطالعہ سے آنکھیں بہت کمزور ہو گئی تھیں اور ۱۹۴۰ میں آنکھوں کی تکلیف بہت زیادہ ہو گئی تھی، مگر مطالعہ کا شوق ویسا ہی باقی تھا۔اس مختصر مضمون میں مولاناؒ کے ذوق مطالعہ کی وسعت کو بیان کرنا ممکن نہیں، اتنا عرض کر دینا کافی ہو گا کہ وسعت مطالعہ کا یہ حال تھا کہ مسائل حاضرہ کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس پر مولاناؒ نہایت تحقیق و تدقیق سے گفتگو کرنے اور حل کرنے پر قادر نہ تھے۔

کانگریسی لیڈروں سے اور اس کے اداروں سے مولاناؒ کے تعلقات ہمیشہ بے لوث رہے اور ایک مثال بھی ایسی نہیں مل سکتی جس میں مولانا کا دامن اغراض ذاتی سے وابستہ ہوا ہو، مخالفین کے اعتراضات جن بد گمانیوں پر منحصر ہوں ان کی تحقیق کا تو موقع نہیں، مگر مخالفین خود بھی اپنی بد گمانیوں کی کوئی بنیاد آج تک نہ بتا سکے۔ کانگریس کے ساتھ مصلحتاً اتحاد عمل مولاناؒ کا کھلا ہوا تدبر تھا ،اور عملی طور پر جب اسلامی حقوق کی محافظت کانگریس کی مخالفت کی داعی ہوتی ،تو مولاناؒ کانگریس کی مخالفت سے کبھی باز نہ آتے ،یہی وہ اصول عمل تھا جس کی وجہ کر ان کی ذات گرامی سے کانگریس مرعوب بھی تھی اور خائف بھی۔ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ مولاناؒ کانگریس یا ہندوؤں سے مرعوب ہوتے تھے وہ ان حقائق پر غور کریں جو عارضی وزارت بنانے اور اس بیان کے شائع کرنے میں پوشیدہ تھے ،جو بت پرستی کو برداشت کرنے اور مسٹر کرپلانی کے خط فلسفۂ گاندھی ازم کے جواب میں لکھا گیا۔

ہمیں امید ہے کہ جب مولاناؒ کے رشحات قلم و افکار و حوادث اور بیانات و خطابت مرقومہ کے وثائق مرتب ہو جائیں گے تو ہم موازنہ کر سکیں گے کہ کس شخص نے ہماری حیات سیاسیہ کی حوصلہ مندیوں کی راہیں متعین کیں اور کون سا لائحہ عمل ہمیں آئندہ اخذ کرنا چاہیے۔ باتیں تو کہنے کہ بہت ہیں مگر ایک نشست میں کہنا ممکن بھی نہیں۔

مولاناؒ کی روح ابھی ہم سے خود مائل گفتار ہے اور اس کی آواز ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے ،اس کو نہاں خانہ دل میں جا گزیں کیجئے "ولا تقولوالمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء ولکن لا یعلمون" ورنہ اگر داستان سرائی ہی مقصود ہو تو ہمیں کہنا پڑے گا کہ

دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید نیست

ماہ ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

رات آدھی سے زیادہ گذر چکی ہے اور عالم تصور اس تصویر کو حقیقت بنا کر پیش کر رہا ہے، جو کبھی مشاہدہ عام و خاص میں تھی۔ رات کی تنہائی ہوتی اور حضرت مولاناؒ کے جہاد حریت کی داستان، ایک نئی نگاہ مضطربانہ اس بطل حریت کے عزائم و حصول مقاصد کی جھلک کو دیکھ کر لرزاں لرزاں قلب نحیف میں ایمان کی روشنی پاتا اور چشم و گوش سے حاصل کئے ہوئے خزانوں کو بے چینی کے ساتھ محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا، اے وائے نصیب کہ وہ متاع گرانمایہ بھی اب گم ہو چکی اور جو کچھ باقی ہے وہ صرف ایک نقش مضطرب! اے کاش کہ یہ بھی شامل حال رہے۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر[۱۲۶]

---

[۱۲۶] محاسن سجاد، ص ۷۵

ابوالمحاسن محمد سجاد[127]

[127] مرتب محاسن سجاد نے اس پر متن میں جو نوٹ دیا تھا ہم نے اس کو حاشیہ میں کر دیا ہے ۔جو حسب ذیل ہے:۔

"اس مجموعہ کے مضامین میں یہ مضمون خاص امتیاز کا مالک ہے ،اس کے لکھنے والے جناب راغب احسن صاحب اپنے سیاسی علم، خلوص اور استقلال وانہماک کے لحاظ سے پورے ملک میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔زیر نظر مقالہ میں انہوں نے مولانا محمد سجادؒ کے کارناموں پر ایک مسلم لیگی کے نقطۂ نگاہ سے روشنی ڈالی ہے،اور اس مجموعہ کی افادیت کے لئے اچھا ہوا کہ اس طرح پر مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کا نقطۂ نگاہ سامنے آگیا۔

فاضل مضمون نگار کو مسئلۂ امارت کے سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی،ان کے خیال میں امارت کی تاسیس محکومیت پر قناعت اور محکومیت کو آئینی صورت اور شکل دے دینے کے مرادف ہے اور مولاناؒ نے گویا"ایک کافر اسٹیٹ کے فولادی خول کے اندر امارت شرعیہ کی ایک محکومانہ پوزیشن طلب کی تھی" الخ الخ

مضمون نگار کا یہ خیال صحیح نہیں، تاسیس امارت شرعیہ ایک مرض کا عارضی علاج ہے ،سوال یہ ہے کہ جب کسی ملک پر کافروں کا استیلا ہو جائے تو محکوم مسلمان کیا کریں؟شرعی احکام کے نفاذ کے لئے کون سا طریقہ اختیار کیا جائے ؟ایک پُرجوش مسلمان جواب دے گا ،اسلامی حکومت کے قیام کی جدوجہد کی جائے ، صحیح اور درست ! لیکن اگر فوری طور پر کامیابی نہ ہو،اور ملک دارالحرب کی جگہ دار الکفر ہو تو پھر کیا کیا جائےِ؟ اسلامی زندگی بسر کرنے اور معمولی شرعی قوانین کے اجراء ونفاذ کے لئے کوئی نہ کوئی نظام تو قائم کرنا ہی پڑے گا۔امارت شرعیہ اسی اسلامی نظام کا دوسرا نام ہے ،یہ ہندوستان کے ایک صوبہ میں امارت کے نام سے قائم ہوئی، فلسطین میں مسلم سپریم کونسل (المجلس الاسلامی الاعلی) اسی قسم کے اسلامی نظام کے اداروں کا کامیاب تجربہ ہو چکا اور ہو رہا ہے۔

لیکن اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ مولانا سجاد مرحوم یا دوسرے داعیان امارت کا یہ آخری نصب العین ہے، حاشا وکلا!! اس مخلص مجاہد کے دامن پر اس سے زیادہ دھبہ اور کوئی نہیں لگایا جا سکتا۔مولانا محمد سجادؒ بھی اسلامی حکومت کی تاسیس کے داعی تھے اور یہی ان کا نصب العین تھا، مسلم نیشنلزم اور کمال اتاترک جیسی اسلامی حکومت نہیں بلکہ وہ خالص الٰہی حکومت (منہاج خلافت راشدہ پر) کے قیام کے داعی تھے۔

بھائی راغب صاحب سے زیادہ اس حقیقت سے کون واقف ہو سکتا ہے کہ مولاناؒ ایک ڈپلومیٹ تھے اور وہ بساط سیاست پر اپنے تمام مہرے نہیں رکھنا چاہتے تھے ،وہ نصب العین اور مطالبہ میں فرق کرتے تھے ،امارت شرعیہ اور نظارت امور شرعیہ کو فوری پروگرام اور مطالبہ کی حیثیت حاصل تھی اور اسلامی حکومت کی تاسیس ان کا وہ نصب العین تھا، جس سے وہ کبھی غافل نہیں رہے۔

یہ اس مضمون کی مرکزی بحث تھی ، جس پر تھوڑی تفصیل ناگزیر تھی ،اب بعض باتوں کی طرف سرسری اشارہ کر کے اس جملہ معترضہ کو ختم کرتا ہوں۔

(۱) امارت شرعیہ کا نظام خالص اسلامی ہے ،وہاں نہ انگلستان کی دستوریت ہے نہ امریکہ کی جمہوریت، اور نہ جرمنی اور اٹلی کی آمریت، ہم اس نظام کو نظام خلافت راشدہ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

(۲) نیشن اسٹیٹ مولاناؒ کا نصب العین نہیں تھا، البتہ سردست صرف حکومت کے خلاف معرکہ آرائیوں میں وہ نیشنل کانگریس کی ہمنوائی کرتے تھے،اور نہ وہ کانگریس کی غیر مشروط شرکت کے حامی تھے،کانگریس کی مشروط اور مجموعی شرکت کے متعلق انہوں نے ایک خاص تجویز مرتب کی تھی، جس کا ذکر مولانا محمد منظور نعمانی کے مقالہ میں آگیا ہے۔

(۳) مسلم نیشنلزم اور "پاکستان کی تعمیر" اور ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی تعمیر مضمون نگار کے نزدیک مرادف ہیں ،افسوس کہ ہم ایسا نہیں سمجھتے ، مسلم نیشنلزم تو ایران اور ترکی میں بھی موجود ہیں ، لیکن اسلام کا اس سے دور کا بھی

واسطہ نہیں، اسلام اور مسلم کے فرق کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ ایران، ترکی، افغانستان، مصر، عراق سب کی سب اسلامی نہیں بلکہ مسلم حکومتیں ہیں، البتہ اتنے فرق کے ساتھ کہ ترکی اور ایران کے ارباب بست و کشاد کو اسلام اور اسلامی چیزوں سے نفرت ہے، عراق پر عربیت غالب ہے، افغانستان اور مصر میں الحمد للہ کہ ابھی اسلام کی بو باس باقی ہے، حجاز و نجد اور یمن کی سلطنتیں اسلامی نظام سے قریب تر ہیں۔

(۴) متحدہ قومیت کے جو معنی عام طور پر لئے جاتے ہیں اس کے قبول کر لینے کے بعد راقم کے خیال میں کوئی شخص اسلام پر قائم ہی نہیں رہ سکتا، مولانا مرحوم کا نقطۂ نگاہ ایک پکے مسلمان کا نقطۂ نگاہ تھا، ہم ان ہی کے اصلی الفاظ نقل کئے دیتے ہیں:

"اور ان خصوصیات کو قطع نظر کر کے مغربی سیاسیین کے نظریہ کی اتباع کرتے ہوئے اس براعظم میں اس قسم کی قومیت متحدہ کی تخلیق کی سعی کرنا جو یورپ کے کسی ملک میں ہے، محض بے سود ہی نہیں بلکہ ملک کے لئے تباہ کن بھی ہے، کیونکہ اس ملک کی دو بڑی جماعتیں مسلمان اور ہندو بحیثیت مجموع دو علاحدہ علاحدہ ممتاز قومیت رکھتی ہیں، مغربی تخیل کے مطابق ہندوستان میں متحدہ قومیت کا قیام ناممکن ہے"۔

(خطبہ صدارت مجلس استقبالیہ بہار پراونشیل مسلم انڈپنڈنٹ پارٹی)

(۵) اگر واقعی کسی طبقے میں "ملاکراسی" (ملائیت) کا وجود ہے تو کم از کم راقم بھی اس کی مذمت میں راغب صاحب کا ہم نوا ہے، اسلام میں نہ ملائیت ہے اور نہ مولویوں کا کوئی موروثی طبقہ ہے، مگر مصیبت یہ ہے کہ نئے لکھے پڑھوں نے عربی زبان اور دینی تعلیم سے یکسر بے اعتنائی برتی اور دینی علوم سے واقفیت رکھنے والے خواہ مخواہ علماء کے نام سے موسوم ہو گئے۔ یہ ملک و ملت کی بدبختی

ہے کہ دین اور دینی علوم سے بے اعتنائی بڑھتی جارہی ہے، اس کا معمولی نمونہ کاظمی صاحب کا " خلع بل " ہے۔ مکار ملا اور مذہبی واقفیت کے جھوٹے مدعی (اور مجتہد) دونوں ملت کے لئے لعنت ہیں۔

(۶) بعض باتیں خلاف واقعہ بھی اس مضمون میں درج ہو گئی ہیں جیسے

(الف) مولاناؒ کی بریلویت، مولاناؒ نہ بریلوی تھے نہ دیوبندی، انہیں حنفیت میں بھی غلو نہیں تھا، ان کے مسلک کے متعلق صحیح بیان مولانا محمد اصغر حسین صاحب کے مضمون میں ملے گا۔

(ب) انوار العلوم کے جس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ یکسر غلط ہے، غالباً مضمون نگار تک صحیح روایت نہیں پہنچی۔

(ج) احرار پارٹی اور یونائٹیڈ پارٹی کے باہمی اختلاف کو مولاناؒ کے سر تھوپنا صحیح نہیں، انڈپنڈنٹ پارٹی کے وجود سے پہلے ہی یہ دونوں پارٹیاں باہم دست و گریباں تھیں۔

(د) امیر شریعت کا انتخاب علما کے بھرے مجمع میں کیا گیا تھا، تفصیل مولانا عبد الصمد رحمانی کے مضمون " قیام امارت شرعیہ " میں ملے گی۔

(ہ) یہ بھی صحیح نہیں کہ دار القضا، بیت المال، نظام نقبا و عاملین وغیرہ وغیرہ کا آج کہیں وجود نہیں، امارت شرعیہ کے تمام شعبے بدستور اپنی اپنی جگہ پر کام کر رہے ہیں۔

(و) امارت شرعیہ کے متعلق فاضل مضمون نگار کی غلط فہمی تو اس نوٹ کے آغاز ہی میں واضح کر دی گئی ہے۔ اب آپ کا تضاد بیان ملاحظہ ہو، ارشاد ہوتا ہے:

"مولانا سجادؒ نے امارت شرعیہ کی تاسیس میں اپنی قیادت فکری و عملی کے تمام جوہر دکھائے، اور اگر وہ اس امارت کو خالص شرعی معاملات کی تنظیم تک محدود رکھتے اور اس کو ملت اسلامیہ ہند کی عام سیاست سے منقطع نہیں کرتے تو یقیناً

راغب احسن صاحب ایم۔اے [۱۲۸]

ان کی تاسیس ان کے بعد بھی ایک مفید ملت انجمن کی
حیثیت سے زندہ رہتی اور مسلمانوں کی آزادی کامل کے جہاد
میں ان کی معاون ہوتی"۔

مطلب یہ ہے کہ اگر امارت شرعیہ مسلمانوں کی رائے عامہ یا مسلم لیگ یا مسلم کانفرنس کے ساتھ چلتی تو مفید ملت انجمن ہوتی۔

اس کے برعکس دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

" امارت شرعیہ کا تصور فی نفسہ غلط، غیر اسلامی اور خطرناک
تھا، ایک بے طاقت امارت شرعی کا تصور اساساً، اصلاً اور
جوہراً غلط، بے بنیاد اور انتہائی گمراہ کن تصور ہے"۔

آخر یہ کیا بات ہے، ایک چیز جو سرے سے غلط اور " گمراہ کن" ہے، مفید ملت کس طرح ہوسکتی ہے؟ باتیں کہنے کی بہت ہیں، راقم نے صرف اصلی باتوں کو لیا ہے، اب ہم ناظرین اور فاضل مضمون نگار کے درمیان زیادہ دیر تک حائل نہیں رہنا چاہتے۔ (م)

[۱۲۸] راغب احسن صاحب ایم اے، کتاب میں مولوی راغب احسن ایم اے لکھا ہے، علام طور پر علامہ راغب احسن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، پاکستان کے زبردست حامی اور مسلم لیگ کے اہم اراکین میں تھے، بہار کا ایک گاؤں جرہا پرانپور متصل دیورہ (گیا) ان کا آبائی وطن تھا، یہیں ان کی پیدائش تذکرہ نگاروں کے بقول ایک غریب گھرانے میں ۱۹۰۵ میں ہوئی، ان کے والد ریاض الدین صاحب کلکتہ میں محکمہ ڈاک میں ملازم تھے، انہوں نے وہیں تعلیم پائی اور اپنی سیاسی زندگی کا آغاز وہیں سے کیا، بی اے کے بعد ہی سے ان کی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہو گیا تھا، جس کے نتیجہ میں جیل گئے، رہائی کے بعد ایم اے کیا، مولانا

حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد نائب امیر شریعت صوبہ بہار، سکریٹری جمعیۃ علمائے ہند کے انتقال پُر ملال کی اچانک خبر سے مجھے جو دلی صدمہ اور افسوس ہوا، اس کا اظہار میں اخبار "عصر جدید" کلکتہ میں اپنے تعزیتی نوٹ میں کر چکا ہوں۔ یہ میری بدقسمتی تھی کہ سیاسی شعور کو پہنچنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو اکثر سیاسی میدان میں مولاناؒ کے خلاف ہی پایا اور پوری قوت اور کامل دیانت کے ساتھ ان کی بعض ہنگامی پالیسیوں کی مخالفت کی، تاہم مجھے اقرار

محمد علی جوہر کی صحبت میں رہ کر ان سے استفادہ کیا اور ان کے کامریڈ کے اعزازی مدیر بھی رہے، ایم اے کی تکمیل کے بعد اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا اور اسٹار آف انڈیا انگریزی اخبار کے ادارتی عملہ میں شامل ہوگئے، پہلے "آل انڈیا یوتھ لیگ" کی بنیاد ڈالی پھر مسلم لیگ کے اراکین میں شامل ہوگئے، اور کلکتہ کے لیگ کے جنرل سکریٹری بھی رہے، اور اسی نسبت سے ان کا ذکر اس مضمون میں کیا گیا ہے، محمد علی جناح کے پرائیوٹ سکریٹری بھی تھے، نیز علامہ اقبال اور دوسرے ممتاز اہل علم سے بھی مراسم تھے اور ان کے نام ان کے خطوط بھی ہیں، کچھ اشارات اس مضمون میں بھی ملیں گے، تقسیم کے بعد ڈھاکہ گئے اور سقوط ڈھاکہ کے بعد کراچی چلے گئے، جہاں ۲۸ نومبر ۱۹۷۵ کو ان کا انتقال ہوا، ۱۹۹۰ میں ان کی خدمات پاکستان کے صلہ میں پس مرگ ایوارڈ ملا، پاکستان کے قیام کے بعد بھی ان کو وہاں بہت بڑی اراضی دی گئی تھی، وہاں انہوں نے ہر محاذ پر کام کیا، سنٹرل اقبال کمیٹی کے نائب صدر اور اسلامک لا کمیشن کے رکن بھی رہے۔ انٹرنٹ پر ان کے متعلق بہت ساری معلومات دستیاب ہیں۔

ہے کہ مولانا سجادؒ صاحب کی قابلیت وصلاحیت، سیاست دانی وسیاست کاری اور مسلمانوں کی تنظیم وتقویت کے لئے حقیقی تڑپ کا برابر معترف رہا۔

گاؤں کی مسجد کا واقعہ:

سب سے اول مولانا ابو المحاسن محمد سجاد کے نام سے میں اپنے بچپن میں اپنے دیہات واقع ضلع گیا میں ایک مسجد میں واقف ہوا۔ جہاں تک مجھ کو یاد ہے یہ جنگ عظیم کا زمانہ تھا، مولانا نے حسب معمول اپنے مدرسہ انوار العلوم گیا کے متعلق کوئی اعلان شائع کیا تھا، اور یہ اشتہار ایک گاؤں کی خوبصورت مسجد کے مینار پر چسپاں کیا گیا تھا۔ اس کا پورا مضمون تو مجھ کو یاد نہیں ہے لیکن اتنا اچھی طرح یاد ہے کہ اس اعلان کا اصل الاصول یہ تھا کہ مسلمانان ہند کی تمام خرابیوں اور کمزوریوں کا علاج یہ ہے کہ وہ دین اور دینی علوم کی اشاعت کریں اور پنی کھوئی ہوئی مرکزیت کو قائم کریں، سارے مضمون میں مسلمانوں کی مرکزیت پر زور دیا گیا تھا، اور فقدان مرکزیت کو مسلمانوں کی اجتماعی خرابیوں کا سرچشمہ قرار دیا گیا تھا۔ مرکزیت کے لفظ کو اشتہار میں جلی حروف میں لکھا گیا تھا، باوجودے کہ اس وقت میں ایک بچہ تھا جس نے شہر کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی، اردو کی پہلی، دوسری کے سوا کچھ نہ جانتا تھا اور دنیا کے مسائل سے بالکل بے خبر تھا لیکن اس اعلان حق کا اثر میں آج بھی اپنے دل ودماغ میں محسوس کرتا ہوں، اور عصر کی نماز کے بعد گاؤں کی خوبصورت فراخ اور عالی شان مسجد کے روشن صحن میں، میں نے جو کچھ پڑھا اور سمجھا تھا، آج تک میرے صفحۂ باطن پر نقش کالحجر کی طرح محفوظ ومرتسم ہے۔

گیا کانگریس اور جمعیۃ علماء:

حضرت مولانا محمد سجادؒ کو پہلی دفعہ (اور یہ آخری دفعہ بھی تھا، اس لئے کہ پھر مولانا سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا) میں نے گیا کانگریس ۱۹۲۲ء کے موقع پر جمعیۃ علمائے ہند کے عظیم الشان پنڈال میں دیکھا گیا تھا۔ کانگریس کا اجلاس زیر ادارت مسٹر سی آر داس آنجہانی ہو رہا تھا، سوراج پارٹی کی بنیاد پنڈٹ موتی لال نہرو، داس اور حکیم اجمل خاں مل کر ڈال رہے تھے، گیا میں اس موقع پر آل انڈیا خلافت کانفرنس اور جمعیۃ علمائے ہند کی سالانہ کانفرنسیں بھی ہو رہی تھیں، دسمبر کا مہینہ تھا، کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا، کانگریس، خلافت اور جمعیت کے پنڈال دریائے پھلگو کے کنارے شہر سے باہر ریت کے ٹیلوں اور خوبصورت پہاڑوں کے دامن میں قائم تھے۔

کانگریس اس وقت بھی سرمایہ دار ہنود کی مجلس تھی، اس کا پنڈال ہندو طرز تعمیر کا نمونہ تھا، صدر گیٹ، دروازے اور اس کے ستون بدھسٹ طرز تعمیر کے مطابق بنائے گئے تھے، اس کا ظاہر و باطن کاملاً ہندو تھا، اس کی تعمیر پر ہزاروں ہزار روپیہ خرچ کیا گیا تھا۔ اس کے بالکل بر عکس جمعیۃ علمائے ہند کا پنڈال اسلامی سادگی، نفاست اور جدت اور (indo .saracenic انڈو ساراسینک) عربی ہندی طرز تعمیر کی رعنائیوں کا آئینہ دار تھا، اس کے عالی شان صدر پھاٹک اور داخل وخارج ہونے کے دروازوں پر عربی حروف میں معنی خیز آیات قرآنی درج تھے۔ مسلمانوں کے علاوہ ہزاروں لاکھوں ہندو روزانہ جمعیۃ علمائے ہند کے پنڈال کو آکر دیکھتے اور تعریف کرتے تھے، جو کلمہ سب کی زبان پر عام تھا وہ یہ تھا کہ باوجود سادہ اور کم خرچ ہونے کے جمعیت کا پنڈال کانگریس کے پنڈال سے ہزار درجہ زیادہ آرام دہ، زیادہ روشن و فراخ اور زیادہ

حسین و جمیل اور زیادہ عالی شان، زیادہ پُر شکوہ تھا، اور یہ سب کچھ مولانا سجاد کی اعلیٰ تعمیری صلاحیت کا نتیجہ تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ مولانا نے یہ سارا انتظام انتہائی بے سروسامانی، تنگی اور پریشانی کے عالم میں اور قلیل ترین وقت یعنی صرف چند دنوں کے اندر کیا تھا۔ گیا کی جمعیۃ علماء کانفرنس اور خلافت کانفرنس کی اصل روح رواں، دماغ، مدبر اور مرکزی شخصیت مولانا سجاد کی ذات تھی۔ مولانا سجادؒ نے محض چند گنے ہوئے دنوں کے اندر جمعیۃ علماء اور خلافت کانفرنس کے متعلق جملہ انتظامات باوجود غربت و افلاس اور بے سروسامانی کے اتنے اعلیٰ پیمانہ اور بہترین بلکہ نادر ترین انداز پر کیا تھا، کہ ہندو مسلم اکابر کی نگاہیں بے اختیار مولانا پر مرکوز ہو رہی تھیں اور سب کی زبانیں اس حقیقت کے اعتراف میں ہم آواز تھیں کہ گیا کانگریس نے ملک کی ایک نادر اور حیرت انگیز تنظیمی طاقت کا انکشاف کیا ہے۔ مولانا حکیم ابو البرکات عبد الروف صاحب قادری دانا پوری ،جمعیۃ علماء ہند کی مجلس استقبالیہ کے صدر تھے، آپ نے مولانا سجادؒ کی انتظامی صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے کھلے جلسہ میں فرمایا تھا کہ:

"مولانا سجاد نے مسلمانوں کی عظیم الشان تنظیمی اور سیاسی کاروائی کا جو ثبوت دیا ہے وہ اس درجہ بلند ہے کہ سوارج ملنے کے بعد مولانا کو ہندوستان کا گورنر اور گورنر جنرل بنانا موزوں ہو گا کیونکہ وہ ایک نئے ہندوستان کے نئے خیالات و اصول کے مطابق تعمیر کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں"۔

حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند صدر اجلاس نے جو خود بھی بہت بڑے منتظم بزرگ تھے، اس خراج تحسین کی تائید فرمائی تھی۔

اسی اجلاس گیا کے موقع پر مجھے مولانا مرحوم کی تقریر سننے کا موقع ملا تھا اور یہ محسوس ہوا تھا کہ وہ صاحب بیان نہیں بلکہ صاحب عمل بزرگ تھے۔

منتظم، معمار، خلاق اور آرٹسٹ:

مولانا سجاد نہ صرف ایک بڑی تنظیمی صلاحیت رکھنے والے بزرگ تھے بلکہ جدید (ORIGINAL) خیالات و افکار رکھنے والے ایک معمار اور خلاق بھی تھے، وہ صرف منتظم اور مدبر نہیں تھے بلکہ مفکر، مجتہد اور آرٹسٹ بھی تھے ، اور کوئی اول درجہ کا معمار اور آرٹسٹ نہیں ہو سکتا جب تک وہ اعلیٰ درجے کی قوت تخیل اور اعلی درجے کی قوت تخلیق نہ رکھتا ہو، اور گیا کی ملی مجالس اور اس کے متعلقہ انتظامات ان کے اعلی قوت تخیل اور اعلیٰ تخلیق کے مخلوقات فکر و عمل تھے، مولانا کی شخصیت میں بیک وقت اعلی درجے کی انتظامی صلاحیت اور عملی طاقت کے ساتھ نئے نئے خیالات و تعمیرات کے عدم سے وجود میں لانے کی تخلیقی قوت بھی جمع تھی، وہ نہ صرف حسب موقع نئے خیالات کو قبول کر سکتے تھے بلکہ نئے خیالات کی آفرنیش کی بھی قوت رکھتے تھے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ وہ اپنے نئے خیالات کے مطابق ایک نئی دنیا کی تعمیر بھی کر سکتے تھے۔

اجلاس گیا کے موقع پر ہر چیز اور ہر انتظام پر مولانا سجاد کی تخلیقی شخصیت اور اجتہادی آرٹ کا چھاپ صاف نمایاں تھا۔

ایک سانحہ لطیف اور انقلابی لاٹ پادری کا پارٹ:

مولانا محمد سجاد کی شخصی زندگی میں تحریک خلافت نے زبردست انقلاب پیدا کیا۔ مسلمانوں میں معاشرتی اصلاح کے زبردست حامی ہونے کا ثبوت وہ پہلے ہی اپنے ایک ایسے اقدام سے دے چکے تھے، جس نے گیا کی مسلم سوشل سیاست میں بھونچال ڈال دیا تھا اور مولانا کی سیاست کاری، ڈپلومیسی اور کاردانی کا لوہا مخالفین سے بھی منوالیا تھا۔ اگرچہ گیا کی مسلم سوسائٹی میں اس ڈراماٹیک سانحۂ لطیف اور حادثۂ عظیم کے متعلق جو ممتاز خاندان کے لئے کامیڈی اور دوسرے ممتاز خاندان کے لئے ٹریجڈی ثابت ہوا تھا، جس میں مولانا نے ایک انقلابی لاٹ پادری کا پارٹ ادا کیا تھا، ہمیشہ دورائیں رہیں گی۔ لیکن اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ رسوم زمانہ کے خلاف لیکن سنت نبوی کی رہبری میں رئیس اعظم گیا کی بہو کو ایک دوسرے صوبے کے مسلمان کے ساتھ عقد ثانی پر آمادہ کر کے اور تمام مخالفتوں کے باوجود اپنی حمایت عملی سے اس کو انجام دلا کر مولانا نے اپنی بے نظیر سیاست کاری اور اقدامی صلاحیت کا ثبوت دیا تھا۔

فرقہ پرست سے پان اسلامسٹ:

بعض حلقوں میں بیان کیا گیا ہے کہ مولانا سجاد دیوبند کے فارغ التحصیل تھے اور دیوبندی تھے، لیکن اس بیان میں صداقت سے زیادہ موجودہ سیاسی فرقہ وارانہ پروپیگنڈا کی رنگ آمیزی ہے، جاننے والے جانتے ہیں کہ مولانا سجاد تحریک خلافت سے پہلے ان غالی حنفیوں یا بریلویوں میں شمار ہوتے تھے، جو بدعتی کہلاتے ہیں اور جو جوش غلو میں کفر کی صداؤں کو تو چپ چاپ سن لیتے ہیں، لیکن آمین بالجہر کی آواز کو برداشت نہیں کر سکتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ مولانا سجاد نے عام دستور زمانہ کے مطابق سخت حکم دے رکھا تھا کہ کوئی طالب

علم، جو رفع یدین کرتا ہو یا آمین بالجہر کہتا ہو، ان کے مدرسہ انوار العلوم میں داخل ہو کر تعلیم نہیں پا سکتا تھا، ایسے واقعات بھی مجھ کو معلوم ہیں کہ بعض طلبہ کو صرف اس لئے مولانا نے مدرسہ سے خارج کروا دیا تھا کہ ان پر رفع یدین کرنے یا اہل حدیث علماء سے درس لینے کا الزام تھا۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب کہ مسلمانوں کا مشغلہ مذہبی مناظرات اور مجادلات کے سوا کچھ نہ تھا، بڑوں اور چھوٹوں کی ساری طاقتیں اسی میں صرف ہو رہی تھیں۔

لیکن یہ مولانا کی عظمت کا اصلی ثبوت ہے کہ جب ان کو اس عدم رواداری اور غلو کی غلطی معلوم ہو گئی اور جنگ عظیم کے بعد دنیائے اسلام کی عام بربادی کی مصیبت عظمیٰ نازل ہوئی اور عام اتحاد اسلامی کی سخت ترین ضرورت کا احساس ہوا اور تحریک خلافت نے ملک وملت کا نقشہ منقلب کر دیا تو مولانا سجاد کے ترقی پذیر فطین و ذہین دماغ نے فوراً اصلاح قبول کر لیا، وہ ایک پکے پان اسلامسٹ ہو گئے اور قومیات کے میدان میں آکر ایسے بدل گئے کہ ان کا پہچاننا مشکل ہو گیا، یہاں تک کہ ایسے لوگوں کے لئے جو مولانا کے ابتدائی حالات اور ان کی سیرت کے ارتقائی منازل سے بے خبر ہیں، ان کے لئے میرا یہ بیان ایک تعجب انگیز انکشاف ہو گا، جس پر ان کے بعض مقلدوں کو شاید شبہ بھی ہو، لیکن اس حقیقت کے بیان سے دراصل مولانا کی شخصیت کی حقیقی طاقت اور صلاحیت ذاتی کا پتہ چلتا ہے۔ مولانا کی شخصیت نہ صرف اپنے جسم کے لحاظ سے بلکہ اپنے باطن کے اعتبار سے بھی ایک ترقی پذیر زندہ نامیہ تھی۔ مولانا پتھر نہیں تھے، بلکہ انسان تھے اور انسان وہی ہے جو خود بھی بدل سکتا ہو، اور دنیا کو بھی بدل ڈالنے کی قوت رکھتا ہو اور مولانا میں یہ دونوں قوتیں موجود تھیں۔

مولانا غالی مولویوں کے ایک ایسے طبقۂ خاص میں پیدا ہوئے، پروان چڑھے اور نمایاں ہوئے جو عموماً اپنے جمود وخمود اور تقلید جامد کے لئے خود علماء میں نمایاں امتیاز رکھتا ہے، لیکن یہ ان کی فطرت سلیمہ اور صلاحیت ذاتی کا ثبوت ہے کہ وہ اس طبقہ کی سطح سے نہ صرف خود بلند وبالا ہو گئے بلکہ بہتوں کو بلند کر دیا اور جماعت علمائے اسلام کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر جمع کرنے میں بہت بڑا حصہ لیا۔

مولانا مرحوم کی خصوصیات:

مولانا سجاد جدید اسلامی ہند کی صف اول کے رجال دین وسیاست میں ممتاز درجہ رکھتے تھے، وہ ان چند واقعی لائق ترین سیاسین میں تھے، جن کو تحریک خلافت نے پردۂ گمنامی سے ابھار کر ہندوستانی سیاست کے صف اول میں کھڑا کیا تھا، پھر وہ تحریک خلافت کے رہنماؤں میں اپنی اصابت رائے، سیاست دانی، معاملہ فہمی، نکتہ رسی، ذہانت، عملی صلاحیت، تنظیمی طاقت، کاردانی، کارپردازی، عزم واستقلال کے ساتھ ایک نصب العین کے لئے مسلسل یکسوئی سے محنت کرنے کی قابلیت، حالات وضروریات کے مطابق زمانہ کے ساتھ چلنے اور ساتھ دینے کی اہلیت اور اپنے مقاصد کے لئے معیار و اصول سے فروتر لوگوں اور چیزوں سے مصالحت کر لینے کی قوت کے لئے ممتاز تھے۔

مولانا سجاد علمائے ہند میں نہ صرف سب سے زیادہ سیاسیات حاضر کے ماہر تھے بلکہ سب سے بڑے عملی سیاست کار بھی تھے، سیاسیات مغرب کے متعلق نہ صرف ان کا علم دوسرے مولویوں سے زیادہ بہتر تھا، بلکہ وہ ان سے زیادہ موجودہ سیاسی ادارات سے کام لینے کی قابلیت رکھتے تھے اور غالباً مسلمانان

ہندوستان میں ان سے بڑھ کر کوئی دوسرا تنظیمی صلاحیت کا انسان نہیں تھا۔ افسوس اس کا ہے کہ ان کی تنظیمی صلاحیت ایک محدود دائرہ میں بند ہو کر ختم ہو گئی، اگر وہ قوم کا ساتھ دیتے اور قوم ان کا ساتھ دیتی تو جیسا کہ مولانا داناپوری نے فرمایا تھا کہ وہ ایک نئے ہندوستان اور کم از کم ایک جدید اسلامی ہندوستان کی تعمیر میں ایک اول درجہ کے معمار کا پارٹ ضرور ادا کرتے۔

مولانا سجاد ہندوستان کے تمام علماء میں سب سے زیادہ عملی سیاست اور دنیاوی معاملات کو سمجھنے اور ان کے برتنے والے کارواں مدبر تھے، وہ انگریزی نہیں جانتے تھے، لیکن انگریزی سیاست ودستور اور مغربی تمدن و قانون کو خوب سمجھتے تھے اور ان کی ماہرانہ سیاست دانی اور سیاست کاری یہ بہترین اور ناقابل تردید ثبوت ہے کہ انہوں نے بہت سے انگریزی داں سیاست دانوں کو شکست دے دی تھی۔ کیوں اور کس طرح؟ اس کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ مولانا مغربی سیاست اور حکمت عملی کو برتنا، توڑنا اور جوڑنا جانتے تھے، اور انہوں نے بلا جھجک اس کے طریقوں کا استعمال کیا تھا۔ بہار اسمبلی کے اولین جنرل الیکشن میں مولانا سجاد نے مولانا شفیع داؤدی صاحب لیڈر احرار پارٹی جیسے محب قوم اور عزیز ملت سید عبد العزیز لیڈر مسلم یونائٹیڈ پارٹی جیسے لائق قانون داں اور وزیر حکومت کی پارٹیوں کو عملاً شکست دے کر بہار اسمبلی کی اکثر سیٹوں پر امارت شرعیہ کی قائم کردہ مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کے ہر ممبر سے امارت شرعیہ کی تابعداری کا بیعت لیا، ایک خالص دنیا دار بینکر اور مصلحت بین، زمانہ ساز، سرمایہ دار بیرسٹر کو پارٹی کا لیڈر مقرر کرایا۔ اور کانگریس سے کولیشن کرنے کی امید میں انڈپنڈنٹ پارٹی کے اولین جلسہ میں امیر شریعت کی اطاعت اور

کانگریس اور کانگریسی پروگرام کی تائید کا اعلان کرایا۔ لیکن جب بعض وجوہ سے کانگریس نے آفس قبول کرنے اور وزارت بنانے سے انکار کر دیا تو بلا جھجک چند ہی دنوں کے بعد مولانا سجاد نے اپنی انڈیپنڈنٹ پارٹی کے لیڈر کو خود وزارت بنانے کی اجازت دے دی۔ بظاہر یہ انڈیپنڈنٹ پارٹی کے اعلان کردہ بیانات اور اصول کے خلاف تھا، لیکن مولانا سجاد کی زندگی میں اکثر عملی سیاست میں طاقت پر قبضہ کرنا اور مصلحت وقت کا ساتھ دینا اصول سے برتر رہا ہے۔ مولانا سجاد کے ساتھ انڈپنڈنٹ پارٹی کے وزارت بہار کے زمانے میں پہلی بار مجھ سے خط و کتابت ہوئی تھی، مولاناؒ نے اپنے خط میں اس کا اقرار کیا تھا کہ وزارت کا بنانا کانگریس کی حمایت کے اعلان اور پلیج کے بعد بظاہر اصول کے خلاف تھا، لیکن مصالح قومی اور ضرورت وقتی کے لئے اکثر اصول کو بالائے طاق رکھنا پڑتا ہے، مولاناؒ نے یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ وہ اسلامی شریعت کے تحفظ کے لئے بعض مسودات قانون کی فکر میں
تھے، شریعت اسلامیہ کے تحفظ واستقلال کی فکر دراصل ان کی فکر زندگی تھی۔

امارت انڈیپنڈنٹ مسلم پارٹی اور مغربی سیاست کا دلدل:

واقعہ یہ ہے کہ مولانا سجاد نے اپنی سیاسی زندگی مغربی سیاست کی مخالفت اور اسلامی سیاست وامارت کی تبلیغ کے ساتھ شروع کی تھی، لیکن فرنگی سیاست کے خلاف اس زندگی بھر کی جنگ کا ایک نتیجہ یہ ہوا تھا کہ وہ نہ صرف مغربی سیاست اور ڈپلوماسی کے ماہر ہو گئے تھے، بلکہ مخالفین کے خلاف اکثر مغربی سیاست اور ڈپلومیسی کے طریقوں کو استعمال بھی کرتے تھے اور بعض اوقات بڑے بڑے انگریز داں سیاسین اور مقننین کو بھی اس کھیل میں مات

کر دیتے، بنابریں مولانا سجاد غالباً علمائے ہند میں واحد شخص تھے جو ایک یوروپین ڈپلوماٹ کا تدبر، ایک ہندوستانی زمیندار کے کارپرداز کی ماہرانہ کارپردازی اور ایک عاشق صادق کی عقیدت و عزم راسخ اور ایک سالک راہ سلوک کی کمال یکسوئی اور استقلال کے اوصاف اپنی سیرت میں جمع رکھتے تھے۔

مولانا مرحوم جس بات کا عزم کر لیتے تھے اور جو بات ان کے ذہن میں جم جاتی تھی، خواہ وہ صحیح ہو یا غلط، اس کے لئے اپنے غیر معمولی دماغ اور جسم کی ساری قوتوں کے ساتھ وقف ہو جاتے تھے اور جی جان سے اس کے پیچھے پڑ جاتے اور ہر طریقہ سے اس کو کامیاب کرنے کے لئے ممکن سے ممکن تدبیر سے دریغ نہیں کرتے تھے، وہ اپنے مخالفین کے کیمپ میں پھوٹ ڈالنے اور ان کی قوتوں کو پاش پاش کر دینے کی ہر ممکن صورت اختیار کرتے تھے۔

مولانا کبھی شکست قبول نہیں کرتے تھے اور کبھی شکست کو معاف بھی نہیں کرتے تھے، وہ کبھی نہ تھکنے والے کارکن تھے اور باوجود لیڈر ہونے کے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے معمولی سے معمولی اور حقیر سے حقیر کام کرنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے تھے، وہ ایک بڑے کام کا نقشہ بہت سنجید گی اور غور و فکر کے بعد بناتے تھے اور اس کو عمل میں لانے کے لئے بہت دور سے آتے تھے اور بہت طویل اور وسیع تیاری کے ساتھ تدبیریں کرتے تھے، وہ کبھی مایوس نہیں ہوتے تھے اور خواہ حالات کتنے ہی ناموافق کیوں نہ ہو اور سامان اور معاون کتنے ہی کم کیوں نہ ہوں اور ان کو کتنی ہی بار ناکامی کیوں نہ ہوتی ہو، وہ بڑے بڑے کام کا عزم کرتے، اس کے لئے نقشہ بناتے اور اس کو پورا کرنے کے لئے ہر چیز کی بازی لگا دیتے تھے۔

مولانا بلا کے لڑنے والے، مستقل مزاج، ثابت قدم جنگجو سپاہی تھے، وہ دشمن کو زیر کرنے کے لئے کسی تدبیر، کسی طریقہ اور کسی ذریعہ کو ترک نہیں کرتے تھے، مولانا کا عقیدہ تھا اور انہوں نے اپنے اس عقیدہ کو میرے دوست جناب قاضی محمد عثمان صاحب ایم،اے ،بی ایل ہیڈ ماسٹر پریسڈنسی مسلم ہائی اسکول پر خود ظاہر فرما دیا تھا کہ ایک بڑے اور نیک مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہر طریقہ کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ان کا دماغ لا محدود تدابیر کا محدود خزانہ اور حکمت عملیوں کا کارخانہ تھا۔یہی باعث تھا کہ مولانا مغربی پروپیگنڈا کے فن میں اپنے بہت سے حریفوں سے زیادہ ماہر ثابت ہوئے تھے۔

مولانا سجاد کی عملی سیاست دانی اور سیاست کاری کا بیان ناقص ہو گا اگر قوم کی عبرت کے لئے ان کی الیکشن گردی کے واقعات پر روشنی نہ ڈالی جائے۔

مولانا سجاد ہندوستان کے طبقۂ علماء میں واحد شخص تھے جس نے ملکی دستور و قانون، مجالس آئین ساز، نیابتی اور انتخابی ادارات اور جمہوریت مغرب کے مسائل کا عملی مطالعہ کیا تھا اور جنہوں نے ان کو اپنے آئیڈیل اور مقصد اصلی کو حاصل کرنے کے لئے بطور آلہ کار استعمال کرنے کی کوشش کی۔مولانا سجاد اسلامی سیاسیات، اسلام کے اصول شریعت و اصول قانون و دستور، اسلام کے اصول سلطنت و عدالت، اسلام کے اصول تعلقات بین الاقوامی اور اسلام کے نظام اقتصادیات و معاشیات کو تمام مغربی و مشرقی نظاموں سے بہتر اور بالاتر مانتے تھے اور اپنے بیانات و تحریرات میں یہ واضح کر چکے تھے کہ وہ اپنا آئیڈیل یقین کرتے تھے اور ساری دنیا کے لئے ان کو رہنما مانتے تھے، وہ انگریز کے عطا کردہ اصلاحات اور مجالس آئین ساز کو ناقص قرار دیتے تھے۔

لیکن مولانا صرف خیالی مفکر اور آئڈیلسٹ نہیں تھے، وہ اپنے نصب العین اور آئیڈیل کو عملاً حاصل کرنے کے لئے موجودہ حقیقت (REALITY) کے ساتھ مصالحت کرنا جائز رکھتے تھے، بنا بریں ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا نے مجالس آئین ساز اور گورنمنٹ اور پاور پر قبضہ کرنے کے لئے انڈیپنڈنٹ پارٹی کی تشکیل کی اور اس کا اصل الاصول امارت شرعیہ کی مذہبی "ہولی سینوڈ" (HOLY SYNDU) کی تابعداری قرار دیا، یعنی پارٹی کے ہر ممبر کے لئے امیر شریعت کی بیعت ضروری قرار پائی اور "پارٹی" امارت کی تابعدار بنائی گئی۔

مولانا کا مقصود اصلی یہ تھا کہ ہندوستان کی ہر اسمبلی اور کانسل کا مسلمان ممبر اس پارٹی عہد نامہ کا تابع اور پابند ہو کہ مجالس آئین ساز میں وہ کسی خلاف شریعت بل، تحریک یا تجویز کی تائید نہیں کرے گا اور ایسے مسائل میں ہمیشہ امارت کی تصریحات اور احکام کی پابندی کرے گا۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مولانا نے خاص امارت کی ایک سیاسی پارلیمنٹری پارٹی مجالس آئین ساز پر فیصلہ کرنے کے لئے تعمیر کی اور اس کا نام مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی رکھا، اس پارٹی کا عام ملکی پروگرام کانگریس سے مختلف نہیں تھا، لیکن اسلامی پروگرام امارت شرعیہ کے نظام شرعی کے استحکام اور مسلم حقوق و مفاد کی حفاظت پر مشتمل تھا۔

مولانا نے اس سیاسی پارٹی کو کامیاب بنانے کے لئے یہ ضروری سمجھا کہ میدان سیاست سے تمام حریفوں کو جو ان کی امارت شرعیہ کی سیاسی آمریت کی

حیثیت کے منکر تھے ،ہٹا دیا جائے خواہ وہ اور لحاظ سے کتنے ہی لائق اور فائق کیوں نہ ہوں، اور ان کی خدمات ملی وملکی کا درجہ ومقام کتنا ہی بلند کیوں نہ رہا ہو۔

اسی بنیاد پر مولانا سجاد صاحب نے مولانا شفیع داؤدی صاحب لیڈر مسلم کانفرنس و احرار پارٹی اور عزیز ملت سید عبد العزیز لیڈر مسلم متحدہ پارٹی سے جنگ کی اور ان کی طاقتوں کو توڑنے کے لئے ایسے لوگوں سے اتحاد کرنے سے بھی پرہیز نہیں کیا جو خود ان کے نزدیک داؤدی صاحب اور عزیز صاحب سے ہزار درجہ بدتر تھے اور جو بالکل ابن الوقت ،مطلبی تھے اور جن کو حقیقت میں دین وملت سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں رہا تھا، اور جو انتہائی درجہ کے رجعت پسند، سرمایہ دار، خود غرض اور زمانہ ساز ٹوڈی رہے تھے، اور جن کو انڈیپنڈنس (INDEPEND) استقلال اور امارت اسلامی کی تحریکوں سے کبھی کوئی ہمدردی نہیں تھی۔

مولانا نے ایک طرف اپنے حریفوں کی قوتوں کو اپنی حکمت عملی سے مجتمع و متحد ہونے سے باز رکھا اور اپنے کارڈ اس طرح کھیلے کہ غیر کانگریسی مسلمان جو کیمونل اوارڈ کی حمایت اور امارت کی آمریت کی مخالفت میں متحد تھے، دو علاحدہ ٹولیوں یعنی احرار پارٹی اور مسلم متحدہ پارٹی میں بٹ گئے، پھر احرار پارٹی اور مسلم متحدہ پارٹی میں تصادم اور ٹکر ہو گیا۔ دوسری طرف امارت کی نام نہاد انڈیپنڈنٹ پارٹی کے امیدواروں کا انتخاب مولانا سجاد نے تمام اصول کو بالائے طاق رکھ کر بالکل عملی سیاست کے اصول پر کیا اور ہر اس شخص کو امارتی امیدواری کا پروانہ دے دیا جس نے امارت کے عہد نامہ پر دستخط کیا، اور جو گانٹھ کا پورا اور عقل کا اندھا آسامی تھا اور جس نے اپنی زمینداری اور سرمایہ

داری کی طاقت جوڑ توڑ کی اہلیت اور دسیسہ کاری کی قابلیت سے اپنی کامیابی کی امید دلائی۔ مولانا نے باستثنائے چند ایسے ایسے امیدوار بھی کھڑے کئے، جو سخت جان ٹوڈی، سیاہ دل، سرمایہ دار، ظلم پیشہ زمیندار اور اخلاق باختہ رئیس زادے تھے ان کا معیار انتخاب جیسا کہ عرض کیا گیا صرف دو تھا(۱) اولاً امارت شرعیہ کو تمام دوسری سیاسی طاقتوں کے مقابلے میں بدرجۂ اولی قبول کرنے پر آمادگی اور (۲) ثانیاً الیکشن کے میدان مقابلہ میں روپیہ، طاقت، سرمایہ داری، زمینداری، جوڑ توڑ یا پیری فقیری کے زور سے کامیاب ہو جانے کی صلاحیت۔ الیکشنوں میں وہ تمام خرافات اور تدابیر کو جائز رکھا گیا جو مغربی سیاست کے امتیازی نشانات اور مغربی تمدن کے مسلمہ مفاسد مانے جاتے ہیں۔

مولانا سجاد نے مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کا لیڈر ایک ایسے شخص کو منتخب کیا جو سائمن کمیشن کے سامنے ایک روز ایک نام نہاد بہار مسلم اسوسی ایشن کے مسلم نمائندہ کی حیثیت سے جداگانہ انتخاب کی حمایت کا وکیل بن کر پیش ہوا تھا اور دوسرے روز بہار زمیندار ایسوسی ایشن کے نمایندہ کی حیثیت سے مخلوط انتخاب کے کیس کا وکیل ہوا تھا، اور جس پر "اسٹیٹسمین" میں بجا طور پر یہ لکھا گیا تھا کہ صاحب مذکور ایک پروفیشنل پلیڈر اور پیشہ ور ایڈوکیٹ کی حیثیت سے کمیشن کے سامنے پیش ہوئے تھے، یہی شخص تھا جو ایک سانس میں کانگریس کی کامل آزادی کے پروگرام اور مارت کی تابعداری کا بھی عہد کر رہا تھا، اور دوسری طرف کانگریس اور امارت دونوں کے اصول کے خلاف وار کمیٹی کا بھی ممبر تھا۔

مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کے لئے جس نے کانگریس کے پروگرام اور کامل آزادی کے نصب العین کے ساتھ اپنے اتحاد کا اعلان کیا تھا، ایک ایسے

شخص کی پارٹی لیڈری کتنی غیر مناسب اور غیر موزوں تھی، ہر شخص پر آفتاب کی طرح روشن ہے، لیکن مولانا سجاد کا خیال تھا کہ وہ ایک دنیادار اور بینکر بیرسٹر کو اپنی امارت پارٹی کے غلبہ اور اپنے حریفوں کو زیر وزبر کرنے کے لئے بطور آلہ کار استعمال کر رہے ہیں۔

یہ سوال کہ آیا "لیڈر" انڈیپنڈنٹ پارٹی امارت کو اپنی سیاسی لیڈری اور غلبہ کے لئے بطور زینہ استعمال کر رہا تھا یا مولانا اس شخص کو امارت کے غلبہ کے لئے استعمال کر رہے تھے، ایک دلچسپ ترین سوال ہے۔ میرا خیال ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو استعمال کر رہے تھے، مولانا سجاد عام جماعتی اور امارتی مفاد کے لئے اور لیڈر مذکور خالص ذاتی لیڈری اور شخصی جاہ طلبی کے لئے ایک دوسرے کو استعمال کر رہے تھے اور دونوں ملت اسلامیہ کی عام جمہوری نہضت جدید کے باعث بالکل ناکام رہے۔

یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے جو تاریخ حال کی حقیقت ہے، مولانا سجاد خود اس صورت حال کو بہترین اور خوشترین نہیں جانتے تھے، ان کا خیال تھا کہ کہ ایک دفعہ امارت کی بالادستی کو دستور، ملک اور حکومت کے اندر منظور و مستحکم کرانے کے بعد وہ امارت پارٹی کو خراب عناصر سے بھی پاک کرنے میں کامیاب ہوں گے، پھر ان کے لئے موقع ہو گا کہ وہ شرعی و اخلاقی اصول اور معیار کے مطابق لوگوں کا انتخاب کر کے لیڈر اور نمائندہ بنائیں، لیکن جب تک ان کو مغربی الیکشن گردی اور مجلس آئین سے واسطہ ہے وہ ان سے الگ تھلگ رہنے کی پالیسی کے خلاف تھے، وہ ضروری جانتے تھے کہ وہ ہر طریقہ سے ان پر

قبضہ کریں اور اگر ان سے کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکے تو کم سے کم ان کے اندر کسی ایسی تحریک کو منظور نہ ہونے دیں جو شریعت اسلامی کی تخریب کا باعث ہو۔

یہ طریقہ کہاں تک صحیح تھا اس پر آئندہ بحث ہو گی، لیکن مولانا کی امارت شرعیہ کے ماتحت ایک پارلیمنٹری پارٹی بنانے، الیکشن لڑنے، وزارت بنانے اور حکومت چلانے کی پالیسی کی یہ روشن ترین فیاضانہ تفسیر ہے جو کی جا سکتی ہے۔

یہ مولانا سجاد کی عظمت کی دلیل ہے کہ وہ ایک غریب جھونپڑے میں پیدا ہوئے، غریب عربی مدرسوں میں چٹائیوں پر تعلیم پائی، لیکن ایک ایسی سیاسی پارٹی کے بانی ہوئے جس میں ہزار عیب سہی لیکن جس نے دینی امور میں ایک امیر شریعت کی تابعداری کی بیعت کی تھی اور جس کے نمائندہ ان کی کار پردازی کی بدولت بہار کے اولین وزارت عظمیٰ پر فائز ہوئے، حالانکہ خود بانی جماعت مولانا سجاد جس جھونپڑے میں پیدا ہوئے، اسی میں فوت بھی ہوئے۔

مولانا سجاد نے امارت شرعیہ کی اس بالادست آمریت (OVER LORDSHIP) کو تسلیم کرانے کی غرض سے سبھوں سے جنگ کی اور سبھوں سے صلح کی، اسی کے لئے وہ مولانا شفیع داؤدی سے لڑتے رہے اور ان کو بہار کی سیاست سے علاحدہ ہو جانے پر مجبور کر دیا اور اسی کی خاطر عزیز ملت سید عبد العزیز سے جنگ آزما رہے اور کچھ عرصہ کے لئے ان کو بھی سیاست سے علاحدہ ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ اسی امارت کی غرض سے مولانا نے کانگریس کی تائید کی اور اسی کے لئے اپنوں سے بھی جدا ہوئے، اسی مقصد کے لئے عامۃ المسلمین کی خواہشات اور رجحانات کے خلاف بہار اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کی تنظیم کی راہ

میں سب سے بڑی رکاوٹ بنے رہے اور مسلم بہار کے صف اتحاد کو پاش پاش کر
دیا۔

مولانا سجاد اور لیگ کا دور جدید:

مولانا عملی سیاست کا اتنا گہرا علم رکھتے تھے کہ وہ ان خیالی آئیڈیلسٹ
مولویوں کی
طرح محض تعصبات کی بنا پر لیگ اور اس کے اصول کے مخالف نہیں ہو سکتے
تھے، جن کا سرمایۂ سیاست محض چند سوفسطائی کلمات ہیں۔ حقیقت میں مولانا
دل سے لیگ کے موجودہ اصول، دعاوی اور مقاصد سے ہمدردی رکھتے تھے،
بلکہ ان کے وضع کرنے میں نمایاں حصہ لے چکے تھے پھر وہ لیگ سے کیسے الگ
ہوئے، کیوں ہوئے؟ اور اس کا نتیجہ ان کی زندگی کے مرکزی نصب العین کے
لئے کیسا ٹریجک اور اندوہناک ہوا، اس کا حقیقت پرستانہ مطالعہ ضروری ہے۔

مولانا ان علماء کے لیڈر تھے جنہوں نے مولوی ابوالکلام آزاد کے اس
سوفسطائی پروپیگنڈا کا زبردست مقابلہ کیا تھا، جو ۱۹۲۸ میں نہرو رپورٹ کی
دوہری غلامی کو اینگلو ہندو سامراج کی صورت میں مسلمانوں پر مسلط کرنے کے
لئے ہندو کانگریس کے سرمایہ سے جاری کیا گیا تھا، طبقۂ علماء کے لئے اس کا خطرہ
پیدا ہو گیا تھا کہ مولانا ابوالکلام اپنے سحر سامری سے جمعیۃ علماء کو مسحور کر کے
اپنے ساتھ بہالے جائیں گے۔ لیکن مولانا سجاد نے نہایت عقلمندی اور قوت کے
ساتھ اس کا مقابلہ کیا اور مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کے اس جہاد کا ساتھ دیا جو
انہوں نے نہرو رپورٹ کے خلاف جاری کیا تھا، مولانا جمعیۃ علماء کے لیڈروں کو
لے کر آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اس اجلاس میں بھی شریک ہوئے، جو یکم

جنوری ۱۹۲۹ء کو بصدارت ہز ہائی نس آغا خاں دہلی میں منعقد ہوا اور جس نے
نہرو رپورٹ کے لئے وہ مطالبات وضع کئے جنہیں مسٹر جناح نے مارچ ۱۹۲۹
میں چودہ نکات کی صورت میں ترتیب دیا۔

جب ۱۹۳۵ کے انڈیا ایکٹ کے پاس ہونے کے بعد مسلم کانفرنس کا
دور ختم ہوا اور ڈاکٹر سر محمد اقبال کی دعوت پر مسٹر محمد علی جناح نے انگلستان سے
ہندوستان واپس آکر مسلم لیگ کو دوبارہ زندہ کرنے کی غرض سے مسلم لیگ کی
لیڈری قبول کی تو مولانا سجاد ان مولویوں میں شریک تھے جنہوں نے مسٹر جناح
کو جمعیۃ علماء کے جلسہ دہلی میں شرکت اور تقریر کرنے کی دعوت دی تھی اور ان
کا خیر مقدم کیا تھا۔ پھر جب آل انڈیا مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ بنانا چاہا اور اس
کے لئے مختلف صوبوں کے لیڈروں کو ۲۶/۲۷/۲۸ اپریل ۱۹۳۶ کو دہلی میں
جمع ہونے کی دعوت دی تو اس میں بھی مولانا سجاد شریک تھے۔

جب مسٹر جناح نے سری نگر کاشمیر سے آل انڈیا مسلم لیگ کی
مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کے ممبروں کے نام کا اعلان کیا تو بہار کے ناموں میں
مولانا سجاد کا نام سب سے اوپر تھا اور بہار کے باقی تین نمائندے خاص مولانا
سجاد کی امارت پارٹی کے لوگ تھے یعنی قاضی احمد حسین صاحب، شاہ مسعود احمد
صاحب و سید عبد الحفیظ صاحب ایڈوکیٹ۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے اس دور جدید کا حقیقی آغاز اس تاریخی جلسے
سے شروع ہوتا ہے جو ۸/جون ۱۹۳۶ء کو بمقام لاہور بصدارت مسٹر جناح منعقد
ہوا، اس جلسے کے علامہ سر ڈاکٹر سر محمد اقبال روح رواں تھے، بلکہ انہی کی علالت
کے خیال سے جلسہ خاص لاہور میں کیا گیا تھا۔ یہ آل انڈیا مسلم لیگ پارلیمنٹری

بورڈ کا اولین جلسہ تھا ،اس میں مولانا سجاد مرحوم ،مولانا کفایت اللہ صدر جمعیۃ علماءئے ہند ،مولانا احمد سعید ناظم جمعیۃ علمائے ہند اور مولانا حسین احمد صاحب قائدانہ حصہ لے رہے تھے ،اس اجلاس اول نے مسلم لیگ کے دور جدید کا آغاز کیا اور اس کا وہ پارلیمنٹری پروگرام وضع کیا جو آج تک اس کا پروگرام ہے، کیونکہ اس کی تنسیخ کسی دوسرے ریزولیشن کے ذریعہ اب تک نہیں کی گئی ہے۔

لیگ کا یہ پارلیمنٹری پروگرام چودہ دفعات پر مشتمل تھا، جس کی دفعہ اول کا لفظی ترجمہ مطابق ذیل:

"مسلمانوں کے مذہبی حقوق کی حفاظت کرنا ،تمام
ایسے معاملات میں جو خالص دینی نوعیت کے ہیں جمعیۃ علمائے ہند
اور مجتہدین کی رایوں کو واجبی وزن دیا جائے گا"

لیگ کے پروگرام کی یہ دفعہ اول حقیقت میں مولانا سجاد کی تصنیف تھی۔

مولانا سجاد اور جمعیۃ علماء کی لیگ سے علاحدگی کا معمہ

اس سے ظاہر ہے کہ مولانا سجاد نہ صرف یہ کہ مسلم لیگ کے جدید پرگرام کے خلاف نہ تھے بلکہ اس کے واضعین میں تھے ،مولانا سجاد اور ان کے ساتھی کیوں لیگ سے الگ ہو گئے ،حالانکہ مسلم لیگ ۱۹۳۷ء میں اجلاس لکھنؤ کے بعد خود ان کے خیال میں بھی ۱۹۳۶ء کی حیثیت اور مقام سے بہت زیادہ آگے نکل چکی تھی ،اس سارے قصہ کا سب سے اندوہناک معمہ ہے، جس کا سلجھانا ضروری ہے۔

مسلم لیگ ۱۹۳۶ء میں جب کہ مولانا سجاد اور ان کی جمعیۃ اس کے حامی تھے ،ایک کاغذی انجمن تھی ،لیکن لکھنؤ کے تاریخی اجلاس اکتوبر ۱۹۳۷ء کے بعد ایک حقیقی طور سے جمہوری نمائندہ تنظیم ہو چکی تھی، جس کا خیر مقدم مولانا سجاد کو کرنا چاہئے تھا۔

مسلم لیگ ۱۹۳۶ء میں ڈومنیین اسٹیٹس کے کریڈ پر راضی تھی، لیکن لکھنؤ کے اجلاس کے بعد آزادی کامل اور مسلم آزادی کی حامی تھی اور یہ چیز لیگ کو مولانا سجاد اور جمعیۃ سے بہت قریب کرنے والی تھی، لیگ مذہبی معاملات میں جمعیۃ کی سیادت کو اپنے دستور اساسی کی رو سے قبول کر چکی تھی ،لہذا یہ کہنا کہ مسلم لیگ اپنے ۱۹۳۶ء کے اصول سے ہٹ گئی تھی ،اس لئے مولانا سجاد اور جمعیۃ علماء والے حضرات اس سے الگ ہو گئے ،قطعا غلط اور بے بنیاد ہو گا ،پھر آخر مولانا سجاد لیگ سے کیوں الگ ہوئے ،یہی ان کی زندگی کا بڑا معمہ ہے۔

حقیقت اصلی یہ ہے کہ مولانا سجاد نے لیگ کو اپنی زندگی کی سب سے چہیتی اور اکلوتی اولاد امارت کے لئے ترک کر دیا اور اسی کے لئے اپنوں سے جنگ مول لی اور ساری قوم کے رجحان عام کے خلاف اپنی علاحدہ پارٹی وضع کی ،اس کو قائم کیا اور چلاتے رہے۔ اگر وہ اسی پر بس کرتے تو بھی غنیمت تھا، لیکن انہوں نے امارت کو کانگریسی جمعیۃ علماء کی کانگریسی سیاست کا کھلونا اور مسلمانوں کی سیاست اور مفاد ملی کے مخالفین کا یک ہتھ کنڈا بنا دیا۔

تنظیم کے متعلق دو خیالات کا تصادم

اصل یہ ہے کہ مسلم لیگ کے دور جدید کے آغاز کے بعد ۱۹۳۷ء میں مسلمانوں میں دو مختلف سیاسی خیالات کا تصادم ہوا۔

ایک طرف عام و خاص مسلمانوں نے مسلم لیگ کی زیر قیادت اپنے استقلال ملی اور وجود قومی کی آزادی کو قائم کرنے کے لئے تنظیم ملت بصورت تنظیم جمہوری کا طریقہ اختیار کیا، گو دینی امور میں علماء اور جمعیۃ علماء کے وجود کو بھی تسلیم کیا، اور اس چیز کی اپنے دستور اساسی میں تصریح کر دی، اس جمہوری مسلم تنظیم نے جس کا نام اس وقت مسلم لیگ ہے، مسلمانان ہند کی مستقل اسلامی سلطنت کی صورت میں تنظیم کا نصب العین اختیار کیا ہے، اس کا عقیدہ ہے کہ اسلامیان ہند کی تنظیم اس وقت تک مکمل نہیں ہو گی جب تک ملک میں اس کی اپنی آزاد مستقل سلطنت نہیں قائم ہو گی جو مسلم اکثریتوں کی محافظ اور مسلم اقلیتوں کی ضامن نہ ہو۔

دوسری طرف علماء کے ایک خاص طبقہ میں جو کانگریسی سیاست سے متاثر تھا اور اپنے آپ کو قومیت متحدۂ ہند کے موہوم شراب باطل کی طرف دعوت دینے کے لئے مامور تصور کرتا تھا، یہ خیال جڑ پکڑ رہا تھا کہ مسلمانوں کی تنظیم صرف بصورت امارت شرعی ہونی چاہئے، یہ طبقہ علماء جس کے امام مولانا سجاد تھے ایک طرف ہندوستان کو جمہوری نیشن اسٹیٹ بنانا چاہتا ہے اور دوسری طرف اس نیشن اسٹیٹ میں ایک امارت شرعی بھی قائم کرنا چاہتا ہے، اور ایک شخص کو امیر شریعت مان کر اس کے ہاتھ پر سب سے بیعت لینا چاہتا ہے، اور سب مسلمانوں کو اس کی اطاعت پر مجبور کرنا چاہتا ہے، بلکہ اس کی بیعت و اطاعت کو شرعا واجب بھی بتاتا ہے۔ یہ خیال کتنا متضاد اور بے جوڑ عناصر سے مرکب ہے اور ملت کے لئے کتنا خطرناک ہے آگے عرض کروں گا۔

بنیاد اس خیال کی یہ عقیدہ تھا کہ مسلمانوں کی قیادت اور سیاسی رہنمائی کا حق علماء اور صرف اصطلاحی علماء کے لئے مخصوص ہے اور ہونا چاہئے، اور کسی غیر عالم کو حق نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کے رہنما ہونے کا دعوی کرے، خواہ وہ کتنا ہی لائق و فائق، دیندار و متقی، مخلص اور ملت کا خدمت گذار کیوں نہ ہو، "عالم" کا اصطلاحی مفہوم اس فرقہ کے خیال میں بہت ہی محدود تھا۔ عالم سے مراد نصاب نظامیہ کا ایک سند یافتہ مولوی تھا۔ ان کے خیال میں رئیس الاحرار مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ جیسا شخص بھی جو مولویوں سے اسلام کا زیادہ گہرا علم رکھتے تھے اور ساری زندگی غلبۂ اسلام کے لئے جہاد کرتے رہے، "عالم" نہیں تھے اور نہ جمعیۃ علماء کی صدارت کے لائق تھے، اگرچہ جمعیۃ علماء کی تاسیس میں ان کا سب سے بڑا حصہ تھا اور مولویوں کو مدرسوں اور خانقاہوں سے نکال کر لیگ اور کانگریس کے اسٹیج پر لانے کے ذمہ دار بھی وہی تھے۔ یہی بنیادی اور اصلی سبب تھا مولانا حسین احمد اور مولانا سجاد کی لیگ سے علاحدگی کا۔ یہ حضرات مسٹر جناح کو اپنا لیڈر ماننے کے لئے تیار نہیں تھے، حالانکہ جناح ان کو پنا مذہبی رہبر تسلیم کر چکا تھا، لیکن مسٹر گاندھی کے زیر آمریت کانگریسی ستیہ گرہ میں شرکت کے لئے راضی تھے، حالانکہ نہ مسٹر گاندھی نے ان کی امارت شرعی تسلیم کی ہے اور نہ مذہبی سیادت قبول کی اور نہ ان کو کانگریس کی سیادت میں شریک کیا، بلکہ کانگریس کو کلیتاً مسٹر گاندھی کے اختیار میں دے دیا گیا اور مسٹر گاندھی کو کانگریس کا آمر مطلق بنا دیا گیا ہے، اگر یہ حضرات یہیں تک بس کرتے تو بھی غنیمت ہوتا، لیکن انہوں نے اس سے آگے اقدام کیا، عام مسلمانوں کی تنظیم و تحریک سے علاحدگی اختیار کرنے کے بعد انہوں نے

جمعیۃ علماء کی لیڈری میں مسلمانوں کو جمع کرنے، عام مسلمانوں کی جمہوری تنظیم کی مخالفت کرنے اور سب کو کانگریسی سیاست کے تابع بنانے کی جد جہد بھی شروع کر دی، گویا وہ مسلمانوں میں قومیت متحدہ کے مذہب جدید کے ایجنٹ ہیں ،جمعیۃ علماء کے حالیہ جلسوں میں کانگریس کی موجودہ ستیہ گرہ جو آزادی ملک کے لئے نہیں بلکہ انگریز کو تمام غیر ہندو اقوام کے علی الرغم کانگریس کو ہندوستان کا مختار مطلق ماننے پر مجبور کرنے اور ہندو اکثریت کے غلبہ و استبداد کے قائم کرنے کے لئے جاری ہے، تائید کا اعلان کیا گیا، اور مولانا سجاد کا آخری مضمون جو اخباروں میں شائع ہوا وہ کانگریسی تحریک ستیہ گرہ کی تائید میں شائع ہوا، حالانکہ مسلمان اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ کانگریسی تحریک مسلمانان ہند کے وجود اور استقلال کو مٹانے کے لئے جاری کی گئی ہے۔

مولانا سجاد، امارت کی تعمیر اور اس کا حشر:

مولانا سجاد کی زندگی کا گلوب اپنے دور حیات میں جس محور پر گھومتا رہا وہ اسلامی مرکزیت کی فکر اور اس کی پیدائش کے لئے تعمیری جدوجہد کا محور تھا اور مولانا نے ہندوستان میں اسلامی مرکزیت کی تعمیر و تخلیق کے لئے جو صورت تجویز کی وہ امارت شرعیہ کی تاسیس تھی، امارت شرعیہ مولانا سجاد کی زندگی کا شاہکار تھی، امارت شرعیہ کا تصور اور تخیل فی نفسہ صحیح ہے یا غلط ہے، محل نظر ہو سکتا ہے، لیکن مولانا آزاد کے بعد بلکہ عملی لحاظ سے ان سے بھی زیادہ اگر امارت شرعیہ بہار کے قیام میں کسی کا حصہ ہو سکتا ہے تو مولانا سجاد صاحب کا جنہوں نے اپنی ساری زندگی اسی خیال کی عملی خدمت و اشاعت میں صرف کر دی کہ مسلمانوں کی تنظیم بصورت امارت شرعی ہونی چاہیے ،مولانا کی ذات

خود ایک انسٹی ٹیوشن تھی اور امارت شرعی کا تخیل اس انسٹی ٹیوشن کا بنیادی تخیل تھا۔

امارت شرعیہ کی تنظیم میں کس کا دماغ کار فرما تھا؟

امارت شرعیہ کا تصور صحیح ہے یا غلط ؟

امارت شرعیہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی یا ناکام ؟

امارت شرعیہ کی نوعیت اور حقیقت واقعتاً کیا تھی اور اس کی علمی تعریف و تحلیل کیا ہو سکتی ہے ؟

امارت شرعیہ اگر ناکام ہوئی تو کیوں اور کیسے ؟

امارت شرعیہ کی تنظیم، طاقت و افادیت کس پوزیشن میں ہے اور اس کے لئے کیا ہو سکتا ہے ؟

امارت کا مسئلہ مولانا سجاد کی زندگی کا مسئلہ تھا اور مذکورہ سوالوں کا جواب مولانا کے مسئلہ زندگی کا حل ہوگا اور اس بات کا بھی فیصلہ کر دے گا کہ مولانا کی زندگی کامیاب ہوئی یا ناکام۔ لیکن ان سوالات کا جواب مولانا سجاد کی زندگی کا حقیقت پرستانہ مطالعہ چاہتا ہے، جس کے لئے ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو ابتدا سے اس تخیل اور تنظیم کے ساتھ ہمدردانہ رہا ہے اور اس کے باوجود عام حالات سے ذہناً الگ ہو کر رائے قائم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

میں اس کا مدعی ہوں کہ امارت شرعیہ کی ابتدا سے میں نہ صرف اس کا حامی رہا بلکہ عملاً بہت سے مواضعات میں اس کی تنظیم و تحریک کے لئے دورہ کرتا رہا ہوں اور اس سے زیادہ یہ کہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ میں تنظیم شرعی کی

سیاسی ضرورت پر مسلسل سوچتا اور لکھتا رہا ہوں، اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا
سیاسیات، اجتماعیات، قانون و دستور اور تاریخ کے نقطۂ نگاہ سے وسیع، گہرا اور
مسلسل مطالعہ کرتا رہا ہوں، آل انڈیا مسلم کانفرنس کی کئی اہم تجاویز کا جو اس
کے متعلق پاس ہوئی تھیں، میں مصنف تھا، آل انڈیا مسلم یوتھ لیگ کے پلیٹ
فارم سے اس کے لئے انگریزی اور اردو میں مسلسل پروپیگنڈا کرتا رہا اور اس
مقصد کے لئے جس کا نام میں نے استقلال نظام شریعت اور ”شرعی سوراج“
رکھا تھا، حضرت علامہ سر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ، علامہ ڈاکٹر سر عبد اللہ المامون
السہروردی، حضرت مولانا قاری محمد سلیمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ پھلواری
شریف، مفتی امین الحسینی مفتی اعظم فلسطین جیسے اکابر علم وسیاست سے بھی براہ
راست مشورہ و مذاکرہ کرتا رہا، اس مسئلہ کے متعلق حضرت علامہ اقبال کی خاص
تحریرات بھی میرے پاس محفوظ ہیں، حضرت مولانا حکیم عبد الرؤف صاحب
قادری داناپوری اور مولانا شفیع داؤدی صاحب جیسے بزرگان قوم اس مقصد کے
لئے ناچیز کی جد وجہد سے واقف ہیں، اس موضوع پر انگریزی اور اردو میں جتنا
اس ناچیز نے لکھا ہے، اتنا شاید کسی دوسرے شخص نے نہیں لکھا ہوگا اور سیاسی و
آئینی لحاظ سے جتنوں کو مسلم لیگ کے پروپیگنڈا کے ذریعہ اس کی مخالفت سے
حمایت پر آمادہ کیا گیا، غالباً کسی اور ادارے سے نہیں ہوا ہوگا، لہذا مخالفین لیگ
بھی کم سے کم اس امارت شرعی کے متعلق ہماری رائے کو دیانتدارانہ یقین
فرمائیں گے اور اس کو کسی تعصب کا نتیجہ قرار نہیں دیں گے، بلکہ تلخ تجربات اور
زندگی بھر کے مخلصانہ اور حقیقت پرستانہ غور وفکر کا نتیجہ یقین فرمائیں گے۔

امارت شرعیہ کی تخلیق و تعمیر میں مولانا سجاد کا قائدانہ حصہ ہندوستان
میں اسلامی فکر سیاست کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ مولانا سجاد کا مقام اس
تاریخ میں یہ ہے کہ برطانوی عہد حکومت ہند میں غدر ۱۸۵۷ء کے بعد یہ مولانا
ہی کی ذات تھی جس نے سب سے اول اس خیال کو عملی جامہ پہنایا، مولانا سجاد
نے امارت شرعیہ کی تاسیس میں اپنی قیادت فکری و عملی کے تمام جوہر دکھائے،
اور اگر وہ اس امارت کو خالص شرعی معاملات کی تنظیم تک محدود رکھتے اور اس
کو ملت اسلامیہ ہند کی عام سیاست سے منقطع نہیں کرتے یا کم سے کم اس کو کفار
ومشرکین ہند کی مخالف اسلام سیاست وقتی کا کھلونا نہیں بننے دیتے تو یقیناً ان کی
تاسیس ان کے بعد بھی مفید ملت انجمن کی حیثیت سے زندہ رہتی اور مسلمانوں
کی آزادی کامل کے جہاد میں ان کی معاون ہوتی، لیکن ایمانداری کی بات یہ ہے
کہ مولانا سجاد کی امارت شرعیہ جہاں تک جمہور مسلمین کی وابستگی کا تعلق ہے
، مولانا سجاد کے مرنے کے پہلے ہی مر چکی تھی۔

تحریک خلافت کے زمانے میں مولانا شاہ بدر الدین صاحبؒ کے زمانے
میں مولانا سجاد صاحب کی قیادت کے ماتحت امارت شرعیہ کی تنظیم مخصوص
ادارت کے ساتھ کی گئی تھی، بہار کے اکثر مواضعات اور امصار میں اس کے
نقیب اور عُمال، مبلغین اور ناظرین مقرر کئے گئے تھے، زکاۃ، صدقات، عشر
وغیرہ کے وصول کرنے اور بیت المال میں جمع کرنے کا انتظام بھی کیا گیا تھا
، قومی محصول کی تشخیص بھی گاؤں گاؤں عمل میں لائی گئی تھی، مسلمانوں کی
مردم شماری کی گئی تھی، اکثر ضلعوں میں دار القضا قائم کیا گیا تھا، مقدمات شرعی
کا فیصلہ شرعی اصول سے کیا جاتا تھا۔

امارت کا اختلال واضمحلال

لیکن افسوس کہ شاہ بدر الدین رحمۃ اللہ علیہ امیر اول کے بعد امارت شرعیہ برائے نام امارت رہی اور حقیقت میں مولانا سجاد کی ذاتی سیاست اور کانگریسی پارٹی پالٹکس کا کھلونا بن کر ختم ہو گئی حتیٰ کہ آج اس کی گمراہی، اپنے مقصد اصلی سے بے پراوئی اور عام مسلمانوں سے بے تعلقی اور کفار سے دوستی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ:

۱. امارت کا صرف نام ہی نام باقی رہ گیا، نہ گورنمنٹ برطانیہ نے اس کو تسلیم کیا نہ کانگریس نے اس کے اصول اور نظام کو قبول کیا اور نہ اب وہ مسلمانوں میں کوئی تنظیم کی حیثیت سے زندہ ہے۔
۲. شاید ہی کسی گاؤں میں اس کے نقیب باقی ہوں۔
۳. دارالقضا کی شاخیں تمام ضلعوں میں ختم ہو چکی ہیں۔
۴. عاملین اور محصلین کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا ہے۔
۵. مبلغین کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا ہے اور ایک مبلغ موجود ہیں وہ دینی تبلیغ میں مصروف نہیں ہیں، بلکہ لیگ کی مخالفت، پاکستان کی تردید اور کانگریسی سیاست کی تبلیغ کا فرض انجام دے رہے ہیں۔
۶. بیت المال بھی دم توڑ چکا ہے، قوم کو اس پر کوئی اعتماد باقی نہیں رہا ہے، اس میں کوئی رقم نہیں ہے۔
۷. امارت شرعیہ کے کسی دستور اساسی اور کانسٹیٹیوشن کا علم کسی کو نہیں ہے اور اگر کاغذ پر اس کا وجود ہے تو اس پر عمل نہیں ہوتا ہے۔

۸. امارت شرعیہ کی کوئی ایسی مجلس شوریٰ نہیں ہے جو ملت کی نمائندہ کہلانے کی مستحق ہو۔
۹. امارت کا جو تھوڑا بہت اثر باقی ہے وہ امارت کے نام سے نہیں بلکہ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے مریدوں اور معتقدوں کی جماعت کے باعث ہے، بلکہ حق یہ ہے کہ امارت کا صرف نام ہی نام باقی ہے، جو کچھ ہے وہ خانقاہ ہی ہے۔
۱۰. مولانا سجاد کے انتقال کے بعد اب امارت کے جسد مردہ میں نہ دماغ باقی ہے، نہ دل، نہ روح باقی ہے اور نہ خون زندگی، ایک بے جان ڈھانچہ کا سایہ اور بھوت رہ گیا ہے اور وہ بھی آہستہ آہستہ نظروں سے انوپ ہوتا جارہا ہے۔

امارت کا تصور فی نفسہ غلط، غیر اسلامی اور خطرناک تھا:

میں نے زندگی بھر امارت شرعیہ کے خیال کی تائید کی، لیکن اب اپنے تجربات کی روشنی میں یہ خیال رکھتا ہوں کہ امارت شرعیہ کا تصور فی نفسہ غلط، غیر اسلامی اور خطرناک تھا، بنابریں امارت شرعیہ کو اللہ نے ساقط اور ناکام کیا اور مسلمانوں کو ایک بڑی گمراہی سے بچالیا، اس لحاظ سے مولانا سجاد کی زندگی ناکامی کی ایک اندوہناک ٹریجڈی ہے۔

امارت شرعیہ کا تصور اس اصول پر مبنی تھا کہ اگر مسلمان کسی ملک میں سیاستاً غیر مسلموں کے محکوم اور غلام بن جائیں تو ان کو لازم اور ضروری ہے کہ ایک مسلمان "عالم" کے ہاتھ پر بیعت کر کے اس کو اپنا امام بنالیں اور اس کی رائے کے مطابق اپنے امور شرعی کو انجام دیں اور اس کی اطاعت کو قبول کریں

اور اس طرح اپنی محکومیت پر نہ صرف قانع ہو جائیں بلکہ اپنی محکومیت کو ایک آئینی صورت اور شرعی شکل بھی دے دیں۔

۱۔ اولاً امارت شرعیہ کا یہ تصور غلط ہے کیونکہ اپنے وجود کے لئے ایک اسٹیٹ کے اندر (IMPERIUM IN " IMPERID) "حکومت در حکومت" کا نظام فرض کر لینا ہے، اور حکومت در حکومت کا وجود عہد حاضر کے کسی اسٹیٹ خصوصاً کسی جمہوری اور نیشن اسٹیٹ کے اندر نا قابل قیاس، نا قابل تصور اور ناممکن الوجود ہے اور نیشنل ساورینٹی کے اصل الاصول کی نفی پر مبنی ہے۔

۲۔ ثانیاً امارت شرعیہ کا تصور اصلاً غیر اسلامی ہے، کیونکہ امارت کا نظام بغیر کامل طاقت تنفیذی ایک پاپائیت سے بھی بدتر چیز ہے اور امارت بے طاقت اور پاپائیت کے لئے اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے، ایک ایسی امارت بے طاقت کا تصور جو محض مولویوں کے ذاتی خیالات پر مبنی ہو اور جو بالکل غیر مسلم حکومت و قانون کے رحم و کرم پر ہو، ایک بدعت کا تصور ہے جس کی کوئی سند قرآن وحدیث میں نہیں ہے، کیونکہ قرآن وحدیث میں مسلمانوں کی محکومیت اور غلامی کا کوئی تصور ہی نہیں ہے اور نہ محکوم مسلمانوں کی حالت محکومیت کے لئے کوئی نظام محکومیت بر بنائے شریعت موجود ہے۔

اسلام کے پاس اگر تلوار اور شریعت کی طاقت نہیں تو وہ ایک رہبانی تصوف سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے، اسلام کا شرعی نظام صرف ایک دینی سلطنت کی طاقت (SANCTION) کے ذریعہ جاری ہو سکتا ہے۔

امارت، سلطنت کے سوا اور سلطنت کے باہر اور کوئی چیز نہیں ہے، سلطنت ہی کا نام امارت ہے اور امارت ہی کا نام سلطنت ہے، سلطنت کے علاوہ امارت کا تصور محکوم ہندی مسلمان کے محکوم دماغ کا محکومانہ مخلوق ہے، لہٰذا ایک بے طاقت امارت کا تصور اساساً، اصلاً اور جوہراً غلط، بے بنیاد اور انتہائی گمراہ کن تصور ہے۔

۳۔ ثالثاً ایک محکوم اور غلام شخص کے لئے محکوم قوم کا امیر و مطاع مطلق ہونے کا دعوی کرنا خطرات کا حامل ہے۔

مسلمان اپنا ایک آزاد جمہوری امام صرف اپنی مکمل طاقت اور سیادت کو قائم کرنے کے لئے ایک وقتی جہاد استقلال کے ایک آلہ کار کے طور پر اختیار کر سکتے ہیں، لیکن ایک ایسے امیر کے لئے امیر المؤمنین اور مسلمانوں کے مطاع مطلق ہونے کا دعوی کرنا نہ صرف غلط، بے بنیاد اور بے سند دعوی ہے بلکہ انتہائی خطرناک بھی ہے کیونکہ ایک ایسے ملک میں جہاں مسلمان اور اسلام محکوم اور کمزور ہیں اور جہاں کفار کو غلبہ حاصل ہے، ہر وقت اس کا خطرہ ہے کہ کافر طاقتیں اپنی ڈپلومیسی سے اس مجبور مسلمان پوپ کو اپنے زیر اثر لے کر اپنے اغراض سیاسیہ کے لئے استعمال کریں گی جس طرح انہوں نے جنگ عظیم کے بعد محکوم شیخ الاسلام استنبول اور محکوم خلیفۃ المسلمین قسطنطنیہ کو آزاد ترکان انقرہ کے خلاف اور شریف حسین کو آزاد خلیفۂ ترکی کے خلاف، ملائے رسولی مراکشی کو امیر عبد الکریم کے خلاف اور ہندوستان کے نام نہاد علمائے امارت و علمائے جمعیۃ کو خود اسلامیان ہند کے استقلال ملی کے خلاف استعمال کیا اور کر رہی ہیں۔

حق یہ ہے کہ اسلامی زندگی کا صرف ایک ہی تصور نا قابل قیاس ہے اور وہ ایک آزاد انسان کا تصور ہے، جو خدا اور رسول کی غیر مشروط اطاعت مطلقہ کے بعد صرف ایک ایسے الو الامر کی مشروط اطاعت کا پابند نہ ہو جو خدا اور رسول کی شریعت کو زندگی کا بنیادی دستور العمل اور کانسٹی ٹیوشن تسلیم کر چکا ہے اور اس دستور کو ساری دنیا سے تسلیم کرانے کے لئے ساعی ہو اور اس کی اہلیت بھی رکھتا ہو، اور اس معنی میں مسلمانوں کے اندر سے ہو کر ملت نے آزادانہ طاقت وا ختیار کے ساتھ اس کو قائم کیا ہو اور کسی غیر مسلم طاقت کا اس پر سیاسی اثر نہ ہو۔

امارت پھلواری کی نوعیت و حقیقت کی علمی تحلیل اور تجزیہ:

لیکن غور فرمائیے کہ امارت پھلواری کی اصل حقیقت اور حقیقی نوعیت کیا ہے اور اس کا وجود کن عناصر سے مرکب ہے، امارت کو کیا ہونا چاہئے، اس سے بحث نہیں ہے، فی الحقیقت وہ اس وقت کیا ہے یہ اصل دیکھنے کی چیز ہے، سوال ہے کہ امارت ہے کیا، آیئے اور امارت کی شخصیت کی علمی تحلیل کیجئے، ہم امارت کا تجزیہ ان سوالات سے بخوبی کر سکتے ہیں:

۱. کیا امارت ایک سلطنت یا اسٹیٹ ہے؟
۲. کیا امارت ایک سلطنت در سلطنت (IMPERIUM IN IMPERID) کا نظام ہے؟
۳. کیا امارت ایک سلسلۂ تصوف یا نظام خانقاہیت (MONASTIC ORDER) ہے؟
۴. کیا امارت ایک انجمن اور یونین ہے؟
۵. کیا امارت ایک لمیٹیڈ کمپنی یا جوائنٹ فیملی بزنس فرم ہے؟

۶. کیا امارت کسی مامور من اللہ اور معصوم عن الخطا شخص کی روحانی و سیاسی خلافت ہے؟

امارت پھلواری شریف کو کوئی بھی سلطنت نہیں کہہ سکتا، کیونکہ اسٹیٹ کے اجزائے ترکیبی یعنی (۱) ملک (۲) آبادی (۳) عام و مطلق حاکمیت (۴) اور عام لا محدود قوت تنفیذی میں سے ایک جز بھی اس کے قبضے میں نہیں ہے۔

امارت "سلطنت در سلطنت" کا بھی نظام بھی نہیں ہے کیونکہ اب تک نہ اسٹیٹ نے اس کے وجود کو قانوناً تسلیم کیا ہے اور نہ کم سے کم اس کے مخصوص دائرہ عمل میں اس کی محدود خود مختاریت (AUTONOMY) اور محدود طاقت تنفیذی ہی کو مانا ہے جیسا کہ کاپی چولیشنس (CAPITULATIONS) کے نظام کے ماتحت سلطنت عثمانیہ ترکی کی بہت سی غیر مسلم ملتوں اور غیر ملکی فرنگی قوموں کے لئے حدود سلطنت عثمانیہ کے اندر مخصوص دائروں میں تسلیم کیا جاتا تھا اور جو بے شمار مفاسد کا سر چشمہ بن گیا تھا اور جس کو معاہدۂ لازین ۱۹۲۲ء کے ماتحت ترکان احرار اور کمال اتاترک نے ختم کیا۔

امارت اور خانقاہیت کا فرق:

امارت ایک سلسلۂ تصوف یا نظام خانقاہیت (مونا سٹک آرڈر) بھی نہیں ہے کیونکہ اصلاً تصوف ایک انفرادی اور شخصی چیز ہے اور امارت اصلاً ایک اجتماعی، عمومی اور سیاسی چیز ہوتی ہے، ایک مخصوص سلسلۂ تصوف سے جو شخص اعتقاد قلبی رکھتا ہے، اس سے متوسل ہوتا ہے اور اس کے طریقہ کے مطابق

چل کر اپنی روحانی ارتقا کی کوشش کرتا ہے خواہ وہ طریقہ خدمت خلق کا کوئی اجتماعی طریقہ ہی کیوں نہ ہو، لیکن جوہراً یہ چیز کاملاً شخصی و انفرادی نوعیت کی ہوتی ہے اور خاص ذاتی عقائد اور خاص ذاتی اصول پر اس کے کیف وکم کا مدار ہے، مثلاً ایک شخص کو ایک شیخ سے اعتقاد ہوتا ہے، دوسرے کو دوسرے سلسلۂ تصوف سے ربط ہوتا ہے اور تیسرے کو کسی اور سے، یہ بالکل ذاتی عقیدہ اور شخصی اعتقاد پر منحصر ہے۔ کسی سلسلہ کا شیخ یا مرشد کبھی دوسروں کو اپنی بیعت پر مجبور نہیں کرتا اور سب کو لازماً اپنے دائرۂ عمل و دخل میں لانے کی کبھی کوشش نہیں کرتا اور دراصل یہ طریقۂ تصوف نہیں ہے۔

امارت برعکس اس کے سب سے لازماً اپنی اطاعت کی بیعت لینا اپنے وجود کے لئے لازمی اور ضروری شرط اول سمجھتی ہے، امارت کا سارا تصور ہی یہ ہے کہ طوعاً و قہراً ہر مسلمان پر امارت اور امیر کی بیعت واجب ہے اور جو شخص بغیر بیعت کے مر جائے وہ جاہلیت کی موت مرتا ہے۔

پھلواری شریف کی امارت نے اپنے لئے اسلامی خلافت کے ان تمام مذکورہ حقوق کا دعویٰ کیا تھا، مولانا سجاد کی امارت دعوی دار تھی کہ ہر مسلمان پر اس کے امیر کی بیعت لازم، واجب اور فرض ہے اور جو بغیر بیعت مرے گا وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔ قرآن وحدیث کے وہ تمام احکام جو خلافت اسلامی کے لئے اترے ہیں مولانا سجاد کی امارت اپنے لئے استعمال کرتی تھی۔ پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ ابتدا ہی سے امارت شرعیہ بہار کو عملاً ایک خاص سلسلۂ تصوف اور ایک مخصوص حلقۂ خانقاہ سے وابستہ کر دیا گیا تھا۔ امارت شرعیہ بہار کے امیر اول شاہ بدر الدین صاحب کو منتخب کیا گیا تھا، جو خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے

سجادہ نشیں اور ایک نہایت عالی پایہ بزرگ تھے، لیکن مجھے ان کی ذات سے بحث نہیں ہے، بلکہ امارت شرعیہ بہار کی علمی و سیاسی نوعیت سے بحث ہے۔

امارت شرعیہ کے دوسرے امیر شاہ بدر الدینؒ کے خلف الرشید صاحبزادہ مولانا شاہ محی الدین صاحب ہوئے، جو خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے سجادہ نشیں بھی ہیں، گویا عملاً شاہ بدر الدین کے بعد امارت شرعیہ بہار خانقاہ مجیبیہ بہار اور خاندان سجادہ نشیں کے ساتھ وابستہ کر دی گئی، اس وابستگی کو الیکشن کے موقع پر خوب استعمال کیا گیا، اتنا اور اس طرح کہ عام مسلمانوں کے لئے خانقاہ پھلواری شریف کے احکام اور امارت شرعیہ کے احکام میں تمیز کرنا دشوار ہو گیا، کیونکہ یہ دونوں ادارات عملاً و حقیقتاً ایک ہی ذات میں مجتمع ہو گئے تھے، جو ایک خانقاہ نشیں صوفی و عالم کی ذات تھی، جن کے خانقاہ کے معمولات میں سے ایک عجیب معمول یہ ہے کہ وہ سجادہ نشیں ہونے کے بعد خانقاہ کے حلقہ اور احاطہ سے زندگی بھر باہر نہیں نکلتے ہیں۔

ایک خانقاہ نشیں سجادہ نشیں کی خانقاہیت کے ساتھ، ایک سیاسی و شرعی امارت کی وابستگی، خواہ کتنی ہی بے جوڑ اور غیر مناسب کیوں نہ ہو، لیکن واقعہ یہی ہے کہ بہار میں ایسا ہی کیا گیا اور ایسا ہی ہوا۔

امارت کسی معصوم عن الخطایا مامور من اللہ کی خلافت بھی نہیں ہے اور نہ اس کا دعوی کیا گیا اور نہ کوئی سنی مسلمان کبھی ایسا دعوی کر سکتا ہے۔

لیمیٹڈ کمپنی اور امارت:

تو پھر کیا امارت شرعیہ ایک جوائنٹ فیملی بزنس فرم یا لیمیٹڈ کمپنی ہے ؟

آئین و قانون کی رُو سے اس میں بعض خصائص لیمیٹڈ کمپنی اور فیملی فرم کے ضرور ہیں لیکن اس کے حالات پر ان کی تعریف بھی مشکل سے پوری طرح صادق آتی ہے۔

اجتماعیت کی روشنی میں امارت کی تحلیل:

علوم اجتماعیات (شوشیالوجی) اور قانون کے ایک طالب علم کے لئے امارت شرعیہ پھلواری شریف کی اصلی نوعیت و حقیقت اور صحیح تعریف کا تعین کرنا ایک مشکل کام ہے، لیکن میں جو کچھ سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ امارت شرعیہ نہ تو کوئی اسٹیٹ ہے اور نہ سلطنت در سلطنت کا نیم دولتی و نیم مختار نظام ہے اور نہ امارت کسی مامور من اللہ یا خدائی فوجدار کی خلافت ہے اور نہ کوئی سلسلۂ تصوف یا نظام خانقاہیت ہے، بلکہ ایک عجیب الخلقت انجمن اور ایسو سی ایشن کے سوا کچھ نہیں، اس میں کئی باتیں ایسی ہیں جو خلاف معمول اور غیر معمولی ہیں۔

امارت ایک ایسی انجمن ہے۔

۱. جس کی صدارت کا منصب حین حیاتی اور عملاً ایک خاندانی اور وراثتی عہدہ ہے۔

۲. اور جس کی ممبری کا دروازہ تو عوام پر بند ہے یعنی ہر خاص و عام اس کا ممبر نہیں ہو سکتا، لیکن

۳. جس کے مقصود اور وظیفۂ عمل کے متعلق دعوائے عمومیت کے ساتھ ہر عقیدہ اور ہر خیال کے مسلمان کو وعیدات قران سے ڈرا کر اپنے امیر کی بیعت عام اور اطاعت عام پر متحد و منظم کر کے سب پر شرعی محصولات کی

تشخیص کرنا، بیت المال قائم کرنا، عدالت و دارالقضا کے ذریعہ انصاف کرنا اور امور شرعیہ کا انصرام و اہتمام کرنا اور بالعموم خلافت کے فرائض انجام دینا ہے۔

۴. اور جس کے قانون اساسی اور دستور العمل کو (اگر وہ موجود ہے) نہ عام مسلمانوں نے بنایا ہے اور نہ وہ اس سے آگاہ ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ امارت پھلواری:

- چند اشخاص
- چند ادارات
- چند قوانین
- چند املاک واموال
- چند دعادی اور
- چند اعمال واشغال

کے عناصر اور اجزاء سے مرکب ہے۔

اشخاص میں اس کے چند عہدہ دار، مثلاً امیر شریعت، نائب امیر شریعت، قاضی، مبلغ، ناظم، مدیر اخبار و ملازمین اور اس کے وہ متوسلین شامل ہیں جو اس سے عقیدت رکھتے ہیں، اس کی بیعت کرتے ہیں، یا اس کو عشر و زکاۃ، صدقات اور قومی محصول طوعاً یا قہراً ادا کرتے ہیں۔

ادارات میں اس کے وہ دار القضا، بیت المال وغیرہ شامل ہیں، جن کے موجودہ اختلال کا حال ہم معلوم کر چکے ہیں اور جو ایک وقت میں موجود تھے اور اب عملاً ختم ہو چکے ہیں۔

قوانین سے وہ تمام تحریریں، یا رواجی قواعد وضوابط مراد ہیں جن کے مطابق یا جن کے خلاف امارت کا کاروبار جاری تھا اور ہے۔

دعادی سے مراد تمام اعلی آرزوئیں اور تمنائیں ہیں جو امارت شرعیہ کے قائم کرنے کی محرک ہوئیں، اور بطور مقاصد اس کے لئے قبول کی گئی تھیں اور وہ تمام احکام، حقوق اور فرائض خلافت بھی مراد ہیں جن کے وارث ہونے کی دعویدار امارت شرعیہ ہے اور جن کا تذکرہ ابھی ابھی ہو چکا ہے۔

املاک و اموال سے مراد وہ قابل انتقال یا نا قابل انتقال اسباب اور سامان ہے، جو انجمن مذکور کے فنڈ یا ملکیت میں ہے۔

اعمال و اشغال سے امارت کے وہ کام مراد ہیں جن کا حال ہم پہلے معلوم کر چکے ہیں، انجمن امارت پھلواری کا سرمایۂ حیات مذکورہ عناصر کے سوا اور کیا ہے؟

انجمن امارت کے امیر کو نہ تو عام بیعت کے ذریعہ تمام مسلمانوں یا اکثر مسلمانوں نے اپنا خلیفہ یا امیر تسلیم کیا ہے، اور نہ امیر مذکور نے قہراً اپنی سیادت و امارت کو تلوار کے زور سے منوایا ہے اور نہ عام مسلمانوں نے ان کا انتخاب کیا ہے اور نہ اہل حل وعقد مسلمانوں کے کسی متعین نمائندہ مجلس نے ان کا انتخاب کیا ہے۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ

۱. اپنی تاسیس اور ترکیب کے اعتبار سے امارت پھلواری ایک انجمن اور ایسو سی ایشن یا یونین ہے۔

۲. لیکن اپنے دعادی اور مقاصد کے لحاظ سے ایک سلطنت در سلطنت اور خلافت کے اختیارات اور حقوق کی دعویدار ہے، گو اس میں اسٹیٹ کی ایک خصوصیت اور اختیار بھی موجود نہیں ہے اور

۳. اپنے بعض خصائص واعمال کے اعتبار سے ایک خانقاہی نظام ہے اور

۴. اپنے بعض حالات کے اعتبار سے ایک فیملی لیمیٹڈ کمپنی ہے۔

الغرض امارت ایک عجیب الخلقت انجمن ہے جو حقیقت میں چند محدود و مخصوص شخصوں کی ایک حین حیاتی لیمٹیڈ کمپنی ہے، جو بیعت عام، اطاعت عام، سیادت عام اور امر عام کے وہ دعوے بھی پیش کرتی جو صرف ایک آزاد اور خود مختار سلطنت کا آزاد بادشاہ اسلام اور خلیفۃ المسلمین ہی پیش کر سکتا ہے۔

بالفاظ دیگر امارت ایک انجمن کے خول پر ایک مذہبی سلطنت کی قبا منڈھنے کی ناکام اور زبردستی کوشش کے سوا کچھ نہیں ہے۔

سقوط امارت کے اسباب:

خدا نے امارت شرعی بصورت انجمن خانقاہی کی بدعت کو جس کی کوئی سند قرآن یا حدیث اور تاریخ دین میں موجود نہیں ہے، ناکام اور ساقط کیا۔

انجمن امارت کے سقوط کامل کے اسباب کی تشریح حسب ذیل طریق سے ہو سکتی ہے۔

(ا) اولاً مولانا سجاد، امارتی علماء اور جمعیۃ علماء والے ایک طرف ہندوستان کو ایک نیشن اسٹیٹ بنانا چاہتے تھے اور قومیت متحدہ کے مذہب یعنی نیشنل ازم کے مبلغ بن گئے تھے اور دوسری طرف وہ مسلمانوں کی امارت شرعیہ اور استقلال ملی کے بھی دعوی دار تھے، نیشن اسٹیٹ اور نیشنل ساورنیٹی کا بنیادی سیاسی

مذہب اسلام کے عقیدۂ توحید کی طرح ایک ہمہ گیر محیط کل (TOTALITARIAN) عقیدہ ہے۔ جس کے مطابق نیشن اسٹیٹ کی حاکمیت ہر چیز پر مطلق اور غیر محدود تسلیم کی جاتی ہے اور نیشن اسٹیٹ کے اندر کسی دوسری طاقت کا اس کو حریف تسلیم کیا جانا قطعی غلط اور ناممکن ہے۔ بجانب دیگر مسلمانوں کی امارت شرعی کا تصور اصلاً ہندوستان کے نیشن اسٹیٹ کے اندر ایک دوسری نیشن اسٹیٹ کی تخلیق و تعلیق کا تصور ہے۔

بنا بریں ہندو سبھا اور نیشنل کانگریس نے جو اس ہندوستان کو ایک وحدانی نیشن اور نیشن اسٹیٹ بنانے کے دعویدار ہیں آج تک با اختیار امارت شرعیہ اور آزاد با اختیار نظام قضا کے اصول تک کو تسلیم نہیں کیا ہے، حالانکہ جمعیۃ علماء اور امارت نے کانگریس کی حمایت میں اپنا وجود تک مٹا دیا ہے، حقیقت میں کانگریس ایسا کر بھی نہیں سکتی ہے۔ کانگریس نیشنل ازم کے لئے امارت شرعی کو ماننا اپنے وجود کا انکار کرنا ہوگا۔

الہ آباد کی اتحاد کانفرنس ۱۹۳۲ء میں علمائے جمعیۃ و امارت نے بہت زوروں کے ساتھ اس مطالبہ کو پیش کیا، کانگریس کے سامنے بھی جمعیۃ نے بار بار یہ مطالبہ رکھا، لیکن آج تک نہ اس کو تسلیم کیا گیا اور نہ کیا جائے گا، جب تک ہندوستان کا ایک نیشن اور ایک متحدہ نیشن اسٹیٹ کا تصور باقی ہے، کیونکہ نیشنل ازم اور امارت شرعیہ اصولاً ایک دوسرے کی ضد اور نفی ہیں۔

(۲) ثانیاً جمہور مسلمان امارت ٹولی اور جمعیۃ علماء پارٹی کی گمراہی اور کانگریس نوازی یعنی نیشن اسٹیٹ کے کانگریسی نصب العین کی تائید کو اپنے وجود ملی کے لئے مہلک خطرہ یقین کرتے ہوئے عملاً ان سے سخت بیزار اور الگ ہو گئے اور

امارت اور جمعیۃ والے بھی کانگریسی تحریک، رابطہ عام کی تائید کرنے کے لئے جمہور مسلمان کی جمہوری تنظیم اور استقلال ملت کے نصب العین سے منقطع ہو گئے بلکہ عام مسلمانوں کی تحریک کی مخالفت کرتے رہے اور پاکستان کے مطالبہ کا مذاق اڑاتے رہے۔

عامۃ المسلمین امارتی علماء سے اس لئے بیزار ہو گئے کہ یہ امارتی علماء مسلم نیشنل ازم یعنی ہندوستان میں مسلمانوں کی اپنی آزاد مستقل سلطنت کو تعمیر کرنے کے نصب العین یعنی تعمیر پاکستان کے خلاف ہیں اور مسلمانوں کو ایک ہندو اسٹیٹ کا محکوم بنانا چاہتے ہیں۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لاہور اور قرارداد پاکستان کے پاس ہو جانے کے بعد مولانا سجاد نے شد و مد سے اس کی مخالفت کی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مالیاتی لحاظ سے یہ اسکیم ناقابل عمل ہے۔

امارتی اور جمعیتی علماء اس لئے جمہور مسلمین کی تنظیم عام یعنی مسلم لیگ اور پاکستان سے منقطع اور بے زار ہو گئے کہ یہ چیز کانگریسی نیشنل ازم اور قومیت متحدہ کے اصول کے بالکل خلاف ہے اور وہ اب تک ہندوستان کو ایک نیشن اسٹیٹ کی صورت میں تعمیر پر عقیدہ رکھتے ہیں، حالانکہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ نیشن اسٹیٹ در اصل ہندو راشٹر یا رام راجیہ کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا اور اس میکانیکل ریاضیاتی جمہوریت اور پارلیمنٹری نظام کے ماتحت جس کا دارو مدار سروں کی گنتی اور ریاضی کے ہندسوں پر ہے، مسلمانوں کی حیثیت ایک دائمی اقلیت اور محکوم غلامی کی ہوگی اور مسلمانوں کے ساتھ اس صورت میں وہی کچھ

ہو گا جو اسپین میں عربوں اور موروں کے ساتھ اور جرمنی میں یہودیوں کے ساتھ ہو چکا ہے۔

امارت شرعیہ کے انحلال کا سب سے محکم سبب اس کا ملت سے یہی انقطاع اور دشمنان ملت سے یہی موالات واتحاد ہے۔

امارت کی ناکامی و بربادی کا تیسرا سبب یہ ہے کہ درس نظامیہ کے فارغین اور علمائے دیوبند میں سے بعض حضرات میں ایک عجیب سیاسی و نفسیاتی انقلاب پیدا ہوا ہے، جس کو لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادیؒ نے اس طرح بیان کیا ہے

ادھر مولوی کس مپرسی میں تھے
نہ آفس میں تھے اور نہ کرسی میں تھے
یہ ٹھہرا کہ آپس میں مل جایئے
سیاسی کمیٹی میں پل جایئے
اسی روشنی کا ہے بس یہ ظہور
خدا جانے ظلمت ہے اس میں کہ نور

ملاکراسی یا ملا شاہیت:

ایک جملہ میں یوں سمجھنا چاہئے کہ سیاسی مولویوں کے مخصوص و محدود گروہ میں یہ خالص دنیا دارانہ اور غیر اسلامی عقیدہ پیدا ہوا کہ ملت کی رہنمائی اور سیادت کا حق شرعاً انہیں کے لئے مخصوص ہونا چاہئے اور ان کا استحقاق حکومت محض ان کی سند عالمیت پر مبنی ہے، ان کی نگاہ ابتداءً تنفیذ شریعت پر نہیں بلکہ سیاسی اقتدار پر قابض ہونے پر ہے، ان کے نزدیک

حکومت وسیادت کا حق طبقۂ علما کے لئے منصوص اور مخصوص ہے اور کسی غیر عالم کے لئے سیادت وامارت ناجائز ہے۔

امارت اس طرح ایک نئی قسم کی افلاطونی آریسٹوکراسی (حکومت اشراف) کی صورت بن گئی جس کو اگر میں ملا کراسی ملا شاہیت کے نام سے موسوم کروں تو بے جا نہ ہو گا، جس طرح افلاطونی جمہوریت میں حکومت و سیادت صرف حکیموں اور فلاسفروں کے طبقہ کے لئے مخصوص رکھی گئی ہے، اسی طرح جمعیۃ علماء اور امارت شرعیہ کی ٹولی کے نزدیک مسلمانوں کی حکومت و سیادت سندی علماء کی ٹولی کے لئے مخصوص رکھی گئی ہے۔

ہندوستان کی موجودہ سیاست کے اندر جمعیۃ علماء ہند نے بعض علماء کی ایک ٹریڈ یونین کی پوزیشن اختیار کرلی ہے، جس طرح ایک مخصوص ٹریڈ یونین ایک مخصوص پیشہ وروں کے مفاد اور کلاس انٹریسٹ کے لئے کام کرتی ہے اور طبقاتی شعور اور احساس اور طبقاتی تعصب کے ساتھ کام کرتی ہے، اس طرح جمعیۃ علماء درس نظامیہ کے سند یافتوں کے طبقاتی مفاد اور عصبیت کی حفاظت اور اس کی ترقی کے لئے کوشاں ہے۔

اس طرح اصطلاحی علماء کی ایک علاحدہ کاسٹ اور جداگانہ کلاس پیدا کی جارہی ہے، جن کا کام خالصاً لوجہ اللہ اعلاء کلمہ "جمعیۃ" وغلبہ امارت شخصی کے لئے سب مسلمانوں سے جنگ کرنا، مسلمانوں کی آزاد سلطنت کی تحریک کی مخالفت کرنا، اور ہندو راجیہ کے لئے مسلمانوں کے خلاف جدوجہد کرنا قرار پایا۔

اگر یہ امارت خالص اسلامی سلطنت کے نصب العین اور مسلم مفاد کے لئے ملت کے ساتھ مل کر کام کرتی اور للّٰہیت کے ساتھ کام کرتی اور قانون

اہلیت کے مطابق ہر کام کے لئے اس کے واقعی اہل شخص کو مقرر کرتی خواہ وہ سندی عالم ہو یا غیر عالم تو قوم از خود امارت کو بلا طلب اپنا سردار تسلیم کرتی، لیکن جب کہ یہ امارت ایک طرف عملاً مسلمانوں کو رام راجیہ، ہندو راشٹر یا ہندو نیشن اسٹیٹ کے محکوم بنانے کی ہندو کوشش میں بھی شریک ہے اور دوسری طرف اپنے لئے اپنی خدمت کے لحاظ سے نہیں بلکہ محض اپنی عالمیت اور تقدس مآبیت کی بنیاد پر سیادت طلب کرتی ہے تو مسلمانوں کو کیا پڑی ہے کہ وہ اپنی دین و دنیا کی قیمت ادا کر کے برہمنیت اور پاپائیت کی بدعت کو خریدیں اور اپنے اوپر مسلط کریں۔

(۴) امارت شرعیہ کی ناکامی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ابتدا ہی سے وہ ایک خانقاہی نظام کے ساتھ جوڑ دی گئی اور خانقاہیت اور سیاست کا جوڑ ایک انمل جوڑ ہے، اس سے دونوں کے دائروں کو صدمہ پہنچا اور بہت زیادہ نقصان ہوا۔

(۵) امارت شرعیہ مسلمانوں کے ایسے مستقل شرعی، معاشرتی اور دینی امور کے انجام دینے کے لئے وجود میں لائی گئی تھی جن کے انجام دینے کے لئے ایک طرف طاقت تنفیذی کی ضرورت تھی تو دوسری طرف تقسیم وظائف کے اصول پر سختی سے عمل کرنے کی ضرورت تھی، لیکن ملت سے برگشتگی کے باعث امارت کو نہ طاقت تنفیذی حاصل ہو سکی اور نہ اس کے شرعی امور و وظائف کے دائرۂ عمل کی کبھی تعریف و تحدید کی گئی، امارت کو ہر معاملے اور ہر مضمون میں الجھا دیا گیا اور سب سے افسوس کی بات یہ ہے کہ اس کو ملک کی پارٹی پالیٹکس، ہنگامی سیاست اور فریقانہ پروپیگنڈہ کا اس طرح

آلۂ کار بنا دیا گیا کہ دار القضاء، بیت المال، نظام محصلین، صدقات و زکاۃ، نظام نقبا و عاملین سب ادارات ان کے سیل رواں میں تنکوں کی طرح (بہہ گئے) کہ آج ان کا نہ کوئی وجود ہے اور نہ نام و نشان ہی باقی ہے۔

مولانا سجاد، امارت اور جمعیۃ کی زندگی کی ٹریجڈی:

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد امارت شرعیہ اور جمعیۃ علماء ہند کی زندگیوں کی ٹریجڈی یہ ہے کہ انہوں نے اپنا دور حیات کفرستان ہند میں اسلام کے نظام مرکزیت کی تاسیس کے مقصد کے ساتھ شروع کیا، اور ان کا خاتمہ عملاً پاکستان یعنی ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی تعمیر کی مخالفت اور ایک کفر و اسلام کی ممزوج متحدہ قومیت کی تکوین کی کوشش اور متحدہ نیشن اسٹیٹ کی تخلیق کی حمایت کرتے ہوئے ہوا، اتنی اچھی ابتدا کی اتنی بُری انتہا قیاس میں نہیں آسکتی ہے، یہ ایک تلخ حقیقت ہے لیکن اس کو بیان نہ کرنا حق ناشناسی ہو گی۔

مولانا سجاد نے شروع میں ایک کافر اسٹیٹ کے فولادی خول کے اندر امارت شرعیہ کی محکومانہ پوزیشن طلب کی تھی، لیکن قوم اس درجہ اور اس پوزیشن سے بہت آگے نکل گئی، ملت اسلامیہ ہند کی نہضت جدید نے اپنے لئے اس ملک میں ایک آزاد مستقبل اور خود مختار اسلامی سلطنت کی تعمیر کرنے کا نصب العین پیدا کیا، لیکن وہ جس نے اس کا خواب دیکھا تھا، بظاہر اس کی مخالفت کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوا۔

یہ انتہائی افسوسناک ٹریجڈی ہے، لیکن حضرت مولانا قمر الدین صاحب قمر کے واسطہ سے مجھ تک یہ روایت پہنچی ہے کہ مولانا سجاد صاحب اپنی پرائیوٹ مجلس میں یہ فرماتے تھے کہ

"پاکستان ہی وہ نصب العین ہے جو مسلمانان ہند کا صحیح سیاسی نصب العین ہو سکتا ہے، البتہ ہمارا اعتراض صرف یہ ہے کہ یہ قبل از وقت پیش کیا گیا ہے"۔

اگر یہ روایت صحیح ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حالات و واقعات نے جن کا وہ سنجیدگی سے بغور مطالعہ کیا کرتے تھے، مولانا کو متحدہ قومیت اور متحدہ نیشن اسٹیٹ کی تعمیر سے اسی طرح مایوس کر دیا تھا جس طرح مولانا شوکت علی اور مسٹر جناح جیسے نیشنلسٹ مایوس ہو چکے تھے، اور مولانا محسوس کر رہے تھے کہ پاکستان کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہو گا۔ غالباً جمعیۃ علماء کی پارٹی پالیٹکس یعنی مولانا حسین احمد صاحب صدر جمعیۃ علماء کا غلو اور ضد ان کو اس حقیقت کے اعلانیہ اعتراف سے روکتی رہی، ورنہ یہ تو ظاہر ہے کہ ساری جمعیۃ علماء کے اندر مولانا سجاد ہی مسلم لیگ سے سب سے زیادہ قریب تھے، کانگریسی وزارتوں کے مظالم اور گاندھی ازم کے خلاف آپ نے جو جنگ جاری کی تھی وہ اس کا ثبوت تھی کہ مولانا کانگریس سے مایوس ہوتے جارہے تھے اور اگر ان کی زندگی وفا کرتی اور وہ مولانا حسین احمد کی جمعیۃ کے ناظم نہ ہوتے تو غالباً وہ اپنے اس انقلاب ذہنی کا اعلان بھی کرتے۔

یہ ایک المناک ٹریجڈی ہے کہ مولانا سجاد جیسی اعلی ترین تنظیمی صلاحیت اور اولین درجہ کی سیاسی قابلیت مسلمانوں کے لئے ضائع گئی، ان کی زندگی کا حاصل (۱) امارت شرعیہ (۲) اور مسلم انڈپنڈنٹ پارٹی تھی، لیکن آج نہ تو امارت باقی ہے اور نہ اس کی مسلم انڈپنڈنٹ پارٹی باقی ہے، دونوں کا صرف سایہ ہی سایہ باقی رہ گیا ہے۔ نہ مسلم لیگ مولانا کی غیر معمولی قوتوں سے قوت

حاصل کر سکی اور نہ امارت کو حقیقت میں کوئی حقیقی استقلال حاصل ہو سکا، مولانا ملت اور ملک دونوں کے لئے کھو گئے، آخر میں وہ بظاہر قومیت متحدہ اور پاکستان کے درمیان کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکے اور ٹھیک ٹھیک صاف طور سے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ واقعی کانگریس کے وحدانی نیشن جمہوری کو مانتے ہیں یا مسٹر جناح کے ٹو نیشن تھیوری کو قبول کرتے ہیں۔ دھڑا بندی اور پارٹی پالٹکس کے طوفان میں مولانا سجاد خود اس طرح گرفتار ہوئے کہ ان کی زندگی کا شاہکار بھی ان کے ساتھ بلکہ ان کی زندگی ہی میں ختم ہو گیا۔

اس بیسویں صدی میں مولانا سجاد اسلامی مرکزیت اور اسلامی امارت کے ہندوستان کے اندر سب سے بڑے داعی کی حیثیت سے اسلامی سیاست کے مبلغ اکبر تھے۔ لیکن افسوس اس کا ہے کہ وہ نیشنل اسٹیٹ، پارلیمنٹری جمہوریت، الیکشن گردی، کانسل، منسٹری اور سوراج افرنگی اور ہندو سیاست کے سیل رواں میں اس طرح بہ گئے کہ ان کے ساتھ ان کی اسلامی سیاست و امارت بھی بہہ گئی۔

لیکن ان شاء اللہ اب پوری ملت اسلامیہ ہند جن میں مولانا سجاد کے تربیت دادہ بہت سے پیش پیش ہوں گے، ہندوستان میں ایک آزاد و مستقل اسلامی مرکزیت کو قائم کرنے اور مولانا مرحوم کے حقیقی نصب العین کو حاصل کرنے کی جدوجہد میں کامیاب ہوگی، لامرکزیت دور ہوگی، مولانا کا خواب تقدیر الہی کے مطابق پورا ہو گا، اور ہندوستان ایک اسلامستان بن کر رہے گا، کیونکہ جیسا کہ مولانا کا اصل عقیدہ تھا، اس ملک کی نجات نہ تو پراچین بھارت کے دھرم راشٹریا میں ہے اور نہ "نوین بھارت" کی گاندھیت اور رام راجیہ میں ہے

اور نہ افرنگی سیاست کی پارلیمنٹری جمہوریت یا اشتراکیت، نازیت و فسطائیت میں ہے، بلکہ اس کی حقیقی حریت صرف سلطنت اسلامی کی تعمیر اور نظام تمدن اسلامی کی تاسیس میں ہے اور اسی کے لئے یکسوئی کے ساتھ مولانا کے تمام خلفا اور متوسلین کو سعی کرنا چاہئے، کیونکہ آزاد خود مختار اسلامستان کی تعمیر اسلامی مرکزیت کے داعی اکبر کی بہترین و موزوں ترین یادگار ہوگی۔

قوم اور اس کے علماء، زعما، عوام اور خواص سب کے رخ اس اسلامستان کی طرف پھر چکے ہیں، سب اس کی طرف چل پڑے ہیں، سب آہستہ آہستہ خود نگری اور خود شناسی کی راہ سے خودیابی کی اس منزل کی طرف گامزن ہیں، جاہلیت، خود فراموشی اور غلامی کی تاریک ڈراؤنی رات صبح ہو رہی، سپیدۂ سحری نمودار ہو چکا ہے، امید کی کلی کھل رہی ہے، آفتاب استقلال ملت اسلام مشرق سے طلوع ہو رہا ہے اور اس کی روشنی میں ملت کی آزادی کے مینار اور کنگرے صاف دکھائی دے رہے ہیں، مایوسی کی سیاہی کافور ہو چکی ہے، ایمان اور عزم کی طاقت، ملت آسمان کو چیلنج دے رہی ہے، زمین سے ٹکر لے رہی ہے، اور اس وقت تک چین نہیں لے گی جب تک اس آسمان کے نیچے اپنا مستقل مقام حاصل نہ کرلے۔

اللہ مولانا کو جوار رحمت میں جگہ دے، ان کی نیکیوں کو قبول کرے، ان کی غلطیوں کو معاف کرے، اور ان کے خلفاء کو ملت کے ساتھ مل کر اس سیاست و مرکزیت اسلامی کے غلبہ و قیام کی جدوجہد میں نمایاں حصہ لینے کی توفیق دے جو مولانا کا اصلی محور حیات تھا، آمین۔[129]

---

[129] محاسن سجاد، ص ۹۵ تا ۱۵۰۔

سرودرفتہ[130]

(استدراک)

جناب شمس ہاشمی بہاری[131]

سرو در فتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگار ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

مرتب "محاسن سجاد" کی مہربانی سے مولوی راغب احسن صاحب سکریٹری کلکتہ مسلم لیگ کا مضمون چھپنے سے قبل حقیر کی نظروں سے گذرا، یہ مرتب کتاب کی انتہائی دیانتداری ہے کہ انہوں نے لائق مضمون نگار کی طراوش فکر کو بلا تخفیف و تقریض[132] اس مجموعۂ مضامین میں جگہ دی، حالانکہ بادی النظر میں "محاسن سجاد" کے ساتھ "معائب و مساوی سجاد" کا پیوند تضاد مقصد معلوم ہوتا ہے، لیکن آج جب کہ ہم آزادی گفتار کا ایک نمونہ ہندوستان میں اور آزادی کردار کا ہولناک منظر یورپ میں دیکھ رہے ہیں تو ایک ایسی بات

---

[130] یہ جناب راغب احسن صاحب کے مضمون کا جواب ہے، مفصل جواب اگلے مضمون میں ملاحظہ فرمائیں، جو ایک کتابچہ کی شکل میں شائع ہوا تھا، اگرچہ پیش نظر عنوان سے اس مفہوم کی وضاحت نہیں، لیکن ہم نے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔

[131] اس شخصیت کی تعیین سے ہم قاصر ہیں کہ یہاں صرف ان کا تخلص ذکر کیا گیا ہے۔

[132] تقریض کے معنی کانٹ چھانٹ کے ہیں۔ (م)

کی اشاعت سے پہلے گریز کرنا جو صحیح یا غلط طور پر ایک جماعت کہہ رہی ہو صداقت سے فروتر ہو گا، اس لئے "محاسن سجاد" کے گوشے میں اس نکتے کا محل نظر ہونا قابل برداشت ہونا چاہیئے، اور ہم ناظرین کتاب سے یہ استدعا کرنا چاہتے ہیں وہ صحیح مطمح نظر سے اس پر غور فرمائیں اور جذبات کو دخل نہ دیں مگر یہ محسوس کرنا بھی فطرتاً جائز ہو گا کہ لائق مضمون نگار نے اس موقع اشاعت کو غنیمت سمجھ کر ایک پُرانے جوش انتقام کو ابھارنے کی ناجائز کوشش کی ہے تاہم وہ بات جو کل کہی جائے گی، کیوں نہ آج کہہ دی جائے اور مسلمانان ہند عموماً اور مسلمانان بہار خصوصاً جس مسئلے پر لازمی طور پر فیصلہ کرنے پر کل مجبور ہوں گے، اس کو آج ہی کیوں نہ چھیڑا جائے، یہی مصلحت عملی مجبور کر سکتی ہے کہ ہم عامۃ المسلمین سے استدعا کریں کہ وہ ٹھنڈے دل سے اس پر غور کرنا شروع کر دیں، وہ وقت یقینی آنے والا ہے جب مسلمانوں کو اس ماضی قریب پر فیصلہ کن رائے دینی ہو گی۔

ایک حصہ تو افکار و اعتراضات کا ایسا ہے، جس کا جواب امارت شرعیہ سے متعلق ہے اور کارکنان نظام مذکور کافی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اس دعوت بے ہنگام کو قبول فرما کر ضیافت طبع کریں۔ اس استدارک کی غرض صرف مغربی سیاست کے اس دلدل سے قارئین کو نکالنا ہے جو فاضل مضمون نگار نے سیلاب الفاظ و ہیجان تخیل و جوش سخن سے پیدا کر دیا ہے۔

حقیقت تو صرف یہ ہے کہ وہ تمام دلیلیں جو امارت شرعیہ یا "سیاست سجاد" کی ناکامی اور مخالفت میں پیش کی جاسکتی ہیں وہ علیٰ حالہ احرار پارٹی، یونائٹیڈ

پارٹی اور مسلم لیگ کے متعلق بھی کہی جاسکتی ہیں، اور شاید موخر الذکر جماعتوں پر مجموعی طور پر زیادہ صادق آئیں گی۔

عامۃ الناس کو تمام واقعات کے مطالعہ کے لئے کچھ اور وقت کا انتظار کرنا ضروری ہے۔ حضرت مولانا سجاد کی زندگی آج ہر کہہ و مہ کے لئے لائق تمحیص و تقلید ہو چکی اور مشیت ایزدی نے اس بوریہ نشیں کی ذات کو اور اس کے حصول زندگی کو اسلامی سرمایہ بنا دیا، جس کے تحفظ و ائتلاف کا حق بلاشبہ قوم کو حاصل ہے، لیکن اگر آپ صرف محاکمہ سخن پر بس کرنا چاہتے ہیں تو ابھی اس وقت کا انتظار کیجئے جبکہ وہ عزیزان ملت و قائدین اعظم و بطل احرار اپنی اپنی زندگیاں قوم کو سونپ کر مشاہدۂ عام و جلوت خاص کی شمعوں کو گل کر چکیں اور قلم کی تراوشیں ان کی ساحر نگاہوں سے مسحور ہونے پائیں، حیات عمل کے معیار کا بازار اسی وقت کھل سکے گا ،فانتظروانی معکم من المنتظرین۔

باقی رہا نفس اصول نظام امارت شرعیہ اور "حریفان امارت" کا طرز مقابلہ تو کیا آج مسلمانان ہند کی کوئی ایسی سیاسی یا مذہبی جماعت بھی ہے جو "نظام امارت شرعیہ" کی بنیادی اینٹوں کو کھود کھود کر خود اپنی امارت کی تعمیر چاہتی ہو؟ آپ سلطنت در سلطنت کے سیاسی تخیل پر ماتم کر سکتے ہیں، مگر خود مسلم لیگ کا پاکستانی تخیل اس (IMPERIUM IN IMPERIO) "سلطنت در سلطنت" سے کچھ زیادہ نہیں ہے اور سرد راتوں کی تاریکی میں خدا کی زمین و آسمان کے وسیع حلقے میں قائد اعظم کا دماغ "اسلامستان فی البرطانیہ" سے آگے نہ جاسکا! اگر اس سردابۂ دل کی تصویر آپ دیکھنا چاہیں تو نواب زادہ لیاقت علی خاں کی آخری تقریر مرکزی اسمبلی میں پڑھ کر فیصلہ کر لیں اور قائد اعظم

کی تشریح پاکستان پر بھی غور کریں! ۔ وہ قوم ”امارت شرعیہ“ کے نظام کے خلاف کیا کہہ سکتی ہے جس کا وجود اس دنیا میں ”حکومت الٰہی“ کے تخیل و تعلیم پر منحصر ہے ؟ آپ تمسک بالقرآن و سنت رسول سے یکسر باز آجائیں اور مدار سیاست ”عقل اجتماعیہ“ ، ”جمہوریت مرکبہ“ کا اعلان کردیں تو پھر کوئی محل مناظرہ باقی نہیں رہ سکتا، نظام سیاست و حکومت کا سوال ایک قوم کی تاریخ کا سوال ہے کسی مضمون نگار کے جوش تحریر کا نہیں۔

مسلمانان ہند بھی مدت مدید تک اس امر پر غور کرتے رہیں گے کہ امارت شرعیہ کا تصور صحیح ہے یا غلط ، لیکن فیصلہ ”امارت شرعیہ“ کے نظام کو محو و منسوخ کرنے کا اگر قوم کبھی بھی دے گی تو وہ دن اس کی مذہبی زندگی کا آخری دن ہوگا جو تاریخ اسلام میں ایک نیا کربلا پیدا کردے گا، آخر حضرت امام حسینؓ بھی تو خلاف جمہور ہی آمادۂ پیکار نظر آئے۔ مسلمانو! ووٹ کے اعتبار سے تو میدان کربلا میں ان کے صرف بہتر ووٹ تھے ،اگر آپ کو شبہ ہو تو علامہ اقبال کی سند حاضر ہے

دشمناں چوں ریگ صحرا لاتعد

دوستانِ او بہ یزداں ہم عدد

پھر اسلامی جمہوریت کا ماتم کرنا کس قدر عبث ہے ،” اکثریت اور جمہوریت“ پر ہمیشہ کے لئے ماتم کر لیجئے۔ نبی امی ﷺ کی بعثت سے لے کر ارتحال سجاد تک اکثریت نے حق کے خلاف بغاوت کی اور تمسک بالقران کا استہزا کیا، هاتو برهانکم، اور اب اس کے بعد آپ فیصلہ کریں کہ ” امارت شرعیہ“ کا نظام جس کو آج فرسودہ اور غلط کہا جا رہا ہے، کامیاب ہوا یا ناکام! ستم

تو یہ ہے کہ جب مسلمان گمراہی میں غیر اسلامی طریقوں پر جا رہے تھے، ان کو چند بوریہ نشیں گداگروں نے جھنجھوڑا، جگایا، اٹھایا، منزل مقصود کی طرف دورایا اور جب وہ منزل کے قریب تر پہنچے تو حوالی منزل کی روشن شعاؤں میں ان کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں اور وہ ہی جگمگی تصویروں اور متحرک شاہانہ جلووں کو دیکھ کر وہ اپنے رہبروں کو بھول گئے اور تقسیم انعامات کے مبہم خطروں سے لرزاں ہو کر سزاولوں، ابر قندازوں اور توپچیوں کو اشارہ کرنے لگے کہ دیکھو یہ ٹکر گدا کہیں ہمارے محلوں میں در نہ آئے کہ "تادر نیائی در نیابی"۔

لیگ والوں نے تراشا ہے بڑے نام کا بت

آپ کہتے ہیں کہ امارت کا نام ہی باقی رہ گیا ہے، نہ گورنمنٹ برطانیہ نے تسلیم کیا، نہ کانگریس نے۔

برادر من ! مسلمانوں کو تو یہی نام کافی ہے ، تسلیم کی حاجت نہیں ، علامہ اقبال کو تو صرف نام ہی کی بقا نے زندہ رہنے پر مجبور کیا تھا۔

ہم تو جیتے ہیں تیرے نام کی عزت کے لئے

اگر امارت کا صرف نام ہی بقول مضمون نگار باقی رہ گیا ہے تو بھی کیا کم ہے۔

کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے ؟

آپ پھلواری شریف تشریف لائیں ،تو دعوت نظر فرمائیں ۔ آج امارت شرعیہ کا دفتر اپنے حلقۂ مبلغین کی سعی و تدبیر سے اس سے زیادہ روح زندگی رکھتا ہے ، جتنا مسلم لیگ یا دوسرے قومی مذہبی ادارے ۔ یہ جسد خالی نہیں جس کو آپ بے جان ڈھانچہ اور بھوت کہہ کر تمسخرانہ طور پر بھلا دیں، اور

پھکڑ الفاظ سے سبک کر دکھائیں۔،یہ ان انجمنوں کے ڈھانچہ پر صحیح اطلاق ہو سکتا ہے جو امارت شرعیہ کے لئے حریفانہ قوت عمل کی تعمیر تھی اور جس کی امارت کو فوقیت بخشنے میں حریفان امارت کی پوری کوشش صرف ہو کر خسران مبین کا اعتراف کر رہی ہیں۔ آج وہ کون صوبائی ادارہ ہے جس کے دفتر میں چراغ بھی روز نہیں جلتا،اس کا فیصلہ خود قوم کرے گی۔ آپ ان تمام غریبوں کے پسینے کی کمائی کی رقموں کو جمع کریں جو قائدین وبطل عظام کی کانفرنسوں اور کمیٹیوں کے جلسوں پر صرف ہوئے اور ''ٹیبلر پیلس'' اور ''دلکشا'' کے تنعمات زندگی اور ''ملیبار ہل'' کی تربیت گاہ کے جاہ وجلال کی قیمتیں اور پھر شفیع منزل کی فقیرانہ رجعت پر یکسر محاسبانہ نظر ڈال کر کامیابی اور ناکامی کا فیصلہ کریں۔ آخر میں اس خالی تودۂ خاک پر جا کر فاتحہ پڑھیں جو پھلواری میں اب تا قیامت محو خواب ہو گیا۔

سخن شناس نہ دلبر خطا ایں جاست

سجاد تو صرف ایک نام کی عظمت کے لئے جیتا تھا،اسوۂ حسنہ اس کا مسلک تھا،اگر وہ زر و مال جہاں پر مرتا تو بت فروشی کے عوض بت شکنی نہ کرتا ،بلا شبہ اس نے قومیت ، مذہبیت ،سیاست ، حریت کے بتوں کو پاش پاش کر دیا ،اور اگر آپ کو حسن تلفظ ہی پسند ہے اور اس صنم کدۂ خیال سے باہر جانا نہیں چاہتے تو یہ تصور کر لیں کہ اس نے کعبۃ اللہ کا ایک بت بنا کر قوم کی پرستش کے لئے پیش کر دیا،اور تقویم پارینہ پر قائد اعظم کی تصویر کو مسجود نگاہ حتی الوسع بننے نہ دیا،یہ فرد جرم صحیح ہے،اور اب یہ مجرم بھی دار و رسن کی طاقتوں سے بلند تر ملائے اعلی پر پہنچ کر ہماری بوالہوسی پر آج بھی افسوس کر رہا ہے۔

بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

آپ شکایت کر سکتے ہیں کہ اس "کعبۃ اللہ" کی از سر نو تعمیر میں اس نے کچھ معمار ایسے بھی رکھے ، جن کا دینی اور قومی وقار مسلّم نہ تھا،تو یہ قصور بہتر مزدور و معمار کا تھا جو حریفانہ جذبات سے متاثر ہو کر تعمیر میں شریک نہ ہوئے اور ایسی گراں اجرت مانگتے رہے کہ جس کو دینا اس تعمیر نو کا قبل از تعمیر انہدام یقینی تھا یا اس کا جس نے تخییلی تعمیر کے لئے اقدام کیا؟،سالکان راہ عمل ہمیشہ تعریف و توہین سے بے نیاز ہوا کرتے ہیں ،یہ منزل تو ان بے کار افراد کی ہے جن کا ذاتی کیسۂ عمل خالی ہوا کرتا ہے اور جو دوسرے صاحب عزیمت انسانوں پر محتسب بن کر بیٹھنا ہی فریضۂ عمل سمجھتے ہیں۔ "امارت الیکشن بورڈ" کے قیام سے لے کر انڈیپنڈنٹ پارٹی کی وزارت تک کے واقعات ابھی بے کم و کاست صفحۂ قرطاس پر نہیں آئے اور حریفان بادہ پیما کی داستان ابھی تک فردوس گوش نہیں بنی ،نہ یہ کوئی موقع ہے کہ ایک نئی جنت نگاہ ترتیب دی جائے، وقت آرہا ہے کہ یہ نئی محفل سجائی جائے ،اس وقت تو صرف آمادۂ نظر کرنا مقصود ہے۔ مفتی اعظم بیت القدس سے لے کر فرنگی محل کے نوجوان صاحبزادے اور وفد تھانہ بھون کی تقریب سیاست بھی قائدین احرار و عزیزان ملت کو سند سیادت و امارت سیاسی نہ بخش سکی،اور تمام مقابلہ ، مناظرہ و مجادلہ ،مباہلہ و مقابلہ کی گرم بازاریاں سرد پڑ گئیں۔ پھر بھی الزام تمیز شخصیت وفضلیت انفرادی قائم ہے،اور ہمیں امید رکھنا چاہئے کہ جب تک انسان کا فرسودہ قلم اختلاف کا لفظ لکھتا رہے گا،اس نظام امارت شرعیہ کی مخالفت ہوتی رہے گی ،اور عدل و تعدیل

کی سکون و خاموش منزل صراط مستقیم و تمسک بالقرآن والرسول کی حد سے دور نہ جائے گی، مؤرخ کا قلم آج تک اورنگ زیب عالمگیرؒ کو کیا کچھ لکھ رہا ہے۔

یہ شکوہ ستم روز گار کیا کہیے

ہمیں اعتراف ہے کہ وزارت یونس منتہائے مقصود نہ تھی بلکہ خار راہ ، مگر ہماری تمام تر موجودہ سیاسی کوششیں اور چیخ و پکار کیا وزارت عزیزی، وزارت شفیعی، وزارت خلیق الزمانی اور مرکزی وزارت نواب زادہ، زیر سایۂ جناح کے لئے نہیں ہیں ؟ فضل الحق کے سائے اور سکندر حیات کی طلب نے کون سا پوشیدہ چشمۂ بقا ڈھونڈھ نکالا ؟

یہ بھی ایک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری
اسلامستان کا تخیل بھی بہت دور ہے
پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلمان کی

اور اس کا مصارف جنگ ہندوستان میں محمد بن قاسمؒ فاتح سندھ اور محمود غزنوی سے لے کر مستقبل ناپیدا کنار تک وسیع ہے ، لیکن اجمیریؒ کی راہ چلنے والے اور اسمٰعیل شہید کے مقلدین اس جنگ زرگری کے سپاہ نہیں ، اگر خوش کامی کوئی دوسری اصطلاح نہیں بتا سکتی اور تہذیب جدید کا پروپاگنڈائی مسلک آپ کو فیملی بزنس ایسوسی ایشن ہی کہنے پر مجبور کرتا ہے تو آپ آگاہ ہو جائیں کہ اسلام نے یہ فیملی بزنس ایسوسی ایشن، کائنات ذات ہی سے بنا رکھا ہے جس کا پہلا ڈائرکٹر ابراہیم بن آذر تھا (علیہ السلام) اور یہ سنگ تراشی کعبۃ اللہ کے خاتم معمار (ﷺ) نے اپنے اوپر ختم کر کے آیت تطہیر کی مہر لگا دی اور

اس صوبہ بہار میں حضرت یحیٰ منیری قدس سرہ اور ان کے خلف اعظم حضرت مخدوم بہار نے پہلا سنگ بنیاد رکھا۔

نعرۂ تکبیر سے جس کے کہستاں ہل گئے
نغمۂ شیریں سے جس کے کفر وایماں مل گئے

اور مبارک ہے ہر وہ ہاتھ جو اس اسلامی بت خانہ (اگر اس کو آپ کہنا پسند کریں ،ورنہ ہم تو صرف خلوت خانہ ہی پر عقیدہ رکھتے ہیں) کی اینٹ پر اینٹ رکھتا جا رہا ہے اور امتداد زمانہ سے پیدا کئے ہوئے درازوں اور فرسودگیوں کو درست کرنے میں اپنی تمام متاع حیات صرف کر دیتا ہے۔

تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو ؟

آپ مُلاکراسی اور خانقاہیت سے گھبرائیں نہیں ، دنیا میں تو یہی ہو رہا ہے ، نئے مُلا نے صرف نئی خانقاہ بنائی ہے اور تمام ترسعی و تلاش حلقۂ مریدان و سلسلۂ جنابانی بیعت ہی تو ہے ، اس حمام میں سبھی ننگے ہیں ، اگر اس میں شبہ ہو تو قائد اعظم سے اس امر پر بیعت کر دیکھئے جس کو وہ نہ چاہیں اور سواد اعظم چاہے۔ کیا آپ نے ایسی مجلسیں بمبئی ، لاہور ، لکھنؤ اور پٹنہ کے بند کمروں میں ۱۹۳۷ء سے گذشتہ ماہ تک نہیں دیکھیں؟ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

عقل حیران ہے کہ کانگریس اور گاندھی کی غلامی کا طعنہ وہ دیتے ہیں جو خود غلامان غلام ہیں ، وہ کون سی آزادی عمل ہے جس کا نمونہ اس نشأۃ جدیدہ میں مسلم لیگ یا کسی دوسرے قابل ذکر قومی ادارے نے دکھلایا ہے ؟ "گاندھی ازم " پر سجادؒ سے بڑھ کر بھی کسی نے لب کشائی اور سخت تنقید کی ہے ؟ اور اس صنم آباد ہند میں جہاں فانی زبان سے نکلے ہوئے فقرے "پاکستان" اور

(TWO NATION THEORY)"دو قومی نظریئے" کی کتاب اللہ سے بھی زیادہ پرستش کی جاتی ہے، جہاں اس وقت مذہبی تحفظ کا سوال ہے نہ اعلائے کلمۃ اللہ کا، جہاں جہاد باللسان کا صحیح مفہوم بھی مفقود ہے اور جہاد بالنفس اور مال کا وہم بھی باقی نہ رہا ہو، جہاں ممبری کے اعداد و شمار پر اور مردم شماری کی غلطیوں پر ہنگامے گرم ہوتے ہیں ، نہ کہ بدر و حنین کی تقلید پر ،اس بت پرست ہندوستان میں ابو المحاسن محمد سجادؒ کے سوا اس دور میں کس نے کانگریس اور مہا سبھائی جمعیتوں کو ببانگ دہل یہ کہا کہ "کس سیاسی تحمل اور رواداری پر مسلمانان ہند اس ملک میں بت پرستی کو برداشت کر رہے ہیں؟" کیا کاغذ کے وہ صفحے محو ہو گئے یا قارئین کی نظروں تک نہیں پہنچے؟ آج بھی اس کو پڑھ کر سکون قلب حاصل کر سکتے ہیں اور اسلامی " حرب سلمی" کا سبق نئے سرے سے پڑھ سکتے ہیں۔ ورنہ ذبیحہ گاؤ کے موقعوں پر بلووں کا شوق ایک طفلانہ تفریح ہو سکتی ہے ،ایک قومی تعمیری اور استقلالی فن نہیں بن سکتا۔

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

فاضل مضمون نگار کا احسان مند ہونا چاہیئے کہ انہوں نے اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے نئے میدان کھول دئے ہیں اور جو فکر و دماغ ابھی تھک کر سکون حاصل کر رہے تھے وہ وقت کی دعوت کو قبول فرمائیں اور لب کشائی کریں۔ مسلک سجادؒ اور نظام امارت شرعیہ یقینی مسلمانوں کی توجہ کے مستحق ہیں، اور یہ آئندہ مورخ اور سیرت نگار کا فرض ہو گا کہ وہ متنازعہ فیہ واقعات اور اور حقائق کو منظر عام پر لا کر مستقبل کے سپرد کر دے۔ "محاسن سجاد" کے محترم مرتب

نے یہ بزم کلمۂ خیر کی ترتیب دی ہے جس کا دامن خیال بہت ہی تنگ ہے اس لئے قلم رک رک کر چلتا رہا کہ مبادا راقم بھی اس گناہ کا مرتکب نہ ہو جائے جس پر استدراک کی لکیریں کھینچی جارہی ہیں۔

انظر الی ما قال ولا تنظر الی من قال۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا[۱۳۳]

---

[۱۳۳] محاسن سجاد، ص ۱۵۱۔

حقیقتِ سجاد

محاسنِ سجاد کے اُس مقالے کا جواب جو مولانا سجادؒ کے خلاف لکھا گیا ہے

از

مولانا سیّد احمد عروج قادریؒ

پیش لفظ

اثر خامہ علاّمہ سیّد مناظر احسن صاحب گیلانیؒ

سابق صدر شعبۂ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی حید آباد دکن

الحمدللّٰہ وکفیٰ والصلوٰۃ والسلام علی عبادہ الذین اصطفی امابعد!

اَمّابعد! ''محاسن سجاد'' نامی کتاب میں شاید یہ پہلا تاریخی واقعہ ہے کہ ایک مستقل مقالہ ''مثالب سجاد'' کے متعلق بھی شریک کر دیا گیا ہے، جو ہمارے کرم فرما مولوی راغب احسن صاحب ایم.اے.کا مرتب کیا ہوا ہے۔ پہلا تاریخی واقعہ میں نے اس کو اردو زبان کی عام سوانح عمریوں کے حساب سے قرار دیا ہے، ورنہ مسلمانوں نے ''رجال'' کے نام سے جس فن کو مدوّن کیا ہے اُس میں تو مشکل ہی سے کوئی ایسا نام نکالا جاسکتا ہے، جس میں صاحبِ ترجمہ کی تعدیل کے ساتھ ساتھ جرح کے الفاظ بھی منقول نہ ہوں۔ غالباً ائمۂ رجال ہی کی اتباع میں کتاب ''محاسن سجاد'' کے مدوّن مولانا مسعود عالم صاحب ندوی نے خلاف دستور عام اِس مقالہ کو اس کتاب کا جزو بنایا ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ علماء اسلام کی ایک ''مردہ سنت'' اِس ذریعہ سے اُردو زبان میں زندہ کی گئی ہے۔ اِس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہر شخص کے سامنے صاحب ترجمہ کے متعلق جو رائیں ان کے معاصرین کی تھیں وہ آجاتی ہیں، بعد کو پھر ''جرح وتعدیل'' میں ترجیح کے جو اصول ائمۂ حدیث ورجال نے مرتّب کیے ہیں ان کی روشنی میں اربابِ بصیرت کسی فیصلہ تک پہنچ سکتے ہیں۔

خود اسی کتاب میں شمسی صاحب کا ایک مضمون بھی شریک کیا گیا ہے،

جس میں راغب صاحب کی جرحوں کا جواب دے کر مولانا سجاد مرحوم کی تعدیل کی کوشش کی گئی ہے، اسی سلسلہ میں ہمارے ہم شیخ وہم مدرسہ مولانا عبیداللہ المرحوم سابق استاذ تفسیر وجامعہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے سعید وبلند طالع صاحبزادے عروج احمد قادری سلمہ اللہ تعالیٰ جن کی اسلامی شکل وصورت اور اسلامی سیرت وروش کو دیکھ کر میرا دل بہت مسرور ہوا ہے، کیوں کہ عصرِ حاضر کے نوجوانوں میں (خواہ وہ اسلامی مدارس سے تعلق رکھتے ہوں یا انگریزی سے) اب اِن اُمور کی کم توقع کی جاتی ہے۔ انھوں نے بھی "راغبی جرح" کے مقابلہ میں "تعدیل" کی کوشش اپنے ایک مضمون میں کی ہے۔ یہ مضمون مجھے دکھایا گیا اور عزیز موصوف نے خواہش کی کہ میں بھی ان کی اِس تعدیلی کوشش کے متعلق کچھ لکھ دوں۔

مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ "جرح وتعدیل" کے اِس ہنگامہ میں کیا لکھوں، تقریباً بیس سال ہوئے کہ جمعیت العلماء صوبہ بہار کے پہلے اِجلاس میں شریک ہونے کے بعد سیاست کے میدان سے باہر نکل گیا اور مسلسل اِس عرصہ میں بجز "شکم پَروری" کے میرا اور کوئی مشغلہ نہیں رہا۔ وطن سے دور انگریزی علاقہ سے باہر دکن میں زندگی گزارتا رہا۔ سیاسیات کے سلسلہ میں جو انقلابی حوادث پیش آتے رہے اُن سے نہ
صرف عملاً بلکہ علماً بھی اگر سچ پوچھئے تو بے تعلق رہا۔

تاہم اِس لیے کہ حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے نہ صرف یہی کہ عقیدت کا تعلق رکھتا تھا، بلکہ ان کی دوسری شادی چوں کہ خان بہادر مولانا عبدالعزیز گیلانی کی صاحبزادی سے گیلانی میں ہوئی تھی، اور

خان بہادر میرے نسبتی بھائی ہیں، اِس لیے مولانا کو بہت قریب سے دیکھنے کا مسلسل موقع ملتا رہا۔ علومِ اسلامیہ اور مغلیہ دَور کے عقلی علوم میں مولانا کو جو دَسترس حاصل تھا، خلاف معمول اس سلسلہ میں ان سے ہمیشہ مرعوب رہا، خصوصاً فقہی جزئیات پر اُن کی وسعت نظری پر ہمیشہ اعتماد کرتا تھا۔ اسی کے ساتھ علاوہ دماغ کے مولانا مرحوم کے سینے میں درد سے بھرا ہوا جو دل تھا اور جس سے کم ہی لوگ واقف ہوں گے اِس باب میں ان کا گویا "محرم اسرار" تھا، یاد آتا ہے کہ گیلانی کی ایک دہقانی صحبت میں مولانا مرحوم مجھ سے میری لکھی نعتیہ نظم، نیاز سن رہے تھے، جب اِس بند پر پہنچا، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے عرض کیا تھا۔

تمری دواَریا کیسے چھوڑوں
تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں
تمری گلی کی دھول بٹوروں
تمرے نگر میں دم بھی توڑوں

تو خلافِ دستور مولانا پر حال طاری تھا، آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہتا چلا جاتا تھا، روکنا چاہتے تھے، لیکن

تراصبا ومرا آبِ دیدہ شد غماز

آب دیدہ ان کی غمازی سے باز نہیں آرہے تھے، میرا دل کہہ رہا تھا

ایحسب الصب أن الحب منکتم
ما بین منسجم منه ومضطرم

گزشتہ سال گرمیوں کے اِن ہی مہینوں میں تقریباً ایک ہفتہ رات دن ایک ہی کمرہ میں مولانا کا ساتھ رہا، خلوت کی ان صحبتوں میں کبھی کبھی ان کے

سینے کے داغ نمایاں ہوتے تھے، روتے تھے اور رُلاتے تھے، فالحمدللہ کہ قیس
نے نجد کی وادی کا جو سفر شروع کیا تھا وہ پورا ہوا۔

صد شکر کہ جنازہ بمنزل رسید

”ما تقول في هذاالرجل“ کے برزخی سوال کے جواب کے
حل میں جو تقریباً ساٹھ سال تک مصروف رہا، ان شاءاللہ تعالیٰ وہ اس کے جواب
میں کامیاب ہوا، وہ کیا تھا، کیا کرتا تھا، کس لیے کرتا تھا، اب دنیا والے ان
سوالات کے جواب میں الجھیں، وہ تو اپنے سوال کے جواب کو حل کر کے جہاں
جانے کے لیے پیدا ہوا تھا، پہنچ گیا۔

باقی رہا مولانا راغب صاحب کا یہ الزام کہ وہ ملاّ شاہی حکومت قائم
کرنے کی فکر میں تھے، اس کے متعلق اِتنا ضرور عرض کر سکتا ہوں کہ اس سے
ان کی کیا غرض ہے؟ مطلب یہ ہے کہ اصطلاحاً جو لوگ مسلمانوں میں ”ملا“
کے نام سے موسوم ہیں، اور شیخ و سیّد پٹھان یا دوسرے خاندانوں کے مسلمانوں
میں سے جو بھی قرآن و حدیث و فقہ کا عالم ہو، اُسے ملاّ کہتے ہیں، مولانا سجاد
صاحب کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے یہی ملاّ براہِ راست مالک
ہو جائیں، اور غیر ملاؤں کو رعایا بنا کر رکھا جائے، تو میرے خیال میں مولانا پر یہ
اتہام ہے، اور اگر یہ مطلب ہے کہ وہ ایک ایسی حکومت کے قیام کے خواہاں
تھے جو اسلامی قانون کی روشنی میں چلائی جائے، تو بتایا جائے کہ مسلمانوں کی ایسی
کون سی جماعت ہے جو اس مقصد کو غلط مقصد قرار دے سکتی ہے، بلکہ جہاں
تک میں جانتا ہوں ”پاکستان“ کے نام سے اسی نصب العین کو پیش کر کے
مسلمانوں کی سیاست کی تنظیم کا ارادہ کیا جا رہا ہے۔ فرق اگر کچھ ہو سکتا ہے تو یہی

کہ مسلمانوں کی جن صوبوں میں اکثریت ہے ان ہی کی حد تک اِس نظام کو
محدود رکھا جائے، یا اکثریت والے صوبے ہوں یا اقلیت والے مسلمان جہاں
کہیں بھی ہوں، حتی الوسع ان کے لیے اسلامی اصول کے تحت زندگی گزارنے کا
موقع فراہم کیا جائے۔ جہاں تک میرا خیال ہے مولانا سجاد مرحوم آخرالذکر
نظریہ کے نہ صرف قائل بلکہ اپنی استطاعت کی حد تک عملاً اسی کی جدوجہد میں
مصروف تھے اور اِسی خیال کے زیراثر انہوں نے بہار کے صوبہ میں امارت
شرعیہ کا نظام قائم کیا تھا، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ دونوں مخالف پارٹیوں میں
آخر نقطۂ اختلاف کیا ہے؟ آخر یہ مولانا کا کیا قصور تھا کہ جس چیز کو لوگ اکثریت
کے صوبوں میں قائم کرنا چاہتے ہیں مولانا علاوہ اکثریت کے اقلیت کے صوبوں
میں اسی کو مروّج کرنا چاہتے تھے۔

آخر میں ان لوگوں سے نہیں جو سرے سے مذہب کے مخالف ہیں اور
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمانوں کا جو ایمانی ربط ہے اس کو منقطع
کرنے کی فکر میں ہیں، بلکہ ان بزرگوں سے جو بہر حال آں حضرت صلی اللہ علیہ
وسلم کی امت بن کر جینا چاہتے ہیں اور اسی حال میں مرنا چاہتے ہیں، جن میں
مولانا راغب احسن صاحب کو بھی میں شریک سمجھتا ہوں ان سے سوال ہے کہ
اطباء یونانی کی مخالفت کے بعد کیا طب یونانی زندہ رہ سکتی ہے اور لوگ طب یونانی
کے زیر اثر علاج و معالجہ جاری رکھ سکتے ہیں، پھر آج ملاّ ازم کے خلاف جو تحریک
اٹھائی گئی ہے کیا بالآخر یہی تحریک اسلام زم کی مخالف نہ بن جائے گی، ”ملاّ“ کسی
خاص نسل، کسی خاص ملک، کسی خاص رنگ کے لوگوں کا نام نہیں ہے، بلکہ ہر وہ
شخص جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب اور آپ کے ملفوظات

وحالات، نیز ان کے قانونی وغیر فانی نتائج کے پڑھنے پڑھانے اور غور وفکر میں زندگی گزارتا ہے، اسی کو ملاّ یا صوفی کہتے ہیں۔ محض اس جرم میں کہ اس نے مسلمانوں کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے علوم کو حاصل کیا ہے کشتنی وگردن زدنی قرار دینا، کیا اس کی کشتنی وگردن زدنی کا فتویٰ ہے، یا اس علم کا جس کو حاصل کرکے وہ اس فتویٰ کا مستحق قرار پایا ہے۔ مسلمانوں کی بقا کی کوشش اور اسلام کے فنا کی جدوجہد کیا دونوں باتیں جمع ہوسکتی ہیں۔ اسلام علم وعمل کے ایک دستور کا نام ہے۔ اس دستور کے ماننے والے جب مٹ جائیں گے تو اسلام کیا باقی رہ سکتا ہے، اور اسلام جب باقی نہ رہے گا تو مسلمان کیسے باقی رہ سکتے ہیں؟

فاعتبروا یا أولی الأبصار!
سلام اللہ یا کر اللیالي
علیٰ ملک المکارم والمعالي

عرض مؤلف

"محاسن سجاد" مئی کے پہلے یا دوسرے عشرے میں پریس سے باہر آئی۔ اِس مجموعے کو مولانا سجاد کے جس ہمدرد نے پڑھا اُسے اس کا ایک مضمون عجیب وغریب سا نظر آیا۔ "گلدستے میں کانٹا"، "مخمل میں ٹاٹ کا پیوند"۔

مولانا سجاد رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں نے جو آج خود بھی سیکڑوں شاگردوں کے استاذ ہیں، احباب نے جن میں سے بعض نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام عالم اسلامی میں علم وثقاہت کا ممتاز درجہ رکھتے ہیں اور رفقائے کار نے جو برسوں مولانا کے ساتھ رہ کر کام کر چکے ہیں۔ مولانا کی زندگی کے متعلق مضامین لکھے ہیں اور سب اس پر متفق ہیں کہ مولانا سجاد زندگی بھر مسلمانوں کی بھلائی اور اسلام کی سربلندی کے لیے جہاد کرتے رہے اور اسی جہد وعمل میں انھوں نے اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کی۔ لیکن ایک ایسے صاحبِ علم نے جنھوں نے مولانا سجاد کو اپنی زندگی میں صرف ایک بار دیکھا تھا، اپنے مضمون میں یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ ان کی زندگی ناکامیابی پر ختم ہوئی اور وہ ملک وملت دونوں کے لیے کھوگئے۔

تفو بَر تو اے چرخِ گردوں تفو!

مجھے یہ بات صاف کردینی چاہیے کہ میں نے مسٹر راغب احسن صاحب ام-اے کے مقالے کا جواب کسی بری نیت سے نہیں لکھا ہے، میرا مقصود صرف یہ ہے کہ حقیقتوں کو ظاہر کردیا جائے اور مولانا پر لگائے ہوئے الزامات کی چھان بین کی جائے، اگر کوئی ایک حقیقت بھی مسٹر راغب احسن

صاحب کی سمجھ میں آگئی تو میں سمجھوں گا کہ محنت کا پھل مجھے اسی دنیا میں مل گیا۔

علاّمہ سیّد مناظر احسن صاحب گیلانی مدظلہ کے لیے میں اپنے دل میں ایک ایسا جذبۂ تشکر پاتا ہوں جو الفاظ میں نہیں سما سکتا، انھوں نے اپنا کام چھوڑ کر بڑی خندہ پیشانی اور انتہائی بزرگانہ شفقتوں سے نہ صرف یہ کہ میرے مضمون کو پڑھنے کی زحمت گوارا فرمائی بلکہ میری درخواست پر حقیقت سجاد کے لیے اپنے سحر نگار قلم سے ایک بیش قیمت "پیش لفظ" بھی عنایت فرمایا۔ طباعت کے سلسلے میں خاص طور پر مجھے اپنے مخلص دوست حکیم عبدالاحد صاحب شرف الدین پوری فاضل الطب والجراحت گولڈ مڈلسٹ کا شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے مشوروں سے مدد پہنچائی بلکہ کاپیاں اور پروف دیکھنے کا اہم کام بھی انجام دیا۔ پٹنہ میں برقی مشین پریس ہی اردو کا سب سے اچھا پریس ہے، میں جناب مولوی امیر الحسن صاحب منیجر برقی مشین پریس کا بھی بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے ہر قسم کی امداد دی۔ آخر میں یہ تذکرہ بھی نامناسب نہیں کہ مجھے جواب لکھنے کے لیے جن مآخذ کی ضرورت تھی اگر وہ اخی معظم مولانا سیّد محمد صاحب امجھری کے ذاتی کتب خانے میں نہ ملتے تو جواب میں بہت دیر ہو جاتی۔ یہ جواب مئی کے آخر عشرہ میں تیار ہو گیا تھا، لیکن چند وجوہ سے جلد سے جلد شائع نہ ہو سکا۔ اس خدا سے جو مقلب القلوب ہے یہ دعا ہے کہ وہ ہمارے دلوں کو پاک وصاف کرے اور ہمیں توفیق خیر عنایت فرمائے۔

آمین!

سیّد احمد عروج قادری امجھری[۱۳۴]

۱۷/جون ۱۹۴۱ء آستانہ امجھر شریف۔ ضلع گیا۔

---

[۱۳۴] مولانا سید عروج احمد بن عبید اللہ قادری امجھری، ممتاز عالم، اور مشہور مصنف وصاحب قلم ہیں، مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ میں تعلیم کی تکمیل کی، جہاں ان کے والد مولانا عبید اللہ قادری امجھری مدرس تھے، جماعت اسلامی سے بڑا گہرا تعلق تھا اور اس کے ایک اہم رسالہ ماہنامہ "نقوش" دہلی کے ایک طویل عرصہ تک مدیر رہے۔ ۱۹۶۱ء میں اس کی ادارت سنبھالی اور اپنی وفات ۱۷/مئی ۱۹۸۶ء تک اسی خدمت میں مشغول رہے، اس دوران ہزاروں مقالات ان کے قلم سے نکلے، جن میں بہت سے بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ آبائی وطن امجھر ضلع اورنگ آباد (سابق ضلع گیا) تھا، جہاں کے مشہور قادری خانوادہ سے ان کا تعلق تھا، جس کا سلسلہ حضرت سیدنا محمد قادری امجھری کے واسطہ سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی تک پہنچتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجاہد جلیل مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمہ اللہ نہ صرف صوبۂ بہار بلکہ سارے ہندوستان کے اُن چند مجاہدین میں تھے، جنھوں نے پوری للّٰہیت اور خلوص کے ساتھ اپنی زندگیاں ملک وملّت کے لیے وقف کر دیں۔ مولانا سجاد اُس دن سے جب وہ اِس میدان میں اُترے، اپنی زندگی کی آخری سانس تک ایک کبھی نہ رُکنے والی مشین کی طرح متحرک رہے۔ اُن کے دبلے پتلے جسم میں خدا نے عزم ویقین اور ایمان وعمل کی ایک ایسی برقی رَو دوڑا دی تھی جس نے انھیں زندگی بھر دین ووطن کی بھلائی کے لیے بے چین رکھا۔ میں بچپن سے مولانا سجاد کو جانتا پہچانتا ہوں۔ میں نے اُس وقت بھی ان کو دیکھا جب عہد طفلی کی بے شعور لیکن متجسس زندگی گزار رہا تھا۔ میں نے اس وقت بھی ان کو دیکھا جب نوجوانی کی ترنگ میں تعلیمی زندگی بسر کر رہا تھا اور جب ہر نوجوان طالب علم معمولی سے معمولی بات پر اعتراض کرنا اپنا پیدائشی حق تصور کرتا ہے۔ میں نے اس وقت بھی اُن کو دیکھا جب تعلیم ختم کر کے اپنے عربی کالج سے نکلا تھا اور فاضل کی ممتاز وپر فخر سند میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے اس وقت بھی ان کو دیکھا جب ان کے سامنے لوگوں کی عقیدت مندانہ نگاہیں جھکی رہتی تھیں اور اس وقت بھی دیکھا جب ایک ہیجانی وبحرانی تحریک کے زیر اثر ان پر سب وشتم کے تیر برس رہے تھے۔ میں نے ان کو عقیدت کی نظر سے بھی دیکھا اور ایک غیر جانبدار کی نگاہ تنقید سے بھی۔ آج ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ مجھے نہ تو کوئی خوشامد اظہار حق سے روک سکتی ہے اور نہ کوئی مروّت، میں اپنی روح کی پوری ایمان دارانہ صلاحیتوں کے ساتھ اِس کا اقرار واعلان کرتا ہوں کہ وہ میری

نظروں میں ہمیشہ دین ومذہب کے ایک بے ریا خادم ثابت ہوئے۔ وہ نبی نہ تھے، معصوم عن الخطانہ تھے لیکن اتنا تو یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ مرتے دم تک اپنی زندگی کے حقیقی نصب العین سے پیچھے نہ ہٹے، عہد حاصر کے اِس مرد حُر کے متعلق جتنا بھی لکھا جائے کم ہے اور اس کی زندگی کے خط وخال جتنے زیادہ اُجاگر کیے جائیں تھوڑے ہیں۔

میرے مکرم ومحترم بھائی مولانا مسعود عالم ندوی مدظلہ اہل ہند کی طرف سے عموماً اور اہل بہار کی طرف سے خصوصاً شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ”محاسن سجاد“ کے نام سے چند مضامین کا خوبصورت مجموعہ شائع فرما کر مولاناؒ کا حق ادا کرنے میں اوّلین درجہ حاصل کیا۔ جب ”محاسن سجاد“ میرے پاس پہنچی تو میں اس وقت تک دوسرا کوئی کام نہ کر سکا جب تک میں نے شروع سے لے کر آخر تک اس کو ختم نہ کر لیا۔ اِس مجموعے میں مسٹر راغب احسن صاحب ایم.اے کا طویل مقالہ پڑھ کر مجھے حیرت ہوگئی۔ مسلمانوں کے اس مجاہد جلیل کی آخری زندگی اور امارت شرعیہ کو انھوں نے جس گمراہ کن طریقے پر پیش کیا ہے وہ حد درجہ مہمل، لغو اور انتہائی شر انگیز ہے۔ اس وقت تک زندگی میں ایک بار مسٹر راغب احسن کی زیارت کا مجھے شرف حاصل ہوا ہے۔ زمانہ وہ تھا کہ سر علی امام مرحوم کے انتقال کے بعد ان کی یادگار (میموریل) قائم کرنے کی تحریک پٹنہ میں گشت لگا رہی تھی اور مسٹر راغب احسن صاحب دفتر اخبار اتحاد میں (بحیثیت مدیر اخبار) تشریف فرما تھے، میں نے سَر علی پہ ایک طویل نظم لکھی تھی جو جریدہ امارت پھلواری میں چھپی تھی۔ راقم بھی سر علی امام میموریل کے حامیوں میں تھا اور اسی سلسلے میں ان کی زیارت

ہوئی تھی۔ جب میں نے ان کا یہ مقالہ پڑھا تو معاً دماغ نے اُن کی وہ تصویر پیش کر دی جو عرصہ ہوا، اس میں چھپی تھی۔ راغب احسن صاحب کے طویل مقالے کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ حصّہ ہے جو تضاد، تناقض اور تصادم کا عجیب وغریب مرقع ہے۔ اور دوسرا وہ جس میں حق وحقانیت کو ناواقفیت کی وجہ سے یا جان بوجھ کر الفاظ کے طلسم میں چھپانے کی بدترین کوشش صرف کی گئی ہے۔ آئندہ میں ان کے مقالے پر انھیں دو حیثیتوں سے روشنی ڈالوں گا۔

میں نے اُن کے مقالے کے دوسرے حصّے کی صرف مرکزی بحثوں کی تفصیل و تحقیق کی ہے۔ اگرچہ بہت سی جزئی باتوں پر بھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن اُن پر خامہ فرسائی کرنا وقت برباد کرنے کے مرادف ہے۔

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کیا تھے؟

اِس عنوان پر میں اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھوں گا، وہ میرے نزدیک کیا تھے، اِس کی طرف ایک جزوی اشارہ تمہید میں کر چکا ہوں۔ اگر موقع ملا تو کسی دوسرے مضمون میں مولانا کے متعلق اپنے جذبات ومحسوسات کو تفصیل سے پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہاں تو یہ دکھانا ہے کہ مسٹر راغب احسن صاحب ایم. اے جنرل سکریٹری کلکتہ ضلع مسلم لیگ کے خیال میں مولاناؒ کی ذاتِ گرامی میں کیا کیا خوبیاں مجتمع تھیں۔

راغب صاحب کے اعترافات:

راغب احسن صاحب اپنے مقالے کی تمہیدی سطور میں رقم طراز ہیں:

''یہ میری بدقسمتی تھی کہ سیاسی شعور کو پہنچنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو اکثر سیاسی میدان میں مولانا کے خلاف ہی پایا۔ اور پوری قوت اور کامل دیانت کے ساتھ اُن کی بعض ہنگامی پالیسیوں کی مخالفت کی، تاہم مجھے اقرار ہے کہ مولانا سجاد صاحب کی قابلیت وصلاحیت، سیاست دانی وسیاست کاری اور مسلمانوں کی تنظیم وتقویت کے لیے حقیقی تڑپ کا برابر معترف رہا۔''[135]

عمل:

''اسی اجلاس گیا کے موقع پر مجھے مولانا مرحوم کی تقریر سننے کا پہلا موقع ملا تھا اور یہ محسوس ہوا تھا کہ وہ صاحب بیان نہیں، صاحب عمل بزرگ تھے۔'' (ص:۱۰۴)

منتظم، معمار، خلاق اور آرٹسٹ:

"مولانا سجاد نہ صرف ایک بڑی تنظیمی صلاحیت رکھنے والے بزرگ تھے، بلکہ جدید خیالات وافکار رکھنے والے ایک معمار اور خلاق بھی تھے۔ وہ صرف منتظم اور مدبر نہ تھے بلکہ مفکر، مجتہد اور آرٹسٹ بھی تھے۔''(ص:۱۰۴)

پیروئ سنت:

''لیکن اِس سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ رسوم زمانہ کے خلاف لیکن سنتِ نبوی کی رہبری میں رئیس اعظم گیا کی بہو کو

[135] محاسن سجاد ص:۱۰۱۔

ایک دوسرے صوبے کے مسلمان کے ساتھ عقد ثانی پر آمادہ
کرکے اور تمام مخالفتوں کے باوجود اپنی حمایت عملی سے اس کو
انجام دلاکر مولانا نے اپنی بے نظیر سیاست کاری اور اقدامی
صلاحیت کا ثبوت دیا تھا۔“ (ص:۱۰۶)

قبول حق:

”لیکن یہ مولانا کی عظمت کا اصلی ثبوت ہے کہ جب اُن کے
اس عدم رواداری اور غلو کی غلطی معلوم ہوگئی اور جنگِ عظیم
کے بعد دنیائے اسلام کی عام بربادی کی مصیبت عظمیٰ نازل ہوئی
اور عام اتحادِ اسلامی کی سخت ترین ضرورت کا احساس ہوا اور
تحریک خلاف نے ملک وملّت کا نقشہ منقلب کردیا تو مولانا سجاد
کے ترقی پذیر، فطین وذہین دماغ نے فوراً اصلاح قبول کرلیا۔ وہ
ایک پکے پان اسلامسٹ ہوگئے اور قومیات کے میدان میں
آکر ایسے بدل گئے کہ اُن کا پہچاننا مشکل ہوگیا۔“
(ص:۱۰۶۔۱۰۷)

مولانا مرحوم کی خصوصیات:

”مولانا سجاد جدید اسلامی ہند کی صفِ اوّل کے رجال دین
وسیاست میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ وہ اُن چند واقعی لائق ترین
سیاسین میں تھے جن کو تحریکِ خلافت نے پردۂ گم نامی سے
اُبھار کر ہندوستانی سیاست کے صف اوّل میں کھڑا کیا تھا۔ پھر وہ
تحریکِ خلافت کے رہنماؤں میں اپنی اصابت رائے، سیاست

دانی، معاملہ فہمی، نکتہ رسی، ذہانت، عملی صلاحیت، تنظیمی طاقت،
کاردانی، کارپردازی، عزم واستقلال کے ساتھ ایک نصب العین
کے لیے مسلسل یکسوئی سے محنت کرنے کی قابلیت، حالات
وضروریات کے مطابق زمانہ کے ساتھ چلنے اور ساتھ دینے کی
اہلیت اور مقاصد کے لیے معیار واصول سے فروتر لوگوں اور
چیزوں سے مصالحت کرلینے کی قوت کے لیے ممتاز تھے۔“
(ص:۱۰۸)

مولانا کا آئیڈیل:

”مولانا سجاد اسلامی سیاسیات، اسلام کے اصول شریعت واصول
قانون ودستور، اسلام کے اصول سلطنت وعدالت، اسلام کے
اصول تعلقات بین الاقوامی اور اسلام کے نظام اقتصادیات
ومعاشیات کو تمام مغربی ومشرقی نظاموں سے بہتر اور بالاتر مانتے
تھے اور اپنے بیانات وتحریرات میں یہ واضح کرچکے تھے کہ وہ
ان کو اپنا آئیڈیل یقین کرتے تھے اور ساری دنیا کے لیے ان کو
رہنما مانتے تھے۔ وہ انگریز کے عطا کردہ اصلاحات اور مجالس
آئین ساز کو ناقص قرار دیتے تھے لیکن مولانا صرف خیالی مفکر
اور آئیڈلسٹ نہیں تھے وہ اپنے نصب العین اور آئیڈیل کو عملاً
حاصل کرنے کے لیے موجودہ حقیقت (Realily) کے
ساتھ مصالحت کرنا جائز رکھتے تھے۔“ (ص:۱۱۲)

لیگ سے ہمدردی:

"حقیقت میں مولانا دل سے لیگ کے موجودہ اصول و دعاوی اور مقاصد سے ہمدردی رکھتے تھے بلکہ اُن کے وضع کرنے میں نمایاں حصّہ لے چکے تھے۔"

(ص:۱۱۸)

"غالباً جمعیۃ علماء کی پارٹی پالیٹکس یعنی مولانا حسین احمد صاحب صدر جمعیۃ علماء کا غلو اور ضد اُن کو اس حقیقت کے اعلانیہ اعتراف سے روکتی رہی ورنہ یہ تو ظاہر ہے کہ ساری جمعیۃ علماء کے اندر مولانا سجاد ہی مسلم لیگ سے سب سے زیادہ قریب تھے۔" (ص:۱۴۸)

ایک اور خصوصیت:

"مولانا مرحوم جس بات کا عزم کر لیتے تھے اور جو بات اُن کے ذہن میں جم جاتی تھی خواہ وہ صحیح ہو یا غلط اس کے لیے اپنے غیر معمولی دماغ اور جسم کی ساری قوتوں کے ساتھ وقف ہو جاتے تھے۔ مولانا کبھی شکست قبول نہیں کرتے تھے اور کبھی شکست کو معاف بھی نہیں کرتے تھے۔ (ص:۱۱۱)

مولانا کی زندگی کا حقیقی نصب العین:

"مولانا سجاد کی زندگی کا گلوب اپنے دورِ حیات میں جس محور پر گھومتا رہا وہ اسلامی مرکزیت کی فکر اور اس کی پیدائش کے لیے تعمیری جدوجہد کا محور تھا۔" (ص:۱۲۵)

"لیکن ان شاء اللہ اب پوری ملت اسلامیہ ہند جن میں مولانا سجاد کے تربیت دادہ بہت سے پیش پیش ہوں گے۔ ہندوستان

میں ایک آزاد مستقل اسلامی مرکزیت کو قائم کرنے اور مولانا مرحوم کے حقیقی نصب العین کو حاصل کرنے کی جدوجہد میں کامیاب ہوگی، لامرکزیت دور ہوگی۔ مولانا کا خواب تقدیر الٰہی کے مطابق پورا ہوگا اور ہندوستان ایک اسلامستان بن کر رہے گا۔ کیوں کہ جیسا کہ مولانا کا اصلی عقیدہ تھا، اِس ملک کی نجات نہ تو پراچین بھارت کے دھرم راشٹریا میں ہے اور نہ "نوین بھارت" کی گاندھیت اور رام راجیہ میں ہے اور نہ افرنگی سیاست کی پارلیمنٹری جمہوریت یا اشتراکیت، نازیت وفسطائیت میں ہے بلکہ اس کی حقیقی حریت صرف سلطنت اسلامی کی تعمیر اور نظام تمدن اسلامی کی تاسیس میں ہے۔"

(ص:۱۴۹)

مولانا سجاد کیا تھے، وہ کیا چاہتے تھے، اُن کا حقیقی نصب العین کیا تھا، اور ان کی ذات میں کون سی خوبیاں جمع ہوگئی تھیں، ان کا بیان خود راغب صاحب کی زبانِ قلم سے پیش کر دیا گیا۔ اگر ان تمام تفصیلات کو مختصر الفاظ میں سمیٹا جائے تو یوں لکھا جائے گا کہ راغب صاحب زوردار الفاظ میں مندرجۂ ذیل حقیقتوں کے معترف ہیں:

۱۔ مولانا سجاد قابل ذی صلاحیت، سیاست داں، سیاست کار، اور مسلمانوں کی تنظیم و تقویت کے لیے حقیقی تڑپ رکھنے والے بزرگ تھے۔

۲۔ وہ صاحبِ عمل اور عملی انسان تھے۔

۳۔ وہ بڑے منتظم، مدبر، مفکر، مجتہد اور آرٹسٹ تھے۔

۴۔ وہ پیروی سنت کا نہ صرف جذبہ رکھتے تھے بلکہ انھوں نے اس کا زبردست عملی ثبوت بھی پیش کیا تھا۔

۵۔ وہ حق و حقانیت کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور حق بات کو قبول کرنے میں جھجکتے نہ تھے۔

۶۔ وہ جدید اسلامی ہند کی صفِ اوّل کے رجال دین وسیاست میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔

۷۔ وہ مقاصد کے لیے معیار واصول سے فروتر لوگوں اور چیزوں سے مصالحت کرلیتے تھے۔

۸۔ زندگی کے تمام شعبوں میں وہ اسلامی اصول کو تمام دنیا کے اصولوں سے بہتر اور بالاتر مانتے تھے۔

۱۰۔ وہ شکست قبول نہیں کرتے تھے۔

۱۱۔ مولانا دِل سے لیگ کے اصول ودعاوی اور مقاصد کے ہمدرد تھے۔
وہ جمعیۃ علماء میں سب سے زیادہ مسلم لیگ سے قریب تھے۔

۱۲۔ مولانا کا محور حیات اسلامی مرکزیت کی پیدائش کے لیے تعمیری جدوجہد تھا۔

۱۳۔ مولانا کی زندگی کا حقیقی نصب العین ہندوستان میں اسلامی حکومت کا قیام تھا۔

۱۴۔ مولانا صرف خیالی مفکر اور آئیڈیالسٹ نہیں تھے۔

مسٹر راغب احسن صاحب مولانا اور مولانا کی زندگی کے متعلق اِن ”چودہ نکات“ کو پورے زور وشور کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں لیکن میں انگشت بدنداں رہ جاتا ہوں جب یہ دیکھتا ہوں کہ ان حقیقتوں کے اعتراف کے ساتھ ہی ساتھ وہ ایسی باتیں بھی لکھتے جاتے ہیں جو تسلیم کردہ نکات کے بالکل خلاف ہوتی ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں کی تنظیم وتقویت کے لیے حقیقی تڑپ رکھنے والے بزرگ کی آخری زندگی پر جس منتقمانہ اور معاندانہ انداز میں تنقید کی ہے خود ان کے اپنے الفاظ اس کی تکذیب وتردید کررہے ہیں، میں یہاں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے اندرونی بحران کے زیر اثر کس قدر بھونڈے تضاد واختلاف میں مبتلا ہوگئے ہیں۔

اِن نکتوں میں سب سے زیادہ دلچسپ گیارہواں نکتہ ہے۔ خصوصیت کے ساتھ بہار مسلم لیگ کے عوام وخواص کی خلوتوں اور جلوتوں میں مولانا کی ذات پر سب وشتم، کذب وافترا اور بیہودہ الزامات کے جو بے شمار تیر برسائے گئے اس کی وجہ صرف یہی بتائی گئی کہ وہ پکے کانگریسی تھے، ہندو پرست تھے، کافر دوست تھے۔ اس سلسلے میں نہ صرف ان کے اعمال پر نہ صرف ان کی نیت پر، نہ صرف ان کے دلی عقیدے پر بلکہ حد یہ ہے کہ ان کے دین وایمان پر ایسے رکیک اور بازاری حملے کیے گئے جس سے انسانیت وشرافت کا دامن تار تار ہوگیا۔ لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ ان کے مرنے کے بعد بہار ہی کا ایک مسلم لیگی سپوت یہ دعویٰ کرے گا کہ مولانا دِل سے لیگ کے ہمدرد تھے اور جمعیۃ علماء میں وہ سب سے زیادہ لیگ کے قریب تھے۔ لیکن جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ دیکھنا یہ

ہے کہ مسٹر راغب اپنے اس دعویٰ پر ٹھہرتے بھی ہیں یا خود ان کے الفاظ اس کی تردید کرتے ہیں۔

"اگر وہ اسی پر بس کرتے تو بھی غنیمت تھا لیکن انھوں نے امارت کو کانگریسی جمعیۃ علماء کی کانگریسی سیاست کا کھلونا بنادیا اور مسلمانوں کی سیاست اور مفاد ملی کے مخالفین کا ایک ہتھکنڈا بنادیا" (ص:۱۲۲)

"اگر یہ حضرات یہیں تک بس کرتے تو بھی غنیمت ہوتا لیکن انھوں نے اس سے آگے اقدام کیا، عام مسلمانوں کی تنظیم وتحریک سے علاحدگی اختیار کرنے کے بعد انھوں نے جمعیۃ علماء کی لیڈری میں مسلمانوں کو جمع کرنے، عام مسلمانوں کی جمہوری تنظیم کی مخالفت کرنے اور سب کو کانگریسی سیاست کے تابع بنانے کی جدوجہد بھی شروع کردی، گویا وہ مسلمانوں میں قومیت متحدہ کے مذہب جدید کے ایجنٹ ہیں"۔ (چند سطروں کے بعد)

"اور مولانا سجاد کا آخری مضمون جو اخباروں میں شائع ہوا وہ کانگریسی تحریک ستیہ گرہ کی تائید میں شائع ہوا، حالاں کہ مسلمان اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ کانگریسی تحریک مسلمانانِ ہند کے وجود اور استقلال کو مٹانے کے لئے جاری کی گئی ہے۔"(ص:۱۲۴)

یعنی بیک وقت مولانا دل سے لیگ کے ہمدرد بھی تھے، وہ جمعیۃ علماء میں سب سے زیادہ لیگ کے قریب بھی تھے، لیگ کے پکے دشمنوں کے گروہ میں بھی شامل تھے، لیگ کے مٹانے کی جدوجہد میں بھی شریک تھے اور ان کی زندگی کا آخری مضمون اس تحریک کی تائید میں شائع ہوا تھا جو نہ صرف لیگ کو مٹانے کے لیے بلکہ سارے مسلمانانِ ہند کے وجودِ استقلال کو مٹانے کے لیے جاری کی گئی ہے۔ تضاد بیان کا یہ شاہ کار اِس لائق ہے کہ اس کو سونے اور چاندی کے پانی سے لکھ کر سنہرے چوکھٹے میں سجاکر دہلی کے گورنمنٹ ہاؤس میں آویزاں کیا جائے۔ اپنے طویل مقالے کے صفحہ ۱۴۷ اور صفحہ ۱۴۸[۱۳۶] میں مسٹر راغب احسن نے اپنی پارٹی کے ایک ممبر مولانا قمرالدین صاحب قمر کی ضعیف روایت کے واسطے سے یہ اچھوتا انکشاف فرمایا ہے کہ مولانا سجاد اپنی پرائیوٹ مجلس میں پاکستان کی تائید فرماتے تھے۔ ان کا اعتراض صرف یہ تھا کہ یہ قبل از وقت پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اس حقیقت کے علانیہ اعتراف نہ کرنے کی وجہ راغب صاحب ظن غالب کے ساتھ یہ بتاتے ہیں کہ مولانا حسین احمد صاحب کی ضد اور غلو نے نیز جمعیۃ علماء کی نظامت نے ان کو اِس اعتراف سے مرتے دم تک روکے رکھا۔ اس سے قطع نظر کہ مولانا نے پاکستان کی مخالفت میں ایک مدلل اور اہم مضمون لکھا تھا جو اخبارات میں چھپ چکا ہے۔ یہاں صرف یہ دیکھنا ہے کہ راغب صاحب پہلے یہ تسلیم کرچکے ہیں کہ مولانا میں نہ صرف یہ کہ قبول حق کی صلاحیت تھی بلکہ وہ حق کا اعتراف بھی کرتے تھے۔ وہ یہ بھی مان چکے ہیں کہ مولانا سجاد ہندوستان کے صفِ اوّل کے لائق ترین سیاسی انسان تھے۔ وہ اس کا

[۱۳۶] پیش نظر اشاعت میں صفحات تبدیل ہو چکے ہیں، فہرست سے مراجعت کی جائے۔

اعتراف بھی کر چکے ہیں کہ مولانا کے ذہن میں جو بات جم جاتی تھی وہ اس کو کامیاب بنانے کے پیچھے لگ جاتے تھے۔ وہ شکست قبول نہیں کرتے تھے۔ لیکن انھیں راغب صاحب کے نزدیک پاکستان کے معاملے میں مولانا کی یہ تمام خصوصیات ختم ہو جاتی ہیں۔ وہ مولانا حسین احمد صاحب کے مقابلے میں شکست قبول کر لیتے ہیں۔ اعتراف حق سے باز رہتے ہیں۔ اور ان کی زندگی کا آخری مضمون پاکستان کی بالکلیہ نفی کی تائید میں شائع ہوتا ہے۔ ہاں ٹھیک ہے اگر تضاد اس درجے کا بھی نہ ہو تو پھر وہ تضاد ہی کیا ہے۔ تسلیم کردہ نکات میں حسب ذیل تین نکتے مولانا کی زندگی کے اہم ترین نکتے ہیں:

(۱) اصولِ اسلام کی بہتری کا اقرار۔

(۲) اسلامی مرکزیت کی پیدائش کی کوشش۔

(۳) اسلامی حکومت کی تعمیر کا نصب العین۔

راغب صاحب نے پوری سچائی کے ساتھ اس کا اعتراف کیا ہے کہ مولانا سجاد صاحب دینِ اسلام کو تمام ادیان سے بہتر سمجھتے تھے، وہ اس کے اصول کو دنیا کے تمام دوسرے اصولوں سے بالاتر مانتے تھے وہ اس کا عقیدہ رکھتے تھے کہ اسلامی ہی اصول کے ماتحت ہندوستان کی نجات ہو سکتی ہے۔ اُن کی زندگی کا گلوب جس محور کے گرد گھومتا رہا وہ اسلامی مرکزیت کا محور تھا، ان کی زندگی کا حقیقی نصب العین سارے ہندوستان میں اسلامی حکومت کا قیام تھا۔ اِس سچائی کے اعتراف کے باوجود اس سچے مسلمان کی زندگی پر جو تنقید انھوں نے کی ہے، وہ اتہام تراشی، تضاد بیانی، مہمل گوئی اور نامعقولیت کی ایسی گھناؤنی تصویر

ہے جس سے ہر معقولیت پسند انسان کو گھن آئے گی۔

حضرت راغب رقم طراز ہیں:

"امارت شرعیہ کا تصور اس اصول پر مبنی تھا کہ اگر کسی ملک میں مسلمان سیاستاً غیر مسلموں کے محکوم اور غلام بن جائیں تو ان کو لازم ہے کہ ایک مسلمان عالم کے ہاتھ پر بیعت کر کے اس کو اپنا امام بنالیں اور اس کی رائے کے مطابق اپنے امور شرعی کو انجام دیں اور اس کی اطاعت کو قبول کریں اور اس طرح اپنی محکومیت پر نہ صرف قانع ہو جائیں بلکہ اپنی محکومیت کو ایک آئینی صورت اور شرعی شکل بھی دے دیں"۔

(ص:۱۳۰)

"عامۃ المسلمین امارتی علماء سے اِس لیے بیزار ہو گئے کہ یہ امارتی علماء مسلم نیشنل ازم یعنی ہندوستان میں مسلمانوں کی اپنی آزاد و مستقل سلطنت کے تعمیر کرنے کے نصب العین یعنی تعمیر پاکستان کے خلاف اور مسلمانوں کو ایک ہندو اسٹیٹ کا محکوم بنانا چاہتے ہیں۔" (ص:۱۴۲)

"امارتی اور جمعیتی علماء اس لیے جمہور مسلمین کی تنظیم عام یعنی مسلم لیگ اور پاکستان سے منقطع اور بیزار ہو گئے کہ یہ چیز کانگریسی نیشنل ازم اور قومیت متحدہ کے اصول کے بالکل خلاف ہے۔ اور وہ اب تک ہندوستان کو ایک نیشن اسٹیٹ کی صورت میں تعمیر پر عقیدہ رکھتے

ہیں۔ حالاں کہ یہ ثابت ہوچکا ہے کہ یہ نیشن اسٹیٹ دراصل ہندو
راشٹر یارام راجیہ کے سوااور کچھ نہیں ہو گا۔" (ص:۱۴۳)

میں اپنے اس مضمون کے دوسرے حصّہ میں امارت شرعیہ، کانگریسی نیشنل اِزم اور قومیت متحدہ کے متعلق اظہارِ خیال کروں گا۔ یہاں تو صرف یہ دکھانا ہے کہ راغب صاحب جس شخص کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ وہ اسلامی اصول کو سب سے بالاتر مانتا تھا۔ اس کا محور حیات اسلامی مرکزیت تھا۔ اس کی زندگی کا حقیقی نصب العین ہندوستان میں اسلامی حکومت کا قیام تھا۔ وہ دوسری سانس میں اسی شخص کے متعلق یہ بھی کہتے ہیں کہ اس نے امارت کے ذریعہ مسلمانوں کی غلامی پر دائمی مہر لگادی تھی۔ وہ ہندوستان میں ہندو حکومت کے لیے کوشاں تھا، وہ مسلمانوں کو ہندوؤں کا محکوم بنانا چاہتا تھا۔ وہ متحدہ قومیت کے مذہب جدید کا ایجنٹ تھا۔ کیا دونوں دعوے ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں؟ کیا ان دونوں کے درمیان آسمان اور زمین کا فرق نہیں ہے؟ کیا مسلمانوں کے اس مجاہد جانباز پر جو خود راغب احسن صاحب کا بھی ممدوح ہے اس سے زیادہ ناپاک اتہام لگایا جاسکتا ہے؟ کیا راغب احسن صاحب کی عقل اتنی کھوئی گئی ہے کہ وہ اس تضاد بیانی کو محسوس نہیں کرتے؟

میں نے اپنے مضمون کی تمہید میں یہ عرض کیا تھا کہ راغب صاحب کے طویل مضمون کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک حصّہ تو وہ ہے جو تضاد بیانی کا عجیب وغریب مرقع ہے وہ ایک جگہ کچھ لکھتے ہیں اور دوسری جگہ اس کے بالکل برعکس کچھ اور تحریر فرماتے ہیں۔ یہ تضاد بیانی اخیر تک پائی جاتی ہے اور اس لحاظ سے ان کے مقالے کو مجموعۂ اضداد کہنا بے جا نہ ہو گا۔ میں نے

اجمالی طور پر مندرجہ بالا سطور میں ان کی تضاد بیانی کا نقشہ پیش کردیا ہے اور مجھے امید ہے کہ راغب احسن صاحب ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے تو وہ اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہوں گے۔ لیکن یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر راغب احسن صاحب جیسا تعلیم یافتہ شخص اس تضاد بیانی میں کس طرح اور کیوں مبتلا ہوا؟ اس سوال پر جہاں تک میں نے غور کیا ہے میری سمجھ میں یہی بات آتی ہے کہ جس وقت تک بے جا تعصب کی تاریکیوں سے ان کا دل ودماغ پاک وصاف رہا مولانا سجاد کی عظمت وجلالت کا آفتاب اپنی پوری تابانی کے ساتھ ان کی نگاہوں کے سامنے پرتو افگن رہا اور انھوں نے مولانا کے متعلق بہت سی سچائیوں اور حقیقتوں کا بالفاظ صریح اعتراف واقرار کیا لیکن جیسے ہی کہ انھیں مولانا شفیع وغیرہ کی شکست یاد آئی، جن کی کامیابی کے لیے وہ خود پوری طرح کوشاں رہے تھے اور جیسے ہی کہ انھیں اپنی چہیتی مسلم لیگ یاد آئی اور اس کے خلاف مولانا کا مضبوط محاذ نظر آیا ویسے ہی بے جا تعصبات وبعد از وقت انتقام کی گھنگھور گھٹا ان کے دل ودماغ پر چھاگئی اور انھوں نے مولانا کی زندگی کو ناکام دکھانے کا بیڑا اٹھالیا۔ اب یہ حالت ہوگئی کہ کبھی کبھی اس کالی گھٹا کے اندر سے کوئی کرن اپنی روشنی دکھاتی ہے اور پھر گھٹاٹوپ اندھیرا چھاجاتا ہے۔ یہی کشمکش مقالے کے آخر تک نظر آتی ہے۔ وہ جذبات کی رسہ کشی میں یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ ابھی کیا کہا تھا اور اب کیا کہہ رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ بدترین پارٹی پالیٹکس ہے جس کا غلط الزام انھوں نے مولانا کی ذات پر لگایا ہے حالاں کہ وہ خود بری طرح اس میں گرفتار ہیں اور اپنی استعداد کو ضائع کررہے ہیں۔

مسٹر راغب احسن صاحب کے مقالے کا دوسرا حصّہ وہ ہے جس میں انھوں نے پوری دیدہ دلیری سے غلط فہمیاں پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ علماء حق اور ان کی جماعتوں پر جاہلانہ الزامات کے زہریلے تیر برسائے ہیں اور قلم کا سارازور اس شر انگیز مقصد پر صرف کیا ہے کہ کسی طرح امارت شرعیہ اور جمعیۃ علماء کی بنیادیں ہلا دی جائیں اور ان دونوں جماعتوں اور ان کے ارکان کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ لیکن جس چراغ کو خدا جلانا چاہے اُسے کون بجھا سکتا ہے۔ جب حکومتِ برطانیہ اپنی طاغوتی طاقتوں، شریرانہ سازشوں اور انتھک کوششوں کے باوجود علمائے حق کی جماعتوں کو نہ مٹا سکی تو راغب صاحب کا متضاد اور مخبوط مقالہ اسے کیا مٹا سکتا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ ناواقف لوگوں میں اِس سے غلط فہمی پھیل سکتی ہے اور درحقیقت اسی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے میں نے قلم اٹھایا ہے۔ متعدد عنوانات کے تحت اختصار کے ساتھ میں سچائی کے چہرے سے نقاب سرکانے کی کوشش کروں گا۔

مسلم لیگ سے علاحدگی:

مولانا سجاد علیہ الرحمہ اور مولانا حسین احمد مدظلہ کی لیگ سے علاحدگی ہی وہ رستا ہوا پھوڑا ہے جو مخالفوں کو کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتا۔ راغب صاحب کا سب سے بڑا الزام یہی ہے کہ مولانا سجاد مسلم لیگ کی کھوکھلی سیاسیات کے بہاؤ میں کیوں نہیں بہہ گئے۔ انھوں نے قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح صاحب کی کیوں مخالفت کی، اُن کے سامنے تسلیم ورضا کی گردن کیوں نہیں جھکائی؟ اگر شریعت اسلامیہ کو نقصان پہنچ رہا تھا، پہنچنے دیا جاتا، اگر ہندوستان کی مدافعت کا متحدہ محاذ پاش پاش ہو رہا تھا، ہونے دیا جاتا، اگر مسلمانوں کی سیاست

سیدھے راستے سے ٹھیک ہو رہی تھی تو اُسے بھٹکنے دیا جاتا، مولانا سجاد کو یہ تمام باتیں برداشت کرتے ہوئے قائد اعظم کا ساتھ دیئے جانا چاہیے تھا۔ مولانا سجاد مسلم لیگ سے کیوں علاحدہ ہوئے؟ اِس سوال کا جواب دیتے ہوئے راغب صاحب نے اس کی دو وجہیں تراشی ہیں جو نہ صرف یہ کہ سرتاپا غلط ہیں بلکہ حسب سابق ایک دوسرے سے متصادم بھی ہیں۔

پہلی وجہ:

> حقیقت اصلی یہ ہے کہ مولانا سجاد نے لیگ کو اپنی زندگی کی سب سے چہیتی اور اکلوتی اولاد امارت کے لیے ترک کر دیا اور اسی کے لیے انھوں نے جنگ مول لی اور ساری قوم کے رجحان عام کے خلاف اپنی علاحدہ پارٹی وضع کی، اس کو قائم کیا اور چلاتے رہے۔" (ص:۱۲۱)

دیکھنے کا نکتہ یہ ہے کہ نہ اس وقت جب وہ لیگ سے الگ ہوئے کوئی آل انڈیا امارت قائم تھی اور نہ آج ہے۔ اس وقت بھی صرف صوبہ بہار میں امارت قائم تھی اور آج بھی بحمدللہ قائم ہے۔ امیر شریعت صوبۂ بہار کا دائرۂ وجوب اطاعت صوبہ بہار تک محدود ہے۔ اس نکتے کو سمجھنے کے بعد دیکھنا یہ ہے کہ راغب صاحب کیا فرما رہے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ مولانا سجاد نے آل انڈیا مسلم لیگ کو صوبائی امارت کے لیے ترک کر دیا۔ اور اس کو ترک کرنے کے بعد پارٹی بھی کیسی بنائی، آل انڈیا پارٹی نہیں صرف بہار مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی، کیا کوئی سلیم الطبع انسان لیگ سے علاحدگی کی اس وجہ پر یقین کر سکتا ہے؟ راغب احسن صاحب کے مقالے کی ایک زبردست خصوصیت یہ ہے کہ بڑا سے بڑا

دعویٰ کرتے ہیں لیکن اس کی کوئی دلیل پیش نہیں کرتے۔ ان کا ہر دعویٰ (اُن کے خیال میں) مدلل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ خود اس کے مصنف ہیں اور شاید وہ سمجھتے ہیں کہ اُن کا ہر دعویٰ ''آفتاب آمد دلیل آفتاب'' کا مصداق ہے۔ وہ اپنے متعلق اس سے بھی زیادہ حسن ظن رکھ سکتے ہیں لیکن دنیا ان کے ہر دعوٰے کو اس لیے تسلیم نہیں کرے گی کہ وہ اس کے مصنف ہیں۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ آخر انہوں نے مولانا سجاد کی لیگ سے علاحدگی کی یہ اچھوتی وجہ کہاں سے دریافت کی۔ کیا اس کے متعلق ان پر کوئی وحی اتری، کوئی الہام ہوا، مولانا سجاد کا کوئی بیان ان کے پیش نظر ہے، کوئی پرائیوٹ دستاویز ان کے پاس محفوظ ہے، آخر وہ کس دلیل سے اس وجہ کو ''حقیقتِ اصلی'' قرار دے رہے ہیں؟ کیا مولانا سجاد نے مسٹر محمد علی جناح سے اس کا مطالبہ کیا تھا کہ وہ صوبائی امارت کی بالادستی تمام ہندوستان پر تسلیم کریں اور جب انھوں نے اس کو نہیں مانا تو وہ لیگ سے علاحدہ ہوگئے۔ کیا اس مطالبے کی کوئی کاپی راغب صاحب کے پاس ہے؟ جب ان میں سے کوئی بات نہیں ہے تو پھر لیگ سے علاحدگی کی اصلی وجہ پر پردہ ڈال کر یہ وجہ تراشنا کہاں کا انصاف ہے؟

دوسری وجہ:

راغب احسن صاحب مولانا حسین احمد مدظلہ اور مولانا سجاد کی لیگ سے علاحدگی کی دوسری وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ان لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کی قیادت اور سیاسی رہنمائی کا حق علماء اور صرف اصطلاحی علماء کے لیے مخصوص ہے اور ہونا چاہیے اور کسی غیر عالم کو اس کا حق نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کے رہنما ہونے کا دعویٰ کرے۔ آخر میں وہ لکھتے ہیں:

> ''یہی بنیادی اور اصلی سبب تھا مولانا حسین احمد اور مولانا سجاد کی لیگ سے علاحدگی کا، یہ حضرات مسٹر جناح کو اپنا لیڈر ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔''
>
> (ص:۱۲۳)

اس چیز کو مختلف جگہوں میں مختلف عنوانات کے ماتحت راغب احسن صاحب نے زبردست مسلم لیگی کے روپ میں اچھی طرح پھیلایا ہے، اور غیر علماء کے جذبات کو پوری طرح برانگیختہ کرنے کی قابل مذمت کوشش صرف کی ہے، حالاں کہ یہ وجہ اور یہ الزام بھی یکسر غلط ہے۔ علماء پر اس لغو الزام کی غلطی خود راغب صاحب کی تحریروں سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

> ''طبقۂ علماء کے لیے اس کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ مولانا ابوالکلام اپنے سحر سامری سے جمعیۃ علماء کو مسحور کر کے اپنے ساتھ بہا لے جائیں گے۔ لیکن مولانا سجاد نے نہایت عقلمندی اور قوت کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا۔ اور مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کے اس جہاد کا ساتھ دیا جو انھوں نے نہرو رپورٹ کے خلاف جاری کیا تھا۔'' (ص:۱۱۸)

یہاں خود راغب صاحب یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مولانا سجاد نے مولانا ابوالکلام کو چھوڑ کر جو ایک وسیع النظر عالم ہیں، مولانا محمد علی کی لیڈری قبول کی جو یقیناً اصطلاحی عالم نہ تھے۔ وہ آگے چل کر پھر لکھتے ہیں:

''مولانا جمعیۃ علماء کے لیڈروں کو لے کر آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اس اجلاس میں شریک ہوئے جو یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو بصدارت ہزہائی نس

آغا خاں دہلی میں منعقد ہوا اور جس نے نہرو رپورٹ کے مقابلے کے لیے وہ مطالبات وضع کیے جنھیں مسٹر جناح نے مارچ ۱۹۲۹ء میں چودہ نکات کی صورت میں ترتیب دیا۔" (ص:۱۱۹)

اس تحریر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مولانا سجاد اور جمعیۃ کے لیڈروں نے نہ صرف

مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ بلکہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے مختار ہز ہائی نس سر آغا خاں کی لیڈری بھی قبول کی جو مسلمہ طور پر غیر عالم ہیں۔ اِس کے علاوہ اس وقت جب مسٹر محمد علی جناح نے انگلستان سے واپس آکر مسلم لیگ کی لیڈری قبول کی ہے اور آل انڈیا مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ قائم کیا ہے جس کے مختار مطلق صرف وہی تھے تو نہ صرف یہ کہ مولانا سجاد اور مولانا حسین احمد صاحب نے ان کی لیڈری قبول کی تھی بلکہ اس بورڈ کو الیکشن میں کامیاب کرنے کے لیے پوری جدوجہد کی تھی۔ ان تمام باتوں کے باوجود مسٹر راغب احسن صاحب علماء پر یہ الزام تھوپ رہے ہیں کہ ان کے نزدیک مسلمانوں کی قیادت کا حق صرف اصطلاحی علماء کو ہے اور مولانا سجاد وغیرہ مسلم لیگ سے اِس لیے الگ ہوئے کہ وہ مسٹر جناح کو لیڈر نہیں ماننا چاہتے تھے۔

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

اس الزام کی غلطی ثابت کرنے کے لیے راغب احسن صاحب کی تحریریں کافی تھیں لیکن مزید تشفی کے لیے میں یہاں شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدظلہ کے بیان کا ایک ٹکڑا پیش کرتا ہوں جس سے معلوم ہو گا کہ علماء نے ہوسِ اقتدار کے پیچھے کبھی ملک وملّت کو نقصان نہیں پہنچایا بلکہ جہاں

کہیں انھیں اسلام اور ہندوستان کی بھلائی نظر آئی وہ شریک ہوگئے، عام ازیں کہ اس کا لیڈر عالم ہو یا غیر عالم۔

"علماء جن کو میادین تحریک میں کود پڑنے کے لیے ذاتی اغراض اور مالی وجاہی حاجات باعث نہیں ہوئی تھیں۔ ان کو نفسانیت اپنی جماعت کی خود پرستی یا ہوسِ اقتدار وغیرہ اس طرف جاذب نہ تھی، وہ اخلاص اور للّٰہیت کے ساتھ میدان میں اترے تھے اور یہی وجہ ہوئی تھی کہ وہ تحریکِ خلافت میں علی برادران اور ان کے جیسے انگریزی خوانوں کے زیر قیادت سرگرم عمل ہوگئے تھے، اپنے قائد بننے اور اس کے لیے جدوجہد کا کوئی معاملہ کبھی ان کی طرف سے مانع ہوا ہی نہیں۔ مسلم کانفرنس میں سر آغا خاں کی زیر قیادت شریک ہوگئے تھے۔ تحریک کانگریس میں ۱۹۱۹ء کے بعد سے بکثرت اور اس سے پہلے ۱۸۸۷ء سے بقلت کام کرنے لگے تھے۔ حالاں کہ کبھی بھی کانگریس کا کوئی صدر عالم نہیں ہوا تھا۔ اسی طرح باوجود مسٹر محمد علی جناح کے صورۃً اور سیرۃً غیر مذہبی ہونے کے ان کے ساتھ اور انھیں کی زیر قیادت قومی اور ملکی خدمات انجام دینے کے لیے تیار ہوگئے۔"

(مسٹر محمد علی جناح کا پراسرار معمہ)

ان بیانات کے بعد مولانا سجاد اور مولانا حسین احمد صاحب کی لیگ سے علاحدگی کی وہ وجہ بتانا جو راغب صاحب نے بتائی ہے ان لوگوں پر

کس قدر ذلیل بہتان ہے۔

اصلی وجہ:

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کونسی بات تھی جو مولانا سجاد وغیرہ کی لیگ سے علاحدگی کا سبب بنی؟ اس کا صرف ایک جواب ہو سکتا ہے اور وہ ہے ”مسٹر جناح کی طوطا چشمی“!۔۔۔اس اجمال کی تفصیل میں اگر چند سوالات حل کر لیے جائیں تو مسئلہ بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ کیا آل انڈیا مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ میں جمعیۃ علمائے ہند کے ارکان بن بلائے مہمان کی طرح خود بخود شریک ہوئے تھے؟ کیا جمعیۃ کے ارکان بغیر کسی شرط ووعدہ تعاون پر تیار ہوئے تھے؟ کیا الیکشن کے بعد مسٹر محمد علی جناح صاحب نے حیرت انگیز طوطا چشمی کے ساتھ اپنے تمام وعدے بھلا نہیں دیئے؟ کیا مسٹر جناح نے نہ صرف یہ کہ اپنے وعدے بھلا دیئے بلکہ انھوں نے علماء کی بدترین توہین اور ان سے بے پروائی کا اظہار نہیں کیا؟

۱۹۳۶ء کا سال ہندوستان کی تاریخ میں یادگار سال رہے گا اس لیے کہ اسی سال سے ہندوستان کی حالت پہلی حالتوں سے یکسر منقلب ہونا شروع ہوئی ہے اور اسی سال نے مسلمانوں کی جماعتوں میں اختلاف کا وہ زہریلا بیج بویا ہے، جس کے تناور درخت کا منحوس سایہ آج ہندوستان کے ہر ہر گاؤں پر اپنا اثر ڈال رہا ہے۔ یہی وہ سال ہے جس میں مسٹر محمد علی جناح نے مغربی سیاست کے وہ کارڈ کھیلے ہیں جنھوں نے مسلمانوں کو دو مستقل متخاصم ٹولیوں میں بانٹ دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسٹر محمد علی جناح نے جب مسلم لیگ کو دوبارہ زندہ کرنا چاہا تو الیکشن کے لیے زمین ہموار کرنے اور مسلمانوں کے حریت پرور طبقہ کو دھوکہ

دینے کے لیے انھوں نے ایسے اعلانات کئے جس سے پتہ چلتا تھا کہ اب وہ ملک وملّت کی حقیقی اور ٹھوس خدمت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور جب حسب توقع ان کے اعلانات کا خیر مقدم کیا گیا تو انھوں نے اور ان کی پارٹی نے مسلمانوں کے حریت پرور طبقوں کے مسلمہ لیڈروں کو اپنے ساتھ اشتراک کرنے کے لیے دعوتی خطوط اور تار بھیج بھیج کر بلانا شروع کیا۔ اور یہ سب محض اس لیے کیا جارہا تھا کہ جمعیۃ علماء کے اثر سے الیکشن میں کامیابی حاصل کی جائے۔ مولانا حسین احمد صاحب مدظلہ اپنے رسالہ ”مسٹر محمد علی جناح کا پراسرار معمہ اور اس کا حل“ میں تحریر فرماتے ہیں:

> (الف) کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ خود مسٹر جناح، مولانا شوکت علی، چودھری عبدالمتین، چودھری خلیق الزماں صاحب، نواب اسمٰعیل خاں صاحب وغیرہ حضرات مارچ ۳۶ء سے آئندہ الیکشن کے لیے بورڈ وغیرہ بنانے میں بے قرار نظر آتے تھے۔ جلسے اور اجتماعات اس کے لیے کیے جاتے تھے اور ان پر غور کیا جاتا تھا کہ کس طرح اس میں حسب منشا کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے اور جس طرح یونیٹی بورڈ میں کوشش کر کے جمعیۃ علماء کو داخل کیا گیا تھا اور ان کی مختلف جماعتوں میں صلح کرائی گئی تھی اسی طرح آئندہ بورڈ کے لیے ان کی امداد واعانت حاصل کرنے کی مساعی کی جاتی تھیں، جس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ مسلم عوام پر جمعیۃ کے اراکین کا اثر تھا۔

(ب) کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ مسٹر جناح نے اراکین یونیٹی بورڈ کو مشورہ دیا کہ وہ زیر قیادت مسلم لیگ مشترکہ بورڈ بنائیں جو کہ مسلم نیشنلسٹ پارٹی، جمعیۃ علماء، خلافت کمیٹی، احرار پارٹی وغیرہ سب کو حاوی ہو۔ اس کے لیے جلسے خصوصی کیے گئے اور اراکین جمعیۃ کو بار بار بلایا گیا۔

(د) کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ دو یا تین اجتماع کے بعد قرار پایا کہ حسین احمد کو بلایا جائے اور اس کو اس مفاہمت میں شریک کیا جائے اور باوجودیکہ چند رجعت پسندوں نے یہ کہا کہ ہم سبھوں کے ساتھ اشتراک عمل کر سکتے ہیں مگر حسین احمد کے ساتھ اشتراک عمل نہیں کر سکتے، تاہم مجھ کو تار دے کر ملتان سے (جب کہ میں وہاں بعض جلسوں میں شرکت کی غرض سے گیا ہوا تھا) بلایا گیا۔

(و) کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ صبح کو تقریباً آٹھ سے دس بجے تک تبادلۂ خیالات اور گفت وشنید ہوتی رہی اور مسٹر جناح نے زور دیا کہ پارلیمنٹری بورڈ میں شریک ہو کر آپ لوگوں کو الیکشن میں حصّہ لینا اور عمدہ سے عمدہ آزاد خیال لوگوں کو امیدوار اور کامیاب بنانا چاہیے۔

(ی) کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ان اسامی میں اُن اراکین جمعیۃ اور احرار کا نام خود چن کر جب کہ وہ کشمیر میں تھے شائع کرایا اور پھر لاہور کے اجلاس میں دعوتی خطوط بھیج کر سب کو بلایا۔

(ک) کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ میری بلا خواہش اور اسی طرح بغیر خواہش صدر وناظم جمعیۃ العلماء یہ نام چنے گئے اور پھر میرا نام بلا میری خواہش صوبہ یوپی کی مجالس میں بھی چنا گیا اور باوجود ہر قسم کی مشکلات اور اعذار کے مجھ پر وَرک (کام) کرنے اور ہر امیدوار کے حلقے میں جانے کا حکم دیا گیا جس کو میں نے بغیر کسی قسم کے لالچ اور نفع مالی کے انجام دیا۔"

کیا شیخ کے ان بیانات کی روشنی میں یہ حقیقت اچھی طرح روشن نہیں ہو جاتی کہ جمعیۃ علماء کے اراکین بن بلائے مہمان کی طرح شریک نہیں ہوئے تھے بلکہ پوری جدوجہد کر کے دعوتی خطوط اور تار بھیج بھیج کر ان کو بورڈ میں شریک کیا گیا تھا۔ اس سوال کی توضیح کے بعد اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا جمعیۃ کے ارکان بغیر کسی وعدہ، اطمینان حاصل کیے بغیر بورڈ میں شریک ہو گئے تھے؟ اگر سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اِس سوال کا جواب بھی پہلے سوال کے حل میں آ گیا ہے۔ اس لیے کہ ہر موٹی عقل کا آدمی سمجھ سکتا ہے کہ جب کسی کو دعوتی خطوط اور تار بھیج بھیج کر کسی اشتراک عمل کے لئے بلایا جائے گا تو وہ بغیر اطمینان حاصل کیے کس طرح اشتراک عمل کر سکتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ جمعیۃ علماء کے اراکین نے بھی مسٹر جناح سے حتمی وعدے لے کر اپنا اطمینان کر لیا تھا۔ جمعیۃ کے ارکان صرف اس لیے پارلیمنٹری بورڈ میں شریک ہوئے تھے کہ رجعت پسندوں اور برطانیہ کے کاسہ لیسوں کو ہندوستان خصوصاً مسلمانوں کی سیاست سے نکال دیا جائے۔ شریعتِ اسلامیہ کے تحفظ کا انتظام کیا جائے اور آزادی کی جنگ ہندو مسلمان دونوں کے متحدہ محاذ سے لڑی جائے کیوں کہ اِس

صورت کے بغیر آزادی حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہے، ان چیزوں کے متعلق نہ صرف یہ کہ مسٹر جناح نے پرزور زبانی وعدے کیے بلکہ اخبارات میں بیانات دئے جن سے صرف یہی مقصود تھا کہ حریت پرور طبقوں کو مطمئن کیا جائے۔

شیخ مولانا حسین احمد صاحب مد ظلہ تحریر فرماتے ہیں:

"بیشک مسٹر محمد علی جناح نے نہایت زوردار الفاظ اور طریقوں سے ہم کو اطمینان دلایا کہ رجعت پسند طبقہ اور خود غرض لوگوں کو ہم آہستہ آہستہ لیگ سے نکالیں گے اور آزاد خیال، قوم پرست مخلص لوگوں کی اکثریت کی کوشش کریں گے اور ایسے ہی لوگوں کے انتخاب کو عمل میں لائیں گے۔ ہم نے بعد بحث ومباحثہ اس پر اطمینان کیا اور تعاون پر آمادہ ہوگئے جس کی زوردار خواہش مسٹر محمد علی اور ان کے رفقاء کار کی اس وقت تھی۔"

مولانا بشیر احمد صاحب کٹھوری ایک جلسے کی مفصل روداد بتاتے ہوئے اور مسٹر جناح سے بحث و گفتگو کی تشریح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"لہٰذا ہم کو تو یہ بتلایا جائے کہ ہم یا آپ کسی طرح بھی اس میں کامیاب نہ ہوسکے کہ پارلیمنٹری بورڈ آزاد خیال منتخب ہو تو پھر آپ کی پوزیشن کیا ہوگی؟ اس پر بہت جوش کے ساتھ سینے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا اگر میں کسی طرح بھی اس پر قادر نہ ہوا تو مسلم لیگ کو چھوڑ کر آپ کے ساتھ آجاؤں گا۔ اس پر بے انتہا خوشی کا اظہار کیا گیا اور سب حضرات نے فرمایا کہ ہم بھی یہی چاہتے

تھے اور پوری مسرت کے ساتھ جلسہ ختم ہوگیا۔"

(مسٹر جناح کا پراسرار معمہ اور اس کا حل)

ہر عقل سلیم رکھنے والا شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ اب اس سے بڑھ کر اطمینان حاصل کرنے اور وعدہ لینے کی دوسری اور کیا شکل ہوسکتی تھی۔ مسٹر جناح کے اخباری بیان کا صرف ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس سے یہ حقیقت اور واضح ہو جائے گی۔ مسٹر جناح کا ایک بیان "بمبئی کرانیکل" میں جون ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا، اس کا خلاصہ حسب ذیل الفاظ کے ساتھ فروری ۱۹۳۷ء کو مدینہ اخبار میں شائع ہوا۔

(۱) مسلم لیگ کی پالیسی کا مقصد ایک ایسے نظام کا بروئے کار لانا ہے جس کے ماتحت ترقی پسند اور آزاد خیال مسلمانوں کے اعلیٰ ادارے متحد ہو جائیں۔

(۲) مسلم لیگ موجودہ دستور سے بہتر ایسا دستور حاصل کرنے کے لیے جو سب کو پسند ہوگا کانگریس کا ساتھ دے گی اور حکومت پر دباؤ ڈالے گی۔

(۳) مسلم لیگ اس اصول کو برقرار رکھتی ہے کہ بطور اقلیت مسلمانوں کو کافی تحفظ حاصل ہو۔

(۴) اسمبلی میں لیگ تمام قومی معاملات میں کانگریس سے تعاون کرے گی اور اس کے ساتھ رہے گی۔

(۵) لیگ کے صدر کی حیثیت سے میرا خیال ہے کہ ایسے چالاک لوگوں کو جن کا مقصد حکومت کے ماتحت عہدے حاصل کرنا ہے اور جنھیں عوام کے حقوق، ضروریات اور مفاد کی مطلق پروا نہیں، سیاسی میدان سے نکال دیا جائے۔

یہ تھے وہ تمام وعدے، معاہدے، شروط اور پیمان جن کی بنا پر جمعیۃ کے

ارکان جن میں مولانا سجاد بھی تھے، آل انڈیا مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ سے اشتراک عمل پر تیار ہوئے تھے اور انھوں نے الیکشن میں پوری پوری مدد دی تھی۔ اس سوال کے حل کے بعد اب وہ آخری سوال آرہاہے جس نے اراکین جمعیۃ کو لیگ سے علاحدہ ہونے پر مجبور کردیا بلکہ یوں کہیے کہ زبردستی ان کو اس سے الگ کردیا گیا۔ کیا الیکشن کے بعد مسٹر محمد علی جناح نے اپنے تمام وعدے، معاہدے بھلا نہیں دیئے۔ کیا انھوں نے علماء کی توہین نہیں کی۔ کیا انھوں نے اُن سے بے پروائی کا اظہار نہیں کیا؟ اِن سوالوں کا جواب دینے کے لیے طوالت کے خوف سے مولانا محمد اسماعیل، سنبھلی اِیم. اِیل. اے کا بیان دے رہاہوں جس سے حقیقت پورے طور پر واضح ہوجائے گی۔

> ”۱۹۳۶ء میں مسلم الیکشن کے سلسلے میں جب کہ مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی تو ہم لوگ اِس بورڈ میں صرف اس توقع پر داخل ہوئے تھے کہ یہ جماعت آزاد خیال افراد پر مبنی ہوگی اور اس کی تمام تر مساعی اور کوششیں آزادی وطن اور رجعت پسند طبقہ کو زیر کرنے کے لیے ہوں گی ،چنانچہ صاف اور واضح الفاظ میں مسٹر محمد علی جناح نے اِس کا وعدہ کیا اور ہر طرح جماعت علماء کو اطمینان دلایا اور بڑی حد تک الیکشن کے زمانے میں اس وعدہ کی پابندی بھی کی گئی لیکن الیکشن سے فارغ ہونے کے بعد فوراً ہی جناح صاحب نے (جو کہ اس بورڈ کے ڈکٹیٹر مطلق تھے) نہ معلوم کن مخفی وجوہ کی بنا پر اپنی روش بدل دی اور باوجود ہماری زبردست مخالفتوں کے انھوں

> نے اس رجعت پسند طبقہ کو شامل کرنا چاہا جس سے دوران الیکشن میں مقابلہ رہا تھا اور اس مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کو جو مسلم لیگ جمعیۃ العلماء ہند، مجلس احرار اور کانگریس کے ممبران سے ترکیب دیا گیا۔ کانگریس کے مدمقابل بنانے کی انتہائی کوشش کی اور کانگریس کو خالص ہندوؤں کی جماعت قرار دینا شروع کیا۔ جب ہم نے اس معاملے میں احتجاج کیا اور جناح صاحب کو ان کے مواعید یاد دلائے اور بتلایا کہ جماعت علماء اس بورڈ میں صرف اس بنا پر داخل ہوئی تھی کہ کانگریس کے ساتھ مل کر آزادئ وطن کے لیے کوشش کی جائے گی اور رجعت پسند طبقہ کو ایک ایک کرکے علاحدہ کردیا جائے گا۔ اور یہ صرف آزاد خیال لوگوں کی جماعت رہے گی۔ آج آپ رجعت پسندوں کو اس میں داخل کررہے ہیں اور کانگریس کے ساتھ بجائے اشتراک عمل اور اتحاد عمل کے جو آپ کے مینوفسٹو میں درج ہے، مخالف جارہے ہیں، تب جناح صاحب نے اور بعض دوسرے لوگوں نے بورڈ کی میٹنگ میں ہتک آمیز رویہ اختیار کیا اور کہا کہ ہمارے سارے وعدے ایک سیاست تھی۔ علماء سیاست سے بالکل ناواقف ہیں۔ اگر جماعت علماء ہمارے اس طرز عمل کو نہ پسند کرے تو ہمیں مطلق اس کی پروا نہیں ہے۔
> (مسٹر جناح کا پراسرار معمہ اور اس کا حل)

اِن توضیحات کے بعد مولانا سجاد اور مولانا حسین احمد صاحب وغیرہما کی لیگ سے علاحدگی کا سبب مسٹر جناح کی طوطا چشمی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اِس اصل اور حقیقی سبب کو چھپا کر ایک مغربی سیاسی کی طرح مسٹر راغب احسن نے مولانا سجاد وغیرہ پر ایک نہایت نامعقول بہتان تراشا ہے۔ کیا یہی وہ سیاست ہے جس کا ڈھنڈورا پیٹ پیٹ کر سارے ہندوستان کو سَر پر اُٹھالیا گیا ہے۔

قومیت متحدہ:

شیخ الحدیث مولانا حسین احمد صاحب مدظلہ نے ایک تقریر میں مغربی نظریۂ قومیت کی تشریح کرتے ہوئے اخباراً وحکایتاً یہ فرمایا تھا "فی زماننا قومیں اوطان سے بنتی ہیں"۔

اس بیان سے ان کا مقصود نہ تو اسلامی نظریہ قومیت کو بتانا تھا اور نہ ہی یہ مقصد تھا کہ ہندوستان میں بھی مغربی نظریۂ قومیت کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کرنی چاہیے۔ لیکن برا ہو پارٹی پالیٹکس اور افترا پردازی کا کہ اس تقریر کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا اور اخبارات واعلانات کے ذریعہ اتنا شور مچایا گیا کہ اُس نے طوفان بے تمیزی کی شکل اختیار کرلی۔ حد یہ ہے کہ اس پروپیگنڈے سے علاّمہ اقبال جیسی متین، سنجیدہ اور باوقار ہستی متاثر ہوگئی اور انھوں نے دو فارسی اشعار کے ذریعہ اس سے اپنی بیزاری کا اظہار فرمایا۔ اور اس موضوع پر مقالے بھی تحریر فرمائے لیکن جیسے ہی اُن پر حقیقت ظاہر ہوئی اور انھوں نے یہ محسوس فرمالیا کہ مقرر کا مطلب وہ نہ تھا جو بیان کیا گیا تو علاّمہ نے ایک اعلان کے ساتھ اِس بحث کو ختم کردیا۔ ان کی نیت نیک تھی اِس لیے انھوں نے اس کو ختم کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ لیکن جن لوگوں کی نیتیں خراب تھیں وہ اِس

اوچھے حربے کے استعمال سے آج تک باز نہیں آئے۔ مسٹر راغب احسن پر حیرت ہے کہ انھوں نے نہ صرف مولانا حسین احمد کو بلکہ مولانا سجاد کو بھی مزعومہ قومیت متحدہ کا ایجنٹ قرار دیا ہے حالاں کہ دونوں ہی کا دامن اس دھبے سے پاک ہے۔ مولانا حسین احمد صاحب نے بار بار اِس کا اعلان فرمایا کہ قومیت متحدہ ہندیہ کا وہ مطلب نہیں ہے جو مسلم لیگی حضرات پھیلا رہے ہیں۔ اس موضوع پر ایک رسالہ لکھ کر جو علاّمہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی ہی میں باصرار شائع کرایا، قومیت متحدہ کی تشریح کردی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ رسالہ مسٹر راغب احسن صاحب کی نظر سے گزرا ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود جب وہ مولانا سجاد کی زندگی پر مقالہ لکھنے لگے تو اس تلبیس کو مکروہ الفاظ میں پھر دہرایا جس کا پردہ چاک کیا جاچکا تھا، وہ اس شخص کی ذات پر جس کو خود مسلم لیگ کا دلی ہمدرد اور جمعیۃ العلماء میں سب سے زیادہ مسلم لیگ سے قریب کہتے ہیں، یہ الزام لگارہے ہیں کہ وہ قومیت متحدہ کے مذہب جدید کا ایجنٹ اور امام تھا۔ مولانا سجاد جس قومیت متحدہ کے قائل تھے وہ مذہب جدید نہیں وہی مذہب قدیم ہے جس کا بنیادی پتھر خود شارع دینِ اسلام ﷺ نے مدینہ میں اپنے مقدس ہاتھوں سے رکھا تھا، کوئی مسلمان، مسلمان رہتے ہوئے مغربی قومیت متحدہ کا ایجنٹ نہیں ہوسکتا۔ اگر راغب احسن صاحب صاف صاف مولانا سجاد وغیرہ کو دائرۂ اسلام سے خارج کردیتے تو اُن کا ہاتھ کون پکڑ سکتا تھا۔ ان کی یہ مہربانی بھی بہت ہے کہ انھوں نے اپنے مقالے میں ناک کو سیدھے سیدھے نہیں، ہاتھ گھما کے چھونے کی کوشش کی ہے۔ آج مولانا سجاد (طاب ثراہ) ہم میں موجود نہیں ہیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ ان کے اعلانات وبیانات چھپ کر

ہمارے ہاتھوں میں پہنچ چکے ہیں، قوم کی جب آنکھ کھلے گی تو وہ دیکھے گی کہ مولانا سجاد کیا تھے اور ان کو کیا کر کے دکھایا گیا تھا۔ قومیت متحدہ کے عنوان کے ماتحت مولانا نے تحریر فرمایا ہے:

"مگر ان اصولوں کے ذکر سے پہلے ضرورت ہے کہ ایک دوسرا بنیادی مسئلہ اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے اور وہ ہندوستانی قومیت متحدہ کی تخلیق کا مسئلہ ہے۔ بلاشبہ یہ امر واضح ہے کہ ہندوستان میں جتنے انسان آباد ہیں چاہے وہ کسی نسل سے ہوں، کسی مذہب کے پیرو ہوں یا سرے سے مذہب ہی کے معتقد نہ ہوں ہندوستانی باشندہ ہونے کی حیثیت سے وہ سب کے سب ایک قوم ہیں اور اس ایک حیثیت سے تمام باشندگانِ ملک کو ایک قوم کہنا صحیح و درست ہے۔ یعنی سب کے سب ہندوستانی ہیں یعنی نہ وہ ایرانی و تورانی ہیں اور نہ چینی و جاپانی وغیرہ، اور بحالت موجودہ ہندوستانی متحدہ قومیت کی خاص خصوصیت صرف اس قدر ہے کہ اس ملک کی قدرتی و مصنوعی پیداوار کے حصول میں سب کا اشتراک ہے اور اسی ملک کی آب و ہوا اور سامان خورد و نوش سے سب لوگوں کے جسموں کی تربیت ہوتی ہے اور ان خصوصیات کو قطع نظر کر کے مغربی سیاسیّین کے نظریے کا اتباع کرتے ہوئے اس براعظم میں اس قسم کی قومیت متحدہ کی تخلیق کی سعی کرنا جو یورپ کے کسی ملک میں ہے محض بے سود ہی نہیں بلکہ ملک کے لیے تباہ کن بھی ہے۔

کیوں کہ اِس ملک کی دو بڑی جماعتیں مسلمان اور ہندو بحیثیت مجموع دو علاحدہ علاحدہ تمدن کے مالک ہیں اور ہر شخص بیّن طور سے ایک کے تمدن کو دوسرے کے تمدن سے ممتاز پاتا ہے اور یقین کرنا چاہیے کہ جب تک اِن دونوں تمدن کا امتیاز باقی ہے مغربی تخیل کے مطابق ہندوستان میں متحدہ قومیت کی تخلیق ناممکن ہے اور اس حیثیت سے ہندوستانیت میں اتحاد و وحدت کے باوجود اِن دونوں تمدنوں کے لحاظ سے ہندو اور مسلمان دو قومیں آج بھی ہیں اور کل بھی رہیں گے۔"

آگے چل کر مولانا مسلمانوں کی قومیت کا معیار تفصیل سے بتاتے ہوئے آخر میں
لکھتے ہیں:

"اور جب مسلمانوں کی قومیت کا معیار و مدار اسلامیت ہوا اور اسلامیت کی حقیقت وہ ہوئی جو ابھی میں نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے، تو اب ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ مسلمانوں کی قومیت کا معیار و مدار غیر متبدل ہے اور کوئی مسلمان بحیثیت مسلمان اِس کو ترک نہیں کر سکتا ہے۔"

(خطبۂ صدارت مجلس استقبالیہ بہار مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی منعقدہ ۱۲۔۱۳/ ستمبر ۱۹۳۶ء)

کیا مولانا سجاد کا یہ بیان صاف صاف قومیت متحدہ ہندیہ کی تشریح نہیں کر رہا ہے؟ کیا مولانا سجاد کا یہ بیان صاف صاف مسلمانوں کی الگ قومیت اور اُن

کے ہندوؤں سے علاحدہ وجود و استقلال کا اقرار نہیں کر رہا ہے؟ کیا کوئی شخص اِس بیان کی اشاعت کے بعد مولانا سجاد کو مغربی متحدہ قومیت کا ایجنٹ کہہ سکتا ہے؟ لیکن مسٹر راغب احسن اِن تشریحات کی موجودگی میں اس سچے مسلمان کی وفات کے بعد اس پر یہ ناپاک الزام لگا رہے ہیں

عقل انگشت بدنداں ہے کہ اسے کیا کہیئے"[۱۳۷]

امارت شرعیہ:

مسٹر راغب احسن صاحب کے مقالے کا وہ حصّہ جو انھوں نے امارت شرعیہ پر سپرد قلم کیا ہے سب سے زیادہ پست اور یک قلم ناواقفیت پر مبنی ہے۔ یہاں پہنچ کر انھوں نے تہذیب و سنجیدگی کا سر رشتہ بھی اپنے ہاتھوں سے چھوڑدیا ہے اور خرافات کا وہ انبار لگایا ہے کہ بس دیکھئے اور ان کی واقفیت و تہذیب پر ماتم کیجئے۔ اِس جگہ وہ ایک ایسے غضب ناک نابینا کی طرح نظر آتے ہیں جس کے منھ سے غصّے میں جھاگ اڑ رہا ہو اور وہ بے تحاشہ اپنی لاٹھی گھمارہا ہو۔ اس کو اس کی قطعی فکر نہیں کہ یہ لاٹھی اس کے دشمن کو زخمی کرے گی یا خود اس کے سچّے ہمدرد کا سر پھوڑے گی۔ اس حصّے کو پڑھ کر یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ ان کو یورپ کے نظامِ سلطنت اور وہاں کے دستور و قوانین کی چاہے جتنی بھی واقفیت ہو لیکن اسلام کے دستور و قوانین سے یکسر ناواقف ہیں یا جوشِ عناد میں ناواقف بن گئے ہیں۔ وہ بڑے طنطنے اور پوری لاف زنی کے ساتھ اِس کے مدعی ہیں کہ انھوں نے امارت شرعیہ کو سمجھنے میں غور و فکر کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا ہے

[۹۵] غالب کے مصرعہ میں ترمیم کی گئی ہے، معلوم نہیں قصداً یا سہواً، غالب کا اصل شعر ہے:

ناطقہ سر بیگر بیاں ہے کہ کیا کہیئے ☆ خامہ انگشت بدنداں ہے کہ کیا لکھیئے

اور انتہائی زعیمانہ انداز میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ زندگی بھر وہ اس خیال کی تائید کرتے رہے ہیں لیکن معلوم وجوہ کی بنا پر یکایک اُن کے خیال میں ایسا انقلاب آتا ہے کہ وہ اس نظام کے ازلی و ابدی دشمن بن جاتے ہیں۔ اور اپنے زعم باطل میں اس کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیتے ہیں۔ وہ مولانا سجاد اور امارت کو لازم و ملزوم قرار دے کر اس شخص کی زندگی کو ناکام دکھانے کی سعی کرتے ہیں جس کو انھوں نے زندگی بھر میں صرف ایک بار اپنے بچپن کے زمانے میں دیکھا تھا، وہ نظامِ امارت شرعیہ کی ہنسی اڑاتے ہیں لیکن نہیں سمجھتے کہ اس تمسخر کی زد براہِ راست مکہ معظمہ کے سیزدہ سالہ اسلامی نظام پر پڑتی ہے۔ وہ مادّہ پرستوں کے اثر سے مادّی طاقت پر اتنے ریجھے ہیں کہ انھیں امارت شرعیہ کا سارا نظام مادّی طاقت کے بغیر نہ صرف یہ کہ غلط بلکہ غیر اسلامی نظر آتا ہے۔ پھر طرفہ تماشا یہ کہ وہ اپنے دعوؤں پر یقین کے ساتھ جمتے بھی نہیں۔ بلکہ یہاں بھی ان کی تضاد بیانی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ناظر حیران رہ جاتا ہے کہ ان کی کس بات کو صحیح سمجھے اور کس کو غلط۔ اِس لیے وہ یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ مقالہ نگار نے انتہائی پریشان دماغی کے عالم میں یہ مقالہ لکھا ہے۔

سب سے پہلے ان کی تضاد بیانی ہی کو دکھانا مناسب معلوم ہوتا ہے:

"امارت شرعیہ کا تصور اس اصول پر مبنی تھا کہ اگر کسی ملک میں مسلمان سیاستاً غیر مسلموں کے محکوم اور غلام بن جائیں تو ان کو لازم اور ضروری ہے کہ ایک مسلمان عالم کے ہاتھ پر بیعت کر کے اس کو اپنا امام بنالیں اور اس کی رائے کے مطابق اپنے امور شرعی کو انجام دیں اور اس کی اطاعت کو قبول کریں اور

اس طرح اپنی محکومیت پر نہ صرف قانع ہوجائیں بلکہ اپنی
محکومیت کو ایک آئینی صورت اور شرعی شکل بھی دے دیں"۔

(ص:۱۳۰)

"مولانا سجاد نے شروع میں ایک کافر اسٹیٹ کے فولادی
خول کے اندر امارت شرعیہ کی محکومانہ پوزیشن طلب کی تھی۔"

(ص:۱۴۷)

اِن عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ راغب صاحب کے نزدیک متیقن طور پر امارت کا تصور مکمل محکومیت کا تصور ہے بلکہ حد یہ ہے کہ امارت محکومیت پر آئین وشریعت کی مہر دوام ثبت کردیتی ہے اِسی لیے مولانا سجاد نے کافر اسٹیٹ کے فولادی خول کے اندر امارت کی محکومانہ پوزیشن طلب کی تھی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ راغب صاحب اِس یقین پر قائم بھی رہتے ہیں یا خود ان کے الفاظ اِس دروغ بے فروغ کی دھجیاں اڑادیتے ہیں:

"بجانب دیگر مسلمانوں کی امارت شرعی کا تصور اصلاً
ہندوستان کے نیشن اسٹیٹ کے اندر ایک دوسری نیشن اسٹیٹ
کی تخلیق وتعلیق کا تصور ہے بنابریں ہندو سبھا اور نیشنل کانگریس
نے جو ہندوستان کو ایک وحدانی نیشن اور نیشن اسٹیٹ بنانے
کے دعویدار ہیں۔ آج تک بااختیار امارت شرعیہ اور آزاد
بااختیار نظام قضا کے اصول تک کو تسلیم نہیں کیا۔ کانگریس
نیشنل ازم کے لیے امارتِ شرعی کو ماننا اپنے وجود کا انکار کرنا
ہوگا"

(ص:۱۴۱)

امارت کے پہلے تصور اور پچھلے تصور اس کے پہلے مطالبہ اور پچھلے مطالبہ میں کوئی صحیح العقل انسان کوئی ذرا سی وجہ مشترک بھی پاتا ہے؟ ایک جگہ وہ امارت کے تصور کو مکمل محکومیت کا تصور کہتے ہیں اور دوسری جگہ اس کو ایک سلطنت کے اندر دوسری سلطنت کا تصور لکھتے ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ امارت نے محکومانہ پوزیشن طلب کی تھی اور دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ آج تک کانگریس نے بااختیار امارت کو تسلیم نہیں کیا کیوں کہ بااختیار امارت کو ماننا اپنے وجود کا انکار کرنا ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ جب مولانا سجاد نے امارت کی محکومانہ پوزیشن طلب کی تھی تو پھر بااختیار امارت کے ماننے نہ ماننے کا سوال کہاں سے پیدا ہوا؟ اور جب امارت کا تصور محکومیت کا تصور ہے تو پھر وہی تصور نیشن اسٹیٹ کا تصور کیسے بن گیا؟ یہ ہے اس شخص کے دماغ کا مرقع جو اپنے کو نہ صرف یورپین دستور وقوانین کا ماہر جانتا ہے بلکہ ایک عالم اجل واکمل کا بھیس بناکر نظام امارت شرعیہ کو قطعی غیر اسلامی نظام قرار دیتا ہے۔

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی!

امارت شرعیہ کا بنیادی تصور:

خدا اور خدا کے رسول ﷺ نے مسلمانوں کے ہاتھ میں زندگی کا جو مکمل قانون دیا ہے اس کے پڑھنے سے یہ حقیقت مہرِ نیم روز کی طرح روشن نظر آتی ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کو انتشار وپراگندگی کی زندگی سے بچاکر مرکزی، جماعتی اور شرعی زندگی بسر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ غیر شرعی

زندگی کو بہیمانہ زندگی قرار دیتا ہے۔ وہ اپنے تمام فرائض، تعلیمات، دستور وقوانین میں کہیں بھی مرکزیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ وہ مسلمانوں کی چھوٹی سی چھوٹی جماعت کو بھی منتشر نہیں دیکھنا چاہتا۔ حدیہ ہے کہ حالت سفر میں بھی وہ کم سے کم تعداد کو بھی جسے جماعت کہا جاسکے یہ حکم دیتا ہے کہ کسی ایک کو امیر بنالیا جائے۔ اسلام کی یہ تعلیم ہر حالت اور ہر زمانے کے لیے عام ہے۔ اس زمانے کے لیے بھی جب مسلمان آزاد وخود مختار ہوں اور اس زمانے کے لیے بھی جب وہ محکوم وغلام ہوں۔ اس حالت میں بھی جب کہ مادّی طاقت ان کے پاس ہو اور اس حالت میں بھی جب وہ اس طاقت سے بجبر محروم کردیئے گئے ہوں۔ اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد یہ بات بالکل صاف ہوجاتی ہے کہ امارت شرعیہ کا بنیادی تصور مسلمانوں کو انتشار، پراگندگی اور فوضیت کی زندگی سے بچانا اور ان کی شرعی زندگی کے لیے ایک مرکز کی تعمیر ہے۔ یہ بات بھی ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ اسلامی پیغام کی روح یہ ہے کہ اس ساری کائنات کو انسانوں کے پنجۂ جبر وسیادت سے نکال کر صرف ایک خدا کی چوکھٹ پر جھکا دیا جائے۔ اس ساری کائنات کا خالق ومالک ایک ہے، اس لیے اس کے سوا کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ اپنی حاکمیت مطلقہ کا اعلان کرے۔ اس ساری کائنات کا تاج خلافت انھیں انسانوں کے سرزیب دیتا ہے جن کو خدا نے اپنا نائب بنایا ہے اور وہ یقیناً خدا کے مسلمان وفرماں بردار بندے ہی ہوسکتے ہیں۔ جو لوگ اِس حقیقت سے واقف ہیں اور بار بار اس کا اظہار بھی کرچکے ہیں کیا وہ اپنی محکومیت پر قانع ہوسکتے ہیں؟ نہیں خدا کی قسم نہیں! کیا ان کا وہ نظام جو شریعت اسلامیہ کی روشنی میں جاری کیا گیا ہے، ان کی محکومیت پر مہر دوام لگا سکتا ہے؟ نہیں لاکھ

بار نہیں!

امارت شرعیہ کیا ہے؟

اس سوال کے تحت مسٹر راغب احسن صاحب نے نظام امارت کے ساتھ جو

سوقیانہ مضحکے کیے ہیں اُن سے قطع نظر کرلینا ہی مناسب ہے۔ اس لیے کہ ہندوستان میں اگر خدا نے اپنے دین کو سربلند کرنا چاہا تو یہ چیز خود بخود ثابت ہوجائے گی کہ یہ مضحکے نظام امارت پر چسپاں تھے یا کسی دوسرے نظام پر۔ میرا فرض صرف یہ ہے کہ میں انھیں یہ بتاؤں کہ نظام امارت کیا ہے؟ اس کے لیے میں اپنے سے ہزار گونہ بہتر عالم اسلامی کے گراں پایہ عالم دین علاّمہ سیّد سلیمان ندوی مدظلہ کا ارشاد گرامی پیش کرتا ہوں:

> "امامت کیا ہے؟ کسی ایک لائق شخص کی سرداری میں افراد امت کی ایسی شیرازہ بندی کہ اُن پر جماعت کا اطلاق ہوسکے۔ احکام شرعی کا نفاذ واجرا بقدر امکان انتظام پاسکے اور جمعہ وجماعت اور نکاح وطلاق ومیراث وغیرہ کے احکام کی تنفیذ ہوسکے اور اگر اس سے زیادہ قوت ہو تو استخلاف وتمکین فی الارض کا وہ فرض بھی ادا ہوسکے جس کی بشارت قرآن پاک نے دی ہے۔ ضرورت ہے کہ حسبِ استطاعت ہم ایک عَلَم کے نیچے جمع ہوں تا کہ ہمارے جمعہ وجماعت، ہمارے اعیاد، رؤیتِ ہلال، صوم وافطار اور زکوٰۃ وخیرات، ائمہ ومؤذنین، مکاتب ومدارس، مساجد ومقابر، نکاح وطلاق، تبلیغ وارشاد اور دوسرے

مذہبی صیغے اور شعبے کسی ایک نظام میں آجائیں۔ اور ہماری مذہبی
وقومی خیرات کی کوڑی کوڑی سنت سینہ کے مطابق ایک بیت
المال میں جمع ہوکر مستحقین میں خرچ ہوسکے۔ بالفعل ہماری
شرعی امارت اسی تنظیم کا نام ہے۔"

اِس ارشاد گرامی کے بعد صوبہ بہار میں امارت شرعیہ کے بانی حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ کا گراں قدر بیان مزید تشفی کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ وہ اجتماعی وشرعی زندگی کی ضرورت بتاتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"اسی مقصد کے لیے امارت شرعیہ کا قیام ۱۹۲۰ء میں عمل میں آیا۔ جس کا بنیادی اصول اربابِ حل وعقد کا امیر منتخب کرنا ہے اور تمام مسلمانوں کا اس کے احکام پر سمع واطاعت کرنا ہے۔ امارت شرعیہ کی حیثیت انجمن کی نہیں ہے۔ جیسا کہ اور انجمنیں ہوتی ہیں کہ اس کے ممبر وغیرہ ہوتے ہیں بلکہ اس کی صورت وہ ہے جو اوپر مذکور ہوئی۔" (مدینہ ۱۳؍ جنوری ۱۹۳۹ء)

کیا اِن بیانات کے بعد بھی یہ سمجھنا مشکل ہے کہ امارت شرعیہ کیا ہے اور اِس کا نظام کیا ہے؟

امارت شرعیہ کا ثبوت:

امارت بے طاقت وباطاقت کا فضول سوال پیدا کرکے لوگوں نے مباحثہ ومجادلہ کا بازار گرم کررکھا ہے۔ حالاں کہ اس کے متعلق اگر صرف ایک سوال کا جواب حاصل کرلیا جائے تو ساری بحث ختم ہوجاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ

اگر مسلمانوں کی جماعت کسی ایسے ملک میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوجائے، جہاں غیر مسلم طاقتوں کا استیلا ہے تو کیا اس ملک میں حسبِ استطاعت شرعی واجتماعی زندگی بسر کرنے کے متعلق اسلام اپنے اندر کوئی نظام، کوئی راہ عمل اور کوئی روشنی نہیں رکھتا۔ اگر فوری طور پر طاقت کے ذریعہ اسلامی حکومت کا قیام نہ ہوسکے تو کیا اسلام مسلمانوں کو انتشار، پراگندگی اور فوضویت کے سپرد کردیتا ہے؟ ایک مسلمان جو قیامت تک کے لیے اسلام کو مکمل ترین دین سمجھتا ہے، یہی جواب دے گا کہ یقیناً اسلام مسلمانوں کو ایسی حالت میں تاریکی میں نہیں رکھتا۔ یقیناً وہ کسی حالت میں مسلمانوں کو انتشار وپراگندگی اور فوضویت کے سپرد نہیں کرتا، یقیناً ایسی حالت میں بھی کہ مسلمانوں کے پاس کوئی مادّی طاقت نہ ہو وہ حسب استطاعت موجودہ ان کی شرعی واجتماعی زندگی کے لیے ایک نظام رکھتا ہے، امارت شرعیہ اسی نظام کا دوسرا نام ہے۔ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کو بلا تامل تسلیم کرلینی چاہیے۔ لیکن مسلمانوں کی مزید تشفی اور اطمینانِ قلبی کے لیے ہمارے بزرگ محترم مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی ناظم امارت شرعیہ صوبہ بہار نے پوری قابلیت کے ساتھ مسئلہ امارت پر قرآن پاک، حدیث شریف، تاریخ اور عالمِ اسلامی کے علماء حق کے فتووں کی روشنی میں ایسی عمدہ تحقیق فرمائی ہے کہ ریب وارتیاب کی تمام تاریکیاں دور ہوجاتی ہیں۔ جو شخص دیانت داری کے ساتھ اس مسئلے کو سمجھنا چاہتا ہے اس کو وہ کتاب ضرور دیکھنی چاہیے۔ ہم طوالت کے خوف سے یہ بحث چھیڑنی نہیں چاہتے ورنہ یہ مختصر رسالہ ایک ضخیم کتاب کی شکل اختیار کرلے گا۔

علاّمہ سیّد سلیمان ندوی مدظلہ، مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی کی کتاب کے تعارف میں اس بحث کا عالمانہ وحکیمانہ فیصلہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "میری سمجھ میں تو ذاتی اغراض سے بلند ہو کر ان اختلافات کا منشا ایک ہی نظر آتا ہے۔ مسئلہ کے مؤید کی نظر میں عدم استطاعت کے سبب سے مکی امامت کا نقشہ ہے اور مخالف کی نگاہیں مدنی امامت کا جلوہ ڈھونڈتی ہیں۔ بات بالکل ٹھیک ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ مکی امامت کی تمہید کے بغیر مدنی امامت کا مقصد جلوہ پیرا نہیں ہو سکتا۔ غار حرا کے سکون سے پہلے غزوۂ بدر کا شور پیدا نہیں ہو سکتا۔ کاش کہ تمہید اور مقصد کے فرق کو سمجھ لیا جاتا تو اِس کشاکش کی نوبت نہ آتی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مکی زندگی میں بھی جو مادّی بے کسی وبے بسی اور سیاسی عجز وضعف کا عہد تھا ہمارے لیے امام کی حیثیت سے بھی ویسے ہی مطاع اور واجب الطاعۃ تھے جیسی اپنی مدنی زندگی میں۔"

اس سے آگے بڑھ کر جب ہم سرورِ کائنات علیہ التحیۃ والتسلیمات کی مدنی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ حضور نے بعض موقعوں پر جنگ کی استطاعت رکھتے ہوئے مخالف طاقتوں سے بظاہر دَب کر صلح کی ہے۔ کیا دنیا صلح حدیبیہ کا اہم ترین واقعہ بھول چکی ہے؟ کیا احادیث وسیر کی کتابوں سے صلح حدیبیہ کی دفعات محو ہو چکی ہیں۔ کیا عمر فاروقؓ جیسے جلیل القدر صحابی نے بھی اس کو اپنی شکست نہیں سمجھا تھا۔ کیا عام طور پر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اِس صلح کو اپنی ہتک تصور نہیں کیا تھا، کیا زنجیروں میں جکڑے ہوئے

ابو جندلؓ صحابہ کی مسلح جماعت کے سامنے سے اس وقت کے دارالکفر مکہ میں واپس نہیں کیے گئے تھے۔ کیا اسی واقعہ صلح کو خالقِ کائنات نے فتح مبین کا حیرت انگیز لقب نہیں دیا اور کیا دنیا نے یہ نہیں دیکھا کہ اسی صلح نے اسلام کی آئندہ تمام کامرانیوں کے لیے دروازہ کھول دیا؟ تو پھر آج جب ہم مادّی طاقت نہ رکھنے کے باوجود اپنے مقصد سے نیچے درجے کے مطالبات مصالحِ شرعیہ سے مجبور ہو کر تسلیم کرتے ہیں تو ہم پر الزامات واتہامات کے تیر کیوں برسائے جاتے ہیں؟ کیا مسٹر راغب احسن صاحب اِن حقیقتوں کو بالکل محسوس نہیں کرتے؟ اگر ایسا ہے تو میں اُن سے یہ اپیل کروں گا کہ وہ از سرِ نو مسئلہ امارت پر غور کریں۔ ممکن ہے کہ زندگی بھر وہ جس خیال کی تائید کرتے رہے ہیں پھر اسی خیال کی تائید پر اپنے کو مجبور پائیں۔

وما علينا إلاّ البلاغ وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين.

نظمیں

نقصان عظیم!

مولانا سید احمد عروج قادری امجھریؒ

یہ کیا حالت ہے میری، آج میرا دل دھڑکتا ہے
یہ کیوں رہ رہ کہ سینے میں اک انگارہ بھڑکتا ہے

مجھے کیوں آج نظم علم و دیں برہم نظر آیا
یہ کیوں ہر دیدۂ حق آشنا پُرنم نظر آیا

صف مردان آزادی پہ حسرت چھائی جاتی ہے
ہوا کیا ہے، وطن میں مردنی سی پائی جاتی ہے

زمیں تا آسماں مجھ کو عجب حالت نظر آئی
تحیر تھا کہ اتنے میں یہ جاں فرسا خبر آئی

کہ مرد حریت سجاد نے اذن سفر پایا
سفر وہ جس سے کوئی آج تک واپس نہیں آیا

سیاست دم بخود، صدق وصفا مرہون حیرانی
تدبر بر سر زانو، روئے مذہب پر پریشانی

عمل کی آنکھ روئی، علم کے دل سے فغاں نکلی
تفقہ کے لبوں سے آہ بے تاب وتواں نکلی

وہ عامل عضو وکامل فرد وشمع ملت بیضا
نڈر، بے باک، سرتا پا مجاہد تھا، مجاہد تھا

مجاہد جس نے ساری زندگی آرام تج ڈالا
مصیبت مول لے لی اور وقار ونام تج ڈالا

ارادے کا دھنی، پیری میں بھی جوش جنونانہ
سراپا علم، سرتا پا عمل جانباز وفرزانہ

مجاہد جس کے نعروں سے لرز اٹھی زمین ہند
مجاہد جس کے سجدوں سے چمک اٹھی جبین ہند

مجاہد وہ جو فاقوں سے نہ شرمایا، نہ گھبرایا
جبین صاف پر جس کی مصائب میں نہ بل آیا

مجاہد جس کی عزم آہنی پر آسماں حیراں
فرشتے دم بخود، جبریل چپ، کون ومکاں حیراں

حکومت عزم سے جس کے ہزاروں بار ٹکرائی
ہوئی ہر بار رسوائی، ہوئی ہر بار پسپائی

وہ عالم جس کی تحریروں میں حکمت پرورش پاتی
صداقت پرورش پاتی، شجاعت پرورش پاتی

امارت کا مربی اور جمیعت اس کے ہاتھوں میں
شریعت اس کے ہاتھوں میں سیاست اس کے ہاتھوں میں

تدبر، نکتہ دانی ختم تھی جس ذات عالی پر
نظر جاتی نہیں اندوہ سے اس جائے خالی پر

جگر سے ہوک اٹھتی ہے، سمجھ میں کچھ نہیں آتا
کلیجہ پھٹ رہا ہے، غم سے کچھ لکھا نہیں جاتا

الٰہی ان کی قبر پاک پر رحمت کی بارش ہو
تلطف کی نظر ہو اور عنایت کی تراوش ہو[۱۳۸]۔

---

[۱۳۸] محاسن سجاد، ص ۱۹۲

یادِ سجاد

مولانا سید عروج احمد قادری

گرم آہوں نے جلا ڈالا دل ناشاد کو
لو جگر تھامو کہ لب کھلتے ہیں اب فریاد کو

ہائے وہ علم سراپا، ہائے وہ دردآشنا
کیا کریں، کیا کہہ کے بہلائیں دل ناشاد کو

ہم مسلمانوں کی خاطر جس نے سب کچھ تج دیا
ہمنشیں کیسے بھلائیں حضرت سجاد کو

شعلۂ جوالہ تھی جس کی حیات کامیاب
جانتا تھا کاہ جو کہ ،کوہِ استبداد کو

جان دے دی جس نے احیائے شریعت کے لئے
جھیل ڈالا جس نے اس رستہ میں ہر بیداد کو

آہ! وہ مرد خدا رشد وہدایت کا چراغ
قبر کو اس کی بنادے اے خدا جنت کا باغ

دفتر حسن عمل میں نام باقی ہے ابھی
تو نہیں لیکن ترا پیغام باقی ہے ابھی

تونے پھونکی ہے وہ روح تازہ جسم مردہ میں
دل میں جوش خدمت اسلام باقی ہے ابھی

کیسے مٹ سکتی ہے تیری زندگی کی یادگار
دہر باقی، چرخ نیلی فام باقی ہے ابھی

منقلب کرنا ہے دنیا کو بانداز دگر
اہتمام گردش ایام باقی ہے ابھی

انقلابی رو کو اسلامی بنانا ہے ہمیں
یعنی ہم لوگوں کے ذمہ کام باقی ہے ابھی

مطمئن رہ تیرا مقصد کھینچ لایا جائے گا
خارزار ہند کو گلشن بنایا جائے گا

ماتم سجاد

مولانا محمد سلیمان آسی قاسمی مظفرپوریؒ

ہوا اوجھل نگاہوں سے وہ چشم قوم کا تارا
الٰہی ہوگیا کیا آہ! غم سے دل ہے سیپارہ
بنی صبح بہاری شام کی ظلمت کا گہوارہ
ڈھلک کر مل گیا انوار سے وہ نور کا پارا

وفات حضرت سجاد ایک پیغام ماتم ہے
جہاں کا ذرہ ذرہ غم میں اس کے چشم پر نم ہے

زعیم قوم کا پی لینا اف جام شہادت کا
یہ طوفانی زمانہ میں ہے اک طوفان آفت کا
علم ہے سرنگوں کردار تحریک امامت کا
بپا ہے عالم امکاں میں ہنگامہ قیامت کا

جگر شق ہو نہ جائے صاحب احساس انساں کا
کلیجہ پھٹ نہ جائے کثرت غم سے مسلماں کا

سیاست کی مسلمانوں کے گتھی کون سلجھائے
شریعت پر سیاست کو چلا کر کون دکھلائے
عمل کرکے شریعت کی حقیقت کون سمجھائے
صدائے حق سے دل اسلامیوں کا کون گرمائے

گری آفت کی بجلی خرمن امید مسلم پر
بڑھا زور گہن، غالب ہوا خورشید مسلم پر

غم سجاد میں آسی کا گھلنا کام ہے گویا
مجاہد پر فدا ہونے کا یہ انجام ہے گویا
مجھے اس سے محبت کا ملا انعام ہے گویا
خلاصہ زندگی کا جس کی یہ پیغام ہے گویا

ہر اک عالم کی قربانی کی ملت کو ضرورت ہے
یہی روح عمل سجاد کی روشن حقیقت ہے

سر اپنا میں تری اسکیم پر ایثار کرتا ہوں
رہ سجاد پر مرنے کا میں اقرار کرتا ہوں
تری اسکیم کے دبنے سے میں انکار کرتا ہوں
اور اس انکار پر بالجزم میں اصرار کرتا ہوں

رگوں میں جب تلک ہے جوش اسلامی کا خوں باقی
تری اسکیم پر سجاد! میں مرنے کو ہوں باقی

تاریخ رحلت حضرت نائب امیر شریعت

از جناب مولانا حکیم شاہ محمد شعیب نیر رضوی پھلواری شریف

در غم آں ہادی دیں مصلح ہمدرد قوم
خاک بر سر بیخیتم شد عالمے اندوہ،وغم
سال ترحیلش چو جستم ہاتف غیبی بگفت
رخت چوں بربست زیں دنیا سوئے ارم
اِنّ موتَ العالِم واللّٰہِ مَوتُ العَالَمِ
۱۳ ھجری ۵۹
کلک نیر زد رقم سال وفاتش این چنیں

جہاں پر شور ومحشر زا،وخلقت خستہ وحیراں
نچوں گردد کہ رفت از قوم مسلم مصلح اعظم

فلک گریاں، زمیں نالاں، مکدر بر فلک اختر
فضائے آسماں مغبر نظام ماہ وخور درہم

خلش در سینہ ہا پیدا،خلش زیں غم بہر دلہا
پریشاں حال ہر مسلم بپا ہر جاست ایں ماتم

گذشت از ما ہمہ سجاد جان علم وروح فن
ازاں شور قیامت گشت پیدا در ہمہ عالم

امیر شرع را نائب زہے رائیش ہمہ نائب
امور شرع زو منظم اساس دیں ازو محکم

اے چشم مسلم زار کز تو گمشد این گوہر
گریبان در،واشک خون روان چشم کن وہرم

خموش اے نیرؔ محزوں زغم تا کے کنی نالہ
صبوری کارفرما،وبداغ دل بنہ مرہم

بسال رحلتش نیرؔ شنید از ہاتف غیبی
بدرد قوم ومذہب مرد آہ آں مصلح قومم

مفصل فہرست

اشاریہ موضوعات

اشاریہ رجال

ا

ب

پ

ت

ج

ح

خ

د

ڈ

ر

ز

س

ش

ص

ط

ع

غ

ف

ق

ک

گ

ل

م

ن

ہ

و

ی

اشاریہ مقالات

آ

ا

ا

ب

پ

ت

ٹ

ج

ح

د

ڈ

ر

س

ش

ص

ع

غ

ف

ق

ک

گ

ل

م

ن

ہ

ی

اشاریہ کتب وجرائد

ا

ا

ا

ب

ت

ٹ

ج

ح

خ

د

ر

ز

س

ش

ض

ع

ف

ق

ک

ل

م

ن

ہ

اشاریہ ادارے، تحریکات، تنظیمیں

ا

آ

ا

پ

ت

ج

ح

غ

د

ر

س

ص

ط

ع

ف

ک

گ

م

ن

ہ

ی